خاکی کمپنی

(پاکستان میں فوجی معیشت کا جائزہ)

عائشہ صدیقہ

مترجم: ناظر محمود

عائشہ صدیقہ اُمورِ افواج کی ماہر اور تجزیہ کار ہیں۔ اُنھوں نے کنگز کالج لندن سے مطالعاتِ جنگ کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ وہ بین الاقوامی رسائل، Jane's Defence Weekly اور پاکستان کے (انگریزی) اخبارات میں تواتر سے لکھتی ہیں۔ وہ 2004-5 میں واشنگٹن ڈی سی کے ادارے ووڈرو ولسن انٹرنیشنل سینٹر فار اسکالرز سے وابستہ رہی ہیں۔ اس سے قبل وہ بون انٹرنیشنل سینٹر کی فورڈ فیلو اور کوآپریٹو مانیٹرنگ سینٹر، سنڈیا نیشنل لیبارٹریز امریکا کی ریسرچ فیلو بھی رہ چکی ہیں۔ وہ محبوب الحق کوڈیکارا اور ایشیا فاؤنڈیشن ریسرچ ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہیں۔ عائشہ صدیقہ فوج کے دائرۂ اختیارات کے متعلق تہلکہ خیز کتاب Arms Procurement and Military Buildup (1979-99) کی بھی مصنفہ ہیں۔

خاکی کمپنی

(پاکستان میں فوجی معیشت کا جائزہ)

Momin Khan

خاکی کمپنی

(پاکستان میں فوجی معیشت کا جائزہ)

عائشہ صدیقہ

مترجم: ناظر محمود

مکتبۂ دانیال

میری زندگی کی اُمیدوں کا مرکز — سہیل

اور

میری فلاکت زدہ سرزمین

کے نام

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب عرضِ خدا کے کعبے سے

سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو ناظر بھی ہے منظر بھی
اُٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

(فیض احمد فیض، امریکا، جنوری ۱۹۷۹ء)

ترتیب

اظہارِ تشکر

میں دانش وروں کے لیے قائم ادارے وڈرو ولسن انٹرنیشنل سینٹر کی شکرگزار ہوں جنھوں نے میری مالی معاونت کی اور ایک سال تک امریکا میں قیام کا موقع دیا تا کہ میں اُس مواد پر ریسرچ کرسکوں جو اس کتاب کی تالیف میں استعمال ہوا۔ میں رابرٹ ہیلاوے، سعید شفقت اور اپنی دوست ناونتیا چھڈا۔ باہیرا کی بھی ممنون ہوں، جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مسودے کے چند ابواب کو پڑھنے کے لیے وقت دیا اور اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔ میں ولی نصر، عائشہ جلال اور مائیکل بردوسکا کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے مجھے اس موضوع کو پرکھنے کے لیے نئے زاویوں سے روشناس کروایا اور مجھے ایسی سمتوں میں دیکھنے کا موقع ملا جو پہلے میری نگاہ سے اوجھل تھیں۔

جن لوگوں کا مجھے شکریہ ادا کرنا ہے، اُن کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن میں بالخصوص لیفٹیننٹ جنرل سیّد محمد امجد اور طلعت مسعود، ایڈمرل فصیح بخاری، حمید ہارون، اکرام سہگل، ناظم حاجی اور ریاض ہاشمی صاحب کی شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے فوج اور فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو گہرائی میں سمجھنے میں مدد دی۔

میں اپنے ان دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے مجھے اس موضوع پر مواد جمع کرنے میں مدد دی۔ میں راجا سلیم، جنید احمد، رؤف اور شہزاد کی بھی ممنون ہوں جنھوں

نے ضروری مواد کی تلاش میں میری بہت مدد کی۔ میں اپنے ریسرچ معاونین عدیل پراچہ، اجیتا شاہ، ماہ رُخ محمود اور جیمس موراتھ کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کروں گی جنھوں نے ضروری مواد کو ڈھونڈنے کے محنت طلب عمل میں میری معاونت کی۔ اور مرتضیٰ سولنگی کی بھی خاص طور پر شکرگزار ہوں جن کی اخلاقی حوصلہ افزائی میرے امریکا میں قیام کے لیے مددگار رہی۔

میرا اظہارِ تشکر نامکمل رہے گا، اگر میں اپنے شوہر سہیل مصطفیٰ کی مدد اور جذباتی ہمت افزائی کا ذکر نہ کروں۔ وہ میرے کام کو تکمیل تک پہنچانے میں میری حوصلہ افزائی کے لیے ہمیشہ موجود رہے۔ میں عزیز، عمر اور جمال کی بھی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے گھر پہ رہ کر کام کرنے اور اس کتاب کو مکمل کرنے میں میرے لیے آسانی پیدا کی۔ میں اپنی عزیز دوست سعدیہ عماد کی حوصلہ افزائی کا ذکر بھی کرنا چاہوں گی جو میرے لیے ہمیشہ موجود و میسر رہی۔

میں پلوٹو پریس کے کمیشننگ ایڈیٹر راجر وان زوانبرگ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ میرے ابتدائی مسودے کے خاکے پر اُن کے تبصروں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ میں کیا لکھنا چاہتی ہوں۔

آخر میں مجھے ناظر محمود صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انھوں نے محنت اور دلی لگن سے میری اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

عائشہ صدیقہ

پبلشر کا نوٹ

ہم جناب مبین مرزا کے نہایت ممنون ہیں جنھوں نے Military Inc. کے اردو ترجمے کی ایڈیٹنگ خاص توجہ کے ساتھ انجام دی۔

ادارہ نائلہ محمود صاحبہ کا بھی بے حد شکرگزار ہے جنھوں نے کتاب کے سرورق کا خیال پیش کیا اور اُس کے لیے فوٹوگرافی کی۔

Acronyms

ABL	Allied Bank Ltd
ABRI	Angkatan Bersenjata Republic Indonesia (armed forces of the Republic of Indonesia)
ACL	Askari Cement Ltd
ADB	Asian Development Bank
AEB	Askari Education Board
AG	adjutant-general
AMAA	Army Mutual Assistance Association (Turkey)
AWACS	airborne early-warning aircraft system
AWNCP	Army Welfare Nizampur Cement Project (Pakistan)
AWT	Army Welfare Trust (Pakistan)
BICC	Bonn International Center for Conversion
BCCI	Bank of Credit and Commerce International
BF	Bahria Foundation (Pakistan)
CDA	Capital Development Authority/ Cholistan Development Authority (Pakistan)
CENTO	Central Treaty Organization
CGS	chief of general staff
CLS	chief of logistics staff – Pakistan Army
CNS	chief of naval staff

CoD	Charter of Democracy (Pakistan)
CPJ	Committee to Protect Journalists (Pakistan)
DCC	Cabinet Committee for Defence (Pakistan)
DHA	Defence Housing Authority (Pakistan)
EBDO	Elective Bodies Disqualification Ordinance (Pakistan)
FF	Fauji Foundation
FFC	Fauji Fertilizer Company Ltd
FJFC	Fauji-Jordan Fertilizer Company
FOTCO	Fauji Oil Terminal and Distribution Company Ltd
FSF	Federal Security Force (Pakistan)
FWO	Frontier Works Organization (Pakistan)
GHQ	General Headquarters
IJI	Islami Jamhoori Ittihad party (Pakistan)
IMF	International Monetary Fund
ISI	Inter-Services Intelligence (Pakistan)
ISPR	Inter-Services Public Relations (Pakistan)
JS HQ	Joint Staffs Headquarters (Pakistan)
JCO	junior commissioned officer
JCSC	Joint Chief of Staffs Committee (Pakistan)
KPT	Karachi Port Trust
MCO	miscellaneous charge order
MGCL	Mari Gas Compay Ltd
MI	Military Intelligence
MLC	Department of Military Land and Cantonment (Pakistan)
MMA	Mutahida Majlis-e-Amal (Pakistan religious party)
MoD	Ministry of Defence
MQM	Muttahida Qaumi Movement (Pakistan)
MRD	Movement for Restoration of Democracy (Pakistan)
MSA	Maritime Security Agency (Pakistan)
NAB	National Accountability Bureau (Pakistan)
NBP	National Bank of Pakistan
NDC	National Defence College (Pakistan)
NGO	non-government organization
NHA	National Highway Authority
NLC	National Logistic Cell (Pakistan)
NoC	no-objection certificate

NPL	non-performing loans
NRB	National Reconstruction Bureau (Pakistan)
NSC	National Security Council (Pakistan)
NWFP	North West Frontier Province (Pakistan)
OYAK	Turkish Armed Forces Mutual Assistance Fund
PAF	Pakistan Air Force
PCCB	Pakistan Cricket Control Board
PIA	Pakistan International Airlines
PIDC	Pakistan Industrial Development Corporation
PIDE	Paksitan Intstitute of Development Economics
PIU	produce index units (unit of land ownership)
PKI	Partai Komunis Indonesia (Communist Party of Indonesia)
PLA	People's Liberation Army (China)
PMEs	private military enterprises
PML-N	Pakistan Muslim League (Nawaz)
PML-Q	Pakistan Muslim League (Quaid-e-Azam)
PN	pakistan Navy
PNA	Pakistan National Alliance
PPP	Pakistan People's Party
PPPP	Pakistan People's Party Parliamentarian Patriot
PR	Pakistan Railways
PSO	Pakistan State Oil
PSO	principal staff officer
QMG	quartermaster-general
RCO	Revival of the Constitution Order (Pakistan)
RMA	Revolution in Military Affairs
SAI	Shaheen Air International Airlines
SCO	Special Communications Organization (Pakistan)
SECP	Securities and Exchange Commission of Pakistan
SF	Shaheen Foundation (Pakistan)
SMS	Securities and Management Services
TFC	term finance certificate
WAPDA	Water and Power Development Authority (Pakistan)

بعد کے برسوں میں☆

2011ء کے ڈوبتے ہوئے سورج نے سیاسی نظام اور جمہوریت کے ایک طرح سے محاصرے میں ہونے کی گواہی دی ہے۔ اس دور میں سیاسی نظام کا خاتمہ براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اُمید کی کرن جو 2008ء کے انتخابات کے بعد نظر آئی تھی یعنی فوجی آمر کو بے اختیار کر دیا جانا اور ایک نئی سیاسی حکومت کا منتخب ہونا، وہ معدوم ہو چکی ہے، لیکن یہ کوئی ایسا حیرت کا مقام نہیں، کیوں کہ یہ عمل تو پاکستان کی تاریخ میں بار بار دُہرایا جاتا رہا ہے۔ بہرطور فوج نے ملک کی سیاست پر اپنی طاقت اور اختیار برقرار رکھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر عوام نے انتخابات میں ایک ڈرامائی تبدیلی کی توقع کیوں لگائی اور یہ کیوں سوچا کہ یہ انتخاب ایک سیاسی تبدیلی لے آئے گا یعنی مشرف کو جی ایچ کیو سے جبری بے دخل اور پھر صدارت کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے گا، اور یہ کیوں سوچا کہ یہ سارا عمل ایک ٹھوس تبدیلی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اُس فوج کی طرزِ حاکمیت میں بھلا اس طرح کی کوئی تبدیلی کیسے آ سکتی ہے، جو ''سیاسی اقتدار''، ''اقتصادی طاقت'' اور ''عقلی اختیار'' کا مرکب ہو؟

فوج کی حاکمیت کا دور

2008ء میں ہونے والے انتخابات کا رُخ ممتاز سیاسی لیڈر بے نظیر بھٹو کی نظر فریب اور

☆ مصنفہ نے یہ مضمون اپنی کتاب کے اس اردو ترجمے کے لیے بطورِ خاص لکھا ہے اور اس میں انھوں نے کتاب میں قائم کیے گئے مقدمے کے بنیادی نکتے کے کچھ اور پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کتاب کی اشاعت کے بعد سے موجودہ صورتِ حال تک رونما ہونے والے حقائق اور تبدیلیوں کا اس مضمون میں احاطہ کیا ہے۔

ناقابلِ یقین الم ناک شہادت سے متعین ہوا۔ بعد ازاں عدلیہ اور مشرف حکومت کے درمیان ہونے والے بحران نے بھی، جس نے وکلا کی تحریک کو جنم دیا، لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ پاکستان ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔ حالانکہ حالات کی یہ تبدیلی پاکستان کی تاریخ کا صرف وہ باب تھی جو سیاسی اختیارات کے مابین کش مکش کی صورتِ حال کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کتاب کے بنیادی استدلال میں سے ایک یہ ہے کہ سیاسی طاقت صرف کسی ایک عنصر کا نام نہیں بلکہ یہ اقتصادی اور سیاسی دونوں طاقتوں کے مجموعے سے وجود میں آتی ہے۔ سیاست اور اقتصادیات کا تعلق کسی ایک حد پر رُک نہیں جاتا بلکہ تواتر سے چلتا رہتا ہے۔ لہٰذا سیاسی طاقت اقتصادی طاقت کو تقویت بخشتی ہے جو آگے چل کر سیاسی طاقت کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے اور اُسے بااختیار رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اب میں اس میں عقلی اختیار کی قوت کو بھی شامل کروں گی جو کسی بھی خاص طاقت کی برتری کو اور مستحکم کرتی ہے۔ یہ وہ پہلو تھا جو اصلی انگریزی کتاب میں تحریر کرنے سے رہ گیا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت لکھنے کا مقصد محض سیاست اور اقتصادیات کے تعلق پر نظر ڈالنا تھا۔ اس مضمون کے آگے آنے والے حصے خاص طور پر 2008ء سے 2011ء کے دور کی فوجی حاکمیت کے بہت سے پہلوؤں کی وضاحت کریں گے۔

سیاسی اقتدار

2008ء میں پی پی پی کی سیاسی حکومت کے اقتدار میں آجانے سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک پائیدار جمہوریت واپس آگئی ہے چونکہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں جمہوریت کے اس ضابطۂ اخلاق پر متفق ہوگئی تھیں جو ''میثاقِ جمہوریت'' (Charter of Democracy) کے نام سے پیش کیا گیا تھا اور جس پر بے نظیر اور میاں نواز شریف نے 2007ء میں دستخط کیے تھے۔ اس کے بعد 2008ء میں انتخابات ہوئے جس میں پی پی پی کی مرکز اور صوبۂ سندھ میں حکومت قائم ہوئی۔ جب کہ پنجاب میں پی ایم ایل (ن) کو برتری حاصل رہی۔ پی پی پی نے باقی دو چھوٹے صوبوں یعنی خیبر پختون خواہ میں اے این پی اور بلوچستان میں جے یو آئی (ایف) کے ساتھ مل کر حکومت بنائی۔ نئے سیاسی نظام کے قیام کے حوالے سے جن خاص مثبت اقدامات کا بہت شہرہ ہوا، اُن میں اہم قوانین مثلاً 18 ویں ترمیم

جس کی رُو سے مرکز سے اختیارات وفاق کو منتقل کرنا یا فوجی آمر پرویز مشرف کو مرکزی اختیار سے باہر کردینا، بھی شامل تھے۔ کچھ لوگ حکومت کی کارکردگی کی فہرست میں یہ نکتہ بھی شامل کریں گے کہ اُس کا دورِ حکومت دو سال کی مدت سے زیادہ ہوگیا ہے۔ جب کہ 90ء کی دہائی میں تو حکومتوں کا دورانیہ حیات یہی رہا تھا۔ پاکستان کی فوج اور عوام کے مابین تعلقات پر ماہرانہ نظر رکھنے والے جناب سعید شفقت کو نئی حکومت زیادہ پُراعتماد نظر آئی، جس کی وجہ جی ایچ کیو راول پنڈی☆[1] اور حکومت کے درمیان ضروری اور طے شدہ معاملات پر لین دین کی مفاہمت ہے بعض دوسرے دانش ور اس سیاسی صورتِ حال کی کامیابی کا سہرا فوجی سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی کی بصیرت افروزی کے سر باندھتے ہیں یعنی اسے اُن کے جنرل پرویز مشرف سے جی ایچ کیو کے اختیارات لینے پر محمول کرتے ہیں۔☆[2] یہ دانش ور جنرل کیانی کی سیاسی سوجھ بوجھ پر زیادہ یقین رکھتے ہیں چونکہ ان کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ جمہوریت کے استحکام کے حوالے سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کے لیے ترقی پسند اور کشادہ ذہن ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جنرل صاحب کا بنیادی مقصد فوج کا رُجحان ان کے پیشے کی طرف کرنا اور انھیں ان کی بیرکوں میں واپس لانا ہے۔

یہ دلیل دی جاتی ہے کہ 2007ء میں مضبوط سیاسی اختیارات رکھنے والی فوج کا انتظام سنبھالنے کے بعد سے جنرل صاحب خود کو اور اپنی فوج کو سیاست سے دور رکھنے کی بتدریج کوشش کررہے ہیں۔ بظاہر یہ بھی ہوا کہ انھوں نے اپنے فوجیوں کے سیاسی رہنماؤں سے ملنے پر پابندی لگا دی اور انھیں تمام سرکاری محکموں سے ہٹانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ فوج کا اپنے معاملات کو ظاہر کرنا اور پارلیمنٹ میں اُس پر کم از کم تین مرتبہ تبادلۂ خیال ہونے دینا فوج کے سربراہ کی ذہنی پختگی کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ دراصل ان کی ذہنی پختگی اس میں ہے کہ پارلیمانی نظام کو موقع شناسی کے ساتھ چلائیں تاکہ فوج کی قدر و منزلت کو بڑھایا جاسکے نہ کہ اس میں کہ وہ اس پارلیمنٹ کو طاقت ور بنائیں جس کے پاس اپنے ایسے خودمختار وسائل تک نہیں کہ جن کے بل بوتے پر وہ آئی ایس آئی کے چیف کے دعووں پر کوئی سوال اٹھا سکے۔ میمو گیٹ اسکینڈل کے حوالے سے دیکھا جائے تو فوج کے نقطۂ نظر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیاسی حکومت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی بلکہ اُسے مفلوج کرنے اور ناکارہ بنانے کا پختہ ارادہ

رکھتی ہے۔ سیاسی حکومت کے اس طرح مفلوج ہونے کے نتیجے میں حکومت کی تبدیلی کی راہ ہموار ہوگی اور ایک ایسی سیاسی جماعت یا سیاسی جماعتوں کے اتحاد کو حکومت میں لانا ممکن ہوگا جو اختیار کے لحاظ سے محفوظ یا غیر ضرر رساں ہو۔ جی ایچ کیو اور ایوانِ صدر کے درمیان مسئلہ دراصل فوج کا حکومت کے بارے میں یہ گمان ہے کہ وہ سیاسی کھیل میں جی ایچ کیو کا ایک اہم کھلاڑی ہونے کی حیثیت سے احترام نہیں کر رہی۔

2011ء کے اختتام تک فوجی سربراہ ملک کا سیاسی نظم و نسق سنبھالنے والی تکون کا حصہ رہا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ فوج اصل میں حکومت اور ریاست کی سیاست میں کتنا مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔

نمبر شمار	قسم	دورانیہ	مدت
.1	براہِ راست فوجی حکومت	17 سال	1958-1962ء 1969-1971ء 1977-1985ء 1999-2002ء
.2	منتخب شدہ حکومت زیرِ اثر فوجی صدر	15 سال	1962-1969ء 1985-1988ء 2002-2007ء
.3	منتخب شدہ حکومت ایک عوامی صدر کے ماتحت (تکون کی حاکمیت)	14 سال	1988-1999ء 2008-2011ء
.4	غیر پارلیمانی طاقتوں کی برتری، ایک رسمی پارلیمانی حکومت کے زیرِ اثر رہنا	11 سال	1947-1959ء
.5	عوامی برتری	6 سال	1971-1977ء

(ذریعہ: محمد وسیم — پاکستان میں فوجی اور شہری تعلقات — راج شری، 2009ء، پاکستان کی علاقائی اور عالم گیر سیاست، نئی دہلی، Routledge، ص 185)

حقیقتاً یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ امورِ خارجہ، قومی تحفظ اور کچھ اندرونی مسائل فوج کے زیرِ اثر رہیں گے جب کہ سیاسی حکومت صرف ریاست کو قانونی جواز مہیا کرے گی تا کہ وہ

اپنے وسائل بڑھائے اور ملک کا نظام چلا سکے۔ یہ حالات اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتے جب تک فوج کوئی رعایت دینے پر تیار نہ ہو یا سیاسی طاقتیں کوئی دلیرانہ اقدام نہ کریں۔ یا پھر ایسا ہو کہ حالات اقتدار کے کھیل کے نئے سانچے کو ڈھالنے پر مُصر ہوں۔ پاکستان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ترکی کی فوج کی مثال دیتے ہیں کہ اُس کی طرح یہاں بھی سیاسی دھارے کا رُخ بدلا جا سکتا ہے۔ یہ مثال اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھے بغیر دی جاتی ہے کہ ترکی میں فوج اور سول تعلقات پر یورپی سیاست کس قدر اثر انداز ہوئی ہے۔ ترکی میں فوج کو سیاسی قوتوں کو تسلیم کرنا پڑا، اس لیے کہ وہ یورپی یونین کا حصہ بننے کی خواہاں تھی۔ ہمارے ہاں مستقبل کا کوئی بحران یا حالات کی ٹھوس تبدیلی کا کوئی امکان ایسا نظر نہیں آتا جس کے تحت فوج اقتدار میں کسی قدر دست برداری پر آمادہ ہو سکے۔ دوسری طرف سیاسی طاقتیں کوئی تبدیلی لانے کے لیے قطعاً نااہل ہیں۔ تاہم، یہ محض سیاست دانوں کی فطری بددیانتی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ سیاست دانوں کے ممتاز طبقے اور فوج کے مفادات یکساں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک بے اختیار معاشرے میں، جیسے وہ معاشرے جہاں جاگیردارانہ نظام کے اختیارات کے اثرات نظر آتے ہوں، وہاں عام طور سے تبدیلی صرف چہروں کی ہو سکتی ہے، حالات کی نہیں۔ بنیادی تبدیلی صرف اس صورت میں ممکن ہے، جب ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما طاقتیں یعنی سیاسی اور فوجی طاقتیں کسی دباؤ یا تباہی کی دھمکی کی وجہ سے رضا کارانہ طور پر اپنے کچھ اختیارات کم کرنے پر تیار ہو جائیں۔

آخر میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ترکی میں تبدیلی کا عمل دراصل بیرونی طاقتوں بالخصوص یورپی یونین کے دباؤ کی وجہ سے ممکن ہوا۔ یورپی یونین کا رُکن بننے کی خواہش نے ملک میں جمہوریت کی اہمیت اور قدر و قیمت کو بڑھانے کا کام کیا اور فوج کو جمہوری نظام میں رکاوٹ ڈالنے سے روکا۔ دیکھا جائے تو پاکستان بیرونی دباؤ سے نکلنے میں کامیاب رہا ہے۔ جہاں تک پاکستانی فوج کا تعلق ہے، اسے ''ناموافق ہمسایے'' کے ساتھ رہنے کا بے حد فائدہ پہنچا اور اُس نے اعلیٰ ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے اس جواز کو استعمال کیا۔ یہی نہیں، بعد ازاں اپنی سیاسی قوت کو درپیش کسی بھی خطرے کے خلاف بھی اسی جواز کو استعمال کیا گیا۔

اقتصادی اختیارات

وکلا کی تحریک کا ایک پہلو ملک کے وسائل پر فوج کے ناجائز قبضے پر شدید تنقید بھی تھا۔ تاہم استحصال پھر بھی ختم نہیں ہوا بلکہ 2008ء میں حکومت کی تبدیلی کے باوجود استحصال میں کمی نہیں آئی۔ فوج کا ریاست کے وسائل اور زمینوں پر قبضہ جاری رہا۔ جیسا کہ میں نے اس کتاب میں تفصیلاً بحث کی ہے کہ استحصال کا عمل دراصل فوج یا طبقۂ اشرافیہ کی طاقت کا فطری اظہار یا اُس کی توسیع ہے۔ اسی لیے (1970ء کی دہائی سے قطعِ نظر) فوج نے کسی سیاسی حکومت کے دوران اپنے معاشی مفادات اور طاقت بڑھانے سے گریز نہیں کیا ہے۔ اس قسم کے استحصال کی ایک مثال جس سے فوج کا ''غیر قانونی'' تسلط قائم کرنے کا رُجحان ظاہر ہوتا ہے، چولستان پر قبضہ ہے۔☆[3] سرکاری ریکارڈ کے مطابق فوج نے چولستان کی 99,865 ایکڑ زمین پر غیر قانونی قبضہ کر لیا جس میں 5,000 ایکڑ جنگلات کے شعبے کا حصہ بھی شامل ہے۔ اس چوری شدہ علاقے کے علاوہ 200,000 ایکڑ زمین فوج کو صوبائی حکومت نے پہلے ہی ٹھیکے پر دی ہوئی تھی جو اُن کے انتظامی امور کے استعمال کے لیے تھی۔

ضلع بہاول پور (چولستان جس کا ایک حصہ ہے) میں، فوج کی ملکیت صرف 8,000 ایکڑ ہے جو اس کو فروخت کیا گیا۔ 1978ء میں ایک بڑا حصہ ٹھیکے پر دیا گیا تھا۔ جب کہ غیر قانونی تسلط اور علاقے کا غلط استعمال 1999ء میں میجر جنرل ایس زیدی کے دور میں شروع ہوا جو اس وقت چولستان کی ترقی کے لیے قائم شدہ شعبے کے سربراہ منتخب ہوئے تھے۔ میجر جنرل ایس زیدی کے بعد میجر جنرل محمد رزاق نے یہ عہدہ سنبھالا اور پھر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ٹوانہ نے ــــ جنھوں نے اس غیر قانونی طور پر حاصل کردہ خطے میں کچھ علاقے کو ذاتی ملکیت بنا لیا۔ اب یہ بریگیڈیئر سیکڑوں ایکڑ پر کاشت کاری کرتے ہیں۔ ان تینوں افسران کا دور 1999ء سے 2008ء تک رہا۔ یہ ممکن ہے کہ یہ زمین کئی برسوں بعد فارم ہاؤس اور افسران کے مکانات کے منصوبے میں تبدیل ہو جائے، لیکن آج اس کا ایک بڑا حصہ کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ بعد ازاں فوج نے زمین کو بڑے بڑے

زمیں داروں اور تاجروں یا ایسے لوگوں کو کرایے پر دینا شروع کر دیا، جنھیں کاشت کاری میں دل چسپی تھی۔ عموماً زمین کا یہ خطہ فوج کے کسی اعلیٰ افسر کے نام پر ہوتا ہے جو اسے مزید کرایے پر اٹھا دیتا ہے۔ زمین کی اس قسم کی تقسیم میں بڑے پیمانے پر پانی کی چوری بھی شامل ہے۔ فوج نے رحیم یار خان اور صادق آباد کے کھیتوں کو مہیا کیے جانے والے عباسیہ متصل نہر کے پانی کے چھوٹے چھوٹے مخرج بنا کر ان کا رُخ چوری شدہ علاقے کی طرف موڑ دیا ہے — یہ ایک نہایت عقل مندانہ منصوبہ ہے جس کی رُو سے کاشت کاروں کو پانی کا ٹیکس دینا پڑتا ہے نہ زرعی زمین کا، جو صوبائی حکومت کے مقرر شدہ ہیں۔

یہ علاقے دوسروں کے مقابلے میں نہایت زرخیز ہیں۔ چونکہ یہ بے داغ زمین ہے، اس سے کوئی فصل نہیں اٹھائی گئی اور اُسے پانی کی ایک بڑی مقدار حاصل ہے، اس لیے اس علاقے میں کرایے کی موجودہ شرح 35,000 روپے فی ایکڑ ہے۔ پچھلے چند برسوں میں لوگوں نے پانی کی چوری کے خلاف متعدد بار احتجاج کیا تھا لیکن وہ بے سود ثابت ہوا۔ سرکاری حساب کے مطابق 21,000 ایکڑ زمین رحیم یار خان اور صادق آباد میں پانی کی چوری کی وجہ سے متاثر ہوئی ہے۔ 4500 کیوسک پانی میں سے تقریباً 350 سے 400 کیوسک چوری ہو جاتا ہے۔ اس نہر کا کام 2002ء میں شروع ہوا تھا اور فوج نے 20 غیر قانونی نکاسی کے ذرائع (104-109 RD-213-228RD) چک واہنی اور قاسم والا کے مقامات پر نکال لیے تاکہ ان کی زمین سیراب ہو سکے۔ سرکاری طور پر فوج کو یہ اجازت ہے کہ جب ان کی مشقیں ہو رہی ہوں تو وہ اپنے سپاہیوں کے پینے کے لیے ایک مخرج سے پانی استعمال کر سکتی ہے لیکن فوج نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پانی کے اخراج کی گنجائش کو وسیع کر لیا۔ نہر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے کھدائی کی بڑی بڑی مشینوں اور دوسرے آلات کو دیکھا جا سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ زمین کھودنے اور مخرج بنانے کے لیے وہاں پہنچائی گئی ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اس چوری میں فوج کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ شعبۂ زراعت کے افسران یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس علاقے کے صاحبِ اقتدار اس دھوکے بازی میں شریک ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں چند لوگوں کے ناموں کی نشان دہی کی ہے، جیسے عصمت اللہ نیازی (مسلم لیگ ق کے ضلعی

صدر)، اقبال مغل (نائب ناظم لیاقت پور)، اقبال چنار (رکن صوبائی اسمبلی، مسلم لیگ ن)، پروفیسر رفیق منہاس اور نذیر خان، یہ لوگ پی پی پی کے ایک مقامی سیاست دان کرنل (ریٹائرڈ) نوید اور بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ایس ایم ٹوانہ کے رشتے دار ہیں اور یہ بھی عباسیہ متصل نہر سے پانی چراتے ہیں۔ تاہم شعبۂ زراعت کے بعض اعلیٰ افسران کا خیال ہے کہ فوج زیادہ بڑے پیمانے پر اس چوری میں ملوث ہے۔ علاوہ ازیں پانی چرانے والے باقی لوگ اپنی چوری کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ وہ بھی اس وقت تک چوری بند نہیں کریں گے جب تک فوج ایسا نہیں کرے گی۔ اس وجہ سے محکمۂ زراعت کے افسران کے لیے کسی کو بھی روکنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ محکمۂ زراعت کے افسران نے اس چوری کو روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن ان کی ناکامی کی دو بڑی وجوہات ہیں یعنی وسائل اور اختیارات کی کمی اور اس کے ساتھ ساتھ فوج کا عمل دخل۔ اس غیر قانونی کارروائی کو روکنے کے لیے مقرر کردہ افراد کو یہ ذمے داری دی گئی یعنی SDO، اس کا ایک ساتھی اور چار بیلدار لیکن ان کے پاس چوروں کو پکڑنے کا کوئی قانونی اختیار نہیں ہے۔ دوسری طرف پولیس انتظامی وجوہات اور خوف کی وجہ سے اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے ڈرتی ہے۔

چونکہ مذکورہ علاقہ دو ضلعوں یعنی رحیم یار خان اور بہاول پور کے درمیان بٹا ہوا ہے، اس لیے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کون سے DPO کے دائرۂ اختیار میں ہے جو چوری کے خلاف کارروائی کرے۔ دراصل یہ سارے بہانے اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ کوئی بھی فوج سے جھگڑا مول لینے کو تیار نہیں ہے۔ چند سال پہلے جب محکمۂ زراعت کے ایک افسر نے فوج کے غیر قانونی نکاسی کے طریقوں کو بند کرنے کی کوشش کی تھی تو اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ بدسلوکی کی گئی اور اسے 24 گھنٹے حراست میں رکھا گیا۔

علاوہ ازیں فوج نے زبردستی میٹلا اور قاسم والا کے زراعتی ریسٹ ہاؤسز پر بھی قبضہ کرلیا۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کو اس معاملے کی خبر تھی اور انھیں تازہ ترین حالات سے بھی آگاہ کیا جاتا رہا۔ ان حالات کے دوران انھوں نے جون جولائی 2008ء میں جائے وقوعہ کا دورہ بھی کیا، لیکن تمام تر حالات جاننے کے باوجود انھوں نے اس مسئلے کو نظرانداز کردیا۔

چولستان کی زمین اور پانی کی چوری اس طریقۂ کار کی نشان دہی کر رہی ہے جس میں فوج کے ساتھ اعلیٰ افسران کے بہت سے گروہ ریاست کے وسائل کو انفرادی فائدے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ کسی بھی ادارے کے اختیارات اور طاقت کو ذاتی مادّی فوائد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا قابلِ اعتراض ہے۔ کسی ایسے ادارے یا جماعت کے ساتھ منسلک ہونا یا اُس کا رکن بننا جو ذاتی فائدے کے لیے ریاست کو نقصان پہنچا رہا ہو، یہ بھی اتنا ہی غلط ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فوج نے اپنی طاقت مدِ مقابل کھڑے ہونے والی عوامی طاقت سے کہیں زیادہ مضبوط کر لی۔

جنرل اشفاق پرویز کیانی نے یوں تو فوج کے غیر کمیشن یافتہ افسران کے لیے ہاؤسنگ اسکیم کے منصوبے کا اعلان کیا۔ لیکن دیکھا جائے تو اس اعلان سے اس کام کے عزم اور اس کی اہلیت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ ادارہ اپنے دائرے میں ترقی اور پھیلاؤ کی گنجائش رکھتا ہے۔ تاہم اس کا فائدہ زیادہ تر فوج کے افسروں کو ہی پہنچتا ہے جو ادارے کے پھیلاؤ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک اور واقعہ 2008ء میں شروع کیا جانے والا لاہور میں Garrison Golf Club میں مکانوں کی تعمیر کا ہے جو فوج کی نگرانی ہی میں ہوا۔ نہ صرف یہ کہ فوج نے اپنے افسران کے لیے گولف کورس قائم کیا بلکہ اعلیٰ فوجی افسران کو مکانات تعمیر کرنے کے لیے زمین بھی دی جن میں جنرل اشفاق پرویز کیانی بھی شامل ہیں۔

اس موقعے پر یہ بتانا بھی ناموزوں نہیں ہوگا کہ فوج کے زیرِ انتظام جاری معاشی منصوبوں سے بھی یہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے کہ وہ کسی طرح سودمند ثابت ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ فوج (AWT) کے تحت کام کرنے والے عسکری بینک کے حوالے سے کہا جا رہا تھا۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے اس دعوے کے برخلاف جو اس نے بینک کی اعلیٰ کارکردگی کے بارے میں کیا تھا، یہ منصوبہ لاحاصل ثابت ہوا۔ بعد ازاں ٹرسٹ کے بااختیار حکام نے بینک کے لیے خریدار کی تلاش شروع کر دی تھی چونکہ اس کو چلانا بے حد مہنگا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا انتظام بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اپنے طور پر بہت سے فوجی افسران یہ سوچتے ہیں کہ وہ خداداد انتظامی صلاحیت کے

مالک ہیں۔ یہ وہ سوچ ہے جس کا ثبوت فوج کے زیرِ انتظام چلنے والے کاروباری اداروں کی کارکردگی سے کبھی فراہم نہیں ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ فوج کو انتظامی اور سیاسی مفہوم جوئی کی کبھی تربیت بھی نہیں دی گئی۔ تاہم معاشی سلطنت دراصل فوج کی مکمل خودمختاری کی آرزو کا اظہار ہے۔ بہرحال انتظامی اہلیت لازمی طور سے پاکستان کی دفاعی افواج کے وجود کا جواز نہیں ہے، جیسا کہ (اب تک) لڑی جانے والی جنگوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ادارے کی حیثیت سے فوج کا شدید اخفا پسند مزاج اور سیاسی قوت محاورے کے مطابق اسے امیر کی جورو بنا دیتی ہے اور اسے کسی خارجی اقدام یا مداخلت اور احتساب سے بالاتر رکھتی ہے۔ اسی طاقت واختیار کے سامنے معاشی انتظام کی اہلیت کا سوال غیر اہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فوج کو اقتصادی ترقی کے متعلق کبھی سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیوں کہ ریاست نے ہمیشہ محکمۂ دفاع کی ترقی کو دوسرے شعبوں کی نسبت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ فوج کو پیسا بچانے اور خود کو کارآمد اور کامیاب ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ذہن پر اختیار رکھنا

اقتصادی نظم و نسق کی طرف یہ خاص رویہ اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ فوج معاشی وجوہات کی بنا پر بھارت سے امن قائم کرنے کے لیے تبادلۂ خیال کرنے کو تیار ہے۔ فوج بھارت سے تعلقات بہتر کرنے کے لیے کسی ڈرامائی موڑ تک پہنچنے میں جھجکتی ہے، ایسا یقیناً معاشی وجوہات کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس دشمنی ہی کی بنیاد پر یہ تاثر قائم رکھ سکتی ہے کہ فوج وہ واحد ادارہ ہے جو پاکستان کے تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔ بھارت سے دشمنی پاکستان کی سیاسی طور پر مضبوط فوج کے لیے ایک ایسا پہلو ہے جس پر تبادلۂ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سب سے واضح ثبوت مشرف کے بھارت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر اعلیٰ فوجی حکام کی مخالفت ہے۔ حالانکہ مشرف اور ان کے ساتھیوں مثلاً ان کے وزیرِ خارجہ خورشید احمد قصوری کا دعویٰ تھا☆4 کہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لیے فوج کے 9 کمانڈرز بھارت کو ممکنہ رعایتیں دینے کے عمل میں شامل تھے۔ اور بھی کچھ لوگ ہیں جو اس امر

کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، سابق سفیر ریاض کھوکھر جو بھارت اور امریکا کے لیے اپنے تنگ مزاج رویے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے مشرف کے اس خیال سے بعد ازاں اتفاق نہیں کیا کہ کشمیر پر اپنے سابقہ مؤقف سے دست بردار ہو کر اقوامِ متحدہ کی قرارداد کے مطابق اس مسئلے کا حل نکالا جائے۔ بھارت دشمنی اس روایتی تأثر کو قائم رکھنے میں حصہ دار ہے کہ ہماری فوج ہی وہ فریق ہے جس سے ان مسائل پر بات چیت ہو سکتی ہے اور یہ کہ وہی ملک کے تحفظ کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہی وہ رائے ہے جو فوج کی سیاسی قوت کو بڑھاوا دیتی ہے۔

فوج کا خیال ہے کہ صرف وہی پاکستان کی درست طور سے نمائندگی کرتی ہے۔ دراصل وہ خود کو پاکستان سمجھتی ہے اور ملک کی مکمل حق دار اور یہ خیال کرتی ہے کہ وہ ملک کو فائدہ پہنچانے والی واحد اکائی ہے۔ اس لیے ایسے حالات پیدا نہیں کیے جا سکتے جن میں فوج سے کسی قسم کا کوئی سوال کیا جا سکے یا اس کا احتساب کیا جا سکے۔ چنانچہ اس نے اس عرصے میں اظہار و بیان کو قابو میں رکھنے اور روابط استوار کرنے والا ایک ایسا پیچیدہ ضابطہ وضع کر لیا جو اس کی طاقت کو قائم رکھے گا۔

ایک خاص تأثر جسے پاکستان میں بہت ابھارا جا رہا ہے، یہ ہے کہ مشرف کے جانے کے بعد فوج نے رضاکارانہ ہتھیار ڈال دیے ہیں اور فوج کے سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے جمہوریت بحال کرنے کی پوری طرح کوشش کی ہے۔ اس خیال کے تحت یہ سمجھا جاتا ہے کہ نہ صرف جنرل کیانی ترقی پسند ہیں بلکہ پاکستان کی جمہوریت کو طاقت ور بنانا چاہتے ہیں اور آزاد خیال ہیں۔ جنرل کا بنیادی مقصد فوج کو واپس بیرکوں میں بھیجنا اور اسے پیشہ ورانہ کام کی طرف راغب کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 2007ء میں سیاسی طور پر مستحکم فوج کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد سے جنرل اشفاق پرویز کیانی نے رفتہ رفتہ خود کو سیاست سے دور کرنا شروع کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فوجیوں کے سیاسی رہنماؤں سے ملنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

فوج کا اپنے معاملات کو برسرِ عام لانا اور پارلیمنٹ میں بار بار اس پر تبادلۂ خیال ہونا فوج کے اعلیٰ افسران کی ذہنی پختگی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ سعید شفقت نے، جو پاکستان کے

فوجی اور سول تعلقات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، اسے اعلیٰ درجے کی رواداری قرار دیا ہے۔☆5 دیکھا جائے تو یہ تأثر اس حقیقت کی تصدیق میں ناکام ہے کہ پارلیمنٹ کے سامنے ایسی پیش کش کیا معنی رکھتی ہے جو آئی ایس آئی کے سربراہ کی جانب سے کیے گئے دعووں کی صداقت کی تصدیق تک نہ کر سکتی ہو۔ بہرحال پارلیمنٹ کے سامنے ہونے والی پیش کشیں میمو گیٹ اسکینڈل جیسی سازشوں کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھتی اور 'مثبت' اقدامات کو انجام تک پہنچاتی ہیں کہ یہ خفیہ منصوبہ حکومت کو کم زور کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ نئی سیاسی جماعتوں کی تشکیل میں غیر قانونی مدد کی فراہمی اور سیاست دانوں کو احتساب کے دباؤ میں رکھنا اُن بے شمار ہتھکنڈوں میں سے ہے جو فوج خود کو سب کے اوپر مسلط رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔

اس امر پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ایک فوج جو وکلا کی تحریک کے ذریعے مذاق کا نشانہ بن چکی تھی، اس کو دوبارہ اپنا پرانا مقام حاصل کرنے میں بہت وقت نہیں لگا۔ احتجاج کرنے والے وکلا نے فوج کو شرمندہ کرنے کے لیے نور جہاں کے گائے ہوئے نغمے، مثلاً ''اے وطن کے سجیلے جوانو'' کی مضحکہ خیز نقل بنائی اور اسے اس طرح سڑکوں پر دُہرایا، ''اے وطن کے سجیلے جوانو! سارے رقبے تمھارے لیے ہیں۔'' یہ وہ نغمہ تھا جو 1965ء کی جنگ میں سپاہیوں کی ہمت اور جوش بڑھانے کے لیے گایا جاتا رہا تھا اور جو آج بھی بے شمار لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اسلام آباد میں پارلیمنٹ کے سامنے فوج کی حمایت میں اور ڈرون حملوں کے خلاف احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ فوجیں اپنا تشخص، خاص طور پر جمہوریتوں کے عبوری دور میں، بڑھانے اور مستحکم کرنے کے لیے تگ و دو کرتی ہیں۔

کیانی کی زیرِ قیادت فوج محتاط طریقے سے اپنے سابقہ چیف جنرل مشرف کے عہد کی صورتِ حال سے خود کو دور رکھے ہوئے تھی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ موجودہ قیادت مشرف کی قیادت کے مقابلے میں سیاسی طور پر زیادہ آزاد خیال ہے۔ اگر ذرا باریک بینی سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشرف کو خود ان کے ادارے نے ہی بے دخل کیا ہے۔ جنرل کیانی نے جو 2007ء میں آئی ایس آئی کے سربراہ تھے، جنرل مشرف اور

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے درمیان ہونے والی چپقلش کے سلسلے میں عدالت میں پیش کیے جانے والے حلف نامے پر دستخط نہیں کیے تھے۔ تاہم، ان کا یہ گریز کسی اصول کے تحت نہیں تھا کیوں کہ ان کے پچھلے کیریئر میں کسی ایسے اخلاقی ضابطے کی مثال نہیں ملتی، بلکہ لگتا ہے کہ یہ پرویز مشرف سے نجات حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ کا آخری طریقہ تھا۔ یہ سمجھنا بے حد اہم ہے کہ ایک فوجی سربراہ جو بہت بااختیار شخص ہوتا ہے، وقت کے پہیے کا ایک فاضل پرزہ بھی بن جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا شخص بھی جس کے ہاتھ میں کسی ادارے کی باگ ڈور ہوتی ہے اور جو بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے اور نہ صرف یہ، بلکہ اس ادارے کے اصول وقوانین کو نظرانداز کرکے حکم چلاتا ہے، خود اسے ایک روز باہر نکال دیا جاتا ہے، مثلاً جنرل آصف نواز جنجوعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس وقت کے آرمی چیف مرزا اسلم بیگ کے گھر اور دفتر پر کڑی نظر رکھی تاکہ ان کی ملازمت میں توسیع نہ ہو اور وہ خود اقتدار سنبھال لیں۔

ایک طویل عرصے سے فوج نے قوم کو اس فریب میں مبتلا کیا ہوا ہے کہ اس کے ساتھ ملے بغیر حکومت کا چلنا ناممکن ہے، مثلاً پاکستان کے آزاد خیال عوام یہ یقین رکھتے ہیں کہ صرف فوج ہی ایک آزاد خیال ادارہ ہے۔ اس کے اپنے کچھ مسائل ضرور ہو سکتے ہیں لیکن صرف وہی ایک ایسا ملکی ادارہ ہے جس میں مذہبی انتہا پسندی کی بجائے اعتدال پسندی پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف مذہبی جماعتیں اور دائیں بازو کے لوگ فوج کے ساتھ براہِ راست ملے ہوئے ہیں اور اسے ایک معتبر قومی ادارہ سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج قومیت کا ایک نیا تصور پیش کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے، جس کی رُو سے تمام دوسرے نسلی اور غیرمرکزی تصورات اور دھارے مسترد ہو جاتے ہیں۔ یہ کسی اقلیتی گروہ، جس میں مذہبی اور ثقافتی اقلیتیں بھی شامل ہیں، کے لیے کوئی نیک شگون نہیں ہے۔

یہ نیا تصور یا قومیت میں شدت پسندی ہمیشہ فوج کو لازمی اور اہم قرار دیتی ہے۔ اس کی تشہیر کے لیے ایک ایسی مشین موجود ہے جس کی کارکردگی بہترین ہے۔ آج کے پاکستان میں جو شدید حب الوطنی کے جذبے کے زیرِ سایہ ابھر رہا ہے، ذرائعِ ابلاغ اور دانش ور طبقہ دونوں ہی

اس کی اہلیت رکھتے ہیں کہ جدید پاکستان کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ سکیں لیکن انھیں مکمل طور پر اس نظام نے قابو کرلیا ہے۔ صحافیوں کی بڑی تعداد اور اکثر دانش ور فوج کے ساتھ بخوشی تعاون کر رہے ہیں، اور یہ انفرادی ترقی اور اجتماعی نشو و نما کے لیے خاصی مضرت رساں بات ہے۔ بہت سے ادارے جن میں فوج کے سربراہ، آئی ایس پی آر سے لے کر آئی ایس آئی اور اسٹریٹیجک پلانز ڈویژن تک شامل ہیں، لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں مصروف ہیں۔

اس طریقِ کار نے ملک کو باصلاحیت دانش وروں کے علمی وظائف حاصل کرنے اور جدید علوم کے حصول سے محروم کردیا جس کی وجہ سے وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو بروئے کار لاکر حالات کا سامنا کرنے کے اہل نہیں رہے۔ یہی حال ابلاغِ عامہ کا ہے۔ دراصل یہ طریقۂ کار بہت پیچیدہ ہے اور یہ تمام شعبوں یعنی اقتصادی، سیاسی اور علم و دانش سب ہی میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ گفتگو اور رائے کی آزادی اور خودمختاری ایک لازمی شے ہے جسے اس کے معیار سے ناپا جانا چاہیے نہ کہ اس کی مقدار یا تعداد کے لحاظ سے۔ جنرل پرویز مشرف جو بے شمار ریڈیو اور ٹی وی چینلو کھولنے کی اجازت دے کر سمجھتے تھے کہ انھوں نے ابلاغِ عامہ کو آزادی دے دی ہے اور جس کے لیے وہ قابلِ تعریف سمجھے جاتے ہیں، غور طلب بات یہ ہے کہ دراصل اسی کے ذریعے وہ ایسے شریکِ کار پیدا کر رہے تھے جنھیں تربیت دی جاسکے کہ وہ دائیں بازو کی حب الوطنی سے آمیز کرکے قومی بیانیہ وضع کرسکیں۔

حفاظتی ریاست کی قلبِ ماہیت

تو کیا پاکستان میں ایسی تبدیلی ممکن ہے کہ لوگ اپنی بابت سوچ سکیں اور ایک دوسرے کو بدلنے میں لگ جائیں؟ مرکزی دائیں بازو کے قومیتی بیانیے کی رُو سے تو ملک میں اقلیتوں، مثال کے طور پر وہ بلوچ ہوں یا چاہے وہ مذہبی اور ثقافتی اقلیتیں ہوں، اُن کے پاس صرف ایک راستہ ہے کہ وہ خود کو بدل لیں یا پھر تباہ ہوجائیں۔ ایسے بہت سے ہوں گے جو حد سے بڑھی ہوئی قومیت پسندی کی قبولیت کو دوسرے مسائل مثلاً بدانتظامی، کرپشن اور نااہلی کے تناظر میں دیکھتے ہوں گے۔ 2012ء تک آتے آتے لوگوں کو یقین دلایا جاچکا ہے کہ پاکستان کے
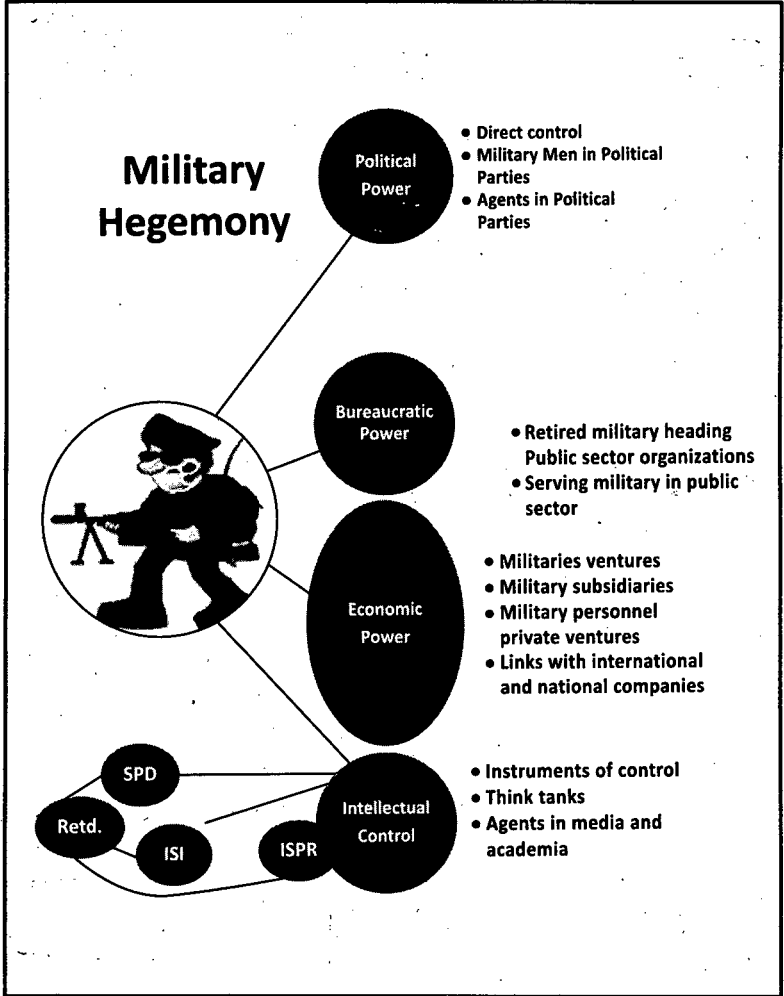
مستقبل کا دار و مدار اس کی قیادت کی تبدیلی اور اُن لوگوں کے حکومت میں لانے پر ہے جو متحرک اور ترقی پسند ہوں اور اقتدار کے روایتی کھلاڑیوں کے برعکس دوسرے سماجی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ نئی قیادت کے ترقی پسند ہونے کا گمان کیا جا رہا ہے جب کہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کا درمیانی طبقہ جو کہ اقتدار میں آنے کی اُمید لگائے بیٹھا ہے، وہ تو ہمیشہ ریاست کا حامی رہا ہے۔ تعلیم یافتہ درمیانی طبقہ جو اقتدار کے میدان میں حریف بن رہا ہے، اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو ذرائعِ ابلاغ، وکلا برادری، این جی او اور ایسے ہی

دوسرے شعبوں سے وابستہ ہیں۔ سو اُنھیں غیر مؤثر افراد کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہی درمیانی طبقہ ملک کی سیاسی مقتدرہ کے بنیادی کردار میں تبدیلی کے بجائے اُن آمرانہ رُجحانات کا عکاس ہے جو قوت و اختیار کو ایک گروہ یا ایک طبقے میں مرکوز کرتے ہیں۔ عام طور سے دی جانے والی یہ دلیل کہ غیر تعلیم یافتہ لوگ غلط سیاسی فیصلے کرتے ہیں، اسی آمرانہ سوچ کی مثالوں میں سے ایک ہے۔ بہر حال کچھ حلقے، خصوصاً حکمتِ عملی وضع کرنے والے لوگ 'بنگلہ دیش ماڈل' کا حوالہ دینے اور پاکستان سے اس کی تطبیق قائم کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ مثال ایک طرح سے بلاواسطہ فوج کے لیے ایک شفاف سیاست اور سیاسی نظام میں بہتر تبدیلی کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ اگرچہ بنگلہ دیش میں بھی ماڈل بہت کامیاب نہیں رہا، لیکن اس کے باوجود پاکستان کے معزز طبقے کی سوچ پر اس کا اثر پڑتا ہے جو ایک ایسی تبدیلی کے خواہاں ہیں جو ان کے حق میں جاتی ہو مگر انھیں اس کے لیے کسی آزمائش سے نہ گزرنا پڑے اور نہ انھیں اپنے رویے کو تبدیل کرنا پڑے۔

تاہم فوج کا بنایا ہوا نظام سیاسی ڈھانچے میں یا معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ خصوصاً جب کہ سب کو معلوم ہے کہ اس ڈھانچے کی بنیاد فوج کی اپنی طاقت، اقتدار اور اختیارات پر ہے جس کی مدد سے وہ ریاست کے وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔ یا پھر اس کے منتخب کردہ چند اعلیٰ طبقوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مفاد حاصل کرنے والا یہ طبقہ جس میں مڈل کلاس کے چند افراد بھی شامل ہیں، غریبوں اور غربت کے لیے آواز ضرور اٹھاتے ہیں لیکن اس کے پسِ پردہ بھی ان کا مقصد بدحال لوگوں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنا یا انھیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا ہی ہوتا ہے۔ حالات اور حقائق کو اپنے انداز سے پیش کرنے کا طریقہ اُن وسائل کو جو اندرونی کے بجائے بیرونی ذرائع سے پیدا ہوں، اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

پاکستانی سیاست اور اس کے نظامِ اقتدار کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کی اشرافیہ بیرونی وسائل اور رقوم خواہ وہ بیرونی ترسیلِ زر ہو یا عطیات میں حاصل کردہ دولت، پر انحصار کرتی ہے۔ پاکستان ایسا گاہک ہے جو ایک سفاک اعلیٰ طبقے کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے جو

تمام بیرونی امداد کو اپنے ذاتی مفاد میں استعمال کرتا ہے۔

ایسی ریاست میں فوجی مقتدرہ عوام میں اُن افراد کو نگاہ میں رکھتی ہے جو اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کچھ دے دلا کر خاموش کر دیا جاتا ہے تاکہ بغاوت نہ ہو۔ ان حالات میں نظم ونسق چلانا اور حالات کو اپنے کنٹرول میں رکھنا فوج کے لیے اہمیت رکھتا ہے، چہ جائے کہ موجودہ نظامِ کار کو چیلنج کر دیا جائے۔ میں نے اس کتاب میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ فوج اشرافیہ کا وہ حصہ ہے جو ملک کے تمام وسائل کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ایسے میں قومیتی بیانیہ فوج کو اُس کی طاقت اور اقتدار کا یقین دلاتا ہے۔

حکومت کا مندرجہ بالا ڈھانچا اس وقت تک تبدیل نہیں ہوسکتا جب تک اس کی اشرافیہ اپنے ملکی وسائل پر انحصار کرنا نہ سیکھ جائے اور اپنے ذرائع سے کچھ پیدا کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا شروع نہ کر دے۔ دوسری طرف طاقت ور فوج اُس وقت تک اپنی طاقت میں کمی پر آمادہ نہیں ہوگی جب تک وہ قوت سے دست برداری کی اہمیت کو محسوس نہیں کر لیتی۔ اس قسم کے اقدامات کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں ہوئے ہیں۔ اس وقت تک اشرافیہ ہتھیار نہیں ڈالے گی جب تک وہ کسی تبدیلی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو محض خام خیالی ہے۔ ایسے معجزے ظہور پذیر نہیں ہوتے۔

قومی اور سیاسی سطح پر تبدیلی لانے کے لیے ہمیں ایک بار پھر انھی صعوبتوں سے گزرنا ہوگا جو بے حد طویل اور اذیت ناک ہوتی ہیں، یعنی مایوسی، احساسِ بے چارگی — جب تک کہ بااختیار حاکم اس بات کا احساس نہ کریں کہ موجودہ صورتِ حال برقرار رکھنے کے لیے بہت زیادہ قیمت ادا کرنا ہوگی، تاہم تبدیلی لانے کے فوائد اس سے کہیں زیادہ ہیں، تب تک تبدیلی ناممکن ہے۔

حواشی

☆1. Saeed Shafqat, "Praetorians and the People" in Maleeha Lodhi, "Beyond the Crisis State" in Maleeha Lodhi, (ed), *Pakistan Beyond the Crisis State*. (Karachi: Oxford University Press, 2011). Pp. 103-112.

☆2. Anatol Lieven, *Pakistan A Hard Country*. (London: Allen Lane, 2011). P. 163. See also, Maleeha Lodhi, (ed), *Pakistan Beyond the Crisis State*.

(Karachi: Oxford University Press, 2011) paperback edition.

☆3. Ayesha Siddiqa, "The Real Culprits" in *Newsline*, 15/02/2011.

☆4. Khursheed Kasuri's interview to Indian peace activist Mani Shankar Aiyar which was used in a documentary by the latter on India-Pakistan peace process. The documentary is titled: "Inside Pakistan with Mani Shankar Aiyer."

☆5. Saeed Shafqat, "Praetorians and the People" in Maleeha Lodhi, "Beyond the Crisis State" in Maleeha Lodhi, (ed), ***Pakistan Beyond the Crisis*** *State.* (Karachi: Oxford University Press, 2011). Pp. 103-112.

تعارف

فوج ریاست کے اہم ترین اداروں میں شمار ہوتی ہے۔ تاہم بعض ممالک میں فوج سیاست میں اپنی حد درجہ شمولیت کے باعث ملک کے دوسرے تمام اداروں پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ یہ سوال بہت سے لوگوں کے لیے اُلجھن کا سبب بنتا ہے کہ بعض افواج اقتداری سیاست کے کھیل میں آخر مرکزی کردار کیوں بن جاتی ہیں؟ بہت سے لکھنے والوں نے اپنے اپنے طرزِ فکر اور طریقۂ کار کے ذریعے اُس رجحان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو فوج کے اقتدار میں آنے کا سبب بنتا ہے۔ اس موضوع پر ملنے والی تحریروں میں فوجی اور سول اداروں کے درمیان عدم توازن اور بعض سماجی عوامل جو فوج کے سیاست میں آنے کا جواز بنتے ہیں، کے علاوہ فوجی اثر ورسوخ کی سیاسی معیشت کا تجزیہ بھی ہمیں ملتا ہے۔ مقتدر افواج دفاعی بجٹ میں اپنے لیے بڑے وسائل مختص کراتی ہیں اور سول حکومتوں پر اُنھیں پورا کرنے کے لیے دباؤ ڈالتی ہیں۔ تاہم دفاعی بجٹ ملکی معیشت کا صرف ایک حصہ ہوتا ہے۔ جب کہ فوج کے تجارتی یا منافع بخش کاروبار جو مسلح افواج کے عملے کے ذریعے چلائے جاتے ہیں یا جن کے ذریعے دفاعی اداروں کے ارکان کے ذاتی معاشی مفادات کو بروئے کار لایا جاتا ہے وہ بجائے خود ملکی معیشت کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن فوج کی اس معاشی سرگرمی کا اب تک کہیں باضابطہ طور پر جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش

ہے۔ اس کتاب میں فوج کی کاروباری سرگرمیوں اور فوجی افسران کے ذاتی معاشی مفادات پر نگاہ ڈالی گئی ہے تا کہ یہ سمجھا جاسکے کہ وہ کس طور سے مسلح افواج کے سیاسی عزائم کا محرک بنتے ہیں۔ یہ وہ خاص فوجی سرمایہ ہے جو دفاعی بجٹ سے بنیادی طور پر الگ ہوتا ہے اور جسے ہم نے ''فوجی کاروبار'' کا نام دیا ہے۔

فوجی کاروبار ہم اُس فوجی سرمایے کو کہہ رہے ہیں جو فوجی برادری☆[1] اور خاص طور پر فوجی افسران کے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سرمایے کا نہ تو فوج کے اخراجات میں کہیں اندراج ہوتا اور نہ ہی یہ دفاعی بجٹ کا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ سرمایے کی مکمل طور پر آزاد شکل ہے۔ اس کا اہم ترین حصہ وہ کاروباری سرگرمیاں ہیں جو ریاست میں جوابدہی کے عمومی نظامِ کار کی حدود میں نہیں آتیں اور اس کا بیشتر حصہ فوجی افسران اور اُن کے عزیز و اقارب کے مفاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس سرمایے کو فوج خود کاروباری استعمال میں لاتی ہے یا پھر اس کی سرپرستی میں کام کرنے والے ظاہری یا خفیہ اداروں کے تحت اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان سرگرمیوں کے فوائد بالعموم افسران تک ہی محدود رہتے ہیں اور عہدوں اور منصب کی مناسبت سے درجہ بہ درجہ تمام فوجیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ فوجی کاروبار سے مستفید ہونے والے مسلح افواج کے اعلیٰ افسران کے نزدیک ان معاشی فوائد کا جواز یہ ہے کہ فوج ریاست کی جو خدمت انجام دیتی ہے، اس کے عوض وہ یہ فلاح و بہبود حاصل کرتی ہے۔

چونکہ یہ فوجی سرمایہ عوام سے پوشیدہ ہوتا ہے اس لیے اسے فوج کی ''اندرونی معیشت'' بھی کہا جاتا ہے۔ فوجی کاروبار کا جائزہ اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی وجہ سے فوجی افسران ریاست کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے اور سیاست میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ مختلف ملکوں میں اس کا طریقۂ کار اور طرزِ اظہار الگ الگ طرح سے ہوتا ہے۔ امریکا، برطانیہ، فرانس، اسرائیل اور جنوبی افریقا جیسے ممالک میں یہ حکومت اور نجی کاروباری طبقے کے ساتھ شراکت داری کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک جیسے ایران، کیوبا اور چین وغیرہ میں بالادست حکمران جماعت یا کسی سیاسی رہنما کے ساتھ فوجی کاروبار ساجھے کا طریقہ

اختیار کرتا ہے۔ جبکہ ترکی، انڈونیشیا، پاکستان، میانمار (برما) اور تھائی لینڈ وغیرہ میں فوج بلاشرکتِ غیرے اپنا کاروبار خود چلاتی ہے۔

ان ملکوں میں چونکہ مسلح افواج ریاست اور اس کی سیاست کے اندر گہرائی میں اُتری ہوئی ہوتی ہے اس لیے یہاں سول اور فوجی شراکت میں نسبتِ معکوس ہوا کرتی ہے۔ یہ فوجی سرمایہ مسلح افواج کے سیاسی اختیار کا اہم ترین محرک بن جاتا ہے۔ منافع کمانے کی دوڑ میں مسلح افواج کی کھلی یا ڈھکی چھپی شمولیت جس کی آزادی فوجی افسران اور اُن کے عزیز و اقارب کو حاصل ہوتی ہے، فوج کی بحیثیت ادارہ ریاست میں پالیسی سازی اور وسائل کی تقسیم کے عمل پر اُس کے زیادہ سے زیادہ اختیار کے حصول کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے ترکی، انڈونیشیا، میانمار اور پاکستان جیسے ملکوں میں فوج کی سیاست میں مداخلت ہی فوجی کاروبار کو جنم دیتی ہے۔

یہی وہ شے ہے جو فوج کے اقتدار میں رہنے یا حکومتی نظم و نسق کو براہِ راست یا بالواسطہ اختیار میں رکھنے کی خواہش کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اسی وجہ سے جمہوریت کا فروغ یا آئین کی بالادستی ممکن نہیں رہتی۔ میرے خیال میں اس تحقیق کا بنیادی سوال جس کا تجزیہ کیا جانا چاہیے، وہ یہ ہے کہ جب فوجی افسران منافع بخش سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں اور مسلح افواج کو ادارے اور ذاتی سطح پر معاشی اثر و رسوخ کے لیے استعمال کرتے ہیں تو کیا انھیں بیرکوں میں واپس جانے اور جمہوری نظام کو پروان چڑھانے میں بھی کوئی دل چسپی ہوتی ہے یا نہیں؟ میں نے اس سوال کا جواب پاکستان کو موضوع بنا کر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترکی اور انڈونیشیا کے برعکس پاکستان اب بھی ایک مطلق العنان فوجی ریاست ہے جہاں فوج کا ایک جنرل 2008ء تک سربراہِ مملکت رہا ہے۔

پاکستان کے حوالے سے اس گفتگو کے ذریعے یہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ سیاسی طور پر مستحکم فوج کو مالیاتی خودمختاری ملنے سے کون سے مسائل سامنے آتے ہیں۔ آج پاکستانی فوج ایک بڑی تجارتی سلطنت کی حامل ہے۔ شفافیت نہ ہونے کے باعث فوج کی اندرونی معیشت کی صحیح مالیت بتانا تو ممکن نہیں لیکن اندازاً یہ اربوں ڈالر پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ فوج کے دو کاروباری ادارے — فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ — ملک کے سب سے بڑے

ادارے بن چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دیگر کئی ذرائع ہیں جن کے توسط سے فوج ملکی وسائل پر اجارہ داری قائم رکھتی ہے۔

یہ کتاب تین دلائل پیش کرتی ہے۔ پہلے تو یہ کہ فوجی کاروبار بذاتِ خود وہ فوجی سرمایہ ہے جو فوج کے غاصبانہ انداز کو سیاست میں تقویت دیتا ہے۔ اس غاصبانہ سرمایے کی اہم خصوصیت اس کا پوشیدہ ہونا ہے۔ دفاعی بجٹ میں اس کا اندراج نہیں ہوتا اور یہ وسائل کو سرکاری شعبے سے نجی شعبے میں ایک غیر واضح اور متنازعہ طریقے سے منتقل کرتا ہے۔ خاص طور پر یہ منتقلی مسلح افواج سے وابستہ افراد اور گروہوں کو ہوتی ہے۔ فوج کی جانب سے اس قسم کے سرمایے کی مالیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ فوج معیشت میں کس حد تک داخل ہو چکی ہے اور ریاست اور سماج پر اس کا اثر و نفوذ کتنا ہے۔ نتیجہ یہ کہ منافع براہِ راست طاقت کے تناسب سے ہوتا ہے۔ مالیاتی خود مختاری فوج کو یہ احساسِ اقتدار اور اعتماد دلاتی ہے کہ وہ "نااہل" سویلین کے مقابلے میں خود مختار ہے۔ واضح رہے کہ فوج اپنے کاروبار کا جواز یہ پیش کرتی ہے کہ یہ فوجی ملازمین کی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کا ایک مجموعہ ہے جبکہ ان سرگرمیوں کی حدود کا تعین بھی فوج خود ہی کرتی ہے۔ معاشی اور سیاسی فوائد کا ربط ہی اس سرمایے کی غاصبانہ نوعیت میں اضافہ کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مطلق العنان ریاستوں میں فوج کی معاشی غارت گری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مسلح افواج کے افسران ذاتی فائدے کے لیے ایسے سیاسی و معاشی روابط تلاش کرتے ہیں جن کی مدد سے وہ زیادہ معاشی منفعت حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مسلح افواج پالیسی سازی کے ایسے ماحول کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں جن میں ان کے لیے معاشی مواقع بڑھتے رہیں۔ پاکستان یا میانمار جیسے مطلق العنان سیاسی نظاموں کے سماجی و معاشی ڈھانچے بھی سرمایہ دارانہ دور سے قبل کے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ معیشتیں کافی ترقی یافتہ نہیں ہوتیں اس لیے ان کے استحصال میں فوجیں براہِ راست شریک ہوتی ہیں۔ جبکہ ترقی یافتہ معیشتوں میں فوجی ساز و سامان اور سہولتوں کی فروخت سے حاصل ہونے والا منافع نجی شعبے کے لیے ہوتا ہے جو اس کی سرمایہ کاری کرتا ہے اور فوج ایسی سرمایہ کاری کا ثانوی فائدہ اٹھاتی ہے۔

فوج کے غاصب ہونے کی دلیل کا تعلق چارلس ٹلی (Charles Tilly) کے پیش کردہ

اس تصور سے ہے جس میں وہ سولھویں اور سترھویں صدی کے یورپ میں موجود ''غارت گر'' یا ''غاصب'' ریاستوں کا حوالہ دیتا ہے۔☆2 یورپ میں حکمران طبقے اپنے عوام کو خطروں سے تحفظ فراہم کرنے کے بہانے اُن سے بھتے وصول کیا کرتے تھے۔ حکمران غیر علاقوں پر حملوں کے لیے بڑی فوجیں رکھتے تھے تاکہ اُن کی طاقت میں اضافہ ہو اور مقامی تاجروں کے لیے منڈیاں پھیلتی رہیں۔ اس طرح فوج اندرونی اور بیرونی طور پر وسائل کی تخلیق میں مرکزی کردار ادا کرتی تھی۔ بیرونی حملوں پر خرچ کے لیے بادشاہ مقامی جاگیرداروں اور تاجروں وغیرہ سے رقم بٹورتا۔ معاشی مؤرّخ فریڈرک لین (Fredric Lane) کے مطابق یہ لوگ فوج کو بھتّہ دے کر یہ امید رکھتے تھے کہ بیرونی علاقوں پر حملوں کے نتیجے میں نئے معاشی مواقع پیدا ہوں گے۔☆3

اشیس نندی (Ashis Nandi) جیسے دیگر مبصرین نے بھی ریاست کو ایک ایسا مجرمانہ ادارہ قرار دیا ہے جو قومی سالمیت کے نام پر عوام کے خلاف تشدد استعمال کرتا ہے۔☆4 عام لوگ ریاست کی مطلق العنانیت کو اس لیے برداشت کر لیتے ہیں کہ وہ خیر و عافیت سے رہ سکیں۔

قومی سلامتی کے لیے عوام جو قیمت ادا کرتے ہیں وہ بھی ایک طرح کا ''بھتا'' ہے۔ لین (Lane) کہتا ہے کہ ریاست کی غارت گری طرزِ حکومت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ ایک مطلق العنان حکومت خواہ وہ سول ہو یا فوجی، اپنے لوگوں سے وسائل بٹورنے میں زیادہ جابر ہوتی ہے۔ ریاست کی فوجی خدمات کے عوض لوگوں سے لیا جانے والا بھتا بڑھتا رہتا ہے۔ خاص طور پر جب کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو تشدد کے استعمال پر اجارہ داری رکھتے ہوں، مثلاً فوج کے ہاتھ میں۔

لین (Lane) نے بھتے یا نذرانے کا تصور استعمال کرتے ہوئے سولھویں صدی کے یورپ میں ریاست اور سماج کے باہمی عمل کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ جیسے فرانس اور ویانا کی ریاستیں عوام سے پیسہ بٹور کر فوج پر لگاتی تھیں اور پھر فوج کشی کر کے بیرونِ ملک منڈیوں پر قابض ہو جاتی تھیں۔ سیاسی اور معاشی طور پر اس کا مطلب ہے کہ فوجیں اور ریاستیں عوام سے بھتے وصول کر کے انھیں تحفظ دیتی ہیں اور نجی کاروبار بڑھانے کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتی

ہیں۔فوجی کاروبار بھی ایسے ہی بھتوں سے چلتا ہے جو قومی سلامتی کے نام پر وصول کیے جاتے ہیں اور جنھیں مفادِ عامہ کا نام دیا جاتا ہے۔ چونکہ مسلح افواج علاقائی سلامتی کی ضمانت دیتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ فوجی افسران کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن اقدام کو جائز قرار دیا جائے۔ حالانکہ بعض اوقات فوج عوام کو اس بات پر بھی قائل کر لیتی ہے کہ ریاست کو ممکنہ یا مفروضہ خطرے سے بچانے کے لیے اضافی قیمت بھی ادا کی جائے۔

اس کتاب کی تیسری دلیل یہ ہے کہ خاص طور پر قومی سرحدوں کے اندر فوج کی معاشی لوٹ کھسوٹ، جاگیردارانہ مطلق العنانیت اور غیر جمہوری سیاسی نظام کا سبب بھی ہے اور اس کا نتیجہ بھی ہے۔ جاگیرداروں اور بڑے تاجروں جیسے حکمران طبقات کی طرح فوج بھی اپنی برادری کے لیے تمام وسائل کا استحصال کرتی ہے۔ بالادست طبقے کے ہاتھوں اور قومی وسائل کا استحصال قبل از سرمایہ داری سیاسی و معاشی نظام کی خاصیت ہے۔ مؤرّخ ایرک ہابزبام (Eric Hobsbawm) ایسی سیاسی معیشت کے بارے میں کہتا ہے کہ کہ اس میں اثاثے صرف سرمایہ بنانے کے لیے جمع نہیں کیے جاتے بلکہ ان کے ذریعے اثر و رسوخ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جاگیردارانہ ماحول میں زمین اور سرمایے کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اثاثوں کے حصول کے ذریعے ایک ادارہ یا فریق دوسرے کے مقابلے میں زیادہ طاقت کا حامل ہو جاتا ہے۔ بااختیار لوگوں کے اثاثوں کا حصول اور تقسیم ہی جاگیردارانہ ڈھانچے کی بنیاد ہے۔ اس کے بدلے تین بااختیار لوگ اپنے مؤکلوں کا خیال رکھتے ہیں تاکہ سیاسی طاقت اور سماجی اثر کا یہ کھیل چلتا رہے۔☆5 اس طرح سرمایے یا اثاثوں کا حصول صرف دولت جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ مزید قوت مول لینے کے لیے بھی ہوتا ہے۔

فائدے حاصل کرنے کے اس عمل میں اہلِ اقتدار دیگر بالادست طبقوں کو بھی لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھوٹ دیتے ہیں۔ اس سے مسلح افواج اور سیاسی طاقت کے باہم سودمند تعلقات پروان چڑھتے ہیں۔ اس کھیل میں فوج کو حکمران طبقے میں شامل رکھنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ دیگر نسبتاً کمزور ساتھیوں کا دفاع بھی ہو سکے۔ اس طرح امدادِ باہمی کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ملک میں فوجی کاروبار کی صحیح مالیت کا اندازہ لگانے کے لیے اُن تمام وسائل کی مالیت بھی اس

میں شامل کرنی ہوگی جو فوج اور اس کے حواری اپنے مصرف میں لاتے ہیں۔ اس سوال پر ہم آگے غور کریں گے کہ فوج کے معاشی استحصال کے عمل کی نوعیت کیا ہے اور کس طرح اس سے حاصل ہونے والے سرمایے کو ''غیر قانونی فوجی سرمایے'' کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

''فوجی کاروبار'' کی تعریف

''فوجی کاروبار'' کی تعریف وضع کرنے کے لیے میں نے بون انٹرنیشنل سینٹر فار کنورشن (Bonn International Centre for Conversion) کی 2003ء میں چھپنے والی ایک کتاب ''فوج، بحیثیت ایک معاشی فریق — افواج کی کاروباری سرگرمیاں'' (The Military as an Economic Actor: Soldiers in Business) سے مدد لی ہے جو درج ذیل ہے:

> ''فوجی کاروبار سے مراد مسلح افواج کے زیرِ اثر ہونے والی تمام معاشی سرگرمیاں ہیں چاہے وہ وزارتِ دفاع کے زیرِ انتظام ہوں، یا مسلح افواج کی مختلف شاخوں کے تحت، یا پھر خاص یونٹوں یا انفرادی طور پر افسران کے ماتحت ہوں۔''☆6

مصنفین کے مطابق فوج کی معاشی سرگرمیوں میں:

> ''مسلح افواج کی ہر سطح کی سرگرمیاں شامل ہیں۔ ان میں بحیثیت ادارہ فوج کی زیرِ ملکیت کارپوریشنوں سے لے کر مختلف فلاحی فوجی شاخوں سے متعلق فلاحی ادارے، یونٹ کی سطح پر چلنے والے کاروبار اور ایسے انفرادی سپاہی شامل ہیں جو اپنی وردی کے بل پر ذاتی معاشی فائدے حاصل کرتے ہیں۔''☆7

ہماری کتاب کے لیے یہ تعریف پوری طرح موزوں نہیں ہے۔ اس میں بعض حوالوں سے اختصار ہے اور بعض معاملات میں بہت زیادہ وسعت بھی۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں دفاعی صنعتوں کو فوجی کاروبار کا حصہ مانا گیا ہے۔ مگر ہم اپنی کتاب میں دفاعی صنعتوں کو فوجی کاروبار کی

تعریف میں شامل نہیں کرتے کیوں کہ یہ صنعتیں حکومتی احتساب کے دائرے میں آتی ہیں۔ مندرجہ بالا تعریف اس لیے بھی محدود ہے کہ یہ فوجی افسران کو ادارے کی طرف سے ملنے والی مراعات کو اس میں شامل نہیں کرتی اور نہ ہی اس حوالے سے اُن کے احتساب کی بات کرتی ہے۔

ہم فوجی کاروبار کو ایسا فوجی سرمایہ سمجھتے ہیں جسے فوجی برادری☆[8] اور خاص طور پر افسران کے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا جائے۔ جس کا اندراج دفاعی بجٹ میں بھی نہ ہو اور جو ریاستوں کے عام احتسابی عمل سے باہر رہ کر ایک آزاد شکل اختیار کرلے۔ یہ سرمایہ یا تو فوج کے براہِ راست اختیار میں ہوتا ہے یا پھر اس کی کھلی یا ڈھکی چھپی سرپرستی میں استعمال ہوتا اور بڑھتا ہے۔

ہماری تعریف کے مطابق فوجی کاروباری سے مراد وہ تمام سرگرمیاں ہیں جو وسائل اور مواقع کو سرکاری اور نجی شعبے سے نکال کر فوج کے انفرادی یا اجتماعی قبضے میں دیتی ہیں اور اس ضمن میں احتساب کے اصولوں کی پاسداری بھی نہیں کی جاتی۔ اس طرح ان سرگرمیوں کو فوجیوں کے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ وسائل کی یہ احتساب سے مبرّا منتقلی کئی شکلیں اختیار کرسکتی ہے۔

☆فوجیوں کو سرکاری زمین کی منتقلی

☆مسلح افواج کے ریٹائرڈ ملازمین کو دی جانے والی مراعات وفوائد پر مزید وسائل کا صرف ہونا، مثلاً معاون عملے کی فراہمی، مخصوص کلب، کلب کی رکنیت، گھریلو استعمال کے بلوں اور سفر کے اخراجات پر تخفیف اور سینئر افسران کے ذاتی استعمال کے لیے گاڑیوں کی درآمد پر خصوصی رعایت۔

☆آزاد منڈی کی معیشت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلح افواج کے اداروں اور افراد کو کاروباری مواقع کی فراہمی۔

☆ایسے افراد کی تربیت پر وسائل کا زیاں جو جلد ریٹائر ہوکر نجی شعبے سے منسلک ہو جاتے ہیں، مثلاً امریکا میں انھیں لوگوں کو نجی شعبے سے واپس لاکر زیادہ تنخواہ پر ملازمت دینے کے لیے حکومت کو اضافی اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

یہ تمام اخراجات عام سالانہ دفاعی بجٹ میں درج نہیں کیے جاتے حالانکہ یہ رقوم فوجی افسران

کے مفاد میں خرچ کی جاتی ہیں اور وہی اسے تصرف میں لاتے ہیں۔

فوجی کاروبار میں فوجی تنظیم مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے فوجی برادری کے افراد مشترکہ طور پر ہی فوجی کاروبار کے بنیادی فریق ہوتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ فریقین میں مسلح افواج کے حاضر ملازمت ارکان (یا فوج بحیثیت ایک ادارے کے) ہی شامل نہیں بلکہ اس میں ریٹائرڈ فوجی اور وہ سویلین بھی شامل ہیں جو فوجی کاروباری تنظیموں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ اس سرمایے کا بنیادی فائدہ افسران کو ہوتا ہے کیوں کہ نچلے ملازمین کی نسبت افسران کو پالیسی سازی کے عمل تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ یوں افسران اپنے لیے معاشی مواقع حاصل کرنے کی بہتر حالت میں ہوتے ہیں اور ریاست اور سماج سے اپنے لیے زیادہ مراعات اور فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ فوائد کے حجم یا معیشت میں فوج کے عمل دخل کا انحصار فوج کے اثر ورسوخ پر ہوتا ہے۔ لہٰذا زیادہ سیاسی طاقت افسران کو زیادہ مالی فوائد حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے چونکہ نچلے طبقے کے ملازمین کے برخلاف افسروں کو پالیسی سازوں تک زیادہ رسائی حاصل ہوتی ہے اور انھیں اپنے لیے معاشی مفاد کے استعمال کے زیادہ مواقع میسر ہوتے ہیں۔ مراعات کے اس نظام کو گمراہ کن طور پر فلاح و بہبود کا نام دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس فلاح و بہبود کا دار و مدار طلب سے زیادہ رسد پر ہے۔ اس فلاح و بہبود کے مالیاتی بوجھ کا تعین معاشرہ نہیں کرتا جو یہ بوجھ اٹھاتا ہے بلکہ اسے وصول کرنے والا یعنی فوج خود کرتی ہے۔

آخری نکتہ یہ کہ فوجی کاروبار کی ایک اور خصوصیت اس کے احتساب کی نوعیت ہے۔ فوجی کاروبار سے متعلق سرگرمیوں کی اکثر ملکوں میں تشہیر نہیں کی جاتی۔ خاص طور پر مطلق العنان فوجی ریاستوں میں تو ان سرگرمیوں پر گفتگو ہی ممنوع سمجھی جاتی ہے۔ اس موضوع پر کسی بھی اہم بحث مباحثے کو مسلح افواج اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتی ہیں۔ ترکی میں بھی جہاں پارلیمنٹ میں فوجی اخراجات پر کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا وہاں فوجی کاروبار تو گویا سویلین لوگوں کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ فوج کے کاروباری اداروں کے بارے میں کوئی بھی سوال نہیں کیا جاسکتا حالانکہ آرمڈ فورسز میوچل فنڈ (جسے عام طور سے اووائی اے کے کہا جاتا ہے) ملک میں فوجی اخراجات کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میں فوجی تجارتی اداروں میں

سب سے بڑا ادارہ فوجی فاؤنڈیشن ہے۔ 2005ء میں وزارتِ دفاع نے منتخب پارلیمنٹ کو فوجی فاؤنڈیشن کے ایک متنازع کاروباری معاملے کی تفتیش کرنے پر تنبیہ کی تھی۔ فوج کی فلاحی فاؤنڈیشن سے کہا گیا تھا کہ پارلیمنٹ میں اس بات کی وضاحت کرے کہ اُس نے ایک شوگرمل کو کم قیمت پر کیوں بیچا۔ اس پر وزارتِ دفاع نے اس معاملے کی تفصیلات بتانے سے انکار کردیا۔☆[9] درحقیقت فوجی کاروبار سے متعلق وسائل سرکاری اداروں کے احتسابی اصولوں پر نہیں چلتے۔ حتیٰ کہ سرکاری شعبے کے مالیاتی وسائل سے چلنے والے فوجی منصوبے یا پروگرام بھی ان سے ماورا ہیں۔ فوجی کاروبار پر سرکاری احتساب کا اطلاق نہ ہونے سے بدعنوانی کے امکانات اور بدعنوانی کا حجم دونوں بڑھ جاتے ہیں۔

اپنے کام کی نوعیت سے فوجی کاروبار دو طرح کی سرگرمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

☆ سلامتی کی نجکاری کے ذریعے منافعے کا حصول —— یہ طریقہ ترقی یافتہ معیشتوں میں اپنایا جاتا ہے۔ اس میں زمین اور وسائل پر قبضے یا تجارتی اداروں کے قیام میں براہِ راست فریق بننے کے بجائے مسلح افواج کے چیدہ ارکان منافع کمانے کے لیے اسلحہ سازی یا تربیت کے نام پر اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں۔ اس کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے والے بھی منافعے میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ خالص سرمایہ دارانہ نوعیت کا ہے جس میں سرمایہ اور ذرائع پیداوار کی واضح تفریق موجود ہے۔

☆ غیر روایتی کردار میں فوج کی شمولیت —— اس میں فوج اپنے روایتی کردار سے ہٹ کر کام کرتی ہے۔ جیسے زراعت، ہوٹل، ایئر لائن، بینک، زمینوں کی خرید وفروخت کے کاروبار۔ یعنی ایسے کام جن کا سلامتی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ طریقہ ترقی پذیر معیشتوں میں اپنایا جاتا ہے۔

ان دو طریقوں میں صرف مالی منفعت کا فرق ہی نہیں بلکہ ان سے اپنے ہی معاشرے اور معیشت میں فوجی اثر ونفوذ کے حدود کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے۔ پہلے طریقے میں معاشی لوٹ کھسوٹ بیرونِ ملک کی جاتی ہے۔ جبکہ دوسرے میں یہ کام فوج خود اپنے ملک میں کرتی ہے۔ فوجی ادارے اپنے لیے جو سرگرمیاں منتخب کرتے ہیں اُن کا انحصار سول فوجی تعلقات اور معیشت کی حالت پر ہوتا ہے۔ یہ وہ نکات ہیں جن پر ہم پہلے باب میں گفتگو کریں گے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سرگرمیوں کی نوعیت یا درجہ بندی سے قطعِ نظر فوجی کاروبار کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتی ہے۔ چونکہ اس طرح کے سرمایے میں سرکاری شعبے سے نجی شعبے کو منتقل ہونے والی رقوم شامل ہوتی ہیں اس لیے یہ محدود شفافیت کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ ایسے فوجی سرمایے میں غیر قانونی عنصر موجود ہوتا ہے۔ وہ معاشرے جہاں سیاسی اور معاشی ڈھانچے اب بھی سرمایہ دارانہ مطلق العنان یا فوجی مطلق العنان حکومتوں میں مسلح افواج وسائل پر قبضے کے لیے طاقت کا استعمال کرتی ہیں۔ چونکہ غاصب فوج ناجائز طور پر ملکی سیاست پر قابض ہوتی ہے، لہٰذا وہ اپنے افسران کو ملنے والی مراعات اور دولت کے ارتکاز کو مخفی رکھنے میں زیادہ حساس ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کی قیمت معاشرے کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس پردہ داری کا مقصد فوج کو سویلین فریقین کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ دیانت دار اور کم سے کم بدعنوان ثابت کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ جن ممالک میں یہ سرگرمیاں ہوتی ہیں اُن کے معاشی ڈھانچے ترقی یافتہ معیشتوں کے مقابلے میں کم استوار اور کم منظّم ہوتے ہیں اس لیے فوجی کاروبار کا بڑا حصہ معیشت کے غیر قانونی زمرے میں آتا ہے۔ ایک کم ترقی یافتہ سیاسی و معاشی ماحول میں اس طرح فوجی سرمایے پر غیر قانونی رنگ غالب ہوتا ہے۔

قومی معیشت پر فوجی کاروبار کے مالیاتی بوجھ کا صحیح اندازہ اس وقت تک لگانا ممکن نہیں جب تک کہ ہم فوج کی اہمیت بحیثیت ایک برادری کے نہ سمجھ لیں۔ فوج ایک ایسی منظّم افسر شاہی ہے جو کسی بھی دوسرے گروہ، تنظیم یا ادارے کی نسبت اپنے سابق ارکان کی زیادہ سرپرستی کرتی ہے۔ اسی لیے فوجی کاروبار میں شامل سب سے نمایاں گروہ ریٹائرڈ افسروں کا ہوتا ہے جو فوجی کاروبار کا لازمی جُز ہیں۔ یہ ریٹائرڈ افسران فوجی برادری کے لیے مزید مواقع تخلیق کرنے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

پُرتشدد حالات سے عہدہ برآ ہونے میں فوج کی مہارت کے طفیل فوجی پیشہ اور ادارے ایک خاص کردار کے حامل بن جاتے ہیں۔ فوج ایک ایسا منظّم گروہ ہے جسے جنگ و جدل کے علم و فن کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ ایک ادارے کے طور پر مسلح افواج خاص تنظیمی اخلاقیات کی حامل ہوتی ہیں اور ان کے ارکان میں بھائی چارے کے اعلیٰ جذبات دیکھنے کو

ملتے ہیں۔ یہ بھائی چارہ مشکل ماحول میں مہینوں اور برسوں ساتھ رہنے سے پروان چڑھتا ہے، جس میں ان کی زندگیوں کا انحصار ایک دوسرے پر ہوتا ہے۔ ریٹائرڈ فوجی افسران کی اپنے ادارے سے وفاداری کسی بھی سویلین ادارے کے ملازمین سے زیادہ ہوتی ہے اور چونکہ ریٹائرڈ اور حاضر ملازمت افسران کی تربیت ایک ہی طرح کی ملٹری اکیڈمی میں ہوتی ہے اور انھیں ایک ہی طرح کے حاکمانہ عہدے ملے ہوتے ہیں اس لیے وہ ''پرانے طلبہ'' کے ایک مربوط جال کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جس کے ارکان ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ عمر یا رتبے میں برتری کا احترام کیا جاتا ہے اور باہمی مفادات ایک ہونے کے باعث ریٹائرڈ افسران نجی شعبے میں جا کر بھی بے بس اور تنہا محسوس نہیں کرتے۔

حتیٰ کہ جب ریٹائرڈ فوجی افسران سیاست میں داخل ہوتے ہیں اس وقت بھی مسلح افواج سے اُن کے رابطے بڑے مضبوط رہتے ہیں جیسا کہ عالمِ سیاسیات ایڈورڈ فیٹ نے کہا ہے کہ سیاست دان بننے والے تمام جنرل فوج سے اپنے رابطے برقرار رکھتے ہیں۔☆[10] فوجی سیاست دان بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر فوجی اداروں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں اسی تانے بانے کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ سیاست دان بن جانے والے سینئر فوجی افسران اپنی سیاسی جماعتیں بھی بناتے ہیں اور سیاسی گروہوں کی سرپرستی بھی کرتے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں لاطینی امریکا، پاکستان، انڈونیشیا اور ترکی میں ملتی ہیں۔ سیاسی حکومتیں ریٹائرڈ فوجی افسروں کو اس تنظیم کا ایک اہم رابطہ سمجھتی ہیں۔ سابق فوجی افسروں کو سیاسی جماعتوں میں شامل بھی کیا جاتا ہے اور انھیں کابینہ میں ذمہ دار عہدے دیے جاتے ہیں اور مسلح افواج سے مذاکرات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سیاسی طور پر ناپختہ معاشروں میں یہ مظہر خاصا واضح ہے۔ دفاعی ادارے اپنے سابقہ ارکان کی جو سرپرستی کرتے ہیں وہ دوطرفہ ہوتی ہے۔ یعنی باضابطہ فوجی ادارے سابقہ فوجی افسروں کو مالی اور سماجی طور پر پہنچنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس کے عوض ریٹائرڈ فوجی ملازمین خصوصاً افسر اپنے ادارے اور دیگر ارکان کے فائدے کے لیے سیاسی ذرائع سے مزید مالیاتی اور دیگر وسائل حاصل کرتے ہیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر فوجی کاروبار سے مستفید ہونے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے

اوران کے بارے میں تفصیلات یا تو پوشیدہ رہتی ہیں یا دستیاب نہیں ہوتیں۔ اس لیے فوج کی اندرونی معیشت کی مالیت کا درست تخمینہ لگانا بہت مشکل ہے۔ یہ تخمینہ اس لیے ضروری ہے تاکہ قومی معیشت پر فوجی کاروبار کے بوجھ کا اندازہ کیا جاسکے۔ مثال کے طور پر فوجی کاروبار کے تخمینے میں فوجی برادری کے تمام اثاثوں کے مالیت شامل ہونی چاہیے۔ لیکن چونکہ اس طرح کے تفصیلی اعداد وشمار حاصل کرنا ممکن نہیں اس لیے شماریاتی تجزیہ بہت مشکل ہے۔ مکمل، صحیح اور شفاف اعداد وشمار کے نہ ہونے کے باعث یہ کتاب صرف فوجی کاروبار کی تعریف اور وضاحت کرے گی۔ بعدازاں ان سرگرمیوں کے نتائج پر بھی گفتگو کی جائے گی۔

اس موضوع پر دستیاب تحریروں پر ایک نظر

دل چسپ بات یہ ہے کہ اب تک فوجی کاروبار کے مظاہر پر سماجی علوم کی تحقیق نے باقاعدہ نظر نہیں ڈالی ہے۔ حالانکہ اس سلسلے میں خاصی واقعاتی معلومات موجود ہیں (یہ الگ بات کہ دستیاب معلومات شماریاتی تجزیے کے لیے ناکافی ہیں)۔ شاید اعداد وشمار کی کمی کے باعث ہی ماہرینِ معیشت فوجی سرمایے کے تجزیے سے گریزاں رہے ہیں۔ پھر یہ کہ نہ ہی سول فوجی تعلقات اور جمہوریت پر موجود تحریری مواد، فوجی کاروبار اور فوجی مطلق العنانیت کے تعلق کا تجزیہ کرتا ہے۔ نیز اس موضوع پر بہت سے ممالک میں زیادہ تر کام بین الاقوامی تعلقات اور سلامتی سے متعلق مطالعات میں کیا گیا ہے۔ مگر ان میں بھی کوئی باقاعدہ اور معقول نوعیت کا اصولی تجزیہ موجود نہیں ہے۔ اگرچہ کچھ مطالعاتی جائزے موجود ہیں جو مختلف ممالک میں فوجی کاروبار یا فوج کی اندرونی معیشت کی تفصیل بتاتے ہیں۔ امریکا، کینیڈا اور چین پر تین کتابی سائز کے مطالعے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انڈونیشیا، پاکستان، سوویت انہدام کے بعد کے روس اور چند لاطینی امریکی ممالک پر بھی چھوٹی موٹی تحقیقات ملتی ہیں۔☆11

کیرولین ہوم کوئسٹ (Caroline Holmqvist) اور ڈیبرا اوَنٹ (Deborah Avant) کی تحقیقات میں جو اس کا موضوعاتی تجزیہ ہیں، نجی سلامتی کے موضوع پر کام کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مصنّفین نجی سلامتی کی صنعت کے ارتقا کو ترقی یافتہ دنیا میں نظام کی ایک واضح

تبدیلی سمجھتے ہیں۔ کئی ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکا، کینیڈا، فرانس اور برطانیہ سلامتی کے مسائل کے شکار ممالک کو فوجی ساز و سامان اور خدمات فروخت کرتے ہیں۔ یہاں سابق یوگوسلاویہ اور افریقا کے ممالک کی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ ترقی یافتہ ریاستیں یہ فوجی ساز و سامان اور خدمات براہِ راست فروخت کرنے کی بجائے نجی کمپنیوں کے ذریعے بیچتی ہیں۔ اس طرح نجی سلامتی کے کاروبار پھیلتے گئے، فوجی افسران کی مانگ بڑھ گئی۔ اتفاقی طور پر نجی سلامتی کے کاروبار میں اضافہ ایسے دور میں ہوا جب سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مغرب میں فوج کم کی جارہی تھی۔

سلامتی سے متعلق ساز و سامان اور خدمات کی فروخت کو ٹھیکے پر دینے سے مغربی حکومتوں کو فوج کو کم کرنے میں انسانی وسائل کی صورت میں سلامتی کی سکت میں زیاں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نجی سلامتی کاروبار سے منسلک ہونے والے سابقہ فوجی افسران کے حکومت سے رابطے تھے اور انھیں ضرورت پڑنے پر مستقبل میں کہیں تعینات بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ فوج میں کمی کرنے سے ریاست کے براہِ راست فوجی اخراجات میں بھی کمی واقع ہوگئی۔ جنوبی افریقا جیسے چند غیر مغربی ممالک نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہوم کوئسٹ اور اوَنٹ نے نجی سطح پر فراہم کی جانے والی سیکورٹی کے پس منظر میں کارفرما عوامل کا جائزہ لیا ہے۔

ان دو مصنفین سے قبل پی ڈبلیو سنگر (P.W. Singer) اور جیمز ڈیوس (James Davis) نے بھی بالترتیب امریکا اور کینیڈا میں نجی سلامتی کی صنعتوں پر تجرباتی تحقیق کی تھی۔ پیٹر لاک (Peter Lock) نے انڈونیشیا کی ایک کانفرنس میں Soldiers in Business نامی مقالہ پڑھا۔ پیٹر کے خیال میں ہماری کتاب کے لیے تحریری مواد کے جائزے میں اس مقالے کا ذکر مناسب نہیں کیوں کہ اس نے فوج کی تجارتی سرگرمیوں کو ایک مختلف انداز سے دیکھا ہے۔☆[12] لاک کا کہنا تھا کہ نجی سلامتی کا تعلق فوجی ساز و سامان اور خدمات کی فروخت سے ہے جس میں تربیت، اہم افراد کی سلامتی، تنصیبات کی حفاظت اور حتیٰ کہ جنگ لڑنا بھی شامل ہے اس لیے یہ سول نجی شعبے کی تجارتی سرگرمیوں سے مختلف ہے۔ لاک اپنی دلیل میں اس بات کو مدِ نظر نہیں رکھتا کہ دونوں طرح کی سرگرمیوں کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں میں

فوج کی شمولیت کا مقصد یہ ہے کہ چند مخصوص لوگوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ اس سے سرکاری شعبے پر بوجھ پڑتا ہے جو عموماً دفاعی بجٹ میں شامل نہیں کیا جاتا۔

اس موضوع پر جو دوسرا تحقیقی مواد موجود ہے اس میں مسلح افواج کی طرف سے غیر روایتی مصنوعات کی فروخت پر بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع کے ایک مطالعے کا ذکر پہلے کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے "فوج بحیثیت ایک معاشی فریق: افواج کی کاروباری سرگرمیاں" (The Military As An Economic Actor: Soldiers In Business)۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، بی آئی سی سی کی تحقیق فوجی کاروبار کو بجٹ کی ایسی بیماری سمجھتا ہے جو صرف ترقی پذیر یا معاشی اُلجھنوں کی شکار ریاستوں کو درپیش ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ فوجی کاروبار کی محض جُزوی تشریح ہے۔ ہم نے اس کتاب میں یہ کوشش کی ہے کہ پورے مسئلے کو بے نقاب کیا جائے۔ اس کے علاوہ چینی مسلح افواج کی تجارتی سرگرمیوں کے بارے میں جیمز ملوینن (James Mulvenon) کا ایک مقالہ بھی ہے جو چین میں فوج کے زیرِ انتظام تجارتی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔ اس مقالے میں یہ بحث نہیں کی گئی کہ فوجی کاروبار پر صرف ہونے والے وسائل کو کہیں اور زیادہ بہتر طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اور نہ فوجی سرمایے کے نظری پہلوؤں ہی پر غور کیا گیا ہے۔ اس مقالے سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے چینی فوج کی تجارتی سرگرمیوں کے اثرات صرف فوجی بدعنوانیوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں ہم نے فوجی کاروبار کی تمام سرگرمیوں کا تجزیہ کرکے نظری خلا پُر کرنے کی کوشش کی ہے اور مسلح افواج کی ایسی تمام کارگزاریوں پر بات کی ہے جو افواج کے انفرادی ارکان، اداروں اور معیشت پر اثرات مرتب کرتی ہیں۔

فوجی کاروبار کا محرّک

سول منافع جاتی سرگرمیوں میں فوج مختلف اسباب کی بنا پر حصہ لیتی ہے جو سبکدوش اور حاضر ملازمت افسران کی فلاح و بہبود اور فلاحی نظام کی فراہمی سے لےکر ان کی سرگرمیوں سے قومی سماجی و معاشی ترقی میں معاونت تک محیط ہے۔ لیکن ایک تشریح یہ بھی ہے کہ ان سرگرمیوں کا

محرک اعلیٰ ترین افسران کا لالچ ہے۔ سینئر جنرل اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایسے معاشی مواقع پیدا کرتے ہیں جو سبکدوش ہونے کے بعد ان کے کام آئیں۔ لیکن اس طرح کے فوجی سرمایے کو صرف ذاتی انفرادی لالچ کا نتیجہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ذاتی مفاد کی اسکیموں کے قیام سے لے کر ادارے کی طاقت میں اضافے کی کوششوں تک یہ عمل اتنا سادہ اور ہموار نہیں ہوتا۔ اکثر حالات میں فوج نے پہلے تو ادارے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مالیاتی خودمختاری طلب کی۔ جواز یہ تھا کہ فوجی افسران کی فلاح و بہبود بہت ضروری ہے کیوں کہ دنیا بھر میں اُن کی تنخواہیں نجی شعبے کی تنخواہوں سے کم ہوتی ہیں۔ حکومتیں بھی اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتی ہیں کہ سرحد کے پاسبانوں کو مزید رقوم یا وسائل مہیا کیے جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مالیاتی آزادی کی جستجو کوئی نئی یا انہونی بات نہیں ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں بھی کرایے کی فوجیں اور سپہ سالار کاروباری افراد کی طرح وسائل جمع کرتے اور پھر جنگ و جدل کرتے تھے۔☆[13] انقلابِ فرانس سے قبل یورپی فوجیں زمینوں کی آمدنی پر گزارا کرتی تھیں۔ کیوں کہ ریاست کے پاس جنگ کے وسائل نہیں ہوتے تھے اور ان کا انحصار جاگیرداروں کے وسائل پر ہوتا تھا جو بادشاہوں کے شریک ہوا کرتے تھے۔☆[14] یہ کرایے کی فوجیں یورپی بادشاہوں کے جابرانہ طرزِ حکومت کا حصہ ہوتی تھیں جو فوجی قوت کے ذریعے ریاست کے لیے وسائل غصب کرنے کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔ جیسا کہ چارلس ٹِلّی نے پہلے کہا ہے کہ روس، سویڈن اور سلطنتِ عثمانیہ جیسی ریاستیں عوام سے بزورِ قوت محصول وصول کرتی تھیں تا کہ جنگ و جدل کے لیے وسائل حاصل کرنے کی طویل المدت استعداد متاثر نہ ہو۔☆[15] طریقہ یہ تھا کہ کچھ سول اور فوجی افسران کو جب تک وہ شاہی ملازمت میں رہتے تھے، شاہی زمینوں کے کرایے دیے جاتے تھے۔☆[16] دنیا کے دیگر علاقوں میں بھی یہی ہوتا تھا جہاں فوجیں جاگیرداروں اور علاقائی حکمرانوں کے لیے لڑائیوں میں حصہ لیتیں۔ یہ جاگیردار اپنی جنگوں کے لیے مالی وسائل حاصل کرنے کے لیے لوٹ مار بھی کرتے تھے۔☆[17] حالیہ وقتوں میں چین اور انڈونیشیا جیسے ممالک میں مسلح افواج اپنی عملی ضروریات کے لیے اندرونی معیشتوں کو بھی استعمال میں لاتی ہیں۔ اندرونی معیشت کا استعمال اُن وسائل کے علاوہ ہے

جو دفاعی ضروریات کے لیے مختص ہوتے ہیں۔

ترقی پذیر معیشتوں میں فوجیں پیسہ بنانے کی سرگرمیوں کا جواز یہ دیتی ہیں کہ وہ قومی ترقی میں معاون ہیں۔ متبادل ترقیاتی ادارے نہ ہونے کے باعث مسلح افواج خود یہ ذمہ لے لیتی ہیں کہ وہ بڑی صنعتیں بھی لگائیں یا وسائل یا سرمایے پر مبنی منصوبے بھی شروع کریں، مثلاً چینی فوج نے ابتدا میں تجارتی اور زرعی منصوبے شروع کیے تاکہ قومی معیشت کی ترقی کے ساتھ ساتھ خود انحصاری میں بھی مدد ملے۔ چینی فوج کے خصوصی جنگی معاشی گروہوں نے منافع کمانے کے لیے متعدد مختلف اقسام کی مصنوعات تیار کیں۔ ان گوریلا صنعتوں نے اپنے منافع جات جنگی تیاریوں پر بھی صرف کیے اور فوجی یونٹوں کے فلاحی منصوبوں پر بھی۔☆[18]

دراصل جنرلوں کی اکثریت فوج کی اندرونی معیشت کو اپنے ادارے کی بہتر کارکردگی کا اظہار سمجھتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وسائل کے استعمال اور ریاست کی مجموعی سماجی و معاشی ترقی میں انھیں برتری حاصل ہے۔ اُن کی معاشی و تجارتی سرگرمیوں سے منافع اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ مسلح افواج زیادہ منظّم ہوتی ہیں اور سویلین کاروباری اداروں سے کم بدعنوان ہوتی ہیں۔ فوج کا یہ احساسِ برتری کم ترقی یافتہ ملکوں میں اور بھی بڑھ جاتا ہے جہاں سویلین ادارے اچھی کارکردگی نہیں دکھاتے اور جہاں کی سیاست بھی ناپختہ ہوتی ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ فوج کی اس تقابلی برتری کو کئی مغربی عالم بھی مانتے ہیں، مثلاً مورس جانووِٹس (Morris Janowitz) کا خیال ہے کہ تیسری دنیا کی فوجیں ''بحرانی ادارے'' ہیں جو مختلف قسم کے خطرات کا سامنا کرنے کی اہل ہوتی ہیں۔ جانووِٹس کو یقین ہے کہ نتائج کے حصول کے لیے غیر مغربی مسلح افواج اعلیٰ صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ سیموئیل پی ہنٹنگ ٹن (Samuel P. Huntington)، الفریڈ اسٹیپان (Alfred Stepan) اور ڈیوڈ میرس (David Mares) کا بھی یہی خیال ہے کہ تیسری دنیا کی فوجیں معاشروں کو سماجی و معاشی طور پر جدید بناتی ہیں۔☆[19] مین فریڈ ہیلپرن (Manfred Helpern) نے مشرقِ وسطیٰ کی فوجوں پر تحقیق کر کے اس خیال کو تقویت دی ہے کہ ایسی فوجیں ترقی پسند عسکریت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔☆[20] مصنف اس قسم کی فوجوں کو ایک ترقی پذیر عسکریت کا معاملہ سمجھتا ہے۔

اس موضوع پر زیادہ تر تحریری مواد مسلح افواج کو خاص سماجی حالات کی پیداوار سمجھتا ہے۔ منتشر اور افسر شاہانہ معاشرے سیاسی طور پر بالادست فوج کو جنم دیتے ہیں۔ یہ کتاب اس تجزیے سے اختلاف نہیں کرتی کیوں کہ ریاست کے اداروں کا تقابلی جائزہ ہمارے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ یہاں ہم صرف اس امر کا جائزہ لیں گے کہ فوجی کاروبار کے ذریعے مسلح افواج کے افسران کے معاشی مفادات پر کیا اثر پڑتا ہے۔

فوجی کاروبار اور شاہانہ مطلق العنانیت پر موجود تحریریں مسلح افواج کے مضبوط کردار پر بحث کرتی ہیں، خاص طور پر اگر یہ کمزور ریاستوں میں ہو۔ فوج اور ترقی پر جو تحریریں 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں لکھی گئیں انھوں نے ترقی پذیر ریاستوں میں فوج کے گوناگوں کرداروں کی توثیق کی۔ یہاں یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ فوج کے ترقیاتی اور جدّت پسند کردار کو قبولیت سرد جنگ کی سوچ نے دی۔ اس وقت تیسری دنیا میں فوجوں کی جانب مغربی رویہ شمال اور جنوب کے فوجی تعاون پر مبنی تھا۔ ترقی پذیر ممالک کے سیاسی انتشار کی ایک وجہ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظریات کا ٹکراؤ تھا۔ ایسے میں فوج ہی ایسا واحد ادارہ معلوم ہوتی تھی جو اچھی حکومت اور استحکام کی ضمانت دے سکے۔ فوج نہ صرف اندرونی استحکام کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے بلکہ کمیونسٹ طاقتوں کے مقابلے میں امریکی سلامتی کے مقاصد کے حصول کے لیے بھی آلۂ کار بنائی گئی۔ کئی مصنفین نے اس بارے میں لکھا ہے کہ کس طرح امریکا نے ترقی پذیر ریاستوں میں فوجی اداروں کو مضبوط کر کے اپنے مقاصد حاصل کیے۔ مثال کے طور پر عائشہ جلال اور ولیم رابن سن (William Robinson) کا کہنا ہے کہ امریکی سلامتی کے لیے لائحۂ عمل نے ہی پاکستان اور لاطینی امریکا میں مطلق العنان فوجی حکومتوں کی اہمیت کا تعین کیا۔☆21

تاہم مسئلہ صرف یہ نہیں کہ امریکی مفادات نے کسی ریاست کے سیاسی لائحۂ عمل کا تعین کیا۔ دراصل مطلق العنان اور سیاسی طور پر ناپختہ ریاستیں جغرافیائی اور فوجی سلامتی کو اپنے شہریوں کے لیے بنیادی مسئلہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔ جو ریاستیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہی غیر محفوظ ہوں وہاں فوجی سلامتی تو ویسے ہی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ ان حالات میں فوج کو قومی سلامتی کے محافظ ہونے کا تاثر بہت فائدہ پہنچاتا ہے اور اس سے فوج کے سیاسی اثر میں

بھی اضافہ ہوتا ہے۔ میری کالاہان (Mary Callahan) نے میانمار کے مطالعے میں اُس تعلق پر بحث کی ہے جو فوج کے محافظانہ کردار اور اس کے سیاسی و سماجی اثر و رسوخ کے درمیان ہوتا ہے۔☆[22] ایسے سیاسی طور پر ناپختہ ماحول میں چونکہ فوج کی جدید ٹیکنالوجی پر دسترس بھی ہوتی ہے اور وہ غیر ملکی ثقافتوں کا شعور بھی رکھتی ہے اس لیے صرف فوج ہی ایک قابلِ اعتبار ادارے کے طور پر خود کو منوانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہنٹنگ ٹن (Huntington) کے ''فوجی مصلح''☆[23] کے تصور کی بنیاد بھی اس مفروضے پر ہے کہ تیسری دنیا کی فوجیں کم ترقی یافتہ معاشروں میں مغربی ثقافتی روایات کی علم بردار ہوتی ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فوجی کاروبار کی حمایت میں جو تحریریں موجود ہیں ان میں جدیدیت کا مطلب ہے افسر شاہی نظام، مرکزی انتظام، ٹیکنالوجی اور سیاسی و معاشی استحکام۔

مغربی ممالک کی فوجیں بھی کاروبار میں شامل ہوتی ہیں۔ بعض مسلح افواج منافع بھی کماتی ہیں خاص طور پر اس طرح کہ فوج کے انفرادی ارکان اچانک انتظامی تبدیلیوں کے باعث وسائل میں کمی کو پورا کرتے ہیں، مثلاً سوویت یونین کے خاتمے کے بعد جب دفاعی بجٹ میں کمی ہوئی تو روسی فوج اور اس کے ارکان مشکل میں پڑ گئے۔ اب روسی مسلح افواج کے ارکان مالیاتی دباؤ کم کرنے کے لیے پیسہ بنانے کے غیر قانونی دھندوں میں پڑ گئے۔ دوسری جانب امریکا، فرانس، برطانیہ اور جنوبی افریقا جیسے ملکوں کے سابق افسران کمپنیاں بنا کر فوجی تربیت اور ساز و سامان ملکی اور غیر ملکی حکومتوں کو بیچنے لگے۔

پوشیدہ اور احتساب سے مبرا مالیاتی وسائل کے پیچھے منطق جو بھی ہو، فوجی کاروبار بالآخر سیاست اور پالیسی سازی میں مسلح افواج کے اثرات کو بڑھاتا ہے۔ اس طرح کا فوجی سرمایہ افسران کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ مالیاتی فوائد کے حصول کے لیے اپنے ادارے کے اثر و رسوخ کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ مثلاً ترک فوج کی مالیاتی خودمختاری سے اس کی قوت میں اضافہ ہوا۔ چونکہ فوجی انتظامیہ اہم سیاسی و معاشی فریق بن چکی ہے اس لیے ترکی کے سرمایہ داروں نے فوج سے اشتراکِ عمل کرلیا ہے تاکہ مل جل کر وسائل کا استحصال کیا جائے۔ ایسا اتحاد بے چین پرولتاریہ کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ فوج کو ایک معاشی

قوت کے طور پر خود اپنی برادری اور سویلینز میں بھی ایک طرح کا قانونی جواز میسر آتا ہے۔ مسلح افواج اپنا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے سول سوسائٹی میں اپنے اتحادی بناتی ہیں اور فوجی برادری کے علاوہ اپنے سویلین حواریوں کے لیے بھی فوائد حاصل کرتی ہیں۔ اس موضوع پر ہم آگے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

فوجی سرمایہ صرف اس لیے مہلک نہیں ہوتا کہ اس سے مسلح افواج معیشت میں سرایت کر جاتی ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ یہ فوجی اداروں کے اعلیٰ افسران کو غیر معمولی قوت دیتا ہے۔ اندرونی معیشت سے بنیادی طور پر مستفید ہونے والوں میں حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ جنرل ہوتے ہیں۔ معاشی فوائد حاصل کرنے کا پورا عمل کچھ اس طرح وضع ہوتا ہے کہ اس کا سب سے زیادہ فائدہ اعلیٰ افسران کو ہی ہوتا ہے۔ اس لیے فوجی کاروبار کو سرحدوں کے محافظوں کے لیے محض ایک بے ضرر سا معاوضہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لیکن پھر بھی فوج معیشت میں اپنی مداخلت کو قومی سلامتی کی مجموعی لاگت کا حصہ قرار دیتی ہے اور اس تناظر میں اسے مفادِ عامہ قرار دیا جاتا ہے۔ دراصل فوجی کاروبار کی لاگت ان خدمات کے عوض بہت زیادہ ہے جو مسلح افواج ریاست اور سماج کو اندرونی اور بیرونی خطرات کے تحفظ میں فراہم کرتی ہیں۔ خصوصاً سیاسی طور پر ناپختہ معاشروں میں مسلح افواج خود کو ایک ایسے نجات دہندہ کے طور پر پیش کرتی ہیں جو ریاست کو بدعنوان سیاست دانوں اور دیگر استحصال کرنے والوں سے بچاتا ہے۔ اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے فوج بڑی چالاکی سے اندرونی اور بیرونی خطروں کا ہوّا کھڑا کرتی ہے۔ عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ دفاعی بجٹ اور ''اندرونی معیشت'' قومی سلامتی کے لیے دی جانے والی معمولی قیمت ہے۔ خطروں کو اس لیے بڑھا دیا جاتا ہے کہ فوج پر اخراجات کا جواز قائم رہے۔

معاشرے کے مراعات یافتہ گروہ خود اپنے مفادات کے باعث فوج کی معاشی سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ فوجی بالادستی والی حکومتوں میں دیگر حکمران گروہ بھی مسلح افواج کے حواری بن جاتے ہیں تاکہ باہمی طور پر سودمند تعلقات استوار کیے جا سکیں۔ انڈونیشیا اس کی ایک واضح مثال ہے جہاں فوج کے معیشت میں مستحکم مفادات ہونے کے

باعث سیاسی قیادت اور کاروباری شعبے نے مسلح افواج کے ساتھ وسائل میں شراکت کرلی۔ سیاسی وفوجی قیادت نے نہ صرف فوجی کاروبار کی اجازت دی بلکہ ایک دوسرے کے معاشی مفادات کی سرپرستی کی تاکہ اقتدار میں ایک خاص گروہ کی بالادستی برقرار رہے۔ جگارتا نے کبھی بھی بجٹ میں وہ نقائص دور کرنے کی کوشش نہیں جن کا فائدہ اٹھاکر مسلح افواج اپنی اندرونی معیشت چلاتی ہیں۔ چونکہ انڈونیشیا کی حکومت فوج کو ہتھیاروں کو جدید بنانے اور افرادی قوت کے لیے کافی وسائل فراہم نہیں کرسکتی تھی اس لیے اُس نے مسلح افواج کو اجازت دی کہ وہ تجارتی سرگرمیوں سے وسائل کی کمی پوری کرلیں۔ رفتہ رفتہ ضرورت کی جگہ لالچ نے لے لی اور جنرلوں نے سیاسی رہنماؤں سے مل کر ایک معاشی سلطنت تعمیر کرلی۔ اس طرح اہم فریقین کا مفاد اسی میں تھا کہ فوج کو منافع بنانے کی اجازت ملی رہے۔

فوجی کاروبار کے نتائج

غیر قانونی فوجی سرمایے کے دوررس اثرات معیشت، سماج، سیاست اور خود فوجی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر پڑتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اجارہ داریوں کے قیام سے منڈی کی معیشت پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فوجی برادری اور اس کے سویلین حواریوں کو ٹھیکے ملنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فوجی کاروبار سے سرکاری شعبے پر بوجھ پڑتا ہے کیوں کہ اس طرح سرکاری شعبے سے نجی شعبے کی طرف رقوم خفیہ انداز میں منتقل ہوتی ہیں۔ چونکہ فوج دعویٰ کرتی ہے کہ فوجی کاروباری سرگرمیاں جائز طور پر نجی شعبے میں کی جارہی ہیں اس لیے سرکاری شعبے کے وسائل کو اس مخصوص نجی شعبے میں منتقل کیا جاتا ہے۔ مثلاً فوج کے زیرِ اختیار اداروں میں فوجی ساز وسامان کا استعمال یا ریاستی زمینوں کی فوجی افسران کو منتقلی جسے وہ بعد میں زیادہ منافع پر فروخت کردیتے ہیں۔ اس کے باوجود فوجی انتظامیہ اپنی اندرونی معیشت کی لاگت کو دفاعی بجٹ میں شامل نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ یہ پوشیدہ لاگت بنیادی طور پر اُن ملکوں میں پائی جاتی ہے جہاں فوج سیاسی طور پر بالادست ہوتی ہے۔

ریاست کے وسائل اور بھی کئی طریقوں سے ضائع ہوتے ہیں، مثلاً اُن لوگوں پر جو فوجی

تربیت حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت چھوڑ کر نجی شعبے میں چلے جاتے ہیں۔ان لوگوں کے جانے سے حکومت کو یہ خدمات نجی شعبے سے زیادہ قیمت پر حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ اس طرح حکومت دوبار خسارے سے دوچار ہوتی ہے۔ترقی یافتہ ممالک میں فوج خود سیکورٹی کی نجکاری کا محرک نہیں ہوتی لیکن اس کے فائدے ضرور اٹھاتی ہے، مثلاً امریکا میں سیکورٹی کی نجکاری سے بڑے بڑے کاروباری ادارے فائدے اٹھاتے ہیں۔ سیکورٹی کی نجی صنعتوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ان تحریروں میں سرکاری سے نجی شعبے کی جانب فوجی افرادِ کار کی پیش رفت کو ''سونے کی کان'' سے تشبیہ دی جاتی ہے۔☆[24] اس ''کان کنی'' کے تباہ کن نتائج نکلتے ہیں کیوں کہ کاروباری شعبہ ایسی پالیسیوں کی حمایت کرتا ہے جو نجکاری کے ذریعے زیادہ منافع دے سکیں۔ اعلیٰ افسران کاروباری شعبے کے حمایتی بن جاتے ہیں جس سے مسلح افواج کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔فوجی کاروبار دست گیری کا ایسا نظام تشکیل دیتا ہے جس سے افسر شاہانہ سیاست پروان چڑھتی ہے۔ رونالڈ ونٹروب (Ronald Wintrobe) نے بھی لکھا ہے کہ فوجی حکومتیں جمہوری حکومتوں سے کہیں زیادہ وسائل کی بندر بانٹ کرتی ہیں تا کہ وفاداریاں خریدی جاسکیں۔☆[25] فوجی آمر وفاداریاں خریدنے کے لیے جزا و سزا دونوں سے کام لیتے ہیں۔اس طرح وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سے استحصالی نظام مضبوط ہوتا ہے۔

سیاسی و معاشی فریقین کے باہمی تعلقات پر فوجی کاروبار کے بڑے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ یہ تعلقات دو سطحوں پر کام کرتے ہیں۔ ایک تو مسلح افواج کے اندر اور دوسرے فوج اور اس کے حاشیہ نشینوں کے درمیان۔ پہلی سطح پر تو معاشی اور دیگر وسائل وفاداریاں خریدنے کے لیے فوج کے اندر ہی بانٹ لیے جاتے ہیں۔ دفاعی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران ایوانِ اقتدار کے میزبان بھی ہوتے ہیں اور مہمان بھی۔ دوسری سطح پر فوجی انتظامیہ دیگر گروہوں کی وفاداریاں خریدنے کے لیے بھی وسائل تقسیم کرتی ہے تا کہ فوج کی مالیاتی سرگرمیوں سے توجہ ہٹائی جاسکے۔

پاکستان میں، مثال کے طور پر، صرف فوج ہی زمینوں پر قبضے نہیں کرتی بلکہ حکومت دیگر فریقین کی بھی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ زمینیں حاصل کریں یا ہاؤسنگ اسکیمیں تعمیر کریں۔

اس طرح مستفید ہونے والوں میں کاروباری شعبہ بھی شامل ہے اور اہم سیاسی شخصیات بھی۔ عدلیہ کے ارکان بھی ملوث ہیں اور صحافی بھی۔ نتیجہ یہ کہ فوج جب زمین کے پلاٹ حاصل کرتی ہے تو اس کے خلاف تنقید کا زور کمزور ہو جاتا ہے خاص طور پر ان لوگوں کی جانب سے جو اس قسم کی سرگرمیوں سے فائدہ اٹھا چکے ہوں۔ اس طرح فوج کی کاروباری سرگرمیاں ایک طرف تو اقربا پروری پر مبنی سرمایہ داری کو جنم دیتی ہیں جس سے معاشرے پر فوج کی بالادستی کو تقویت ملتی ہے، فوج کھلے طور پر ریاست اور سماج میں اہم انتظامی اور سیاسی عہدوں پر قابض ہو جاتی ہے اور دوسری طرف یہ باور کرایا جاتا ہے کہ قوم کے تمام امراض کے لیے مسلح افواج کے پاس اکسیر وجود ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ فوج مقامی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر کاروباری سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔ پاکستان، ترکی اور انڈونیشیا جیسے ملکوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی کاروباری ادارے بھی ان ملکوں میں فوج کے زیرِ انتظام چلنے والے کاروبار میں شراکت کرتے ہیں۔ چونکہ فوج ریاست پر بالادست بھی ہوتی ہے اور پھر خود کو سب سے قابلِ اعتبار ادارے کے طور پر بھی پیش کرتی ہے، اس لیے بین الاقوامی فریقین کو یہ بات آسان معلوم ہوتی ہے کہ فوج کے زیرِ انتظام کمپنیوں کے ذریعے کام نکالے جائیں۔ بین الاقوامی کاروباری اداروں کو راغب کرنے میں سویلین کے مقابلے میں سینئر جنرل اپنے اچھے تاثر کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دفاعی اداروں کا مثبت تاثر قائم کرنے کی ایک کوشش ہمیں پاکستان کے فوجی صدر جنرل پرویز مشرف کی اُس تقریر میں ملتی ہے جو انھوں نے ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں سمندری پانی کو قابلِ استعمال بنانے کے ایک منصوبے کا افتتاح کرتے ہوئے کی۔ انھوں نے کہا:

> ..."ہمارے پاس آرمی ویلفیئر ٹرسٹ بھی ہے اور فوجی فاؤنڈیشنز بھی۔ جو بینکاری بھی کرتے ہیں اور کھاد بھی بناتے ہیں۔ ہمارے پاس دوائیں بنانے کے ادارے بھی ہیں اور سیمنٹ پلانٹ بھی اور اگر یہ ادارے ٹھیک چل رہے ہیں تو کسی کو کیا مسئلہ ہے؟ فوجی اداروں کے بینک بھی سب سے اچھے ہیں اور سیمنٹ پلانٹ بھی۔ ہمارے کھاد بنانے والے کارخانے

بھی بہترین کام کررہے ہیں۔اب اس میں کسی کو جلنے یا حسد کرنے کی
کیا ضرورت ہے؟ اگر ریٹائرڈ فوجی افسران یا اُن کے ساتھ وابستہ
سویلین اچھا کام کررہے ہیں تو کسی کے ان سے بغض رکھنے کا جواز کیا
ہے؟ وہ تو پاکستانی معیشت کی ترقی کے لیے کام کررہے ہیں۔''☆26

اب اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اس تقریر کے کچھ ہی دنوں بعد ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی نے ایک بین الاقوامی فریق سے مل کر کراچی میں ایک نئے رہائشی منصوبے کا آغاز کردیا۔

ان بین الاقوامی کاروباری رابطوں کا ایک سیاسی پہلو یہ ہے کہ صفِ اوّل کی ریاستوں کی افواج عالمی طاقتوں کو اپنی خدمات فراہم کرتی ہیں۔ امریکا ایسی فوجی حکومتوں کی سرپرستی کرتا ہے جو سیاسی و معاشی مدد کے عوض امریکی مفادات کے لیے کام کرسکیں۔

بہت سے مقامی فریق سیاسی و معاشی فوائد کے لیے مسلح افواج کے تعاون کو مؤثر سمجھتے ہیں جس سے افواج کی طاقت بڑھنے کے ساتھ فوج کی معاشی حرص اور مزید قوت حاصل کرنے کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔یعنی فوج کا سیاسی اثر ورسوخ صرف اپنی طاقت کے بل پر نہیں بلکہ اپنے حواریوں کی سیاسی و معاشی قوت پر بھی ہوتا ہے یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

سیاسی طاقت+ معاشی طاقت (فوجی برادری x حواری)=فوج کا سیاسی سرمایہ

اس مساوات کی رُو سے فوج کے ارکان اور اُن کے حواری مسلح افواج کے اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اہم سیاسی و معاشی فریقین کا ریاستی قیادت یا بالادستی پر متفق نہ ہونا تو ممکن ہے لیکن سب اس پر ضرور متفق ہوتے ہیں کہ چاہے حکومت کی باگ ڈور کسی کے بھی ہاتھ میں ہو سیاسی اقتدار میں اضافے کے لیے فوج کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مراعات یافتہ طبقات اپنے مفادات کے حصول میں اتنے منہمک ہوتے ہیں کہ اُنھیں قومی وسائل پر قبضے کے دوررس نتائج پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ وہ معاشرے کے ''محروم'' لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ہی انھیں مجموعی قومی وسائل میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں حکمران طبقات (سویلین اور فوجی دونوں) اپنے عارضی فائدے کے لیے قوم کے دیرپا مفادات کو قربان کردیتے ہیں۔ان حالات میں نظریاتی وفاداریاں بھی زیادہ

عرصے نہیں چلتیں اور فریقین اپنے ذاتی مفادات کے لیے کسی بھی قسم کی سمجھوتے بازی سے گریز نہیں کرتے۔ اقتدار کے لیے یہ اندھا دھند دوڑ دھوپ ادارے کو تباہ کر دیتی ہے اور اسی کے باعث سیاست اور پالیسی سازی میں فوج کا کردار کم نہیں ہو پاتا۔

یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ فوج کا کاروباری سرگرمیوں میں حریصانہ رویہ ریاست اور سماج میں تصادم اور ٹکراؤ کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف تو سماجی و معاشی عدم تحفظ پھیلتا ہے اور دوسری طرف ریاست کو چلانے والی قوتوں میں تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ ریاست کے حکمران گروہ اور سماج کے محروم طبقات میں تفاوت بہت بڑھ جاتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہونے والی اور نوتعمیر شدہ ریاستوں میں اس کے اثرات بڑے تباہ کن ہوتے ہیں جیسا کہ ولی نصر (Vali Nasr) نے لکھا ہے کہ یہاں ریاست اور سماج کے تعلقات سیّال اور ناپختہ ہوتے ہیں۔ ایسے ماحول میں سیاسی طور پر طاقت ور قوتیں مثلاً فوج، سیاسی جماعتیں، مذہبی طاقتیں اور بڑے کاروباری ادارے ریاست کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اُن کے ذاتی مفادات مستحکم ہوں۔ معاشرے کو ایک خاص سمت میں ہانکنے کی کوشش سے عوام اور خواص مخالف سمتوں میں چل پڑتے ہیں۔[☆27] حریصانہ رویے کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو اس سے مراعات یافتہ گروہ (فوج سمیت) اصل میں ریاست اور سماج کے تعلقات میں بگاڑ کا باعث ہوتے ہیں۔

انڈونیشیا اور ترکی بھی ایسی ہی مثالیں ہی جہاں سیاسی و معاشی طور پر حریصانہ رویوں نے ریاست اور سماج کے درمیان بہت فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔ چونکہ وسائل کی تقسیم سے مراعات یافتہ طبقے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے حکمرانوں اور عوام کے درمیان فاصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کے علاقے آچے میں ہونے والے تشدد سے متعلق لیزلی میک کلوچ (Lesley McCulloch) کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح سیاسی و معاشی طور پر حریصانہ رویے کسی طرح افراد کے باہمی بلکہ خانگی تعلقات تک کو متاثر کرتے ہیں۔ لیزلی کا مقالہ آچے میں فوج کی بھتا خوری کی دل چسپ تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ وہاں مسلح افواج اور پولیس نہ صرف یہ کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں ملوث ہیں بلکہ تجارتی مقاصد کے لیے

زمینوں پر قبضے بھی کرتے ہیں۔☆[28]

یہ بات واضح طور پر معلوم ہے کہ مسلح افواج کو ان نتائج کی پروا نہیں ہوتی۔ خصوصاً ترقی پذیر ریاستوں میں جہاں فوج کی کاروباری سرگرمیاں گھناؤنی شکل میں پائی جاتی ہیں وہاں مسلح افواج اپنی اندرونی معیشت کو چلانا اپنا فطری حق سمجھتی ہیں۔ چونکہ مسلح افواج ریاست کو تحفظ فراہم کرتی ہیں اس لیے سماج پر ذمہ داری ڈالی جاتی ہے کہ وہ مسلح افواج کے ارکان کو مراعات دے۔ اس منطق کے ذریعے فوج کے تجارتی مفادات کو قانونی تحفظ دے کر سیاسی اثر ورسوخ حاصل کیا جاتا ہے اور مفادات پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، مثلاً ترک فوج لوگوں کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ دفاعی بجٹ یا فوج کے کاروباری اخراجات کی بابت سوال کریں۔

پیٹر لاک فوجی کاروبار کے نظری پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ...''یہ بات قابلِ فہم ہے کہ فوجی اشرافیہ آنے والے ریاستی بحران کا اندازہ رکھتی ہو اور اسی لیے وہ اپنے پیداواری وسائل چاہتی ہو تاکہ سول سوسائٹی کے لیے تباہ کن حالات میں بھی اپنی خود مختاری اور ادارتی استحکام کو باقی رکھ سکے۔ یہی حکمتِ عملی فوج کے بالادست تاثر کو تقویت دیتی ہے۔☆[29]

مگر معاشرے کو اس طرزِ عمل کی بھاری سیاسی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ فوج کی ان سرگرمیوں سے جمہوری ادارے نہیں پنپتے اور معاشی مفادات کی حامل فوج سیاسی اقتدار کو چھوڑنا نہیں چاہتی بلکہ ریاست اور سماج میں اپنے اداروں کی بالادستی برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ فوج کی یہ بالادستی پاکستان، انڈونیشیا اور ترکی میں بڑی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

پیشہ وارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلح افواج جب حصولِ زر کی کاوشوں میں مشغول ہوتی ہیں تو اُن کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔ چین کی مثال بڑی واضح ہے۔ وہاں جب کاروبار سویلین نگرانی سے الگ اور قانونی چارہ جوئی سے محفوظ کردیا گیا تو اس کا نتیجہ بدعنوانیوں کی شکل میں نکلا۔☆[30] جیمز ملوی نن (James Mulvenon) نے بھی چینی فوج کی تجارتی اور غیر فوجی سرگرمیوں میں شمولیت کو بدعنوانیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔☆[31] اس طرح فوج

کی کاروباری سرگرمیوں سے صرف فوجیوں کی فلاح و بہبود ہی نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ فوجی افسران کے ذاتی مقاصد کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔ بہرحال فوجی انتظامیہ کے افسران حکمران گروہ میں شامل ہونے کے طفیل خوب مال بناتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مسلح افواج میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سے ادارے کے لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور پیشہ ورانہ صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔ چونکہ معاشی مراعات کی تقسیم اعلیٰ افسران کی صوابدید پر ہوتی ہے اس لیے درمیان درجے کے افسران اپنے اعلیٰ افسران کی خوشنودی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہم دیکھیں گے کہ جب افسران فائدے اٹھانے اور ریٹائر ہونے کے بعد کی مراعات کے حصول میں مشغول ہوں تو اُن کی فہم وفراست کس طور متاثر ہوتی ہے۔ بہرحال چین میں ان مسائل پر قابو پانے کے لیے پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر دوبارہ زور دیا جانے لگا ہے۔

''فوجی معاملات میں انقلاب'' نامی اصلاحات کے ذریعے مسلح افواج کی غیر فوجی سرگرمیوں کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور فوج کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ عام صنعتوں میں اپنی شمولیت کم کریں۔☆[32] اس کے باوجود چینی فوج اب بھی دفاعی پیداوار میں سرگرم ہے۔

فوجی کاروبار اور پاکستان

گیارہ ستمبر 2001ء کو ہونے والے واقعات کے بعد پاکستان کے سیاسی مستقبل پر عالمانہ بحث بھی ہو رہی ہے اور خدشات کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے۔ زیادہ تر سوالات پاکستانی ریاست کے مستقبل کے بارے میں کیے جاتے ہیں۔ کیا اتنے گوناگوں خطرات کے سامنے پاکستان میں جمہوریت ٹھہر سکے گی؟ کیا جنرل پرویز مشرف کی حکومت اپنے دعوے کے مطابق پائیدار جمہوریت بحال کرنا چاہتی ہے؟ پاکستان کے جمہوری اداروں اور سیاسی ڈھانچے کو مستقبل میں فوجی مداخلت سے بچانے کے کون سے طریقے آزمائے جا سکتے ہیں؟ پاکستان میں جمہوریت، سول وفوجی تعلقات اور سیاست پر لکھی جانے والی تحریریں عام طور پر فوج اور سیاسی قوتوں کے تقابلی جائزے پیش کرتی ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد امریکی پالیسی سازوں نے جنرل مشرف کی اُن

کوششوں کی حمایت کی جو بظاہر جمہوریت کے استحکام کے لیے کی جا رہی تھیں۔ اس سوچ کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں افواج کو سویلین اداروں سے زیادہ باصلاحیت سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان کے سیاسی نظام کی کمزوریوں کو سمجھنے کے لیے فوج کے سیاسی مفادات کی چھان بین ضروری ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا فوج کبھی اقتدار چھوڑے گی یا نہیں؟ پاکستان کی مسلح افواج یا کوئی بھی ایسی فوج جس کے بڑے معاشی مفادات ہوں وہ کیوں کسی سیاسی طبقے کو اقتدار منتقل کرے گی؟ پاکستان اُن ریاستوں کا نمائندہ ہے جہاں سیاسی طور پر بالادست افواج ریاست اور سماج پر اقتدار حاصل کر لیتی ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے افواج معاشرے، ریاست اور معیشت میں سرایت کر جاتی ہیں۔ دفاعی اداروں کی مالیاتی خودمختاری، معاشی نفوذ اور سیاسی طاقت نہ صرف باہمی طور پر جڑے ہیں بلکہ یہ ایک شیطانی چکر کا حصہ ہیں۔

آج پاکستانی فوج کی اندرونی معیشت اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ اس نے مسلح افواج کو ایک غالب معاشی فریق بنادیا ہے۔ فوجی کاروبار کے سب سے نمایاں اور جانے پہچانے ادارے چار ہیں یعنی فوجی فاؤنڈیشن، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ، شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن۔ یہ چاروں دفاعی انتظامیہ کے ذیلی اداروں کے طور پر کام کرتے ہیں، اور سول اور فوجی دونوں طرح کے ملازمین رکھتے ہیں اور چھوٹے بڑے ہر طرح کے کام کرتے ہیں جن میں چھوٹے پیمانے پر بیکریاں، باغات، اسکول، نجی سیکورٹی فرمیں وغیرہ اور بڑے پیمانے پر تجارتی بینک، انشورنس کمپنیاں، ریڈیو اور ٹیلی وژن چینل، کھاد، سیمنٹ اور سیریل بنانے کے کارخانے اور دیگر کارخانے شامل ہیں۔

تاہم یہ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ ادارے کی حیثیت میں بھی فوج بہت سی چھوٹی بڑی کاروباری سرگرمیوں میں براہِ راست ملوث ہے جن میں شفافیت کی بہت کمی ہے۔ اسی وجہ سے فوج کی اندرونی معیشت کا درست تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ ان سرگرمیوں میں ہائی وے یا موٹروے پر محصول جمع کرنا بھی شامل ہے اور گیس اسٹیشن بھی۔ شاپنگ مال بھی شامل ہیں اور اس طرح کی دیگر سرگرمیاں بھی اور پھر سبکدوش ہونے والے افسران کے لیے طرح طرح کی مراعات ہیں جن میں شہری اور دیہی زمین کے علاوہ ملازمت یا کاروبار کے مواقع بھی شامل ہیں۔

ریاستی زمین کے پلاٹ بانٹنے سے ملک کے وسائل انفرادی فائدوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور پھر کاروباری مراعات کے لیے بھی اثر ورسوخ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ فوجی بیوپاری مسلح افواج سے وابستہ ہوتے ہیں اس لیے نجی شعبے کے تاجر اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اپنی معاشی بالادستی قائم رکھنے کے لیے مسلح افواج ہر ممکن تنظیمی اور سیاسی طاقت استعمال کرتی ہیں۔

پاکستان میں فوجی کاروبار کا آغاز اس وقت ہوا جب فوج نے اپنے ملک کے سیاست دانوں سے سیاسی محاذ پر لڑنا شروع کیا۔ فوجیوں کو زمین کے پلاٹ دینے کی روایت تو انگریزوں کے زمانے سے چلی آ رہی تھی لیکن 1954ء کے بعد فوج کی اندرونی معیشت کا ارتقا بے مثل تھا۔ فوج کے جن مقامی افسران نے 1951ء کے آس پاس مسلح افواج کی تینوں شاخوں کی قیادت سنبھالی انھوں نے مالیاتی خودمختاری اور فیصلہ سازی میں اثر ونفوذ بڑھا کر اپنی سیاسی طاقت کو مستحکم کیا۔ کاروباری سرگرمیوں کے ذریعے فوجی افسران انفرادی طور پر بھی خوش حال ہوئے اور انھیں مراعات فراہم کرنے کا پورا نظام بھی وجود میں آیا۔ اس طرح قومی وسائل کا منظم طور پر استحصال شروع ہوا اور مسلح افواج کی اجتماعی معاشی و مالیاتی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایسے کاروبار شروع کیے گئے جن کا انتظام مسلح افواج کے پاس تھا۔ پاکستان اور بھارت میں جونیئر افسروں کو جلد ترقیاں ملنے سے فوجی اداروں کی مجموعی استعداد پر بھی اثر پڑا۔ پاکستان میں تو یہ ستم بھی ہوا کہ فوج پر کوئی سیاسی کنٹرول بھی نہیں رہا۔ جس کے باعث خود فوج کے اعلیٰ افسران میں سیاسی آرزوئیں پروان چڑھنے لگیں۔ اس کے برعکس بھارتی سیاسی قیادت نے ایسے فیصلے کیے کہ فوج پر سیاسی اور سول بالادستی قائم رہے۔☆33

پاکستان میں نتیجہ یہ نکلا کہ فوج نے کمزور سیاسی طبقات کو ایک طرف ہٹا کر حکومت پر براہِ راست قبضہ کرلیا۔ پہلا ملک گیر مارشل لا 1958ء میں لگایا گیا اور اس وقت سے فوج سیاست میں اپنی بالادستی کو مسلسل مستحکم کر رہی ہے۔ ریاست کی ساٹھ سالہ تاریخ میں فوج چار مرتبہ براہِ راست اقتدار پر قبضہ کر چکی ہے اور اس نے یہ بھی سیکھ لیا ہے کہ جب حکومت پر براہِ راست قبضہ نہ ہو تو بھی کس طرح اپنی حاکمیت منوائی جاتی ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہر آٹھ دس سال کی سول حکومت کے بعد تقریباً ایک عشرے کے لیے فوجی حکومت آ جاتی

ہے۔ نتیجہ یہ کہ عوامی جمہوری معاشرہ اور سیاسی ادارے مسلسل کمزور رہتے ہیں۔

اس مضبوط حیثیت سے فوج کو یہ موقع ملا کہ وہ سیاست میں بھی سودمند ثمرات کے مزے اُڑائے۔ چنانچہ فوجی انتظامیہ ایک ایسے بالادست طبقے میں تبدیل ہوگئی جو سماج، سیاست اور معیشت میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ مسلح افواج کی اپنی عادات و اطوار، کاروباری روایات اور قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ اُن کے مستحکم معاشی مفادات ہوتے ہیں اور وہ اپنے اداروں میں گھسنے کی کوشش کرنے والوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اگرچہ مسلح افواج کے افراد سول انتظامیہ میں عہدے حاصل کرسکتے ہیں، لیکن کسی سویلین ادارے کا کوئی فرد مسلح افواج میں عہدہ حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ان پابندیوں کی ایک وجہ تو فوج کا پیشہ ورانہ کردار ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فوج اپنے اداروں میں داخلے کے دروازے بڑی چابک دستی سے بند رکھتی ہے۔

1977ء کے بعد مسلح افواج نے اس بات کی منظم کوششیں کیں کہ خود کو ایک آزاد، پیشہ ورانہ اور سماجی طبقہ بنالیں جو ملک کے دیگر بالادست طبقات کی طرح اپنے مفادات کے لیے کام کرسکے۔ اس طرح فوج ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہونے کے علاوہ سیاسی طور پر سب سے زیادہ بااثر طبقہ بھی بن گئی جس نے 1985ء میں ایک سول حکومت کو متنازع آئینی ترمیم کرنے پر مجبور کردیا۔ اس ترمیم کی رو سے صدر کو پارلیمنٹ تحلیل کرنے کا اختیار مل گیا جس کی مدد سے ایک قانونی آلۂ کار فوج کے ہاتھ آ گیا تاکہ سول حکومتیں برطرف کی جاسکیں۔ اس کے بعد پرویز مشرف کی فوجی حکومت نے 2004ء میں قومی سلامتی کونسل بناکر فوج کی طاقت میں بے تحاشا اضافہ کردیا تاکہ وہ اپنے مفادات کا ہر طرح سے دفاع کرسکے۔

قومی سلامتی کونسل قائم کرنے کی بات 1977ء کے بعد بار بار اٹھائی جاتی رہی۔ ترکی اور چلّی کی طرز پر قائم کی جانے والی اس پاکستانی کونسل نے مسلح افواج کو سیاسی اور سول سوسائٹی میں ایک بڑا کردار سونپ دیا۔ اس کتاب میں دیے جانے والے دلائل میں ایک یہ بھی ہے کہ فوجی اشرافیہ کے معاشی مفادات اور اُن کی مالیاتی خودمختاری نے اس ادارے کی آزادانہ حیثیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خودمختاری معاشی طاقت نے اعلیٰ افسران کے اعتماد ہی میں اضافہ نہیں کیا بلکہ انھیں احساسِ برتری سے بھی ہم کنار کیا۔ اس طرح ایک ایسی فوج جو اپنے ''بوناپارٹی'' رجحانات سے

مشہور ہے اگر اُسے سیاسی و معاشی آزادی بھی مل جائے تو ایک بڑا مہلک مرکب وجود میں آتا ہے۔

پاکستان میں مسلح افواج کی اندرونی معیشت اور سیاست میں نمایاں حیثیت کے تعلق پر مطالعہ اور تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی بات اُن اکثر ممالک پر بھی صادق آتی ہے جہاں فوج کا معاشی کردار نمایاں ہو۔ تحقیق کم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ اس امر میں دل چسپی نہیں لیتے۔ اس موضوع پر مسلسل تحقیق نہ ہونے کی تشریح چار طرح سے کی جاسکتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ پاکستان کی معیشت، سیاست اور سول فوجی تعلقات کے مبصرین نے روایتی طور پر دفاعی بجٹ کو فوجی سرمایے کا بنیادی جُز سمجھا ہے۔ ویسے بھی پاکستان کی دفاعی معیشت پر بہت کم تجزیے کیے گئے ہیں۔ چونکہ قومی سلامتی کے معاشی پہلو شفاف نہیں ہیں اس لیے سیاسی ماہرین شاذ و نادر ہی اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ معروف مؤرّخ عائشہ جلال نے فوج کی سیاسی معیشت پر نظر ڈالی ہے مگر وہ دفاعی بجٹ سے آگے نہیں گئیں۔☆34 حال ہی میں حسن عسکری رضوی نے بھی فوجی کاروبار پر گفتگو کی ہے مگر تفصیلی نہیں۔☆35 ایسا بنیادی طور پر اعداد و شمار کی کمی کے باعث ہوتا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے فوج کی کاروباری سرگرمیاں بڑے غیر محسوس طریقے سے بڑھتی ہیں۔ گو کہ فوج کی اندرونی معیشت 54-1953ء میں قائم ہوگئی تھی لیکن اس کے بعد دفاعی بجٹ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ 1977ء میں تیسرا مارشل لا لگانے کے بعد فوج نے اپنے معاشی مفادات کو پھیلانے میں بڑے تسلسل سے کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی فوج کو سول سوسائٹی اور دیگر تمام سیاسی فریقین کے متوازی ایک اہم فریق کی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔

مسلح افواج کے ان دعووں کے برعکس کہ جمہوریت مضبوط کرنے کے لیے قومی سلامتی کونسل ضروری ہے، درپردہ خواہش یہ ہے کہ فوج کو ایک ایسی آزاد حیثیت دے دی جائے جس میں وہ حکمران طبقے کے دیگر ارکان کی طرح اپنے مفادات کی نمائندگی اور تحفظ کر سکے۔ جیسے جیسے دفاعی انتظامیہ کو حکومت اور سیاسی اقتدار کا تجربہ ہوتا گیا ویسے ہی اس کے معاشی مفادات بھی پھیلتے گئے۔ ہر فوجی حکومت نے اپنے افرادِ کار کو پچھلی فوجی حکومتوں کی نسبت زیادہ فوائد بہم پہنچائے اور اپنے افسران کے ذاتی مفادات کا زیادہ خیال رکھا۔ ہر فوجی حکمران خود اپنی بقا (اور

قانونی جواز) کے لیے فوج کے دیگر اعلیٰ افسران کو نوازنے پر مجبور ہوتا ہے تاکہ وہ وفادار رہیں اور افواج میں سپہ سالار کا حکم مقدس رہے۔ فوجی افسران کو زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر مراعات دینے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فوجی حکمران اس کا ایک جواز یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ چونکہ سویلین قیادت مسلح افواج کو کمزور کر کے تباہ کرسکتی ہے اس لیے مراعات دینے سے فوجی ادارے کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہوں گے۔ زیادہ مالیاتی خودمختاری بھی فوجی اداروں کی طاقت کا اظہار ہوتی ہے۔

اس موضوع پر تحقیق نہ ہونے کی تیسری تشریح کا تعلق فوجی سرمایے کی بابت رازداری ہے۔ چونکہ فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا بنیادی مقصد اعلیٰ افسران کو فائدے پہنچانا ہوتا ہے، اس لیے مسلح افواج متعلقہ معلومات بہت خفیہ رکھتی ہیں۔ ترک مسلح افواج کی طرح پاکستان کی فوج بھی اپنے مفادات کی کڑی نگرانی کرتی ہے ور دفاعی بجٹ یا فوجی کاروبار پر کسی سنجیدہ گفتگو کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔ غیر فوجی افراد کی فوجی کاروبار سے متعلق معلومات تک رسائی نہیں ہوتی کیوں کہ ان معلومات کو عام نہ کرنے کے لیے فوج کو ضروری قانونی استثنا حاصل ہوتا ہے۔ فوج کی چاروں فاؤنڈیشنز ایسے قوانین کے تحت رجسٹرڈ ہیں جو انھیں نجی اداروں کے زمرے میں لاتے ہیں اور جن کا سرکاری آڈٹ نہیں ہوسکتا۔ اس قانونی استثنا کے باعث حکومت اور آڈیٹر جنرل کا شعبہ کسی بے قاعدگی یا بدعنوانی کی صورت میں بھی کوئی قدم اٹھانے سے قاصر رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک کی ساٹھ سالہ تاریخ میں سیاسی قیادت یا سول سوسائٹی نے فوج کو اپنے معاشی مفادات پھیلانے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف حال ہی میں سیاسی حزبِ اختلاف کے کچھ ارکان جیسے سینیٹر فرحت اللہ بابر اور شیری رحمان نے فوج کی معاشی سلطنت پر سوالات اٹھائے ہیں۔ اس سے قبل سیاسی قیادت نے یا تو فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو کسی خطرے کا باعث نہیں سمجھا یا پھر اس لیے نظرانداز کیا کہ کہیں جنرل بہت زیادہ خفا نہ ہوجائیں۔ اس طرزِ عمل کا منطقی جواز یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ چونکہ فوجی کاروبار کو فوج کے مفادات میں مرکزی حیثیت حاصل ہوچکی ہے اس لیے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں۔ مسلح افواج کو معاشی ترغیبات دینے کا مقصد

یہ تھا کہ جنرل خوش اور وفادار رہیں اور حکومتوں کو پریشان نہ کریں۔ یہ حقیقت نظر انداز کر دی گئی کہ مالیاتی خودمختاری سے فوج سیاسی، تنظیمی اور نفسیاتی طور پر بہت مستحکم ہو جائے گی۔

ایسی مالیاتی خودمختاری کے باعث فوج دیگر فریقین کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہوگئی۔ چونکہ منافع بخش سرگرمیوں میں ملوث فوج کو وسائل درکار ہوتے ہیں جو اس کا بنیاد کردار نہیں ہے، لہٰذا وہ آزادانہ طور پر وسائل حاصل کرنے میں پُر اعتماد ہو جاتی ہے۔ جس کے لیے پہلے اسے حکومت یا نجی شعبے کا محتاج ہونا پڑتا تھا۔ فوجی حلقوں میں یہ خیال بڑا مقبول ہے کہ اُن کے کاروباری منصوبے جتنے اچھے چل رہے ہیں اتنے نہ تو سرکاری شعبے کی صنعتیں چل رہی ہیں اور نہ ہی سول افسروں یا نجی شعبے کے تحت کاروبار۔ تاہم یہ ایک خیالِ خام ہی ہے۔ اس کتاب میں فوج کے زیرِ انتظام چلنے والی تجارتی سرگرمیوں کی نااہلی کو ٹھوس بنیادوں پر ثابت کیا گیا ہے۔ سیاست میں فوجی اثر ورسوخ کی قیمت قومی وسائل پر بہت بھاری پڑتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ پاکستان کی سیاسی قیادت نے فوج کی سیاسی و معاشی آرزوؤں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کتاب میں بھی ہمارا استدلال یہی ہے کہ سیاست دانوں نے مسلح افواج کے سیاسی اثر ونفوذ کو روکنے کی کوئی پُر جوش کوشش نہیں کی۔ فوج کو ایسا سیاسی ثالث سمجھا جاتا ہے جو متحارب سیاسی گروہوں کے درمیان سمجھوتا کرا سکے۔ فوج کے ساتھ سیاسی قیادت کا اصل مسئلہ صرف فوج کی سیاست میں شمولیت نہیں بلکہ ریاست پر اس کی بالادستی بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ فوج کی انتظامی قوت کو ایک حکمران طبقہ دوسرے کے خلاف استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

وہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے وزرائے اعظم جیسے ذوالفقار علی بھٹو، نواز شریف اور بے نظیر ہوں یا معین قریشی اور شوکت عزیز جیسے بین الاقوامی ٹیکنوکریٹ، ان میں سے کسی نے بھی یہ سوال نہیں کیا کہ فوج کو قومی وسائل کا بڑا حصہ غصب کرنے کا کیا حق ہے؟ نہ ہی سیاست میں فوجی طاقت کے استعمال پر اعتراض کیا گیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کسی سویلین ادارے نے فوج یا حکومت میں اس کے کردار کو للکارا کیوں نہیں؟ اس خاموش تعاون کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ فوجی طاقت اور سیاسی قوت کا گہرا باہمی تعلق ہے۔ ملک کے دیگر بالادست طبقے

مفادات کے تحفظ کو باہمی طور پر سود مند سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی اجتماعی لوٹ مار ہے جسے مینکر اولسن (Mancur Olson) نے وسائل پر ڈاکا قرار دیا ہے۔☆36

اولسن کے مطابق ڈاکو دو طرح کے ہوتے ہیں: گشتی اور مقامی۔ گشتی یا آوارہ گرد ڈاکو کسی گاؤں یا قصبے سے زیادہ لوٹ مار کرتے ہیں۔ یہ گشتی ڈاکو لوٹ مار کر کے وسائل باہر لے جاتے ہیں جس کے بہت زیادہ منفی اثرات پڑتے ہیں اور رفتہ رفتہ مالِ غنیمت بھی کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔ مقامی یا ایک جگہ رہنے والے ڈاکو اپنی ہی بستی کو لوٹتے ہیں۔ ان کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ بستی والوں کو گشتی یا آوارہ گرد قسم کے ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے بھتا وصول کریں۔ اس طرح باہمی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک طرح کا سمجھوتا ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کا پاکستان پر اطلاق کریں تو سیاست دان اور دیگر بالا دست طبقے فوجی طاقت کو وسائل بٹورنے کا آلۂ کار سمجھتے ہیں جبکہ عام باشندے ان وسائل سے محروم رہتے ہیں۔ یہ رویہ معاشرے یا حکمران طبقے کے جاگیردارانہ رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ پاکستانی فوج بھی اسی طرح کے فیوڈل رویوں کا اظہار کرتی ہے۔ یہ ایک جدید ادارہ ہونے کا دعویٰ تو بے شک کرتی ہے لیکن اپنے رویوں میں فیوڈل اور مطلق العنان نظر آتی ہے۔

چونکہ فوج اور دیگر بالا دست گروہوں کا دار و مدار ایک دوسرے پر ہے اس لیے بہت سے سیاسی رہنما اور کاروباری لوگ فوجی حکومتوں کو اپنے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ ملکی تاریخ میں اکثر سیاست دان اور بہت سے بیوپاری فوج کے کارخانوں سے ہی ڈھل کر میدان میں آئے ہیں۔ فوج اور دیگر بالا دست طبقے اپنی حریصانہ خواہشوں کی تکمیل میں ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں جس کے بھیانک نتائج معاشرے کو بھگتنے پڑتے ہیں، مثلاً طبقۂ اعلیٰ کو زمین کے خطے تقسیم کرنے سے بے زمین کسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسی طرح دیگر بنیادی وسائل کی تقسیم بھی مراعاتِ یافتہ طبقے کے مفاد میں کی جاتی ہے اور عام لوگ محروم ہی رہ جاتے ہیں۔ سندھ میں ماہی گیروں اور اوکاڑہ میں بے زمین کسانوں کے ساتھ فوج اور نیم فوجی دستوں کا برتاؤ وسائل پر فوجی قبضے کی مثالیں ہیں۔ ان دونوں مقامات پر فوج اور نیم فوجی دستوں نے وسائل پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے مقامی باشندوں سے واقعتاً لڑائی کی۔ اس طرح کے

واقعات سے معاشرے میں بڑا عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔

اس اجتماعی لوٹ مار کے باوجود غیر فوجی اشرافیہ نے فوج کے اثر و رسوخ کو کبھی نہیں للکارا۔ سیاست دانوں کی اکثریت اقتدار میں آنے کے لیے مفروضہ خطرات سے بچنا چاہتی ہے۔ پھر فوج اپنے جواز کے لیے بھارتی خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے۔ اور دفاع کے نام پر بھاری اخراجات حاصل کرتی ہے اور کہیں سے کوئی سنجیدہ صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔

ساٹھ سال کے عرصے میں قومی سلامتی بھی کسی مذہبی عقیدے کی طرح ایک کٹر نظریہ بن چکی ہے۔ صحافی، سیاست دان، انسانی حقوق کے علم بردار اور سول سوسائٹی کے دیگر ارکان جو فوج کے سیاسی و معاشی غلبے سے اتفاق نہیں رکھتے انھیں جبراً خاموش کرادیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ مسلح افواج کی بالادستی کے خلاف کوئی منظّم احتجاج سامنے نہیں آتا۔

معاشرے کو سیاسی خاموشی کی بھی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ جب کوئی للکارنے والا نہ ہو تو فوجی طاقت مزید مستحکم ہو جاتی ہے۔ جس سے سویلین اداروں کی کمزوری میں اضافہ ہوتا ہے۔ کمزور اداروں کے باعث ریاست اور سماج مزید منتشر ہو جاتے ہیں اور سماجی و معاشی ترقی کے لیے ماحول سازگار نہیں رہتا۔ اقربا پروری اور طفیلی رشتوں کے اس ماحول میں پاکستانی جمہوریت کیسے پروان چڑھ سکتی ہے؟ انڈونیشیا اور ترکی جیسے ممالک میں بھی صورتِ حال کم و بیش ایسی ہی ہے۔

اکتوبر 1999ء میں آنے والی پاکستان کی فوجی حکومت بھی جمہوریت بحال کرنے کے دعوے اور وعدے تو بے شک کرتی تھی لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بھی پچھلی فوجی حکومتوں سے مختلف نہیں تھی اور سویلین اداروں کو مضبوط نہیں ہونے دے رہی تھی۔ دیگر عوامل کے علاوہ فوج کی اندرونی معیشت بھی فوج کو اپنا رویہ تبدیل کرنے سے روکتی ہے۔ سیاسی اقتدار کے ثمرات سمیٹنے کے بعد مشرف اور ان کے ساتھی جنرل ایک ''گائیڈڈ'' یا زیر دست جمہوریت ہی لائیں گے جس میں اُن کے مسلّمہ مفادات بعینہٖ برقرار رہیں۔ ایک مضبوط سیاسی نظام احتساب اور شفافیت کا تقاضا کرتا ہے جو فوج اور اشرافیہ دونوں ہی کو قبول نہیں۔

کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ پاکستان میں جمہوریت محض ایک خواب ہی رہے گی؟

ہمارے خیال میں ایسا ضروری نہیں۔ لیکن جمہوریت کے استحکام کی تدبیر یہی ہوسکتی ہے کہ اندرونِ ملک ایک مضبوط تحریک چلے جسے بیرونی حمایت بھی حاصل ہو۔ آخر لاطینی امریکا میں بھی تو فوجی اثر ورسوخ کو کم کیا جا چکا ہے۔ چلی، ہونڈوراسس اور نکارا گوا کی افواج بھی بڑی معاشی سلطنتوں کی حامل تھیں لیکن پھر بھی انھیں واپس بیرکوں میں دھکیل دیا گیا۔ بہرحال لاطینی اور جنوبی امریکا کے سیاسی نظاموں میں تبدیلی کا باعث داخلی جدوجہد بھی تھی اور امریکا اور بین الاقوامی برادری کا دباؤ بھی۔ یہ بات واضح ہے کہ داخلی سیاسی ماحول نے امریکا کو مجبور کیا کہ وہ ان ممالک میں حزبِ اختلاف کی مدد کرے تاکہ امریکی مفادات کے لیے اہم خطے میں تبدیلی آسکے۔ کمیونزم کے خطرے نے امریکا کو مجبور کیا کہ وہ اپنے گردونواح میں نئے تعلقاتِ کار کی حوصلہ افزائی کرے۔ چنانچہ چلی میں فوج کو نیشنل سیکورٹی کونسل کے اختیارات کم کرنا پڑے اور کئی سیاسی و معاشی مراعات سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس طرح لگتا ہے کہ پاکستان میں بھی یہی راستہ ہوگا کہ عوام ایک مضبوط سیاسی تحریک چلائیں جس کا مقصد کسی کی بھی مطلق العنانیت اور فوج کی بالادستی کا خاتمہ ہو۔ ایسی تحریک کے لیے داخلی سیاسی قوتوں کی مدد میں بیرونی دباؤ بہت کارآمد ہوگا۔

کتاب کا خاکہ

اس کتاب میں پیش کی جانے والی تحقیق کی نوعیت تفتیشی بھی ہے اور تجزیاتی بھی۔ پاکستانی فوج کی اندرونی معیشت کے بارے میں کچھ نئی معلومات کے ذریعے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں معلومات کی عدم دستیابی شروع میں بڑی پریشان کُن تھی۔ 2000ء کے ایک مقالے میں پیش کی جانے والی تحقیق اور چند پاکستانی اور امریکی اخبارات میں چھپنے والے مضامین کے علاوہ بہت کم تحریریں دستیاب تھیں۔[☆37]

یہ موضوع حساس ہونے کے باعث اس پر تحقیق خطرے سے خالی نہیں۔ اس بات کو ایک بار پھر بتانا ضروری ہے کہ فوج اپنے مفادات کے بارے میں معلومات کو بہت پوشیدہ رکھتی ہے۔ دفاعی بجٹ اور ڈھکی چھپی معیشت ہی مسلح افواج کی طاقت اور مفادات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

جنرل مشرف کی حکومت نے ذرائعِ ابلاغ کو بڑی چالاکی سے قابو میں کیا ہوا تھا۔ جس کے باعث صحافی فوج کے معاشی مفادات کی چھان بین کرنے سے گریز کرتے تھے۔

مشرف حکومت جزا اور سزا دونوں طریقوں سے ذرائع ابلاغ کو قابو میں رکھے ہوئے تھی۔ تاہم 2002ء کے بعد پارلیمنٹ میں حزبِ اختلاف نے جو سوالات پوچھے اُن سے اس موضوع پر کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ پھر بھی یہ ممکن نہیں ہوسکا کہ فوج کی اندرونی معیشتؒ کے اصل حجم کے بارے میں مکمل معلومات دی جاسکیں۔ اس کتاب میں بہت زیادہ اعداد وشمار دینے کے بجائے کیفیتی (Qualitative) تجزیے پیش کیے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ فوج کی اندرونی معیشت کے ڈھانچے کو واضح کیا جائے تا کہ فوجی کاروبار پر مستقبل میں ہونے والی تحقیق میں مدد مل سکے۔ اس کتاب میں فوجی سرمایے کی مالیت کا اندازاً تخمینہ بھی دیا گیا ہے اور معیشت پر اس کے اثرات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

میں نے اس کتاب کے لیے تحقیق میں بنیادی اور ثانوی دونوں ذرائع استعمال کیے ہیں۔ تحقیق کے دوران مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذرائعِ ابلاغ اور سول سوسائٹی فوج کی معاشی سلطنت کا پردہ چاک نہیں کرتی تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جو معلومات میسر ہیں اُن سے بھی ممکنہ فائدہ نہیں اٹھایا جاتا، مثلاً کمپنیوں کی سالانہ مالیاتی رپورٹیں۔

پاکستانی فوج کی چاروں فاؤنڈیشنز کے جن 96 منصوبوں کا ذکر میں نے کیا اُن میں سے صرف نو سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن میں رجسٹر ہیں۔ اس کتاب کے لیے انھی نو فوجی کمپنیوں کی رپورٹوں کے علاوہ اخباری رپورٹیں بھی ثانوی معلومہ مواد (Data) کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔

اس کتاب ے لیے سو افراد کے انٹرویو کیے گئے جن میں کاروباری لوگ، سیاست دان، ریٹائرڈ فوجی افسران اور سیاسی و دفاعی تجزیہ نگار شامل تھے۔ بعض اہم معلومات جن لوگوں نے فراہم کیں اُن کے کوائف عیاں نہیں کیے جاسکتے۔ فاؤنڈیشنز کے موجود اور سابق افسران کے انٹرویوز سے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔

اگرچہ اپنی گفتگو میں انٹرویو دینے والوں نے بڑے محتاط انداز میں انکشافات کیے لیکن پھر بھی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ سیاست اور معیشت میں فوج کی شمولیت کو کس طرح

دیکھتے تھے۔ یہ امر بھی باعثِ تعجب نہیں کہ زیادہ تر سابق فوجی افسران فوج کے کاروبار کے میں ملوث ہونے سے یکسر انکار کرتے ہیں۔

دراصل ''فوجی کاروبار'' کی تعریف کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ فوجی کارپوریشنز، افسر شاہی، مطلق العنانیت اور سول فوجی تعلقات پر موجود تحریروں سے ''فوجی کاروبار'' کی تعریف اخذ کرنا آسان کام نہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ کوئی ایک تعریف وضع کیے بغیر اس اندرونی معیشت کا تجزیہ ممکن نہیں۔ 2005ء میں جب پاکستان میں ''فوجی کاروبار'' پر پارلیمانی بحث ہورہی تھی تو ایک واضح تعریف کی کمی کے باعث سیاسی حزبِ اختلاف کے لوگ اپنا مُدعا صحیح طور پر بیان نہ کرسکے۔ حزبِ اختلاف کے ارکان نے بڑی کوشش کی کہ فوج کی تجارتی سرگرمیوں کو نشانہ بنائیں مگر چونکہ فوج کی پوشیدہ معیشت کی حدود کا تعین کرنا ہی مشکل تھا اس لیے کوئی بڑی معنی خیز بات نہ کی جاسکی۔ اس کتاب میں اس موضوع پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب میں کل دس باب ہیں۔ پہلا باب فوجی کاروبار اور سول فوجی تعلقات کے بارے میں ہے۔ بنیادی مؤقف یہ ہے کہ زیادہ تر افواج کسی نہ کسی طرح کے فوجی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں۔ البتہ معیشت اور سماج میں فوج کے سرایت کرنے کا انحصار اس کی سیاسی طاقت اور دیگر سماجی وسیاسی فریقین سے اس کے تعلق پر ہوتا ہے۔

پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ سول فوجی تعلقات کی نوعیت چھ مختلف اقسام کی ہوسکتی ہے۔ ان تمام اقسام میں فوج کے مفادات اور اُس کے پھلنے پھولنے کا دارومدار اس امر پر ہوتا ہے کہ خود ریاستی ادارے کتنے مستحکم ہیں۔ پہلی دو اقسام کے سول فوجی تعلقات اُن ریاستوں میں پائے جاتے ہیں جہاں سیاسی قوتیں نسبتاً مضبوط ہیں۔ اُن کے بعد تین اور اقسام ہیں جہاں ریاستوں کی شناخت اُن کی سیاسی قوتوں کے بجائے فوجی طاقت سے ہوتی ہے اور آخری قسم وہ ہے جہاں فوج ریاست کی ناکامی سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ زیادہ تر افریقا میں پائی جانے والی یہ افواج دیگر جنگی رہنماؤں سے مل کر ریاستی اثاثے لوٹتی ہیں۔

دوسرے باب سے پاکستان کے ذکر کا آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ فوج کی سیاسی طاقت سے اس کے حریصانہ رویوں کا تعین ہوتا ہے اس لیے دوسرے باب میں ہم نے پاکستانی فوج کی

طاقت اور اس کے حریصانہ رویوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب کا عنوان ہے ''پاکستانی فوج میں افسر شاہی کا ارتقا (1977ء– 1947ء)'' اس میں ہم نے مسلح افواج کے بتدریج استحکام پر بحث کی ہے۔ یہاں مسلح افواج کے سیاسی ارتقا کے علاوہ اُن کو ملے ہوئے اختیارات، مختلف لسانی گروہوں کی فوج میں نمائندگی اور فوج کے انتظامی ڈھانچے سے بھی بحث کی گئی ہے۔

پاکستانی فوج ملک میں سب سے زیادہ مضبوط ادارہ ہے۔ فوج ریاست کے نجات دہندہ کے طور پر خود کو اعلیٰ استعداد کا حامل باور کراتی ہے اور اس کا آغاز 1947ء میں ملک کی آزادی کے فوراً بعد ہی ہوگیا تھا۔ بھارت کے ساتھ پہلی جنگ ہی سے ملک کے سیاسی راستے کا تعین ہوا۔ جب فوج کو ناکافی سویلین کنٹرول کے ساتھ ایک بڑی فوجی مہم شروع کرنے کی اجازت دی گئی تو فوج غیر معمولی حد تک نمایاں ہوگئی۔ اس کے بعد سے ہی بیرونی خطرے کو مسلح افواج کے جواز کے طور پر استعمال کیا جانے لگا اور پھر بیرونی خطرے میں اندرونی سلامتی کے معاملات کو بھی شامل کرلیا گیا۔ دیگر اداروں کی نگرانی نہ ہونے کے باعث فوج نے خود ہی قومی مفادات کا ذمہ لے لیا۔

فوج کی اہمیت بڑھانے میں ملک کے سویلین نمائندہ افراد نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ سول افسر شاہی نے فوج کو اپنی سیاسی طاقت میں اضافے کا ذریعہ سمجھا اور یہ نہیں سوچا کہ فوج خود بالادست ہوجائے گی۔ 1958ء میں مارشل لا کا مقصد بھی سول افسر شاہی کی حکمرانی کو مستحکم کرنا تھا۔ اس کے بجائے جاہ طلب فوجی قیادت نے حکومت پر خود قبضہ کرلیا۔ مسلح افواج کو مضبوط کرنے والے عوامل کئی تھے، جن میں سے سب اہم فوج کا اُن تین بالادست طبقوں سے تعلق تھا جن کی نشان دہی حمزہ علوی نے کی ہے۔

اس باب میں ہم نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ مسلح افواج کا ترکیبی مزاج شروع ہی سے فوجی حکمرانی کا جوہر رکھتا تھا۔ ابتدا ہی سے ان کا منشا نہیں تھا کہ سیاست چھوڑی جائے۔ اس لیے پہلے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان نے مسلم لیگ اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو دائمی قبضے کے لیے استعمال کیا۔ جنرل ایوب سے جنرل یحییٰ کو اقتدار کی منتقلی دوسرا فوجی انقلاب نہیں تھا بلکہ یہ

محض فوج اور ریاست کی اعلیٰ قیادت میں تبدیلی تھی۔فوج نے 72-1971ء تک سیاست جاری رکھی، جب بالآخر انھیں بھارت سے جنگ میں شکست کے بعد سیاست میں بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔

تیسرے باب کا عنوان ہے ''فوجی طبقے کا ارتقا 2005ء-1977ء''۔اس باب میں بھی فوج کی سیاسی طاقت میں اضافے کی بابت بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ فوجی افسران کے معاشی مفادات بڑھنے سے کس طرح فوجی برادری کی معاشی خودمختاری میں اضافہ ہوا اور کیسے انھیں دیگر فریقین کے مقابلے میں بالادست کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ 1972ء میں جمہوریت بحال کردی گئی مگر اس وقت تک فوج اس بات کو یقینی بنا چکی تھی کہ اقتدار شیخ مجیب الرحمان کے بجائے ذوالفقار علی بھٹو کو ملے جو فوج کے نسبتاً زیادہ قریب تھے۔ بھٹو اُسی جاگیردار اور فیوڈل طبقے کے نمائندے تھے جو ملک پر حکمران اشرافیہ کا حصہ تھا۔

تاہم فوج سیاسی نظام کو مکمل طور پر اپنے قابو میں نہ رکھ سکی۔ 1970ء کا عشرہ پاکستان میں عوامی سیاست کا زمانہ تھا جس نے عوام کو اپنے اختیارات کا کچھ احساس بہرحال دیا۔ بھٹو اپنے طبقاتی مفادات اور خود اپنی اقتدار پسندی کے باعث جمہوری اداروں کو مضبوط نہ کر سکے اور نہ ہی اپنے مقبول نعرے ''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں'' کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اس کے بجائے منتخب وزیراعظم نے مسلح افواج کی تعمیرِنو کی۔ نتیجہ یہ کہ فوج 1977ء میں ایوانِ اقتدار میں واپس آ گئی۔

اس کے بعد فوج کی اعلیٰ قیادت اپنے معاشی مفادات مستحکم کرنے اور اپنے اقتدار کو دوام دینے کے نئے راستے ڈھونڈنے لگی۔ تیسرے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے نیشنل سیکورٹی کونسل کے قیام کی بات شروع کی جس کا مقصد مسلح افواج کو اقتدار میں مستقل طور پر شامل کرنا تھا۔ گو کہ جنرل ضیاء کونسل قائم نہ کر سکے پھر بھی انھوں نے آئین میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے منتخب حکومت کو برطرف کرنے کا صدارتی اختیار حاصل کرلیا۔ یہی ترمیم 1990ء کے عشرے میں کئی سیاسی حکومتوں کی برطرفی کا باعث بنی۔

نیشنل سیکورٹی کونسل کے قیام کا منصوبہ بالآخر 2004ء میں چوتھے فوجی حکمران جنرل مشرف کے دور میں کامیاب ہوا۔ حالانکہ یہ کونسل ضیاء الحق کے دور میں موجود نہیں تھی لیکن پھر بھی فوج اتنی اہم حیثیت اختیار کر چکی تھی کہ 1988ء میں جہاز کے پُراسرار حادثے میں فوجی

آمر کی موت کے بعد بھی فوج کو پیچھے نہیں ہٹایا جاسکا، بلکہ سیاست دانوں نے فوج کے معاشی مفادات کو استحکام دینے میں اپنا کردار ادا کیا اور انھیں معاشی استحصال کے مواقع بہم پہنچائے گئے۔ مسلح افواج کے معاشی مفادات اور سیاسی خواہشات نے مل کرفوج کی حکمرانی کو اٹل بنادیا۔

چوتھے باب کا عنوان ہے ''فوجی کاروبار کا ڈھانچا'' اس میں پاکستانی فوج کی معاشی سلطنت کی تنظیمی ترتیب کو بیان کیا گیا ہے۔ یہاں فوج کی کمان اور اختیاریاتی ڈھانچے کی وضاحت کرتے ہوئے معاشی وسائل کے استحصالی طریقوں پر گفتگو کی گئی ہے۔فوج کی معاشی سلطنت تین سطحوں پر کام کرتی ہے: ایک تو فوج کی براہِ راست مداخلت، دوسرے اپنے ذیلی اداروں کے ذریعے معاشی استحصال اور تیسرے فوجی برادری کے افراد کومراعات کی فراہمی۔ انڈونیشیا میں بھی اس طرح اعلیٰ سیاسی قیادت فوجی اداروں کے ساتھ مل کر ملک کی معیشت کا استحصال کرتی ہے۔

پانچویں باب کا عنوان ہے''فوجی کاروبار کے ابتدائی برس 1977-1954ء۔'' 1950ء کے عشرے کے وسط سے ہی مسلح افواج نے زراعت، صنعت اور مختلف خدمات کی صنعتوں میں اپنے اثرات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اُن 23 برسوں کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا 1954ء سے 1969ء اور دوسرا1969ء سے 1977ء۔ان ادوار میں اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئیں۔

پہلے سولہ سال میں مسلح افواج نے بتدریج سیاست اور معیشت میں قدم جمائے۔ اگلے چھ برسوں میں ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت کی شکل میں ایک جمہوری وقفہ آیا۔ صرف اس دور میں ہی فوجی کاروباری تیزی سے نہیں پھیلا کیوں کہ مسلح افواج کی خودمختاری پر کچھ سیاسی روک ٹوک موجود تھی۔ پھر بھی بھٹو فوج کی سیاسی و مالیاتی خودمختاری پر کچھ زیادہ پابندی نہ لگا سکے کیوں کہ وہ خود اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے فوجی طاقت پر انحصار کررہے تھے۔

چھٹے باب کا عنوان ہے''فوج کی کاروباری سرگرمیوں میں توسیع 2000ء– 1977ء۔'' اس عرصے میں فوج کی اندرونی معیشت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ 1977ء میں تیسرے مارشل لا کے نفاذ کے بعد فوج نے اپنے معاشی مفادات کے تحفّظ کے لیے کئی نئے منصوبے شروع کیے جن میں نئے ادارے بھی شامل تھے جیسے شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن۔

ناپائیدار جمہوریت کے دس سال میں فوج کے معاشی کردار کو مزید تقویت ملی۔ 1988ء سے 1999ء کے دوران سیاسی حکومتوں نے مسلح افواج کے تعاون کے بدلے انھیں مزید معاشی فوائد بہم پہنچائے۔ اس عرصے میں فوج مالیاتی اور بینکاری کے شعبوں میں وارد ہوئی۔ اسی دور میں فوج کے معاشی مفادات میں مزید توسیع ہوئی اور استحکام آیا اور جب 1999ء میں فوج نے چوتھی بار اقتدار غصب کیا تو دفاعی انتظامیہ کی سماج میں سرایت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

ساتویں باب کا عنوان ہے ''نئے جاگیردار''— اس باب میں شہری اور دیہی زمینوں پر مسلح افواج کے قبضے کی داستان رقم ہے۔ پاکستان کا بنیادی مسئلہ وسائل اور خاص طور پر زمین کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ صرف چند لوگوں کے پاس بڑی بڑی زمینیں ہیں جبکہ تین کروڑ بے زمین کسان اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور بالادست طبقات جن میں فوج بھی شامل ہے، صورتِ حال میں مساوات لانے کے بجائے مزید زمین کے خطوں پر قبضے میں مصروف ہیں۔

برطانوی دور میں یہ روایت تھی کہ فوج کو مخصوص مقاصد کے لیے زمین کے خطے دیے جاتے تھے۔ پاکستان میں اس روایت کو فوج کے اعلیٰ افسران کے مفاد میں باقی رکھا گیا ہے۔ ریاست اور فوج کے جاگیردارانہ رویے کا اظہار زمین کی غیر منصفانہ تقسیم سے بھی ہوتا ہے اور پانی جیسے اہم وسائل پر اجارہ داری سے بھی۔ گوکہ فوجی افسران کے علاوہ عام سپاہیوں کو بھی زمین کے خطے ملتے ہیں مگر عام سپاہیوں کو زرعی زمین کاشت کاری کے قابل بنانے کے لیے پانی نہیں ملتا۔ یہ سہولت صرف اعلیٰ افسران کو ملتی ہے اور وہ یہ مراعات لے کر سویلین جاگیرداروں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ شہری زمین کی تقسیم سے بھی مراعات یافتہ طبقے کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شہریوں کو سر چھپانے کی جگہ فراہم کرنے کے بجائے حکومتیں مسلح افواج اور دیگر بالادست طبقات کو سونے جیسی زمین کوڑیوں کے مول بیچ دیتی ہیں۔

خود فوج سمجھتی ہے کہ ان مراعات سے کسی کا استحصال نہیں ہوتا بلکہ صرف اُس کے افراد کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ آٹھواں باب اسی بارے میں ہے جس کا عنوان ہے ''فوج کو مراعات یا فلاح و بہبود''۔ حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجیوں کی فلاح و بہبود کے پروگرام چلانے کا مقصد فوجی ملازمت کو صحت مند شہریوں کے لیے پُرکشش بنانا ہے۔ اس قسم کے فلاح و بہبود کی اپنی

سیاست ہوتی ہے۔ ایک سطح پر رفاہی اقدام کا فائدہ اثر ورسوخ والوں کو زیادہ ہوتا ہے یعنی اعلیٰ افسران کو عام فوجیوں کے مقابلے میں زیادہ فائدے ملتے ہیں۔ ایک اور سطح پر وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ ملازمت دینے کی بے سروپا حکمتِ عملی ہے جو چھوٹے صوبوں اور لسانی اقلیتوں کے خلاف معاندانہ رویہ رکھتی ہے۔ اس سے ملک میں موجود لسانی تناؤ میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

نویں باب کا عنوان ہے ''فوجی کاروبار کی لاگت'' اور اس میں فوج کی اندرونی معیشت کی مالیاتی لاگت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہاں دیے جانے والے اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کی تجارتی سرگرمیاں مالیاتی طور پر اُتنی اچھی نہیں جتنا کہ اُن کے بارے میں فوج دعویٰ کرتی ہے۔ فوج کے چند بڑے کاروباری اور ذیلی اداروں نے مشکل مالی حالات میں سرکاری مدد لے کر خود کو باقی رکھا ہے اور قومی خزانے پر بوجھ ڈالا ہے۔ فوج کے اس دعوے کے باوجود کہ اس کے کاروبار نجی شعبے میں ہیں، کئی فوجی کمپنیاں سرکاری وسائل استعمال کرتی ہیں جس سے منڈی میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے اور فوجی کاروبار کی لاگت میں اضافہ ہوتا ہے۔ فوج کی ان سرگرمیوں سے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔

دسویں باب کا عنوان ہے ''فوجی کاروبار اور پاکستان کا مستقبل''۔ اس باب میں فوجی معیشت کے فوجی استعداد پر اثرات اور ریاستی سیاست پر بحث کی گئی ہے۔ اس آخری باب میں ہونے والی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ فوجی کاروبار سیاسی وسماجی دونوں لحاظ سے بہت مہنگا پڑتا ہے۔ سیاسی طور پر یہ فوج کی جاہ طلبی بڑھاتا ہے۔ اتنے وسیع مفادات رکھنے والی فوج کی بالادستی ختم نہیں کی جاسکتی۔ فوج کی بالادستی کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ملک کے اندر اہم تبدیلیاں ہوں یا پھر بین الاقوامی جغرافیائی وسیاسی حالات مسلح افواج کو سیاسی اقتدار چھوڑنے پر مجبور کردیں۔

سماج میں فوج کی مصلح ومحافظ کی حیثیت کا تاثر ختم ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ محروم طبقات کی محرومیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ فوج کی معاشی سرگرمیاں اُسے معاشی استحصال میں بحیثیت ادارہ ملوث دکھاتی ہیں جس سے فوج کے کردار پر اثر پڑتا ہے۔ ایسی معیشت فوج کی ماہیت بدل کر اُسے ایسے ادارے کے طور پر سامنے لاتی ہے جو خصوصاً اپنے اعلیٰ افسران کے

لیے مالی مراعات کے حصول کے لیے فوجی قوت کو بروئے کار لاتا ہے۔ دیگر بالادست طبقات کی ناانصافیوں سے متاثر عام لوگ ایسی صورت میں فوج کی طرف سے کسی مصلح اور انصاف پسندانہ کردار سے ناامید ہوجاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاست معاشرے کے افراد کو کچھ اور انتہا پسندانہ نظریات کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ پاکستان، ترکی اور انڈونیشیا میں مذہبی قدامت پسندی میں اضافہ محض ایک اتفاق ہے یا ان تینوں ممالک میں مسلح افواج کے کردار کی تبدیلی کا اس صورتِ حال سے کوئی تعلق ہے؟

باب-1

فوج کی کاروباری سرگرمیاں — ایک تناظر

اس کتاب کے تعارفی باب میں ہم نے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے اسے فوجی افسروں کا ایک مشغلہ قرار دیا تھا۔ جیسا کہ واضح کیا گیا ہے کہ فوجی معیشت کا یہ پہلو سرکاری اور نجی سرمایے اور وسائل کو افراد کے اختیار میں دینے کی وضاحت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کارروائی کی کہیں نشان دہی کی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی دستاویزی ثبوت چھوڑا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے فوج کے اثر و رسوخ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں تو بہت سے ممالک میں مسلح افواج کاروباری سرگرمیوں میں ملوث ہوتی ہیں لیکن معیشت میں فوجی اثر ونفوذ کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کسی ملک کی سیاست وحکومت پر کس حد تک فوج کے اثرات ہیں اور سول انتظامیہ اور وہاں کی فوج کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔

اس باب میں ہم سول انتظامیہ اور فوج کے تعلقات کی چھ مختلف صورتوں کے حوالے سے بات کریں گے جن میں سے ہر ایک کا انحصار ریاست کی سیاسی قوت پر ہوتا ہے۔ یہاں پیش کیا جانے والا نظریاتی خاکہ ایک ایسی ریاست کو محورِ نگاہ بناتا ہے جو سیاسی طور پر مستحکم بھی ہو اور اپنے کثیر المزاج رجحانات کے حوالے سے پہچانی جاتی ہو۔ کسی ریاست اور سماج میں فوج کا اثر و نفوذ، مداخلت اور بالادستی دراصل اُس کے سیاسی نظام کے استحکام پر منحصر ہوتی ہے۔ ناقص سیاسی صورتِ حال دراصل کمزور تر ریاست کی علامت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں افواج معیشت،

سیاسی اور سماجی نظام میں ہر سطح پر مداخلت کرتی رہتی ہیں۔ سول انتظامیہ اور فوجی تعلقات کے جو خاکے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں اُن کی مدد سے فوج کے معاشی استحصال کے ہتھکنڈوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ گو کہ تمام افواج زیادہ سے زیادہ وسائل کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں مگر کسی بھی ریاست میں اُن کے استحصالی رویے اُن کے سیاسی اثرات کے تحت ہی کارآمد ہوتے ہیں۔

سول فوجی تعلقات کا دائرۂ کار

علمِ سیاسیات میں ریاست ایک اہم موضوع ہے اور تجزیہ نگاروں نے اسے متعدد نقطہ ہائے نظر سے دیکھا ہے۔ ریاست کے اہم پہلوؤں میں اس کی ساخت، کارگزاری اور اپنا کردار نبھانے کی اہلیت بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ساخت کے نقطۂ نظر سے ریاست:

''ایک ایسا ادارہ ہوتی ہے جو انتظامیہ، مقنّنہ، افسر شاہی، عدلیہ، پولیس، فوج اور بعض صورتوں میں درس گاہوں اور عوامی اداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ریاست کوئی یک جہتی ادارہ نہیں ہوتا۔ اگر چہ بعض ریاستیں دوسروں کی نسبت زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔''☆1

انسانی جسم کی طرح ریاست کے بھی مختلف اعضا ہوتے ہیں جو اپنے مخصوص کام انجام دیتے ہیں۔ ریاستی ڈھانچے کے اجزا اور ان کی کارکردگی کے تعلق کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ یہ:

''طاقت کے مرکزی اداروں کا ایک پیچیدہ آلہ ہے جو قوت کے استعمال پر اجارہ داری رکھتا ہے، جائیداد کے حقوق کا تعین کرتا ہے اور اپنے زیردست علاقوں میں سماجی نظم و ضبط کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اسے بین الاقوامی طور پر ایک ریاست تسلیم کیا جاتا ہے۔''☆2

اسی طرح چارلس ٹِلی نے ریاستوں کے سات بنیادی کام بیان کیے ہیں:

- ریاست کا قیام
- جنگ جوئی
- تحفظ
- بازیابی
- عدالتی فیصلے

- تقسیم
- پیداوار☆[3]

ریاست سے متعلق تحریروں میں اس امر پر خاص توجہ دی گئی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی کتنی صلاحیت رکھتی ہے۔ سماج اور عوام سے تعلقات میں ریاست کو ایک ماورا (Supra) ادارے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو دیگر اداروں مثلاً خاندان، برادری، قبیلے اور منڈی کے مقابلے میں بالادستی رکھتا ہے۔☆[4] چنانچہ ریاست کی طاقت کا اندازہ سماجی خدمات کی استعداد سے لگایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ریاست کی صلاحیت کا اندازہ معاشرے پر اس کے اقتدار کے حوالے سے بھی کیا جاتا ہے۔

مختلف اداروں کے استحکام اور تعلقات سے ریاستی استعداد پر اثر پڑتا ہے اور اسی سے ریاست کی توانائی یا ناتوانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ہم ریاست کی استعداد کو فقط اس کی ذمہ داریاں پوری کرنے سے نہیں پرکھیں گے بلکہ مختلف فریقین سے تعلقات کو بھی جانچیں گے۔ وہ ریاستیں جہاں سیاسی اثر ورسوخ اور قومی وسائل کے حصول کے لیے فریقین گفت وشنید کرتے ہیں اُن ریاستوں سے بہتر سمجھی جاتی ہیں جہاں سیاسی گفتگو پر فوجی طاقت کے ذریعے قدغن لگائی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم ریاست کو یکساں رائے کا حامل یک جہت ادارہ نہیں سمجھتے بلکہ تعلقات کا ایک ایسا مجموعہ سمجھتے ہیں جو وسائل کی تقسیم کا تعین اپنی طاقت سے کرتا ہے۔☆[5]

دراصل فریقین کی طاقت، باہمی تعلقات اور اپنے مفادات کے سلسلے میں ان کی آزاد گفت وشنید کی صلاحیت سے ہی سیاسی طور پر مستحکم ریاست کا تعین ہوتا ہے۔ وسائل کی تقسیم کا انحصار فریقین کی سیاسی طاقت پر ہوتا ہے۔ وسائل کے حصول کے جدوجہد میں کھینچا تانی اور غیر یقینی کے باعث فریقین کے درمیان تناؤ کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔☆[6]

مختصر یہ کہ ریاست کی استعداد کا تعین مختلف مفاد برداروں کے باہمی روابط پر ہوتا ہے اور اسی سے وسائل کی تقسیم کا عمل آگے بڑھتا ہے اور ریاست اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔ ریاست کا بنیادی مقصد ایک ثالث کا ہوتا ہے جو فریقین کے باہمی تعلقات کو ایک مخصوص سمت میں ڈالے۔

چنانچہ ریاست کے نظریاتی مطالعے میں چار جہتیں واضح نظر آتی ہیں:

(الف) مفاد برداروں کی نوعیت اور ان کے مسابقتی مفادات

(ب) ریاست کی ساخت پر اُن کا اثر

(ج) ریاست کی استعداد کا تعین اور

(د) ریاست کا کردار

ان چاروں عناصر کی ترتیب بدل کر انھیں چار جہتی کی بجائے حلقہ وار بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اس تبدیلی سے کسی ریاست کا کردار اس کی استعداد کا تعین بھی کرسکتا ہے جس سے اس کی صلاحیت پر اثر پڑتا ہے اور اس سے مفاد برداروں کی نوعیت اور مفادات بدل بھی سکتے ہیں۔

بنیادی طور پر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ریاست کی طاقت کا انحصار صرف ذمہ داریاں پوری کرنے کی صلاحیت پر نہیں ہوتا بلکہ اس امر پر بھی ہوتا ہے کہ ریاست کس طرح تعلقات کے ضابطے بدل کر اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔☆[7] اس طرح ریاست صرف خاندان، برادری، قبیلے اور منڈی سے ماورا نہیں ہوتی بلکہ اس لیے بھی آگے چلی جاتی ہے۔☆[8]

ریاست پر اختیار حاصل کرنے کا کھیل سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ریاست اور سماج کے تعلقات میں مرکزی حیثیت مختلف فریقین اور ان کے مفادات کو حاصل ہوتی ہے اور ان کے مقابلے سے ہی ریاست کا تعیّن ہوتا ہے۔☆[9] اگرچہ تمام فریقین کو اُن کے مطلوبہ حصّے دینے کا کوئی بہترین کلیہ موجود نہیں پھر بھی ایسا سیاسی ماحول ضروری ہے جو صحت مند مقابلے کی اجازت دے۔ ایک جمہوری سیاسی نظام میں ریاست اپنے سرکاری فیصلوں پر لوگوں کو مجبور کرنے کی بجائے انھیں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مزید یہ کہ ایک اجتماعی سیاسی کلچر کے طفیل سول سوسائٹی بھی ریاست سے اپنے حقوق پر بات کرنے کے قابل ہوجاتی ہے۔ بعض مصنّفین ریاست کے استحکام کو سول سوسائٹی پر اُس کی بالادستی سے منسلک کرتے ہیں۔☆[10] بہرحال ہمارے خیال میں ریاست کا استحکام اور بالادستی کا تصوّر جو لاطینی امریکا کے سلسلے میں متعدد مصنّفین مثلاً گلر مواد ڈائل اور جوان لنز کا مرکزِ نظر تھا، کسی مضبوط ریاست کا کلیدی عنصر نہیں ہے۔☆[11] بلکہ یہ کسی ریاست کی اہلیت ہے کہ وہ متنوع کرداروں کو اجازت دے کہ اس مقصد کے لیے وہ ایک ریاست اور معاشرت کے رشتوں پر مبنی نسبتاً سطح میدان میں

کھیل سکیں جس کی بنیاد زیادہ رضا مندی پر ہو۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ریاست تسلّط اور رضا مندی دونوں ذرائع سے اپنے کام نکالتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نظریاتی خاکے میں ریاستی طاقت کا اندازہ اس امر سے لگایا جائے گا کہ ریاست اور سماج کے تعلقات جمہوری ہیں یا غیر جمہوری۔ ایک مستحکم جمہوریت اجتماعیت کو فروغ دیتی ہے اور مختلف مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ اس کے لیے کم ازکم ضرورت اس روایت کی ہوتی ہے کہ ملک میں متواتر جمہوری انتخابات ہوتے رہیں۔ یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح وہ ریاستیں اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہوجاتی ہیں جہاں فوج ریاست میں جوڑ توڑ کرتی ہے۔ انتخابات پر مبنی جمہوریت ایک ایسے سیاسی کلچر کا اظہار ہے جو اجتماعیت کو فروغ دیتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جمہوریت اور اجتماعیت کا مطلب ہے ایک ایسا ماحول جہاں مختلف فریقین سیاسی و معاشی مفادات کے متعلق مسلسل گفتگو کرسکیں اور جہاں فوج یا کوئی اور فریق دیگر فریقین کو مستقل طور پر دبا نہ سکے۔☆[12]

ورنہ اجتماعیت کسی ریاست میں اقتدار کے رشتے کی خوبیوں کو نقصان پہنچاتی ہے کیوں کہ یہ نمونہ ایک معاشی شگاف کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ہمارے نظریاتی خاکے میں ریاست پالیسی سازی کا بنیادی ادارہ ہے جو سول سوسائٹی کو سہولتیں فراہم کرتا ہے۔☆[13] مثلاً ریاست تحفّظ اور ترقی کی ضمانت دیتی ہے اور طبقاتی بالادستی کے آلۂ کار کے طور پر کام نہیں کرتی۔☆[14] سیاسی اجتماعیت جیسا کہ اس کا اظہار بنیادی جمہوری، سیاسی قانون میں ہوتا ہے، دو وجوہ سے ضروری ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ ریاست اور معاشرے پر فوجی قبضے کے خلاف ایک حفاظتی آلے اور ایک مضبوط گروہ کے قبضے کے طور پر کام کرتی ہے۔ سیاسی اجتماعیت کا اظہار جمہوری سیاسی حکومت کی شکل میں ہونا اس وجہ سے ضروری ہے کہ سیاسی طور پر ریاست اور سماج پر فوج یا کسی مخصوص گروہ کی بالادستی کا امکان کم ہوجاتا ہے کیوں کہ فوج ملک میں تشدّد کے استعمال کے لیے منظّم ترین ادارہ ہوتی ہے۔☆[15] اس لیے یہ سول اداروں پر بالادستی کے لیے زور زبردستی کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ مسلح افواج غیر جمہوری ماحول میں بالادستی کے لیے دیگر فریقین پر فوقیت رکھتی ہیں۔☆[16] دنیا بھر میں فوج پالیسی سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور

قومی سلامتی کے مسائل کے باعث معاشرہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ مسلح افواج کو پالیسی سازی میں اہم حیثیت دے۔ تاہم اگر فوج پر نظر نہ رکھی جائے تو وہ بزورِ طاقت دیگر تمام فریقین پر حاوی ہوجاتی ہے۔ حتیٰ کہ فوج بزعمِ خود ریاست بھی بن سکتی ہے جیسا کہ پاکستان میں ہوا۔ جب کہ ایک مضبوط ریاست اسے سمجھنا چاہیے جو اپنی مسلح افواج کو کوئی فریقین میں سے ایک سمجھے اور پالیسی پر عمل درآمد کا ایسا ادارہ بنائے جو اندرونی اور خارجی طور پر بروئے کار لایا جاسکے۔

ہمارے نظریاتی خاکے میں مرکزی حیثیت ایک ایسی ریاست کو حاصل ہے جو جمہوری طور پر مستحکم ہو۔ ہم جس قدر اس مرکزی نکتے سے دور ہوتے ہیں اسی قدر ریاست کی قوت بتدریج کم ہوتی جاتی ہے اور ناتواں سیاسی ڈھانچے پر سیاسی جماعتیں، افراد، فوجی حکومتیں یا جنگجو رہنما حاوی ہوجاتے ہیں۔ سول فوجی تعلقات کی نوعیت سے ہی اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ فوج کس حد تک قومی وسائل کا استحصال کرے گی۔

سول فوجی تعلقات کی اقسام

سول فوجی تعلقات کی چھ اقسام با آسانی شناخت کی جاسکتی ہیں:

- سول فوجی شراکت
- مطلق العنان سیاسی افسر شاہانہ شراکت
- حکمران فوجی بالادستی
- ثالث نما فوجی بالادستی
- سرپرستانہ فوجی بالادستی
- جنگجو رہنماؤں کی بالادستی

چونکہ سیاسی نظام کی طاقت سے ہی ریاست کی قوت کا تعین ہوتا ہے اور اسی پر سیاسی، سماجی اور معاشی اداروں میں فوج کے اثر ونفوذ کا انحصار ہوتا ہے، لہٰذا درجِ بالا اقسام میں سے ہر قسم ایک مخصوص سیاسی وسماجی نظام اور سول سوسائٹی کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سماج، معیشت اور سیاست میں فوجی مداخلت کی حد بھی مختلف ہوتی ہے۔ (دیکھیے جدول 1.1)

جدول 1.1 سول فوجی تعلقات کی چھ اقسام

	سول فوجی پارٹنرشپ	مطلق العنان سیاسی جماعت اور فوج کی پارٹنرشپ	حکمران فوج	ثالث نما فوج	سرپرستانہ فوج	جنگجو فوج
سیاسی نظام	جمہوریت	پارٹی کنٹرول	فوجی حکومت	فوجی/سول مطلق العنانیت	فوج کا آئینی کنٹرول	جنگجو رہنما
سول سوسائٹی	واضح اور بلند آواز	پابند	کمزور	منتشر	منتشر	کمزور
فوج کا کنٹرول	سول حکومت	سیاسی جماعت	فوجی	فوجی	فوجی	جنگجو رہنما
فوج کا کنٹرول: تاریخی تناظر	سول	سیاسی جماعت	فوجی	فوجی	فوجی	فوجی/سول
فوجی کردار	پیشہ ورانہ	پیشہ ورانہ	نیا پیشہ ورانہ	نیا پیشہ ورانہ	نیا پیشہ ورانہ	غیر پیشہ ورانہ
کلیدی فوجی کردار	بیرونی خطرہ	بیرونی خطرہ	اندرونی خطرہ	اندرونی خطرہ	اندرونی خطرہ	اپنا تحفظ
ثانوی کردار	امن کی بحالی، قدرتی آفات میں مدد، ہنگامی حالات میں سویلین سے تعاون	امن کی بحالی، قدرتی آفات میں مدد، ہنگامی حالات میں سویلین سے تعاون	امن کی بحالی، قدرتی آفات میں مدد، ہنگامی حالات میں سویلین سے تعاون، سیاسی کنٹرول، پولیس کے کام	امن کی بحالی، قدرتی آفات میں مدد، ہنگامی حالات میں سویلین سے تعاون، سیاسی کنٹرول، پولیس کے کام	امن کی بحالی، قدرتی آفات میں مدد، ہنگامی حالات میں سویلین سے تعاون، سیاسی کنٹرول، پولیس کے کام	قدرتی آفات میں مدد، سیاسی کنٹرول، پولیس کے کام

	سول فوجی پارٹنرشپ	مطلق العنان سیاسی جماعت اور فوج کی پارٹنرشپ	حکمران فوج	ثالث نما فوج	سرپرستانہ فوج	جنگجو فوج
سیاسی جواز	کوئی نہیں	کوئی نہیں	متبادل ادارہ	سیاسی ثالث	مستقل ثالث	لٹیرے
فوج کا سیاسی اثر	ماتحت	ماتحت	ابتدائی	بالادست	ابتدائی	پارٹنر
فوج کی سیاسی مداخلت	کوئی نہیں	کوئی نہیں	ہاں	ہاں	ہاں	ہاں
فوجی حکومت	کوئی نہیں	کوئی نہیں	ہاں	وقتی	مستقل	پارٹنر
مملکت اور سماج پر فوج کا اختیار	کوئی نہیں	کوئی نہیں	مکمل	بالادست	فوجی بالادستی	جنگجو رہنماؤں کا پارٹنر
معاشی نظام	آزاد سرمایہ داری	پابند معیشت	قبل از سرمایہ داری	قبل از سرمایہ داری	قبل از سرمایہ داری	منتشر مزاجی
معیشت میں فوج	ماتحت	ماتحت	بالادست	بالادست	بالادست	بالادست

پہلی قسم میں فوج سویلین حکام کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سول ادارے اور سول معاشرے کی مضبوطی ہے۔ اس نظام میں منڈی کی معیشت آزاد ہوتی ہے جس کی بدولت فوج دیگر بالادست سیاسی و معاشی فریقین کے ساتھ پارٹنر شپ بنا کر فائدے حاصل کرتی ہے اور آزادانہ طور پر کام نہیں کرتی۔ ایسی ریاستوں میں مسلح افواج اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے پہچانی جاتی ہیں اور سویلین حکام کے ماتحت ہوتی ہیں۔

دوسری صورت میں بھی فوج پہلی کی طرح سول حکام پر انحصار کرتی ہے۔ تاہم مسلح افواج اپنی طاقت کے لیے بالادست سیاسی جماعت، رہنما یا حکمران طبقے کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ تاہم معیشت کے آزاد نہ ہونے کے باوجود فوج تنِ تنہا کام نہیں کرتی بلکہ سیاسی جماعت یا رہنما کے تعاون سے فائدے حاصل کرتی ہے۔ مسلح افواج بنیادی طور پر پیشہ ور ہوتی ہیں لیکن اندرونِ ملک سلامتی اور نظم و نسق میں نسبتاً زیادہ فعال ہوتی ہیں۔

اگلی تین قسمیں فوجی بالادستی کی مختلف صورتیں پیش کرتی ہیں۔ سماج کی افسر شاہانہ نوعیت اور سیاست میں مسلح افواج کی تاریخی اہمیت کے باعث فوج سیاسی اختیار اور ذمہ داریاں بھی سنبھال لیتی ہے۔ ان تینوں صورتوں کے درمیان فرق فوج کے قانونی جواز کا ہوتا ہے۔

قانونی جواز کا مطلب یہی نہیں کہ سول سوسائٹی فوج کے کردار کو تسلیم کرتی ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ فوج کس طرح اپنے سیاسی اثر ورسوخ کو حق بجانب ثابت کرتی ہے۔ حکمران فوج خود کو ریاست کنٹرول کرنے والے ایک متبادل ادارے کے طور پر پیش کرتی ہے۔ ثالث قسم کی فوج کا کردار مبینہ طور پر اس عدم توازن کو کم کرنا ہوتا ہے جو سیاسی قیادت پیدا کرتی ہے۔ سرپرستانہ قسم کی فوج آئینی ردوبدل کر کے اپنا کردار مستقل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس مستقل کردار کے ذریعے فوج ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مختلف اندرونی و بیرونی خطرات سے مقابلے کے لیے فوج ہی سب سے موزوں حکمران ہے۔ آخری صورت وہ ہوتی ہے جس میں سماج نراجیت (Anarchy) کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے اور جہاں فوج دیگر بالادست سویلین فریقین کے ساتھ مل کر لوٹ مار کرتی ہے۔

مضبوط سیاسی نظام یا سیاسی جماعت کا کنٹرول فوج کو زیردست رہنے پر مجبور کرسکتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں مسلح افواج کے کردار کا تعین سویلین قیادت کرتی ہے اور یہ کردار صرف بیرونی خطرات سے تحفظ تک محدود ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری بیان کردہ چھ اقسام اُن تعلقات کا خلاصہ پیش کرتی ہیں جو مسلح افواج ریاست اور سماج کے ساتھ استوار رکھتی ہیں۔ (خلاصے کے لیے دیکھیے جدول 1.2)

سول فوجی شراکت داری

اس طرح کی پارٹنرشپ زیادہ تر ایسے ملکوں میں پائی جاتی ہے جہاں جمہوریت مستحکم ہو۔ سول سوسائٹی اور سویلین ادارے مضبوط اور متحرک ہوں، مسلح افواج پر سویلین کنٹرول پختہ ہو اور وسائل کے حصول کے لیے فوج دیگر فریقین پر فوقیت نہ رکھتی ہو اور صرف پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھاتی ہوں۔ اس طرح کی پیشہ ور افواج اُن افسر شاہانہ افواج سے قدرے مختلف ہوتی ہیں جو لاطینی امریکا، جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر خطوں میں پائی جاتی ہیں۔

ایسی افواج کا بنیادی کام بیرونی خطرات سے مقابلہ ہوتا ہے اور وہ صرف سویلین حکام کے کہنے پر ہی اندرونی معاملات میں مداخلت کرتی ہیں اور وہ بھی سویلین سیاسی رہنمائی میں فوج کا پیشہ ورانہ احساسِ ذمہ داری اور داخلی طور پر محدود کردار مضبوط سول سوسائٹی اور جمہوری اداروں کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ جہاں میڈیا، عدلیہ، انسانی حقوق کے ادارے، الیکشن کمیشن، سیاسی جماعتوں اور حکومتوں کے آڈٹ کے ادارے مستحکم ہوتے ہیں خاص طور پر میڈیا بہت مضبوط ہوتا ہے جس کے باعث مسلح افواج کو اپنے محدود کردار کے اندر رہنا پڑتا ہے۔

اس قسم کے ممالک میں سیاست کا ایک کارپوریٹ کلچر ہوتا ہے۔ ریاست سماج پر اپنی مرضی چلاسکتی ہے اور مختلف فریقین کو گفت وشنید کا موقع دیتی ہے۔☆[17] اس طرح فریقین کے اتفاقِ رائے سے سیاسی ایجنڈا ابھرتا ہے اور ہر فریق فوج کے دباؤ سے آزاد ہوکر اپنے ایجنڈے پر عمل کرتا ہے یا اس کے لیے گفت وشنید کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ عمل بہت آئیڈیل طریقے سے ہو یعنی جمہوری اقدار میں کمی بیشی ممکن ہے۔ برطانیہ، امریکا، جرمنی اور فرانس کے علاوہ بھارت، جنوبی افریقا اور برازیل میں اسی طرح کی جمہوریتیں ہیں۔

جدول: 1.2 سول سوسائٹی

	پارٹنر	بالادست	سب پر بھاری
سول فوجی پارٹنر شپ	امریکا، فرانس، برطانیہ، جنوبی افریقا، انڈیا، برازیل، اسرائیل		
سیاسی جماعت مطلق العنان فوجی پارٹنر شپ	چین، ایران، کیوبا، سری لنکا		
حکمران فوج		چلی ہیتی، برما، ارجنٹائن	
ثالث نما فوج		پاکستان (۱۹۷۷ء سے پہلے) ترکی (۱۹۶۱ء سے پہلے) انڈونیشیا، تھائی لینڈ ویت نام، کمبوڈیا، بنگلہ دیش	
سرپرستانہ فوج			پاکستان (۱۹۷۷ء کے بعد) ترکی (۱۹۶۱ء کے بعد) انڈونیشیا (۱۹۶۶ء کے بعد)
جنگجو		نائیجریا، ایتھوپیا سیرالیون، انگولا، سومالیا، سوڈان	

اس طرح بھارت، جنوبی افریقا اور برازیل کی سیاسی تاریخ و روایت اور ریاستی و سماجی ارتقا مغربی ملکوں سے خاصا مختلف رہا ہے، مثلاً بھارت کے سیاسی کلچر کو کسی حد تک افسر شاہانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔☆[18] 1970ء کے عشرے میں اندرا گاندھی کی حکومت نے ہنگامی حالات نافذ کرکے جو کچھ کیا وہ اسی مخفی مطلق العنانیت کی مثال ہے۔ تاہم اس ریاست کی مطلق العنانیت کے باوجود بھارتی فوج سخت سویلین کنٹرول کے تحت کام کرتی ہے اور مسلح افواج کو پالیسی پر عمل درآمد کا ایک آلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کے سول فوجی تعلقات کو سوچے سمجھے طریقے سے بھارتی ریاست کے سیاسی ڈھانچے کا حصہ بنایا گیا ہے، اور سویلین قیادت نے مسلح افواج پر کنٹرول کو برقرار رکھا ہے۔ بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے ایک خاص دفاعی اور انتظامی کلچر کو فروغ دیا تاکہ فوج سیاسی قیادت اور سویلین حکام کے تحت رہے۔☆[19] اس طرح ریاست اور دفاعی پالیسی سازی پر سویلین بالادستی کو فوج نے تسلیم کرلیا ہے اور کبھی سویلین قیادت کو للکارنے کی جرأت نہیں کی۔

اسی طرح جنوبی افریقا کا جمہوری کلچر بھی مسلح افواج پر کنٹرول کے حوالے سے ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ گوکہ وہاں نسل پرستی کی تاریخی جڑیں موجود ہیں پھر بھی ایک لبرل سیاسی کلچر اور مسلح افواج میں پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو اصلاحات کے ذریعے پروان چڑھایا گیا ہے۔ اصلاحات کا مقصد ایک ایسا کلچر متعارف کرانا تھا جس سیاسی نظم و نسق اور مذاکرات پر فوج بالادست نہ ہوسکے۔

ان ممالک کی معیشت اور سیاست میں سول فوجی پارٹنرشپ کی جانب خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ امریکا، فرانس، برطانیہ، اسرائیل اور بھارت جیسے ممالک میں سول فوجی پارٹنرشپ خاص مستحکم ہوچکی ہے۔

اسرائیلی فوج نے عرب انتفاضہ سے لڑتے ہوئے سول فوجی تعلقات کو خاصا تبدیل کیا ہے اور اب مسلح افواج ماضی کے مقابلے میں ریاست کے لیے بہت زیادہ اہمیت اختیار کرگئی ہیں۔☆[20] اس نئے کردار کا مطلب یہ ہے کہ اب فوج پر اس طرح حکم نہیں چلایا جاسکتا جیسے ڈیوڈ بن گورین جیسے ابتدائی اسرائیلی رہنماؤں نے سوچا تھا۔ کم و بیش اسی طرح 9/11 کے بعد

امریکا میں فوج اور سویلین حکام کے درمیان تعلقات خاصے تبدیل ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ نظم و نسق میں دفاعی انتظامیہ کا کردار بڑھ گیا ہے اور سی آئی اے یا ایف بی آئی جیسے ادارے اندرونی خطرات کے علاوہ بھی دیگر معاملات میں فریق بن گئے ہیں۔ منصوبہ بندی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو داخلہ، خارجہ اور دفاع کے محکموں کے درمیان قریبی رابطے اندرونی خطرات میں اضافے کے ساتھ مسلح افواج کے کردار کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

امریکا میں سرد جنگ کے بعد سرکاری شعبے کی افرادی قوت میں کمی کی جانے لگی تھی اور مسلح افواج کا کردار بھی بدل رہا تھا۔ مگر 9/11 کے بعد مسلح افواج کے حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ اہلکار دوبارہ سے فیصلہ کن کردار ادا کرنے لگے ہیں۔ امریکا اور اسرائیل میں پایا جانے والا سول فوجی ماڈل تصادم کے بجائے پارٹنرشپ پر مبنی ہے۔ یعنی فوج پر سویلین حکام کا کنٹرول بدستور موجود ہے اور فوج سیاست میں براہِ راست شامل نہیں ہے۔ تاہم سیکورٹی کے داخلی خطرات کے پیشِ نظر فیصلہ سازی اور نظم و نسق میں فوجی اثر بڑھ گیا ہے۔

سول فوجی پارٹنرشپ سیاسی و معاشی دونوں سمتوں میں کام کرتی ہے۔ ایک طرف تو فوج کے کردار میں تبدیلیوں کے ذریعے سویلین کارپوریٹ سیکٹر اور فوجی عمائدین کی پارٹنرشپ کی وہ مثالیں ہیں جنھوں نے اندرونی تحفظ پر زیادہ توجہ دی تو دوسری طرف ترقی پذیر معیشت میں منافع حاصل کرنے کے لیے بھی ایک شرکت کی تشکیل کی جاتی ہے۔ یہ معیشت فوجی کاروبار کی اقسام میں بھی شامل ہے۔ امریکا، انگلستان، فرانس اور جنوبی افریقا میں فوج کا نجی کاروبار اور نجی تحفظ کا کاروبار ان معاشی فوائد کی کچھ مثالیں ہیں جو سویلین کارپوریٹ حلقے اور فوج میں ایک شراکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ 1990ء کی دہائی میں قائم کیے جانے والے نجی فوجی کاروباری ادارے ریٹائرڈ فوجی اہلکاروں کو سیکورٹی کے فرائض کے لیے بوسنیا، روانڈا، کروشیا، صومالیا، سیرے لیون اور عراق جیسے ممالک میں بھیجتے ہیں۔

اس پارٹنرشپ کے ذریعے فوجی انتظامیہ ان ممالک میں اپنے جغرافیائی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے نجی کاروباری اداروں کو استعمال کرتی ہے اور اسے براہِ راست مداخلت کم کرنی پڑتی ہے۔ سلامتی کے نجی ٹھیکے دار وہ کچھ کرسکتے ہیں جو حکومتیں یا افواج سیاسی یا

دیگر وجوہ کی بنا پر نہیں کرنا چاہتیں۔ ڈاؤن سائزنگ (یعنی سرکاری ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد۔ مترجم) کے بعد جو فوجی اہلکار مارکیٹ میں آئے، انھیں نجی طور پر استعمال کیا جانے لگا تاکہ اُن کی جنگ وجدل کی استعداد کو استعمال کیا جاسکے۔ متعدد نجی فوجی کاروباری ادارے جیسے ہیلی برٹن، ایم پی آر آئی (MPRI) کیلوگ، براؤن اینڈ روٹ، اور ڈن کارپوریشن وغیرہ کو عراق میں جاری جنگ سے بہت فائدہ پہنچا۔ اس جنگ سے نجی شعبے اور سیاسی وفوجی قوتوں کو کام کرنے کے بہت سے مواقع ملے۔ نجی شعبہ تو بڑے مالیاتی فائدے میں رہا۔ نجی فوجی کاروباری اداروں کو اہلکاروں کی تربیت پر وسائل خرچ نہیں کرنے پڑے کیوں کہ ریٹائرڈ فوجی اہلکار پہلے سے تربیت یافتہ تھے۔

سیاست دانوں کو سیاسی و مالیاتی دونوں طرح کے فوائد ہوئے۔ دفاعی معاہدوں سے مستفید ہونے والی سو بڑی کمپنیوں میں سے اکثریت نے قانون ساز اداروں کے انتخابات میں حصہ لینے والے امیدواروں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی تھی۔[21]☆ سول فوجی تعاون سے ریٹائرڈ فوجی اہلکاروں کو ملازمتوں کے بہترین مواقع ملے۔ بہت سے اہلکار پینشن کے علاوہ دو یا تین مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرنے لگے۔

اس موضوع پر موجود تحریروں میں اس بات کا تجزیہ موجود نہیں ہے کہ اس پارٹنرشپ کی اصل قیمت کیا ہے۔ جب حکومت کے تربیت یافتہ اہلکار سرکاری ملازمت چھوڑ کر نجی شعبے میں ملازمت کر لیتے ہیں تو اس کا مالیاتی نقصان حکومت کو ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کی تربیت پر مالی وسائل ضائع ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ نجی فوجی ادارے وہی کام بہت زیادہ قیمت پر سرانجام دیتے ہیں۔ سرکاری اکاؤنٹینٹ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیکورٹی کی نجکاری سے طویل المدت سفارتی اور مالیاتی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے مین ٹیننس کی لاگت کم ہو جاتی ہے۔ اور لاشیں آنے سے حکومت کو شرمندگی بھی نہیں ہوتی۔

تاہم یہ تو واضح ہے کہ اس سے بدعنوانی کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں اور شفافیت کی کمی ہوتی ہے۔ یہ خطرہ بہرحال موجود ہوتا ہے کہ ممکنہ فائدے حاصل کرنے والے لوگ ملک کو ایسی پالیسی کے راستے پر ڈال دیں جو اُن کے ذاتی مفاد میں ہو۔

عراق کی جنگ سے متعلق کئی فیصلوں پر سوالات اٹھائے گئے ہیں، مثلاً 2003ء میں ہیلی برٹن کو دیے جانے والے چار اعشاریہ تین ارب ڈالر کے ٹھیکوں میں آدھے ایسے تھے جو مقابلے کی پیش کشیں طلب کرنے کے بعد دیے گئے۔☆22

امریکی محکمۂ دفاع کی 2004ء والی رپورٹ کے مطابق ''ایسا نہیں ہوا کہ ڈالر غلط کمپنی کو دیے گئے ہوں بلکہ خود پینٹا گون نے ڈیٹابیس میں غلط اندراج کیے۔''☆23 ایک اور رپورٹ میں یہ بتایا گیا کہ MPRI نامی نجی ٹھیکے دار نے نہ صرف پینٹاگون کے لیے ضوابط تحریر کیے بلکہ محاذِ جنگ سے جاسوسی کا کام بھی کیا۔ MPRI کی ایسے کاموں کی صلاحیت کے بارے میں شکوک وشبہات موجود رہے ہیں اور حکومت اور محکمۂ دفاع کی دیانت داری پر بھی سوالات اٹھائے گئے ہیں۔☆24

نجی فوجی کاروباری ادارے پالیسی سازی کے عمل کو جنگجوئی کے راستے پر لے جانے کے لیے ترغیبات دیتے ہیں اور ان ترغیبات کا خاص ہدف اعلیٰ فوجی افسران ہوتے ہیں۔ جو اقتصادی فوائد دے سکتے ہیں۔ جنگجوئی پر مبنی جارحانہ پالیسی سے مسلح افواج کی قدر میں اضافہ ہوتا ہے اور ریاست کا فوج پر انحصار بڑھ جاتا ہے۔ سرمایہ دار معیشت میں افسران سرمایہ بنانے میں مصروف ہوتے ہیں جب کہ قبل از سرمایہ داری کے ماحول میں زیادہ زور اثاثے جمع کرنے پر ہوتا ہے لیکن اس طرح فوج کی کاروباری سرگرمیاں مفید نہیں ہوتیں۔ اگر اس عمل پر نظر نہ رکھی جائے تو فوج کی کاروباری سرگرمیوں سے ریاستی اور جمہوری ادارے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسی پارٹنرشپ سے فائدہ اٹھانے والے لوگ مطلق العنانیت کو ترجیح دیتے ہیں جہاں سول سوسائٹی یک طرفہ فیصلوں کے خلاف آواز اٹھا نہ سکے۔ فوج کے ایسے کاروبار سے سول سوسائٹی اور جمہوریت کو امریکا کے ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس والا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے جس کے بارے میں امریکی صدر آئزن ہاور نے 1961ء میں خبردار کیا تھا۔ امریکی عوام سے اپنے مشہور الوداعی خطاب میں امریکی صدر نے قوم کو اس شعبے کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے خبردار کیا تھا۔☆25

اس قسم کے سول فوجی تعلقات میں جمہوری روایات کی موجودگی سے ہی فوج معیشت، سیاست، اور سماج میں کھلی مداخلت سے باز رہتی ہے۔

مطلق العنان سیاسی وفوجی شراکت داری

اس طرح کی پارٹنرشپ زیادہ تر کمیونسٹ ریاستوں میں یا اُن ممالک میں پائی جاتی ہیں جہاں کوئی مطلق العنان سیاسی جماعت قابض ہو۔ طاقت کا ارتکاز کسی واحد جماعت، فرد یا گروہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو سیاسی نظام پر مُسلط ہوتے ہیں۔ اس طرح کی مثالوں میں چین، شمالی کوریا، کیوبا، شام، مصر، عراق، روس، سری لنکا، اور اسلامی انقلاب کے بعد کا ایران شامل ہیں۔ کچھ لوگ کیوبا کو فوجی حکومت مانتے ہیں لیکن یہاں ہم نے کیوبا کو شام، عراق اور مصر جیسی سیاسی وفوجی پارٹنرشپ میں شامل کیا ہے☆[26] کیوں کہ کیوبا میں فوج فیدل کاسترو اور اس کے خاندان کے ماتحت ہے۔

سول فوجی پارٹنرشپ کی طرح اس دوسری صورت میں بھی فوج کسی کلیدی سیاسی جماعت یا رہنما کی بنائی ہوئی پالیسی پر عمل کرتی ہے لیکن یہاں کی سیاسی ساخت جمہوری ریاستوں کی طرح نہیں ہوتی۔ اس سیاسی نظام میں اقلیتی گروپوں کا زور کم ہوتا ہے۔ اور حکمران سیاسی گروہ سول سوسائٹی کو پابند رکھتا ہے۔ یہاں اعلیٰ قیادت کی پالیسیوں کو لاگو کرنے میں فوج فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ تاہم سیاسی جماعت یا ایک کرشماتی رہنما بذاتِ خود قانونی جواز فراہم کرتا ہے۔ کیوبا کے فیدل کاسترو یا مصر کے جمال عبدالناصر جیسے رہنماؤں نے فوج کو اپنے ماتحت رکھا ہے۔ ناصر نے فوج کے متوازن سویلین ادارے بھی بنائے تا کہ اپنی سیاسی بقا کے لیے صرف فوج پر ہی انحصار نہ کرنا پڑے۔☆[27] مسلح افواج کی انتظامی طاقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے سیاسی جماعتیں یا رہنما فوج کو زیادہ اختیارات دینے کا خطرہ مول نہیں لیتے۔

سیاسی جماعت سماجی اتفاقِ رائے کا ایک فورم ہوتی ہے، اور سیاسی نظام کی طاقت سیاسی جماعت یا سویلین حکمران طبقے کے پاس ہوتی ہے۔ اس طرح مسلح افواج مکمل اقتدار حاصل نہیں کر پاتیں۔ یہاں مضبوط سول سوسائٹی کی جگہ سیاسی جماعت یا حکمران طبقہ ہوتا ہے۔ حکمران جماعت اپنے سیاسی وسماجی ایجنڈے پر عمل کے لیے فوج یا نیم فوجی دستوں کو استعمال کرتی ہے۔ جس سے ریاستی استحکام یقینی ہو جاتا ہے۔ اکثر معاملات میں پالیسی سازی میں فوج کی اہمیت

کا اعتراف اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ ریاست کی تشکیل اور سالمیت کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔

سیاسی وفوجی پارٹنرشپ کی بنیاد مسلح افواج اور مرکزی سیاسی جماعت کے ربطِ باہمی پر ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو طاقت فراہم کرتی ہیں مثلاً چین میں 1920ء سے 1980ء تک انقلابی فوج ہر خطے میں پھیل کر کمیونسٹ پارٹی کی مدد کرتی رہی اور خود اپنی سیاسی حیثیت بھی مستحکم کرتی رہی۔☆[28] کمیونسٹ پارٹی اور فوج نے نہ صرف ایک دوسرے کی مدد کی بلکہ باہمی تعاون پر مبنی سیاست کر کے اپنے حصے حاصل کرنے کی جدو جہد بھی کرتی رہیں۔ کمیونسٹ نظام میں فوج کو سویلین کمیونسٹ پارٹی کی بالادستی کی ضامن سمجھا جاتا ہے۔☆[29] اور تصادم کے بجائے تعاون جاری رہتا ہے۔

اس پارٹنرشپ میں افواج کو پیشہ ور رہنے کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ سویلین حکام کے ماتحت رہیں۔ یاد رہے کہ ایسے ممالک میں افواج پہلے انقلابی اور پھر پیشہ ور ہوتی ہیں۔

ایک ذرا مختلف مثال سری لنکا کی ہے جہاں فوج نے ریاستی تسلّط اور سنہالی اور تامل افسر شاہانہ رجحانات کا تحفظ کیا۔ سری لنکا کی فوج نے چند برسوں میں ہزاروں سنہالی اور تامل ہلاک کیے۔ صرف 1977ء میں جنوبی بغاوت میں ساٹھ ہزار لوگ مارے گئے۔☆[30]

ایسی افواج بظاہر اندرونی سلامتی کے لیے مداخلت کرتی ہیں اور فوج نیم فوجی دستوں اور پولیس میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں افواج حکمران جماعت کے تسلّط کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ چین، سری لنکا اور شام جیسے ممالک میں فوج بڑا اثر ورسوخ رکھنے کے باوجود سیاسی جماعت اور قیادت کے ماتحت ہوتی ہے، اور نظم و نسق سیاسی جماعت یا قیادت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

سول سوسائٹی کے ادارے نسبتاً کمزور ہوتے ہیں اور صرف کلیدی سیاسی جماعت یا گروہ مضبوط ہوتا ہے۔ سیاسی جماعت یا قیادت تمام سیاسی عمل کو کنٹرول کرتی ہے۔

اس طرح کی افواج معیشت میں گہرا اثر ونفوذ رکھتی ہیں اور حکمران جماعت سے پارٹنر شپ میں مل کر انفرادی اور ادارے کے فائدے کے لیے سرمایہ پیدا کرتی ہیں۔ سماجی و معاشی ترقی میں اپنے کردار کے باعث فوج معیشت میں بھی سرگرم ہوجاتی ہے۔ چین، شام، کیوبا اور

ایران جیسے ممالک اس کی مثالیں ہیں۔ یہاں حکمران جماعت مسلح افواج کو استعمال کر کے ریاست پر اقتدار قائم رکھتی ہے اور اس تعلق میں معیشت چلانے میں شراکت بھی شامل ہے۔

فوج اپنے مالیاتی وسائل کی کمی کو پورا کرنے کے لیے منافع جاتی سرگرمیوں میں ملوث ہوتی ہے کیوں کہ حکومتیں مسلح افواج کی تمام ضروریات پوری نہیں کر سکتیں۔ اس لیے مسلح افواج کا ذیلی کردار اہم ہے۔ فوج سیاسی پارٹی کے آلہ کار کے طور پر ترقیاتی کاموں کا بیڑا اٹھاتی ہے جس سے ریاست کے وسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ پارٹی سیاسی اور اقتصادی استحصال میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ سیاسی جماعت اگر طاقت ور ہو تو فوج کو معیشت سے باہر نکال سکتی ہے جیسا کہ چین میں ہوا۔ 1998ء میں چینی حکومت نے فوج کے مالیاتی مفادات کم کر کے اُنھیں خالص پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے راستے پر ڈالا☆[31] مگر اس کے لیے صرف ایک سرکاری حکم کافی نہیں تھا۔ فوج کیا اعلیٰ افسران اپنے ذاتی مالیاتی مفادات کے باعث اپنی ''دکانیں'' بند کرنے پر راضی نہ تھے اور فوج معیشت میں اثر رکھنے پر اصرار کرتی رہی۔ فرینک اومارا کے مطابق چین کی پیپلز لبریشن آرمی تنظیمِ نو پر اصرار کے باوجود معیشت پر اثر انداز ہوتی رہی۔☆[32] فوج اور پارٹی کی اعلیٰ قیادت کے درمیان باہمی تعلقات کے باعث فوج نے اپنے مفادات باقی رکھنے کے لیے گفت وشنید کی اور سیاسی قیادت کو فوج کے معاشی مفادات پر کڑی ضرب لگانے سے باز رکھا۔☆[33]

پارٹی قیادت بھی چونکہ فوج کے ساتھ مشترکہ مفادات رکھتی تھی چنانچہ اس نے بھی ہاتھ ہلکا رکھا، اور اعلیٰ فوجی کمانڈرز کو بتدریج تبدیل ہونے پر راضی کیا۔ چینی مسلح افواج کو خدمات کے شعبے سے نکلنا پڑا لیکن وہ صنعتی شعبے میں بدستور شامل رہیں۔☆[34]

ایک مطلق العنان سیاسی نظام اپنے ارکان اور حواریوں میں وسائل کی تقسیمِ نو کرتا رہتا ہے۔☆[35] مثلاً ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد سابق صدر ہاشمی رفسنجانی جیسے اہم سیاسی فریقین کی شمولیت کے باعث وسائل کی تقسیمِ نو ہوئی۔ رفسنجانی نے حزب اللہ ملیشیا کی مدد کی تاکہ وسائل پر قبضے کے ساتھ مذہبی خیراتی اداروں (جنھیں ''بنیاد'' کہا جاتا ہے) کی سرپرستی کی جائے۔☆[36]

اسی طرح کیوبا میں مسلح افواج اور فیدل کاسترو کا خاندان مل کر قومی وسائل کا استحصال

کرر ہے ہیں☆[37] ایرانی حزب اللہ، کیوبا کی فوج اور چین کی پیپلز لبریشن آرمی (PLA) تسلّط اور بالادستی برقرار رکھنے کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ یہاں مطلق العنان حکومتوں اور فوج یا نیم فوجی دستے مل کر سیاسی استحصال کرتے ہیں اور وسائل غصب کرتے رہتے ہیں۔☆[38]

کچھ افواج سیاسی جماعت سے الگ بھی وسائل کی لوٹ مار کرتی ہیں، جیسا کہ 1991ء کے بعد روس میں ہوا۔ سوویت یونین کی تشکیلِ نو اور مطلوبہ رقوم نہ ملنے سے مایوس فوجیوں نے لوٹ مار بھی کی۔ دفاعی انتظامیہ کی مالیاتی خودمختاری کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے وسائل میں اضافہ کیا جائے اور چشم پوشی سے کام لیا جائے۔

حکمران فوج

حکمران فوج خود کو سویلین اداروں کے متبادل کے طور پر پیش کرتی ہے اور مستقل طور پر برسرِاقتدار رہتی ہے۔ دفاعی انتظامیہ خود کو ریاست کی تشکیل وتعمیر کے لیے ناگزیر تصوّر کرتی ہے۔ مسلح افواج اپنے اس خود ساختہ کردار کی بدولت ریاست پر مطلق العنانیت مسلّط کر کے خود سیاست کرنے لگتی ہیں اور جمہوریت کی بحالی کا کوئی وعدہ نہیں کرتیں۔ اس صورتِ حال میں اپنی مطلق العنان فطرت کے باعث اس قسم کی فوج کو سول سوسائٹی للکارتی ہے، خاص طور سے جب مسلح افواج انسانی حقوق کی منظّم اور مسلسل خلاف ورزیاں کرتی ہیں۔

پہلی دو اقسام اور فوجی غلبے کی تیسری قسم میں ابتدائی فرق سیاست پر کنٹرول کا ہے۔ سیاسی طور پر یہ دو اوّلین اقسام سے مختلف ہے کیوں کہ اس میں فوج کا سیاسی کنٹرول براہِ راست اور مستقل ہوتا ہے۔ فوج کی براہِ راست اور مستقل حکمرانی اُسے کسی بھی اخلاقی جواز سے محروم کر دیتی ہے اور سول سوسائٹی بھی مزاحمت کرتی رہتی ہے۔ سیاسی افراتفری کے نتیجے میں انسانی حقوق کی مزید خلاف ورزیاں ہوتی ہیں جس سے فوج اور سماج کے درمیان خلیج اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ قسم دوسری دو فوجی قسموں سے مختلف ہے۔ یہاں مطلق العنان زیادہ عرصے براہ راست کنٹرول نہیں رکھتا اور بالواسطہ سیاسی کنٹرول کے لیے آئین میں گنجائش نکالتا ہے حکمران کی یہ قسم کلّی طور پر آمرانہ ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو جدول 1.3)

حکمران فوج مستقل اقتدار میں رہنا چاہتی ہے اور سویلین قیادت کو اقتدار میں شامل کیے بغیر ریاست اور نظم ونسق پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے۔ 1970 اور 1980 کے عشروں میں لاطینی امریکا کے کئی ممالک میں یہی صورتِ حال تھی مثلاً چلی، ارجنٹائن، ایکواڈور، نکاراگوا، پیرو اور ہیتی اور دوسرے علاقے جنھوں نے ایک طویل عرصے تک فوجی حکومت کا تجربہ کیا۔ اس فہرست میں آج کے میانمار کو بھی رکھا جاسکتا ہے، جہاں فوج کو براہِ راست کنٹرول حاصل ہے۔

فوج کی براہِ راست اور مستقل حکمرانی کی ایک وجہ سول سوسائٹی کا کمزور ہونا بھی ہے۔ تاہم حکمران فوج کے پاس کوئی سیاسی جواز نہیں ہوتا اس لیے داخلی اور خارجی دباؤ کے ذریعے فوج کو سیاست اور نظم ونسق سے باہر دھکیلا جا سکتا ہے۔ چلی، ارجنٹائن اور دیگر لاطینی امریکی ممالک میں یہی ہوا۔ فوجی حکمرانوں کی طرف سے انسانی حقوق کی مسلسل پامالی کے خلاف سوسائٹی نے آواز اٹھائی جسے بیرونی ملک سے مالیاتی، اخلاقی اور سیاسی حمایت حاصل ہوئی۔

حکمران فوج بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے مطلوبہ پیش ورانہ رویے اور تربیت نہیں رکھتی۔ سرحدوں پر کشیدگی کے باوجود ریاست کو کوئی بڑا خطرہ نہیں ہوتا۔ بجٹ سے خطیر رقوم لے کر یہ افواج بڑی خوشی رہتی ہیں اور قومی سلامتی کی ضامن بنی پھرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اندرونی خطرات کے بل پر فوج داخلی سیاست میں مداخلت کرنے لگتی ہے۔ اس طرح فوج سیاست سے وابستہ عناصر کے قریب آکر سیاسی برائیوں سے بھی آلودہ ہونے لگتی ہے۔

لاطینی امریکا کے بارے میں لکھی گئی تحریریں اس امر پر روشنی ڈالتی ہیں کہ فوجیں کس طرح اقتدار پر قبضہ کرتی ہیں۔ حکمران افواج انقلابی تو ہوتی ہیں لیکن ان کے رویے اتنے پیشہ ورانہ نہیں ہوتے کہ وہ سویلین بالادستی کو قبول کرسکیں۔ ان ممالک میں سیاسی اتفاقِ رائے اور یک جہتی نہ ہونے کے باعث افواج سیاست کی طرف راغب ہوجاتی ہیں۔ طبقۂ اشرافیہ میں اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے فوج اقتدار میں رہتی ہے۔ فوج خود کو ایسا ادارہ سمجھنے لگتی ہے جو معاشرے کو جدید خطوط پر چلا سکتا ہے۔ کیوں کہ بہت کم لوگ جدیدیت کے مغربی تصور سے آشنا ہوتے ہیں۔

جدول 1.3 فوج کی اقسام

	معاشرہ			
	تین فوجی قسمیں	مطلق العنان	پارٹنر *	بالادست * *
فوج	حکمران فوج	میانمار، چلی، نکاراگوا، ہیتی، ارجنٹائن، پیرو، سیرے لیون		
	ثالث فوج		پاکستان: 1977ء تک ترکی: 1961ء تک انڈونیشیا: 1966ء تک بنگلہ دیش	
	سرپرستانہ فوج			پاکستان: 1977ء کے بعد ترکی: 1961ء کے بعد انڈونیشیا: 1966ء کے بعد

* اس قسم میں فوج مستقل طور پر براہِ راست کنٹرول نہیں رکھتی بلکہ سویلین کرداروں کو ساتھ ملا کر اقتدار میں رہتی ہے۔

** بالادست کردار سے مراد ہے سماج، سیاست اور معیشت پر غیراعلانیہ مگر مکمل اختیار۔ یہ افواج سیاست کے ساتھ ساتھ آئینی اور قانونی اقدامات کے ذریعے ریاست اور سماج پر اپنا ایک نافذ العمل اقتدار قائم کرتی ہیں۔

فوجی حکمرانی تین طرح کی ہوتی ہے۔ ذاتی، گروہی اور کارپوریٹ۔☆[39] یہ تینوں ذیلی اقسام سول فوجی تعلقات کی مختلف حدود ظاہر کرتی ہیں یعنی فوجی قیادت کس حد تک سویلین افسروں، ٹیکنو کریٹس اور سیاسی قیادت پر انحصار کرتی ہے۔ لیکن ہر صورت میں سویلین پارٹنر مسلح افواج کے ماتحت ہی رہتے ہیں۔ ان تینوں ذیلی اقسام میں حکمران فوج ہی وسائل کی من پسند تقسیم

کرتی ہے۔

پہلی قسم میں عیدی امین کا یوگنڈا، جنرل سوموزا کا نکاراگوا اور فرزسیا کوئی دورا کی ہیتی شامل ہیں۔ اس طرح کے سیاسی نظام میں ایک آمر اپنے کاسہ لیسوں کو خوب نوازتا ہے۔☆40 تاہم یہ طرزِ حکمرانی فوج کے اندر تفریق پیدا کرتی ہے، گوکہ فوج اقتدار کے کھیل میں سب سے بڑی کھلاڑی ہوتی ہے کیوں کہ آمر کے لیے اپنے ادارے کی حمایت بڑی ضروری ہوتی ہے تا کہ معاشرے میں جبر واستبداد چلتا رہے۔

پیرو، چلّی، ایکواڈور اور میانمار دوسرے ذیلی گروپ میں آتے ہیں جس میں ایک فرد کے بجائے ایک گروہ حاوی ہوتا ہے۔ حکمران گروہ کی حمایت ایک نسبتاً خودمختار فوج کرتی ہے جو نظم ونسق میں مدد دے کر سیاسی پارٹنر شپ بنالیتی ہے۔ اس طرح کی گروہی حکمرانی میں کسی سیاسی جماعت سے شراکت نہیں کی جاتی۔ افسران کا گروہ کسی سول سیاسی پارٹنر کے بغیر ہی خود کو حکمرانی کا اہل سمجھتا ہے☆41 اور ریاست کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا دعوے دار ہوتا ہے۔ مگر اس عمل میں دیگر فریقین فوجی گروہ سے دور ہو جاتے ہیں اور ریاست ایک نوآبادیاتی قبضے کی سی شکل پیش کرنے لگتی ہے۔☆42 جو سیاسی تجزیہ نگار کلیوی جے ہولسٹی کے مطابق ریاست کی تعمیر کا عزم نہیں رکھتی۔

تیسری ذیلی قسم یعنی کارپوریٹ ڈیزائن سیاست اور نظم ونسق میں فوج کی ادارتی مداخلت کی ہوتی ہے۔ اس میں فوج سویلین رہنماؤں کے ایجنٹ کے بجائے مرکزی فریق کا کردار ادا کرتی ہے۔ سیاسی اور سول سوسائٹیز مسلح افواج کے زیرِ اثر رہتے ہیں۔ اس کی مثالیں برازیل اور ارجنٹائن میں ملتی ہیں جہاں فوج دیگر فریقین کو پالیسی سازی میں شامل کرتی ہے۔ جبکہ اس کی حیثیت سرپرست کی ہوتی ہے اور وہ مرکزی کردار ادا کرتی ہے، مثلاً ریاست کو چلانے کے لیے ٹیکنو کریٹس استعمال کیے جاتے ہیں اور مرکزیت پر مبنی نظام سیاسی ارتقا کو روکتا ہے۔☆43 افسر شاہانہ اور مطلق العنان نظام دیگر فریقین سے تعلقات قائم کرتا ہے تا کہ نظم ونسق اور پالیسی پر عمل درآمد کے لیے تیکنیکی مدد لی جاسکے۔☆44

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ ایسے ممالک میں جہاں فوجی حکمرانی ہو وہاں وسائل کی خوب لوٹ

مار ہوتی ہے جس کا زیادہ فائدہ فوج اور اس کے حواریوں کو ہوتا ہے اور مختلف عہدوں کے افسران وسائل کے استحصال میں حصہ لیتے ہیں۔

چونکہ فوج خود کو ریاست کی تشکیل، تحفظ اور سالمیت کا اور معاشرے کو جدید بنانے کا ضامن سمجھتی ہے اس لیے وسائل بھی قبضے میں رکھتی ہے۔ بہر حال اس کی قیمت بھی بہت زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے۔ حکمران فوج مینکر اولسن (Mancur Olson) کے الفاظ میں ایک طرح کی گشتی ڈاکو ہوتی ہے۔☆45 یہ مطلق العنانیت انارکی یا نراجیت کو جنم دیتی ہے۔ ساکن ڈاکے کے برعکس گشتی ڈاکا زیادہ مہنگا پڑتا ہے اور معیشت کی پیداواری استعداد کو کم کرتا ہے۔ یہ نہ صرف غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ مسلح افواج کی پیدا کردہ تشدد اور سماجی و سیاسی ابتری کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ویسے تو تمام فوجی مطلق العنان حکومتیں سماج کو بہت مہنگی پڑتی ہیں لیکن براہِ راست فوجی حکمرانی سے سیاست سے سول سوسائٹی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی ایک مثال میانمار ہے جہاں معیشت، سیاست اور سماج کو فوجی حکمرانی کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

معاشی طور پر میانمار کے نقصان کی بڑی وجہ فوجی افسران کا لوٹ مار کرنا، نجی جائیدادوں پر غیر قانونی قبضے کرنا اور افیم کی اسمگلنگ ہے۔ ان سرگرمیوں کو روکنا ممکن نہیں کیوں کہ بقول میری کالاہان (Mary Callahan):

> ''وہ ریاستیں جہاں اندرونی مسائل اور سیاسی بحران کے حل کے لیے جبر و استبداد پر مبنی فوجی ذرائع استعمال کیے جائیں اور فوج مختلف کام کرے مثلاً قانون کا نفاذ، معاشی ضابطہ کاری، ٹیکس کا حصول، مردم شماری، نشر و اشاعت، سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن، غذائی اجناس کی تقسیم وغیرہ— وہاں روایتی دفاعی ذمہ داریاں پسِ پردہ چلی جاتی ہیں۔''☆46

یہ حالات معاشی نراجیت پھیلاتے ہیں اور سیاسی و معاشی ماحول عوام کے لیے سازگار نہیں رہتا۔ میانمار میں فوجی مطلق العنانیت نے بڑے قابل لوگوں کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ معیشت کو ایک اور بھاری نقصان غیر صحت مندانہ اجارہ داریوں کی شکل میں ہوتا ہے۔

ذاتی اور گروہی اقتدار سے اجارہ داریاں جنم لیتی ہیں۔ حکمران فوج وسائل کو مسلح افواج اور حواریوں میں بانٹتی ہے۔ کارپوریٹ ماڈل میں دیگر گروپوں کی حمایت کے ساتھ تقسیم نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ برازیل کی مثال میں وسائل کی تقسیم فوج، ٹیکنو کریٹس اور کاروباری افراد میں ہوئی جنھیں معاشی پلاننگ کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔☆47

عام تاثر تو یہ دیا جاتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں افواج ریاست کو جدید خطوط پر چلاتی ہیں۔☆48 جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور معیشت میں فوج کی شمولیت کے فوائد نقصانات سے بہت کم ہوتے ہیں۔ لاطینی امریکا میں فوجی حکومت کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جیری دیور اس تصور کو چیلنج کرتا ہے کہ فوجی حکمرانی سے متوسط طبقے کو فائدہ پہنچتا ہے۔☆49

ثالث فوج

اس طرح کی افواج وقتاً فوقتاً براہِ راست سیاسی اقتدار تو حاصل کرتی ہیں مگر اپنے اقتدار کو طول دینے سے گریز کرتی ہیں۔ جب ایسا لگتا ہے کہ وہ مسائل حل ہوگئے جن کے لیے وہ اقتدار میں آئے تھے تو فوجی افسران بیرکوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اس طرح مسلح افواج پچھلی نشست پر بیٹھ کر ڈرائیونگ کو ترجیح دیتی ہیں تاوقتیکہ پھر حالات اُنھیں براہِ راست مداخلت کے لیے مجبور نہ کردیں۔ تاہم مداخلت کا فیصلہ فوج خود اپنی صوابدید پر کرتی ہے۔

ایسی افواج مختلف سیاسی قوتوں کے درمیان خود کو ایک توازن پیدا کرنے والی قوت کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ وہ اپنی مداخلت کا خودساختہ اخلاقی جواز یہ پیش کرتی ہیں کہ قوم کی ترقی اور استحکام کے لیے اُن کی مداخلت ضروری ہے۔ اندورنی اور بیرونی طور پر مملکت کے تحفظ کے سلسلے میں سیاسی فریقین کی صلاحیتوں کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلائے جاتے ہیں اور سویلین بدعنوانیوں کو روکنے کے لیے افواج خود کو نگراں مقرّر کرلیتی ہیں۔☆50 اور متواتر مداخلت کا جواز پیدا کرلیتی ہیں۔

فوج کے کردار کی نوعیت معاشرے کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ افسر شاہانہ معاشروں میں جہاں سیاست کی کوئی مستحکم شکل نہیں ہوتی اور گروہ بندیاں زیادہ ہوتی ہیں وہاں فوج کو غیر موجود

سماجی قوتوں کے متبادل کے طور پر مداخلت کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔☆51 اس کی چند مثالیں انڈونیشیا (1966ء سے قبل) پاکستان (1977ء سے قبل) ترکی (1961ء سے قبل) اور جنوبی کوریا، تھائی لینڈ، کمبوڈیا، ویت نام اور بنگلہ دیش ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ فوج اپنے اقتدار کو طول کیوں نہیں دیتی؟ کیا سول سوسائٹی کی مضبوطی کے باعث فوجی مداخلت عارضی ہوتی ہے؟ بنگلہ دیش جیسی مثال میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مضبوط سول سوسائٹی کے باعث مسلسل احتجاج کے باعث فوج کو براہِ راست اقتدار سے نکلنا پڑا۔ مطلق العنانیت کے خلاف سول سوسائٹی کے مسلسل احتجاج کے باعث بنگلہ دیشی فوج نظم و نسق اور براہِ راست حکومت سے باہر نکلنے پر مجبور ہوئی۔ پھر بھی سول سوسائٹی اتنی مضبوط نہیں ہوتی کہ وہ ثالث کے طور پر مسلح افواج کے کردار کو کم کر سکے معاشرے میں گروہ بندیاں ہوتی ہیں جن کے باعث اجتماعیت کی روایات پروان نہیں چڑھ پاتیں۔

پرل مٹر (Perlmutter) نے ان معاشروں میں فوجی اقتدار طویل نہ ہونے کی کئی وجوہ بیان کی ہیں، مثلاً:

- موجود سماجی ساخت کو تسلیم کر لینا
- بیرکوں میں واپسی پر رضا مندی
- فوج کی آزاد سیاسی تنظیم نہ ہونا
- فوجی حکومت کی طوالت محدود ہونے کا تصور
- پریشر گروپ کے طور پر فوج کا کردار
- قومی شعور کی کم تر سطح
- سویلین انتقام کا خوف
- پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا خیال☆52

درجِ بالا نکات میں سے تیسرا نکتہ یعنی فوج کی آزاد سیاسی تنظیم کا نہ ہونا خاصا اہم ہے۔ چوں کہ فوج کی پیشہ ورانہ تربیت بیرونی خطرات سے مقابلے کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس کے پاس اقتدار میں رہنے کا کوئی سیاسی جواز نہیں ہوتا۔ سیاسی جواز کے فقدان کا احساس فوج

کو پسِ منظر میں جانے پر مجبور کر دیتا ہے مگر اس کی باا‌ثر حیثیت برقرار رہتی ہے۔ چناں چہ بار بار مداخلت کا اخلاقی جواز پیش کرنے کے باوجود فوج زیادہ عرصہ اقتدار میں نہیں رہ سکتی۔ سول سوسائٹی منتشر تو ہوتی ہے مگر اتنی کمزور بھی نہیں ہوتی کہ مسلح افواج کی مطلق العنان حکومت کو مسلسل اقتدار میں رہنے کی اجازت دے دے۔ اس سلسلے میں بنگلہ دیش کی مثال بہت واضح ہے جہاں سول سوسائٹی کی مزاحمت کے باعث مسلح افواج اقتدار کو طول نہ دے سکیں۔

بعض معاملات میں، مثلاً 1961ء سے پہلے کے ترکی اور 1977ء سے پہلے کے پاکستان میں بھی دفاعی اسٹیب لشمنٹ طویل اقتدار کے لیے مکمل طور پر تیار نہیں تھیں، اور نہ آئینی جوڑ توڑ کے ذریعے متبادل طریقے ہی نکال سکی تھیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں فوج کی سیاسی مداخلت جنرل ایوب خان (69–1958) نے شروع کی جو جنرل یحییٰ خان (71–1969) نے جاری رکھی۔ ایوب خان کے دور تک چونکہ فوج کو ملک چلانے کا کافی تجربہ نہیں تھا اس لیے اسے بڑی حد تک سویلین افسر شاہی پر تکیہ کرنا پڑا۔ مزید یہ کہ بھارت سے جنگ ہارنے کے بعد مسلح افواج کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ منتخب سویلین قیادت کو اقتدار منتقل نہ کریں۔ بعد میں جنرل ضیاء الحق (88–1977ء)، جنرل پرویز مشرف (1999-2008ء) اقتدار کو طول دینے اور نظم و نسق میں فوج کی شمولیت برقرار رکھنے کے لیے زیادہ تیار تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ثالث فوج میں پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا احساس حکمران فوج کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ ثالث فوج کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ وہ سیاست اور معیشت کے انتظام سے اپنے اہلکاروں کو دور رکھے۔ تاہم اس زمرے میں دو طرح کی افواج آتی ہیں۔ ایک تو انڈونیشیا جیسی فوج جو نظم و نسق اور معاشی انتظام میں اپنے اہلکاروں کو زیادہ ملوث کرتی ہے۔ دوسری پاکستان، ترکی اور بنگلہ دیش کی مثالیں ہیں جہاں فوج اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے سیاسی پارٹنر شپ کی تلاش میں رہتی ہیں۔ دوسری صورت میں مسلح افواج اندرونی و بیرونی خطرات کو استعمال کر کے نظم و نسق میں اپنا کردار دائمی بناتی ہیں۔ ترکی میں اتاترک نے نظم و نسق میں فوج کے کردار کا قانونی جواز پیش کرنے کے لیے فوج کو آئین اور قومی سلامتی کا محافظ بنا کر پیش کیا اور سویلین حکمرانوں کی بدعنوانی سے بھی خوف دلایا۔ اس طرح فوج بہتر نظم و نسق

کی ضامن بھی بن بیٹھی اور دیانت دار سویلین بھی۔☆[53]

ایسی صورتِ حال میں ''پیشہ ورانہ'' ذمہ داریوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلح افواج جنگیں لڑنے کے علاوہ دیگر کام بھی کرسکتی ہیں۔ اس کا مطلب اندرونی سلامتی اور نظم ونسق میں اس کا زیادہ کردار ہے۔☆[54] اور یوں مسلح افواج ان ممالک میں سیاسی عدم استحکام جیسے مسائل میں ملوّث ہوجاتی ہیں اور قومی نظریے یا مختلف اندرونی و بیرونی خطرات کو جواز بنالیتی ہیں۔ فوج خود کو قومی سلامتی کا سرپرست اور ضامن سمجھ لیتی ہے اور اپنے کردار کو صرف علاقائی سلامتی تک محدود نہیں رکھتی۔

پرل مٹر کی تعریف کے مطابق اس قسم کی فوج سویلین پارٹنر شپ ڈھونڈتی ہے جنھیں وہ وقتاً فوقتاً اقتدار منتقل کرسکے اور خود کو محض ایک ثالث کے طور پر پیش کرتی ہے یعنی مسئلہ حل ہوتے ہی بیرکوں کو واپس — فوجی افسران دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ موقع ملتے ہی ایک 'قابل قبول' سویلین حکومت کو اقتدار منتقل کرکے ظاہری طور پر جمہوریت بحال کردیں گے۔ مگر ہمیشہ پسِ پردہ پریشر گروپ کے طور پر سیاسی جماعتوں اور گروہوں یا تنظیموں سے پارٹنر شپ بناتی رہتی ہیں۔☆[55] یہ مالک اور کارندے کے تعلق کی ایک اور مثال ہے جس میں فوج عام طور پر بالادست ہوتی ہے۔ ان پارٹنروں میں سول افسران، ٹیکنوکریٹ، بیوپاری، مذہبی ولسانی گروہ شامل ہوتے ہیں تاکہ دونوں فریق باہمی فائدے کے لیے طاقت کے موجودہ توازن کو برقرار رکھ سکیں۔

فوج سیاسی و معاشی دونوں فائدوں کے لیے سویلین پارٹنر ڈھونڈتی ہے۔ انڈونیشیا اسی طرح کی ثالث فوج کی ایک مثال ہے۔ سویلین اور فوجی قیادت کاروباری سرگرمیوں میں تقریباً یکساں حصہ رکھتی ہیں۔ سوئیکارنو سے لے کر سوہارتو اور بعد کے تمام سیاسی رہنماؤں نے فوج کو قومی وسائل کے استحصال کا موقع دیا ہے۔ دراصل مسلح افواج انڈونیشیا کی ریاست کے قیام سے ہی سویلین رہنماؤں کی پارٹنر رہی ہیں کیوں کہ فوج نے اُنیس سو پینتالیس سے انیس سو انچاس تک ولندیزی فوجوں کے خلاف جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔☆[56]

انقلابی سیاسی جماعت پی کے آئی (PKI) اور ری پبلک آف انڈونیشیا کی مسلح افواج (ABRI) کے درمیان کشیدگی اور کمزور جمہوری اداروں کے باعث فوج نے بار بار سیاسی

مداخلت کی۔ سیاسی نراجیت یا انارکی نے فوج کے غیر فوجی کردار کو مستحکم کیا جسے تین بنیادی دستاویزات کے ذریعے سرکاری تحفظ دیا گیا۔ یہ دستاویزات تھیں 1945ء کا آئین، پنچ شیلا کا قومی نظریہ اور سپتا مارگا یعنی فوج کا ضابطہ جس کے تحت فوج پنچ شیلا کی محافظ ہے۔☆[57] ان قانونی تحفظات سے فوج کا سیاست اور معیشت میں کردار مستحکم ہوا۔

سماجی و اقتصادی اور سیاسی نظم ونسق میں فوج کی شرکت خاص طور پر اس کے پیشہ ورانہ فرائض پر اثر انداز ہوتی ہے۔ معیشت میں فوج کا کردار بڑھنے سے سیاست میں اس کا اثر و رسوخ بڑھ جاتا ہے، نتیجے کے طور پر مسلح افواج کو علاقائی تحفظ کے اصل کام کی بجا آوری میں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے بیرونی و اندرونی علاقائی کے کردار کے ملاپ نتیجہ میں فوج کو جن چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ انڈونیشیا کی شکل میں واضح نظر آتے ہیں جہاں فوج نے اندرونی سلامتی کا اہم کردار ادا کیا۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ ایک ایسا سیاسی نظام جو فوج کو مالیاتی خودمختاری دیتا ہو، کس طرح سول سوسائٹی کو اتنا مضبوط کرسکتا ہے کہ وہ فوج کے اثر و رسوخ کو کم کرے۔ کیا ایک ثالث نما فوج جو اپنے معاشی مفادات مستحکم کرچکی ہو، ہمیشہ ثالث کا کردار ادا کرتی رہے گی اور صرف اس وقت حکومت سنبھالے گی جب بحرانی صورتِ حال ہو؟ بنگلہ دیش جیسے ملکوں میں فوج کا کردار ثالثی تک محدود رہ سکتا ہے جہاں حکومت نے باقاعدہ طور پر فوج کو راغب کیا کہ وہ اپنی مالیاتی بقا کے لیے دیگر متبادل راہیں تلاش کرے۔

بنگلہ دیش فوج کے براہِ راست حکومت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بنگلہ دیشی فوجی مالیاتی طور پر خودمختار ہے۔

ڈھاکا کی فوج مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے اقوامِ متحدہ کے امن بحالی کے مشن پر انحصار کرتی ہے جس کے نتیجے میں وہ 91-1990 سے اقتدار سے باہر رہی ہے۔ بنگلہ دیش کی مسلح افواج امن بحالی کے مشنوں کے ساتھ شرکت کے زیادہ مواقع تلاش کرنے میں سویلین حکومتوں سے عمدہ تعلقات پر انحصار کرتی ہیں۔ بنگلہ دیشی فوج کی تجارتی مہم جوئی بھی امن بحالی کے مشنوں سے کمائی پر انحصار کرتی ہیں۔ گزشتہ دنوں میں ڈھاکا کی مسلح افواج نے ہوٹل

کی صنعت، ٹیکسٹائل، جوٹ سازی اور تعلیم میں بڑا حصہ بنالیا ہے۔ بنگلہ دیش کا سول معاشرہ اس صورتِ حال سے غالبًا اپنی سادہ لوحی کی بنا پر چوکنا نہیں ہوا۔ سیاسی تجزیہ کار سیاسی مہم جوئی کو اس روایت کا حصہ سمجھتے ہیں جو 1971ء سے پہلے کی پاکستانی فوج نے چھوڑا ہے۔ مزید برآں اس بات پر یقین کیا جاتا ہے کہ فوج اقوامِ متحدہ کی امن بحالی کے مشنوں کے ذریعے منافع حاصل کرنے کے مواقع کھونے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔☆[58] اس امکان پر بہت کم غور کیا گیا ہے کہ فوج کو غالبًا اقوامِ متحدہ ایسے مواقع نہ دے جن سے وہ مالی فوائد حاصل کرنے کے دوسرے مواقع تلاش کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اقوامِ متحدہ کی امن بحالی کے مشنوں میں اپنی شرکت کے باوجود پاکستان، ترکی اور انڈونیشیا کی فوجیں منافع اندوزی کی مہم جوئی میں مشغول رہی ہیں۔ معاشی استحصال ان کی سیاسی قوت کا ایک نتیجہ ہے۔ درحقیقت یہ تینوں افواج اپنے ملکوں کی آزادی کے ابتدائی دنوں سے سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے سیاسی طور پر بڑی مضبوط رہی ہیں۔ ان فوجوں کی مالی خودمختاری کا انحصار ان کی سیاسی خودمختاری پر ہے اور ان کے سیاسی اثر کے بلا روک ٹوک بڑھنے ہی کا امکان ہے یا کم از کم اس بات کا امکان ہے کہ وہ اس وقت تک کم نہیں ہوگا جب تک کہ ان کے اقتدار کو اندرونی اور بیرونی دونوں جانب سے شدید چیلنج درپیش نہ ہو۔

فوجی مداخلت کا تجزیہ کرنے میں پرل مٹر نے سیاسی معیشت اور خاص طور سے افسروں کے کیڈر کے مالی مفادات پر توجہ نہیں دی۔ ایک بار جب کسی فوج کو کام کرنے سے احتراز کی اجازت مل جاتی ہے تو وہ سیاست اور معیشت میں اپنا کردار پھیلاتی جاتی ہے۔ ''احتراز'' کی اصطلاح ہم نے اقوامِ متحدہ میں سول اور فوج کے تعلقات کے بارے میں پیٹر فیور کے مقالے سے لی ہے اور اس کا اشارہ فوج کے اس انکار کی جانب ہے جو وہ سویلین پالیسی سازوں کے احکام بجا لانے میں کرتی ہے۔☆[59] کمزور سیاسی قوتیں جو مضبوط اصولوں کی پابندی کرنے کی اہل نہیں ہوتیں، وہ مسلح افواج کو زیادہ سیاسی اور معاشی گنجائش دینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتیں۔ مثال کے طور پر پاکستانی، ترک اور انڈونیشیائی فوجوں نے اپنے معاشی مفادات کی معاونت کے لیے اپنی سیاسی قوت میں اضافہ کرلیا۔ یکے بعد دیگرے آنے والا ہر

فوجی آمر اپنے پیش رو سے یہ سیکھتا ہے کہ زیادہ معاشی مفادات حاصل کرنے کے لیے کس طرح سیاسی اثر میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے بعد فوجیں ایسے آئینی راستے ڈھونڈ لیتی ہیں جن کے ذریعے وہ ملک اور معاشرے پر اپنے کنٹرول کو دوام بخش سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تینوں معاملات کو ہم نے ایک الگ زمرے میں رکھا ہے جس پر اگلی ذیلی دفعہ میں بحث کریں گے۔

سر پرستانہ فوج

اس زمرے میں آنے والے تین ممالک پاکستان، ترکی اور انڈونیشیا ہیں۔ یہ مسلح افواج اپنی سیاسی طاقت کو آئینی اور قانونی ترمیم سے تحفظ دیتی ہیں۔ یہ ترامیم لانے کے لیے وہ اپنے اُن سویلین ساتھیوں استعمال کرتی ہیں جن کی بقا کا دارومدار فوج پر ہوتا ہے۔ گو کہ ہر عہدے کے فوجی کو اقتدار میں شامل نہیں کیا جاتا ہے پھر بھی اعلیٰ ترین اور درمیانی عہدوں کے فوجی افسران اور فوجی برادری کے دوسرے ارکان ریاست پر قابض رہتے ہیں۔

مسلح افواج کے سیاسی کردار کی توثیق کرنے میں سویلین پارٹنر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی سادہ اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ انڈونیشیا میں ہوا یا جیسے ترکی اور پاکستان میں آئینی ترامیم کے ذریعے قومی سلامتی کونسل بنائی گئی۔ یاد رہے کہ ان تینوں ممالک میں افواج پہلے ثالثی کا کردار ادا کرتی رہیں اور پھر انھوں نے سر پرستانہ کردار اپنالیا۔ دراصل وہ اپنے بڑھتے ہوئے معاشی مفادات کے باعث اپنی سیاسی طاقت کو مستقل کرلیتے ہیں۔ تاکہ حکمران طبقۂ اشرافیہ کی حیثیت سے اپنی بالادست پوزیشین حاصل کرسکیں۔

قانونی اور آئینی ترامیم کی بدولت جو ان کی اضافی فوجی کردار کی توثیق کرتی ہیں، مسلح افواج اب پالیسی کا آلۂ کار نہیں رہتیں بلکہ مساوی شریک کار بن جاتی ہیں اور حکمران اشرافیہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ اقتدار اور قومی وسائل میں شریک ہوتے ہیں۔ یوں مسلح افواج حکمران طبقات میں مستقل طور پر شامل ہوجاتی ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ حکمران طبقات فوج کے ساتھ شراکت سے ہی اپنا اثر ورسوخ حاصل کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح فوج کا اپنے کردار کو بدلنا اس کی بدلتی ہوئی اس سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ

خود کو سیاست اور نظم ونسق کا مستقل حصہ سمجھنے لگتی ہے اور فوج کے اقتدار کو دائمی حیثیت دینا مسلح افواج کے کارپوریٹ مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ وہ سیاسی فریقین کو مسلسل شک و شبے سے دیکھتی ہے۔ چونکہ سول سوسائٹی اور سیاسی فریقین کو فوج اس قابل نہیں سمجھتی کہ وہ ملکی سالمیت کا تحفظ کر سکیں اور فوج کے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنا سکیں، اس لیے فوج خود کو سب سے ماورا سیاسی طاقت میں بدل کر مستقل حکمران رہنے کی روش اختیار کر لیتی ہے۔

ان حالات میں سوسائٹی کو بہت ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے کیوں کہ افواج بہت چالاک ہوتی ہیں اور حالات کا تجزیہ کر کے اپنی بقا کی حکمتِ عملی تشکیل دیتی ہیں۔ وہ ریاست پر اپنا کنٹرول چھوڑنا نہیں چاہتیں اور اپنے سویلین پارٹنروں کو آگے رکھ کر کام چلاتی ہیں۔ اس طرح فوج کے خلاف ممکنہ تحریکیں بھی کمزور جاتی ہیں۔ فوج کے سویلین حواری فوج کے خلاف تحریکیں ناکام بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں۔

انڈونیشیا میں عبوری عوامی کانگریس نے 1966ء میں مسلح افواج کو سیاست اور سیکورٹی میں دُہرا کردار مستقل طور پر دے دیا۔ ایک سرکاری اعلامیہ کے مطابق:

> ''انڈونیشیا کی ری پبلک مسلح افواج کا غیر فوجی کردار مُسلّم ہے جو وہ بحیثیت شہریوں اور انقلابیوں کے ادا کرتی ہیں۔ افواج ہر شعبے میں عوام کی تکالیف کم کرنے اور انقلابی مقاصد پورے کرنے کے لیے جو کام کرتی ہیں اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔''☆60

انڈونیشیا میں فوج نے سیاسی کردار اپنا کر سوہارتو جیسے پارٹنروں کو آگے رکھا اور سول افسر شاہی پر بالادستی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ معیشت پر بھی کنٹرول حاصل کر لیا۔☆61

دوسری جانب ترکی میں فوج نے قومی سلامتی کونسل بنا کر اقتدار میں اپنے کردار کو دوام بخشا۔ اس کونسل میں چھ فوجی اور پانچ سویلین ہوتے ہیں۔ جس سے مسلح افواج کو واضح فائدہ ہے جو سیاسی نظام میں داخل ہو چکی ہے اور سول بیوروکریسی اور پارلیمنٹ میں اپنے ارکان رکھتی ہے۔ لیکن بات صرف تعداد کی نہیں بلکہ طاقت کی ہے۔ پاکستان میں اس کونسل کے صرف چار رکن اور نو ارکان سویلین ہیں لیکن فوجیوں کی طاقت کہیں زیادہ ہے۔ ترکی فوج بھی سماج

اور معیشت میں بھاری بھرکم طور پر موجود ہے۔ ترکی میں فوج پر تنقید کرنا یا اس کے بجٹ پر بحث کرنا غیر قانونی ہے۔☆62

اسی طرح پاکستانی فوج نے 1977ء کے بعد ضیاء الحق (88-1977ء) کے دور میں قومی سلامتی کونسل کا خیال پیش کیا اور بالآخر 2004ء میں جنرل پرویز مشرف نے اسے قائم کیا۔ جنرل ایوب اور یحییٰ خان کے مقابلے میں جنرل ضیا کی حکومت نے سیاست اور نظم ونسق میں فوج کے کردار کو دوام بخشنے کی بھرپور کوشش کی۔ جنرل ضیا نے ماضی سے جو سبق سیکھا وہ یہ تھا کہ فوج کے مفادات کا بھرپور تحفظ کیا جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سویلین حکومت نے فوج کی شرمناک شکست کے بعد اسے دوبارہ مضبوط تو کیا لیکن اسے زیردست رکھا تھا۔ فوج کی طاقت کو کم کرنے کا مسئلہ نظم ونسق میں فوج کے کردار کو متعین کر کے حل کیا جاسکتا ہے۔

ثالث نما فوج سے سرپرستانہ فوج میں تبدیل ہوتے ہوئے افواج کچھ خصوصیات برقرار رکھتی ہیں مثلاً ٹیکنوکریٹ، سول بیوروکریٹ، کاروباری افراد اور مخصوص سیاسی فریقین سے پارٹنر شپ برقرار رکھتی ہے۔ یہ سویلین شراکت کار فوجی اسٹیبلشمنٹ کی مدد کرنے میں اور اپنی سیاسی بقا اور اقتصادی فوائد کے لیے اس پر انحصار کرتے ہیں۔ فوج کی مدد سے سرپرستی کا یہ نظام ہی افواج کی دائمی سیاسی قوت کا خاصہ ہے۔ فوجی سلامتی کونسل جیسا ادارہ اُن کی سیاسی بالادستی کو دوام بخشتا ہے، اور اسی بالادستی کا اعتراف کرتے ہوئے سویلین فریقین اور فوج ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

ثالث سے سرپرستانہ فوج میں تبدیلی بتدریج ہوتی ہے جو فوج کے سیاسی اور اقتصادی مفادات کی طوالت کی وجہ سے ہے، جس میں فوج جمہوریت قائم کرنے کے نعرے لگاتی رہتی ہے۔ فیصلہ سازی میں سینئر جنرلوں کی شمولیت سے سول قیادت کے خطرے کا سامنا رہتا ہے۔

دراصل سویلین سیاسی قیادت اور افسر شاہی فوج کی بیرکوں میں واپسی سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ فوج اقتدار چھوڑنے پر راضی ہے۔ اقتدار کے لیے فوج کی بھوک کا بھی سیویلینز غلط اندازہ لگاتے ہیں کیوں کہ وہ مسلح افواج کی مالیاتی اور سیاسی خودمختاری کے درمیان تعلق کو نہیں سمجھتے۔ سویلین یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اگر فوج کو معاشی فوائد دے دیے جائیں تو وہ

پیچھے ہٹ کر سویلین سیاسی حکومت کو آزادانہ کام کرنے دے گی۔ یہ بات نہیں سمجھی جاتی کہ فوجیوں کو جتنے معاشی فوائد ملتے ہیں اتنے ہی وہ سویلین قیادت کو کمزور کرنے میں لگے رہتے ہیں، جیسا کہ پاکستان میں ہوا۔ سیاسی طبقے کی ناکامیوں سے واقف ہو کر فوجی اپنے مفادات آرام اور آمدنی کے بارے میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں جسے وہ ریاست کی بقا کے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں، اس طرح فوجی مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔☆[63] اور اس طرح فوجی مفادات کو استحکام ملتا ہے۔

سرپرستانہ فوج قومی وسائل کی تقسیمِ نو میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ جب فوج ایک بالادست معاشی فریق بن جاتی ہے تو خود اپنی برادری میں وسائل بانٹنے لگتی ہے اور اپنے سیاسی و معاشی کنٹرول کو باقاعدہ شکل دینے کی کوشش کرتی ہے۔ معاشی مفادات کا پھیلاؤ ایک پیچیدہ نیٹ ورک کے ذریعے ہوتا ہے جو فوج کی کاروباری سرگرمیوں سے براہِ راست فائدہ اٹھانے والے حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ فوجی افسران اور سویلین افراد بناتے ہیں، مثلاً ترکی میں فوج نے 1960ء اور 1980ء کی دہائیوں میں جو مداخلتیں کیں ان کا مقصد سینئر جنرلوں کے ایک گروہ کو مضبوط کرنا تھا جنھوں نے بڑے کاروباری طبقوں کے ساتھ بھی ایک اتحاد بنا لیا تھا۔☆[64]

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا تخمینہ لگانے کے لیے فوج اور اس کے سویلین پارٹنروں کے معاشی مفادات کا اندازہ لگانا ہوگا۔ سرپرستانہ فوج کاسہ لیسی کی سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ فوج کی موجودگی کارپوریٹ شعبے کے رویے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کیوں کہ بہت سے سویلین کاروباری لوگ اپنی بقا اور نشوونما کے لیے فوج پر انحصار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فوج اپنی طاقتور پوزیشن کی وجہ سے ان کو مفادات سے محروم کر سکتی ہے یا ان کے لیے مفادات کو یقینی بنا سکتی ہے اس لیے وہ فوج کی مخالفت نہیں کرتے۔☆[65] جیسا کہ ترکی میں ہوا۔

وسائل کی تقسیم سے فوج کی کاروباری سرگرمیوں پر براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ فوج کی اندرونی معیشت کو فوجی انتظامیہ، اس کے ذیلی ادارے اور انفرادی ارکان چلاتے ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ فوج کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے وسائل ڈھونڈ کر اُن پر قبضہ کیا جاتا ہے۔☆[66] یہ اجارہ داریوں کے قیام سے مختلف ہے جیسا کہ حکمران فوج

اکثر کیا کرتی ہے۔ گوکہ فوجی کاروبار کے نتیجے میں اجارہ داریاں قائم ہوسکتی ہیں لیکن ایسا کرنے کے لیے دیگر پارٹنروں کو بھی ملا لیا جاتا ہے۔ سرپرستانہ فوج کے زیرِ اثر انفرادی ارکان اور ذیلی ادارے بڑا فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اندرونی معیشت کو چلاتے ہوئے فوج کے اثر و رسوخ سے نئے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ فوجی کاروبار کا تخمینہ لگاتے ہوئے تینوں سطحوں پر تقسیم ہونے والے وسائل کو نظر میں رکھنا ہوگا یعنی ادارے کی سطح پر، ذیلی اداروں کی سطح پر، اور انفرادی سطح پر۔

سرپرستانہ فوج کی اندرونی معیشت خاصی ڈھکی چھپی ہوتی ہے کیوں کہ فوجی افسران کی معاشی سرگرمیوں میں براہِ راست شمولیت محدود ہوتی ہے۔ فوجی ادارے اپنے ارکان کو مالیاتی سرمایہ اور مواقع فراہم کرتے رہتے ہیں جو اعلیٰ ترین عہدے دار حاصل کرتے ہیں۔ گوکہ سپاہیوں کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا ہے لیکن زیادہ تر فوائد اعلیٰ افسران ہی حاصل کرتے ہیں اور اس زمرے کے تینوں ممالک یعنی پاکستان، ترکی اور انڈونیشیا میں کم و بیش یہی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔

مسلح افواج کی مشترکہ سیاسی اور معاشی اثر و رسوخ کی بڑی بھاری قیمت ہوتی ہے۔ بہرحال فوج کے اثر کو سول سوسائٹی کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے گھٹایا نہیں جاسکتا، خاص طور سے یہ سول سوسائٹی اگر سیاسی جماعتیں ہوں۔

جنگجو فوج

فوجی بالادستی کی آخری قسم وہ سیاسی نظام ہے جہاں قومی ریاست انتشار کے دہانے پر ہو یا ناکام ہوچکی ہو۔ ریاست کا انہدام ہونے سے انفرادی رہنما یا گروہ سامنے آتے ہیں جو سیاسی و معاشی استحصال کے لیے فوجی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ کئی افریقی ریاستیں مثلاً ایتھوپیا، زائر، موزمبیق، لائی بیریا، سیرے لیون، صومالیا اور روانڈا اور ایشیا میں افغانستان اس صورتِ حال کی نمائندہ مثالیں ہیں۔

ان ریاستوں میں مرکزی ریاستی نظام ختم ہوجاتا ہے۔ اور ریاست لوگوں کو بنیادی سہولتیں

فراہم کرنے کے قابل نہیں رہتی یعنی نظم ونسق بہت ابتر ہوجاتا ہے۔ سیاسی، لسانی یا گروہی رہنما اپنے اپنے گروہ کے لوگوں کو تحفظ دیتے ہیں جیسا کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے کے یورپ کے فیوڈل نظام میں ہوتا تھا۔ سرکردہ رہنما مقبولیت حاصل کرنے اور قومی وسائل کنٹرول کرنے کے لیے لسانی یا قبائلی سیاست کرنے لگتے ہیں۔☆67 جنگجو رہنما اپنے سامنے سر جھکانے والوں کو تحفّظ دیتے ہیں۔ ایتھوپیا اور افغانستان جیسے تصادم میں متحارب گروہ دوسرے گروہوں اور ان کا ساتھ دینے والے لوگوں کو روٹی اور سر چھپانے کی جگہ جیسی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جنگجو رہنما صرف فوجی طاقت پر بھروسا کرتے ہیں جو مقامی بھی ہوسکتی ہے اور باہر سے لائی ہوئی بھی ہوسکتی ہے۔ بعض افریقی جنگجو مغربی ممالک سے نجی فوجی ٹھیکے یا کرایے پر حاصل کرتے ہیں جو بیرونی فوجی طاقت پر انحصار کی ایک مثال ہے۔ جب حکمران طبقے اتفاقِ رائے کے قابل نہیں رہتے تو وہ استحصال کے لیے جنگجو طریقے آزماتے ہیں۔ سیرے لیون کی مثال سامنے ہے جہاں کے رہنماؤں نے خود ریاست کو تباہ کیا اور خود بعد میں جنگجو بن گئے۔☆68 ان حالات میں جنگجو رہنما کی طاقت سے ہی وسائل کے استحصال کا تعین ہوتا ہے۔ رہنما لسانی یا مذہبی نفرت کے راستے پر چلتے ہیں اور وسائل پر خود قبضہ کر کے دوسروں کو اس سے محروم رکھتے ہیں۔ پوری ریاست کے مشترکہ فائدے کی بات نہیں کرتے۔ افغانستان، ایتھوپیا اور سیرے لیون جیسے ممالک میں سول اور فوجی افسر شاہی کے لیے ریاست کے پاس رقم نہیں ہوتی۔ ان حالات میں جنگجو رہنما فوجی طاقت استعمال کر کے وسائل اپنے گروہ کے لیے حاصل کرتے ہیں۔

وسائل کی کمی کے باعث افواج پیشہ ور نہیں رہ پاتیں اور ریاست فوج کی وفاداری پر بھروسا نہیں کرسکتی۔ فوج وسائل کی لوٹ مار شروع کردیتی ہے یا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر ایسا کرنے لگتی ہے۔ حکمران باہر سے گولہ بارود خریدتے ہیں تاکہ خود کو مخالف گروہوں سے بچاسکیں یا ہیروں اور سونے کی کانوں جیسے قدرتی وسائل کا استحصال کرسکیں۔ حکمران گروہ بیرونِ ملک کے ریاستی یا غیر ریاستی اتحادیوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ریاستی اداروں کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔☆69 فوج اور سابق جنگجو اقتصادی وسائل کے استحصال کا ذریعہ

ہیں کیوں کہ دوسرے ممالک سے مسلح افراد کرایے پر حاصل کیے جاتے ہیں۔

ان جنگجو رہنماؤں کی طاقت کا انحصار فوجی قوت پر ہوتا ہے جس سے وہ ایک مخصوص علاقے میں لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ وسائل کے استحصال کے لیے جنگی ساز و سامان کا ہونا ضروری ہے جس میں افواج وسائل لوٹنے میں جنگجوؤں کی مدد کرتی ہیں۔ بعض اوقات مسلح افواج براہِ راست اقتدار بھی حاصل کر لیتی ہیں مگر زیادہ تر وہ ایسے سیاسی رہنما سے پارٹنر شپ بنا کر لوٹ مار کرتی ہیں جو عوامی حمایت حاصل کر سکے۔

اس طرح کی جنگجو افواج اِدھر اُدھر کے کرایے کے ٹٹوؤں پر مشتمل ہوتی ہیں اور انقلابی یا غیر پیشہ ورانہ رویوں کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ جنگجو اپنے راہنما کے حکم پر لوٹ مار میں مصروف رہتے ہیں۔ یوں تو دنیا بھر میں افواج قومی وسائل میں سے حصے بٹورنے کی کوشش میں رہتی ہیں لیکن ہر جگہ ان کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر جنگجو رہنماؤں کی افواج ذاتی طور پر لوٹ مار کرتی ہیں تو دیگر افواج خود ریاست بن جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں فوجیں ریاست کا ایک ادارہ ہوتی ہیں جو اثر بڑھانے اور قومی وسائل میں اپنے حصے کے لیے کوشش کرتی ہیں۔ سیاسی و معاشی استحصال کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے کسی ملک کے سیاسی و فوجی ڈھانچے کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

قومی وسائل میں مسلح افواج کا حصہ ان کے سیاسی اثر ورسوخ پر منحصر ہوتا ہے۔ فوج کی اندرونی معیشت کو سمجھنے کے لیے کسی ملک میں سول فوجی تعلقات کو سمجھنا ضروری ہے۔ دفاعی انتظامیہ کا اثر ورسوخ جتنا زیادہ ہوگا اس کے وسائل کی شفافیت اتنی ہی کم ہوگی اور دوسرے فریقین کے مقابلے میں اُس میں وسائل حاصل کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لیے سول فوجی تعلقات اور فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے ربط کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

ہماری گفتگو کا بنیادی استدلال یہ رہا ہے کہ تمام افواج کے منافع بخش سرگرمیوں میں ملوّث ہونے کے باوجود معاشی استحصال کی نوعیت کا انحصار سیاسی نظام اور ماحول کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ ان ریاستوں میں جہاں فوج سیاست دانوں کے تابع ہوتی ہے، ریاست کے اندر استحصال اور معاشرے اور معیشت میں فوج کی مداخلت کم گہری ہوتی ہے اور کنٹرول کی

جاسکتی ہے۔ایک سیاسی نظام مسلح افواج کو ایک اہم ادارہ سمجھتا ہے جو سیاسی کنٹرول یا وسائل میں حصے کے لیے کوشش کرتا ہے۔علاوہ ازیں ایسے سیاسی نظام میں فوج بنیادی طور پر پالیسی پرعمل کا ذریعہ ہوتی ہے دوسرے بالادست فریق جسے سیاسی اور اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مگر جہاں فوج زیادہ بااثر ہو، وہاں سیاسی نظام کی اجتماعیت کم ہوجاتی ہے۔سیاسی اثر و رسوخ بڑھنے سے افواج معیشت میں زیادہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور وسائل کی تقسیم میں سرپرستانہ یا بالادست کردار اپنا لیتی ہیں۔اگرچہ سیاست میں فوجی بالادستی کے تین ماڈلز میں مسلح افواج قومی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیےنظم ونسق یا سیاسی کنٹرول سنبھال لیتی ہیں۔ان کی اقتصادی سرگرمیاں رفاہِ عامہ کے لیےنہیں ہوتیں۔ان کا معاشی کردار ان کے سیاسی اثر و رسوخ کا نتیجہ ہوتا ہے۔درحقیقت فوج کی سیاسی قوت کی تصویر وسائل پر قبضہ کرنے کی صلاحیت کے تجزیے کے بغیر نامکمل ہے۔جنرلز ریاست کے محافظ کی حیثیت سے فوج کے بالادست کردار کو دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں تاکہ اپنے ارکان کے لیےفوائد حاصل کرسکیں۔اس طرح دفاعی ادارے کی لگاتار سیاسی قوت کے لیےاقتصادی دلیل دی جاتی ہے۔

سویلین حکام یا سیاست دان فوج کی اندرونی معیشت کوکم اہمیت دیتے ہیں۔جیسا کہ بعد میں پاکستان پر جائزے میں یہ بات سامنے آئے گی۔افسروں کے مالی مفادات جنرلوں کے مفادات کے لیے اہم سمجھے جاتے ہیں۔لیکن ان کا فوج کے سیاسی عزائم سےتعلق نہیں ہوتا۔یہ صحیح ہے کہ افسروں کو منافع بخش مواقع فراہم کرنے کے لیےفوج کا اقتدار حاصل کرنا ضروری نہیں، تاہم فوج کے اقتدار کوطول دینے یا فیصلہ سازی اورنظم ونسق پراس کا اثر بڑھانے سےاس کے افسروں کواقتصادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔جواس کے سیاسی اثر کو برقرار رکھنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔اس لیے سیاست میں فوج کا جتنا زیادہ اثر ہوگا، اتنے ہی زیادہ اعلیٰ افسروں کواقتصادی فوائد حاصل ہوں گے اوراس سےفوج کے اثر اورسیاسی کنٹرول کو برقرار رکھنے میں ان کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

سول وفوجی تعلقات کی چھ اقسام مسلح افواج کی طرف سے اقتصادی استحصال کی مختلف

سطحوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پہلی دو اقسام کا تعلق ان معاملات سے ہے جہاں دوسرے بالادست کھلاڑی اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے لیے فوج کو استعمال کرتے ہیں۔ ایسے معاملات میں فوج اقتصادی استحصال میں بنیادی کردار کی بجائے ثانوی حیثیت سے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ تاہم بعد کی اقسام میں اصل فائدہ فوج کو ہوتا ہے۔ مزید برآں مسلح افواج سرپرستانہ کردار ادا کرتی ہیں، اپنے سویلین حواریوں یا شریک کاروں کو سیاسی اور اقتصادی فوائد فراہم کرتی ہیں۔

اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ فوج کی مالیاتی اور سیاسی خودمختاری کا آپس میں تعلق کیا ہے۔ جبکہ ادارے کا سیاسی اثر سیاسی نظام کی نوعیت کے مطابق تبدیل ہوسکتا ہے۔ فوج کی مالیاتی خودمختاری سیاست اور پالیسی سازی پر اثر انداز ہونے کے لیے اس کی خواہش بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کاروباری سرگرمیوں کے نقطۂ نظر سے مسلح افواج کی سیاسی اور مالیاتی خودمختاری کے درمیان تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ بات سمجھنی چاہیے کہ سیاسی ماحول میں بھی فوج پالیسی سازی پر اثر انداز ہوکر وسائل کے زیادہ حصے کے لیے کوشش کرتی رہے گی۔ چونکہ فوج زیادہ حصہ حاصل کرنے میں ایک کلیدی عامل ہے اس لیے زیادہ مواقع کے لیے کوشش کرنا لازمی امر ہے۔ جیسا کہ امریکا، اسرائیل اور دوسرے سیاسی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں ہوا ہے۔

پاکستان جیسے ملک میں جس کے بارے میں اس جائزے میں تفصیل سے بحث کی جائے گی، مالیاتی خودمختاری سے ادارے کو مضبوط کرنے اور سیاست میں بالادست حیثیت حاصل کرنے میں فوج کی دلچسپی بڑھتی ہے۔ ملکی سیاست میں فوجی طاقت کا مستقل اور باقاعدہ شکل اختیار کرنا کسی ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے نیک شگون نہیں ہوتا۔ جب تک اندرونی یا بیرونی دباؤ فوج کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور نہ کرے، اس وقت تک فوج ریاست پر بالادست رہے گی۔

باب–2

پاکستانی فوج میں افسر شاہی کا فروغ
(1947ء سے 1977ء)

کسی بھی ریاست میں فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی کہانی دراصل قومی معیشت میں فوج کے سیاسی اثر ونفوذ کی داستان ہوتی ہے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں بیان کیا گیا کہ فوجی انتظامیہ کی طاقت اور خصوصاً اس کی قومی وسائل کا استحصال کرنے کی قوت اس کی مالیاتی خودمختاری کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔

اس باب میں ہم 1947ء سے 1977ء تک پاکستانی فوج کے سیاسی اثر ورسوخ پر نظر ڈالیں گے۔ اس تاریخی پس منظر میں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح فوج نے بتدریج اپنا سیاسی کردار بڑھایا اور کس طرح اس کی قوت میں اضافہ ہوا۔ اس عرصے میں پاکستانی فوج نے حکمرانہ رجحانات کا مظاہرہ کر کے ریاستی نظم ونسق پر اختیار حاصل کرلیا اور ایسا خاص طور پر 1958ء کے بعد ہوا۔

اگرچہ 1962ء میں بظاہر جمہوریت بحال کردی گئی لیکن پہلے فوجی آمر جنرل ایوب خان نے اپنے قول وفعل سے سویلین اداروں کو کمزور کردیا۔ اس نے ریاست اور سیاست پر ذاتی اختیار کے ذریعے فوجی بالادستی مسلط کی۔ ایوب خان کا ذاتی اقتدار 1969ء میں جنرل یحییٰ خان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ختم ہوا۔ تاہم اس تبدیلی سے فوجی اقتدار ختم نہیں ہوا بلکہ

ڈاکے پرڈاکا ڈالا گیا۔ اصل تبدیلی جو بہر حال عارضی تھی، 1972ء میں آئی جب بھارت سے جنگ میں فوجی شکست کے بعد جمہوریت بحال کردی گئی۔ مشرقی پاکستان کا گنوانا اورنوے ہزار فوجیوں کا ہتھیار ڈالنا اتنا بڑا سانحہ تھا کہ چند سال کے لیے فوج کو پس منظر میں جانا پڑا۔ مگر یہ تبدیلی بھی عارضی تھی، خاص طور سے 1977ء میں فوج کے دوبارہ اقتدار پر قبضہ کرنے تک۔

طویل فوجی اقتدار کی ایک وجہ سیاسی جماعتوں کی کمزوریاں تھیں۔ سیاسی قیادت اور سول افسر شاہی کی نااہلیت کی وجہ ان کے اپنے رویے تھے۔ سول افسر شاہی اور سیاسی اشرافیہ نے مسلح افواج کو ہمیشہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی اور اس طرح فوج کے لیے ایک منفرد سیاسی کردار تخلیق ہوا۔ سیاسی ثالث کے طور پر فوج کی قبولیت نے اسے قومی سلامتی کے محافظ کے علاوہ دیگر سیاسی فریقین پر بالادستی بخشی۔

حمزہ علوی کے مطابق پاکستانی ریاست ضرورت سے زیادہ پھل پھول گئی ہے جس میں فوج بالادست طبقات کی سیاست اور مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ مارکس کے مکتبۂ فکر کے ایک نمایاں دانشور حمزہ علوی نے حکمران طبقات کی سیاسی وسماجی بالادستی پر لکھتے ہوئے سول اور فوجی افسر شاہی کا موازنہ سیاسی جماعتوں سے کیا ہے۔ ان کے مطابق سیاسی قوتوں کی کمزوری اور فوج کی بالادستی نے ملک میں فوجی افسر شاہی کے اقتدار کو پروان چڑھایا۔

سول اور فوجی تعلقات کے ایک ماہر، ایمس پرل مٹر، جدید افسر شاہی کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ:

> یہ فوج کی ترقی کو مرکزی حیثیت دیتی ہے اور ایک حکمران قوت کے طور پر اس کی ہمت افزائی کرتی ہے... آئینی تبدیلیاں فوج کرتی ہے جو تمام سیاسی اداروں میں ایک غالب کردار ادا کرتی ہے۔☆1

فوج کا ادارہ

پاکستانی فوج سیاسی طور پر ملک کا سب سے بااثر ادارہ ہے۔ بعض لوگ تو اسے سب سے بڑی سیاسی جماعت سمجھتے ہیں۔ گو کہ 1973ء کے آئین کی دفعہ 245 کے تحت فوج کا

آئینی کردار سرحدوں کی حفاظت اور قدرتی آفات میں سویلین حکام کی مدد تک محدود ہے۔ اس آئین میں مسلح افواج کو دیا جانے والا یہ کردار 1956ء اور 1962ء کے آئینی کردار سے مختلف نہیں تھا۔

پاکستان میں فوج تقریباً ساڑھے چھ لاکھ افراد پر مشتمل ایک رضا کارانہ ملازمت ہے جس میں بری فوج تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ، فضائیہ پینتالیس ہزار اور بحریہ صرف پچیس ہزار افراد پر مشتمل ہے۔

فوجیوں کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے۔ اس تنظیم کی شناخت یوں اپنی نسلی یکسانیت سے ہوتی ہے۔ فوج کے تقریباً پچھتّر فی صد لوگوں کا تعلق پنجاب کے صرف تین اضلاع سے ہے جنھیں سالٹ رینج (علاقۂ نمک) کے اضلاع کہا جاتا ہے۔☆[2] باقی بیس فی صد لوگ صوبۂ سرحد کے چار اضلاع سے آتے ہیں۔ جب کہ سندھ اور بلوچستان کی نمائندگی فوج میں صرف پانچ فی صد تک محدود ہے۔ سندھیوں سے بھی کم تعداد میں بلوچ ہیں جن کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ لسانی ساخت ملکی سیاست میں خاصا اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس سے مختلف لسانی گروہوں کے باہمی تناؤ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فوج میں پنجابیوں کی بالادستی کے باعث اس ادارے میں بڑی یکسانیت ہے۔ فوج اب بھی ملازمتیں دینے کے لیے پرانا برطانوی طریقہ استعمال کرتی ہے جس میں چند علاقوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تین تائی ینگ کے مطابق برطانوی حکومت نے ''مارشل ریس'' یا جنگجو نسل کی اصطلاح استعمال کی اور اس میں پنجابیوں کو فوقیت دے کر بھرتی کیا۔ 1857ء میں بنگالی سپاہیوں کی بغاوت کے بعد بڑی تعداد میں پنجابی بھرتی کیے گئے۔☆[3] پنجابی مالی معاوضوں اور ترقی کے مواقع کے عوض انگریزوں کی خاطر لڑنے کے لیے بہت آمادہ تھے۔

انگریزوں نے فوج میں بھرتی کے جو رہنما اصول تحریر کیے، اس میں جنگجو نسل کی ذاتوں اور ذیلی ذاتوں کو ان مقامات تک جہاں سے وہ دستیاب ہوتے تھے، تفصیل سے بیان کیا ہے۔☆[4] اس کے نتیجے میں فوج میں پنجابیوں کا تناسب جو 1858ء میں صرف 32 تھا، 1910ء میں 53 فیصد تک پہنچ گیا۔☆[5]

مصطفیٰ کمال پاشا نے نوآبادیاتی سیاسی معیشت کے بارے میں اپنی کتاب "Colonial Political Economy" میں منتخب بھرتی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ ان گروہوں نے مغل دور میں ایک جنگی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن 1857ء سے قبل جنگجو نسل کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ صرف 1857ء کے واقعات کے بعد ہی انگریزوں نے بعض گروہوں کو نوآبادیاتی فوج سے سلسلہ وار بنیاد سے خارج کرنا شروع کیا۔☆[6]

پنجابیوں اور پٹھانوں کے جنگجو ہونے کے نظریے کو 1947ء میں آزادی ملنے کے بعد بھی مزید پھیلایا گیا اور مسلم افواج کی لسانی ساخت اور مراعات یافتہ حیثیت برقرار رکھی گئی۔ فوج میں بھرتی کے ان اصولوں کے باعث مرکز اور چھوٹے صوبوں میں کشیدگی بڑھی اور بنگالی، سندھی اور بلوچی افواج کو ایک قومی فوج سمجھنے کے بجائے پنجابی فوج سمجھنے لگے جس کا کردار استحصالی تھا اور جو بھاڑے پر کام کرتی تھی۔☆[7]

ایک دانشور ایرک نارڈلنگر کے مطابق فوج میں مغربی پاکستان کی جانب سے عدم توازن کی وجہ سے پاکستانی فوج کی لسانی ترکیب میں سماجی عدم توازن بھی پیدا ہوا۔☆[8] اور مارس جانوویز کی اس دلیل کو رد کرنے کے لیے کہ ترقی پذیر معاشروں میں فوج سویلین قیادت سے زیادہ باصلاحیت ہوتی ہے۔☆[9] نارڈلنگر کی دلیل یہ ہے کہ فوجی حکومتوں کی جانب سے کی جانے والی اصلاحات لازماً حکمراں طبقے کے مفادات کے لیے خطرہ نہیں بنتیں۔ مسلح افواج کے بالائی افسران، بالائی وسطی طبقوں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ دراصل مسلم افواج کے اعلیٰ افسران اشرافیہ کے ہی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔☆[10]

مصنف نے اس ضمن میں پاکستان کی مثال دی۔ پاکستانی فوج کی سماجی سیاسی حرکیات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ فوج اپنا سیاسی اثر اپنے لوگوں کی سماجی نقل پذیری کے لیے استعمال کرتی ہے۔ 1950ء کے بعد پاکستانی فوج میں کچھ نچلے طبقے کے لوگ بھی آئے لیکن اس سے فوج کے اندر کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آئی۔ فوجی افسران سرمایہ اکٹھا کرتے رہے اور اشرافیہ کے دیگر ارکان

کے برابر آنے کی کوشش کرتے رہے۔ خود فوج کے اندر بھی اعلیٰ افسران کے بچے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے زیادہ مواقع حاصل کرتے رہے ہیں۔ پھر اعلیٰ، درمیانی اور نچلے عہدوں کے افسران کے خاندان ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔☆[11] بحریہ کے لیے کام کرنے والی ایک ماہرِ نفسیات نے بتایا کہ فوجیوں کے زیادہ تر نفسیاتی مسائل ان کی سماجی تقسیم سے پیدا ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ اعلیٰ افسران اپنے بچوں کو نچلے افسران کے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے۔☆[12]

اس سماجی درجہ بندی کا اظہار فوج کے تینوں شعبوں یعنی بری، بحری اور فضائیہ کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ بری فوج کی طاقت بحریہ اور فضائیہ سے بہت زیادہ ہوتی ہے اور اکثر بری فوج، بحریہ اور فضائیہ کو خاطر میں نہیں لاتی اور قومی تحفظاتی منصوبوں میں بری فوج کی قیادت بقیہ دونوں کی اہمیت کو اس لحاظ سے دیکھتی ہے کہ وہ جنگ کے لڑائی کے منصوبوں کی حد تک کردار ادا کرتی ہیں۔

تینوں افواج میں تین ستاروں والے افسران انتظامیہ اور فیصلہ سازی میں بہت بااثر ہوتے ہیں لیکن پھر بھی چار ستاروں والے افسران حتمی اختیارات رکھتے ہیں۔ بری فوج کا سربراہ سب سے طاقتور ہوتا ہے اور بری فوج کی جاسوسی کے ادارے بحریہ اور فضائیہ کے ان اداروں سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔

بری فوج کی جاسوسی زیادہ تر سیاست دانوں اور سول سوسائٹی کے بارے میں ہوتی ہے۔ آئی ایس آئی بھی عملی طور پر آرمی چیف کو ہی جواب دہ ہوتی ہے جب کہ تینوں شعبوں کی انٹیلی جنس ایجنسی ہونے کی بنا پر اسے آئینی طور پر وزیراعظم کو جواب دہ ہونا چاہیے۔

بری فوج کے سربراہ کی طاقت جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے سربراہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ کمیٹی 77-1976ء میں تشکیل دی گئی تاکہ مسلح افواج کی مشترکہ منصوبہ بندی کی جاسکے۔ بظاہر تو اس کمیٹی کا سربراہ زیادہ اہمیت کا حامل ہونا چاہیے کیوں کہ مشترکہ منصوبہ بندی اس کی ذمے داری ہوتی ہے لیکن 1976ء میں ہونے والی فوجی تشکیلِ نو میں اس کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر کو تینوں مسلح افواج کے افرادِ کار اور عملی منصوبہ بندی پر کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔☆[13] نتیجہ یہ کہ تینوں افواج کے سربراہ 1976ء سے پہلے کی طرح ہی کام کرتے رہے اور انھیں عملی طور پر اپنی اپنی فوج پر مکمل اختیار حاصل رہا۔

یہ کمیٹی تینوں افواج کے اعلیٰ افسران کے مابین گفت وشنید کے لیے فورم کا کام کرتی ہے اور انتظامی معاملات یا وسائل سے متعلق فیصلے ایک ڈاک خانے کی طرح اِدھر سے اُدھر پہنچاتی ہے۔[14]☆ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بری فوج نے اس ادارے پر بھی اجارہ داری حاصل کرلی ہے۔ اس کمیٹی کا سربراہ اب باری باری فضائیہ، بری اور بحری افواج سے نہیں لیا جاتا بلکہ صرف بری افواج سے آتا ہے۔ آہستہ آہستہ بری فوج میں پایا جانے والا طاقت کا نشہ دیگر افواج میں بھی سرایت کرچکا ہے اور نچلے درجے کے عہدے دار بھی اس سے مبرا نہیں رہے۔ اعلیٰ افسران تو خود کو ملک کی سالمیت کا محافظ سمجھتے ہی تھے، اب معمولی عہدے دار بھی فوج کو قومی مفادات کا واحد نگراں اور ناقابلِ تسخیر سمجھنے لگے ہیں۔ سویلین لوگوں کو ''نااہل'' بے خلوص، بدعنوان اور حرص کا مارا سمجھا جاتا ہے۔

فوج کی تنظیم میں مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور سربراہوں کے پاس سب سے زیادہ اختیارات ہوتے ہیں۔ 1973ء سے پہلے بھی یہی صورتِ حال تھی جب ذوالفقار علی بھٹو نے ہر فوج کے سربراہ کے لیے کمانڈر اِن چیف کے بجائے چیف آف اسٹاف کا عہدہ متعارف کرایا اور اس طرح سول بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی۔ وزارتِ دفاع کو مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی اور تینوں افواج کو اس وزارت کے ماتحت کردیا گیا۔ وزیرِ دفاع پارلیمنٹ میں کابینہ کی دفاعی کمیٹی کو جواب دہ تھا۔ تاہم یہ کوششیں صرف تحریر تک محدود رہیں اور کوئی عملی شکل اختیار نہ کرسکیں۔

بری فوج کے سابق سربراہ جنرل جہانگیر کرامت کے مطابق فوج میں ذیلی کلچر (Sub Culture) کی اجازت نہیں۔ فوج میں کھل کر بولنے اور نظم وضبط سے غفلت برتنے کو پسند نہیں کیا جاتا۔ فوج میں بھرتی کے وقت ان شرائط کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے فوج اپنی اندرونی تنظیمی طاقت برقرار رکھنے کے لیے حفظِ مراتب کا خاص خیال رکھتی ہے۔

فوج کا بنیادی کردار

فوج نے آزادی کے بعد پاکستان میں محافظ بن کر مرکزی کردار حاصل کرلیا۔ 1947ء

کے بعد سے ریاست عدم تحفظ کا شکار تھی، اس میں فوج نے ریاستی محافظ کے طور پر خود کو مستحکم کیا اور بیرونی خطروں سے اندرونی طور پر فائدہ اٹھایا۔ ارجنٹائن میں بھی کم و بیش ایسا ہی ہوا تھا جب فوج کے زیرِ اثر ریاست نے قومی سلامتی کا ہوّا کھڑا کیا۔☆[16] پاکستانی فوج نے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے بنائی جانے والی ریاست کے تحفظ کا ذمہ لے لیا۔ اسٹیون کوہن (Stephen Cohen) نے پاکستانی فوج کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> کچھ افواج سرحدوں کی حفاظت کرتی ہیں، کچھ معاشرے میں اپنی حیثیت مستحکم کرنے میں لگی رہتی ہیں اور کچھ کسی نظریے کو بچانے میں مصروف ہوتی ہیں۔ جب کہ پاکستانی فوج یہ تینوں کام کرتی ہے۔☆[17]

فوج نے یہ تینوں کردار آزادی کے فوراً بعد ہندوستان کے ساتھ پہلی جنگ کے نتیجے میں اپنا لیے تھے، ملک کی پالیسی ساز اشرافیہ قومی سلامتی کو لاحق خطرات بھارت سے منسلک کرتی ہے۔ بھارت کے جارحانہ رویے کو پاکستان کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ آدھی صدی سے زیادہ عرصے تک اس بات کو پیٹا جا رہا ہے کہ بھارتی قیادت نے مسلمانوں کے آزاد ملک کو تسلیم نہیں کیا اور وہ پاکستان کے خاتمے کے درپے ہے۔

پاکستان کے پالیسی ساز بھارت کی علاقائی بالادستی کی خواہش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ نمایاں حیثیت حاصل کرنے کی کوئی بھی بھارتی کوشش پاکستان کے لیے خطرہ سمجھی جاتی ہے۔

1947-48ء میں ہندوستان سے ہونے والی پہلی جنگ نے ہی قومی سلامتی کے مسائل کھڑے کر دیے اور پہلے ہی سال کے بجٹ میں ستّر فی صد حصہ دفاع کے لیے مختص کر دیا گیا۔☆[18] نامور محقق حسین حقانی کے مطابق پہلی جنگ کے بعد ہی ''اسلامی پاکستان'' نے خود کو ''ہندو بھارت'' کے مقابل کھڑا کر دیا۔☆[19]

بھارتی خطرے کے باعث ہی پاکستانی فوج داخلی طور پر تمام فریقین سے نمایاں ہو گئی۔ اس پر طرّہ یہ کہ سویلین قیادت مسلح افواج پر سرسری سا اختیار ہی قائم کر پائی۔ حتیٰ کہ بابائے قوم بھی ابتدائی دنوں میں مسلح افواج پر سخت کنٹرول نہ رکھ سکے۔ پاکستانی فوج کے کمانڈر اِن چیف جنرل گریسی نے 1947-48ء میں کشمیر میں فوجیں بھیجنے سے انکار کیا تو محمد علی جناح کچھ نہ

کرسکے۔ مشہور پاکستانی مؤرّخ عائشہ جلال کا کہنا ہے کہ فوج نے حکم عدولی نہیں کی بلکہ انڈیا اور پاکستان کے مشترکہ کمانڈر اِن چیف جنرل آکنلک نے جناح کو کشمیر میں فوجیں بھیجنے کا فیصلہ بدلنے پر راضی کرلیا۔[20] اس کے برعکس کوہن (Cohen) کے مطابق بابائے قوم خود فوج پر کمزور کنٹرول کے ذمے دار تھے کیوں کہ انھوں نے اہم فوجی فیصلے جنرل گریسی پر چھوڑ دیے تھے۔[21] بہرحال جو کچھ بھی ہوا ہو، اس پہلی جنگ نے ہی اس بات کا فیصلہ کردیا کہ پاک بھارت تعلقات کشیدہ رہیں گے۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اے آر صدیقی کا خیال ہے کہ کشمیر میں قبائلیوں کو بھیجنے سے جنگ شروع ہوئی اور پاکستانی ریاست پر فوجی بالادستی کا آغاز ہوا۔[22]

اس پہلے فوجی تصادم کے بعد پاکستان کشمیر کے غیر تصفیہ شدہ مسئلے پر بھارت کے خلاف ڈھائی جنگیں اور لڑ چکا ہے۔ فوجی انتظامیہ اور پالیسی ساز اشرافیہ مسئلۂ کشمیر کو پاکستانی سلامتی کے لیے فیصلہ کن اہمیت کا حامل گردانتا ہے۔ سابق صدرِ پاکستان اور فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف کے الفاظ میں ''کشمیر ہمارے (پاکستانیوں کے) خون میں دوڑ رہا ہے۔''[23] بہرحال یہ مسئلہ ہندوستان کے ایک بڑے ادراک کا ایک حصہ ہے جو خلقی طور پر پاکستان سے معاندانہ تعلق رکھتا ہے۔ مشرف جیسے فوجی رہنماؤں کو یقین ہے کہ مسئلۂ کشمیر حل ہونے پر بھی ضروری نہیں کہ بھارت سے کشیدگی کم ہوجائے، اس لیے 2004ء کے بعد بھارت سے امن مذاکرات کے باوجود روایتی دشمن کے ساتھ دوستی کرنے کے لیے فوج کی سوچ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

غالباً فوج اندرونی سیاسی وسلامتی کے مسائل کو بیرونی خطرات کا تسلسل سمجھتی ہے۔ ملک میں لسانی اور فرقہ وارانہ تشدد میں اضافہ بھارت کے مذموم عزائم سے جوڑا جاتا ہے۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ بھارتی اشاروں اور امداد کے بغیر مختلف لسانی اور فرقہ وارانہ گروہ ملک میں گڑبڑ نہیں کرسکتے۔ حسین حقانی اور حسن عباس اس تاثر سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں لسانی اور فرقہ وارانہ تشدد فوجی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ مذہبی اور لسانی گروہوں کو کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ فوج قومی سلامتی کا رونا روتی رہے۔[24] فوج نے مذہبی گروہوں کو موقع دیا کہ وہ ہر ایسے محاذ پر اپنے لوگ تعینات کرسکیں جہاں مدد کی ضرورت ہو۔

قومی تحفظ کی خاطر ریاست کے لیے فوج کی افادیت پر بحث اس بات کو یاد دلاتی ہے کہ فوج کے مفادات ریاستی پالیسیوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بالکل ہندوستان کی طرح غلط پالیسی اور خراب حکمرانی ملکی بے چینی اور سماجی سیاسی انتشار کے لیے براہِ راست ذمے دار ہے۔فوجی تنظیم ملکی پالیسیوں کو خارجی خطرات کے تناظر میں دیکھتی ہے۔

اس طرح فوج بلوچستان، سندھ اور قبائلی علاقوں میں گڑبڑ کا ذمے دار بھارت کو قرار دیتی ہے تاکہ بھارت سے بچانے کے لیے فوج کا کردار اور جواز باقی رہے۔اس کو بنیاد بنا کر فوجی قیادت مسلح افواج کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں لگی رہتی ہے اور بھارت سے ہر طرح کے ثقافتی، تجارتی اور دیگر تعلقات کو قومی سلامتی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

فوج کا ثانوی کردار

جنگیں لڑنے کے علاوہ پاکستان کی مسلح افواج ملک کی سرحدوں کے اندر بہت سی سرگرمیوں میں شامل رہی ہیں۔ ان میں سڑکیں بنانا، بجلی چوری کرنے والوں کو پکڑنا، تجارتی منصوبے چلانا، بدعنوان عناصر کی بیخ کنی اور ریاست تک چلانا شامل ہے۔فوج خود کو ایک ایسا متبادل ادارہ سمجھتی ہے جو ملک کی سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی میں حصہ لیتا ہے۔دراصل اب یہ کردار فوج کے بنیادی کردار کا حصہ بن چکا ہے۔

پاکستان کی مسلح افواج سے متعلق ایک مکتبِ فکر وہ ہے جسے ہم ''پروپیگنڈا'' کہہ سکتے ہیں۔ایسی تحریریں قومی ترقی میں فوج کے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہیں، ان میں جنرل فضل مقیم خان، جنرل ایوب خان، رے منڈ مور (Raymond Moore)، برائن کلفلی (Brian Cloughly) اور پرویز چیمہ جیسے لکھنے والے شامل ہیں، جو فوج کو قوم کا معمار سمجھتے ہیں۔ دراصل سیاست اور نظم ونسق میں فوجی اثر ورسوخ کو فوج کے مثبت کردار سے جوڑا جاتا ہے۔ یہ دعوے کیے جاتے ہیں کہ فوج سیاست اور نظم ونسق میں اس لیے آئی کہ وہی سب سے جدید اور اہل ادارہ ہے۔☆25 ان کے مطابق چونکہ سیاسی قیادت نااہل ہوتی ہے اس لیے فوج کو نہ چاہتے ہوئے بھی سیاست میں داخل ہونا پڑتا ہے۔اور مقیم خان کے مطابق فوج ''سیاست

اور جماعتوں سے بالاتر ہے۔فوج کے افسروں اور جوانوں کی کارکردگی ملک وقوم کے لیے ان کی قربانیوں کا عکس ہوتی ہے اور اسی لیے فوج نے خود کو پاکستان میں استحکام قائم رکھنے والی سب سے بڑی قوت ثابت کردیا ہے۔''☆26

سیاسی اداروں کی نااہلیت کے مقابلے میں فوج کا تنظیمی نظم و ضبط ہی فوج کی سیاسی مداخلت کا جواز فراہم کرتا ہے۔☆27 غیر مغربی ممالک میں فوج کے مثبت کردار کو کئی مغربی مصنفین نے موضوع بنایا ہے جن میں سیموئیل پی ہن ٹنگ ٹن (Samuel P. Huntington) بھی شامل ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق بدتہذیب سیاست دانوں کے مقابلے میں افواج بہتر طور پر تعمیرِ ملت کرسکتی ہیں۔ چیمہ کے خیال میں ناخواندگی کے باعث جمہوریت کمزور ہوتی ہے لیکن اس بات کی وضاحت پیش نہیں کی جاتی کہ ایسی ہی ناخواندگی کے باعث بھارت میں سیاسی ادارے کمزور کیوں نہیں ہوئے۔

اس طرح کا پروپیگنڈا فوج کو ایک غیر جانب دار سیاسی ثالث کے طور پر پیش کرتا ہے جو اندرونی اور بیرونی خطرات سے ریاست کا دفاع کی خواہش مند ہے۔لہٰذا کلاوَلی جیسے مصنفین ذوالفقار علی بھٹو (1977-1971ء) اور محمد خان جونیجو (1988-1985ء) جیسے وزرائے اعظم کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ہی سیاسی حکومتوں کی برطرفی کا صحیح تجزیہ کرتے ہیں۔☆28 اس صورتِ حال میں فوج کو متحارب سیاسی قوتوں کے درمیان اور عوام اور ''بدعنوان'' سیاسی حکومتوں کے درمیان ثالث بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔فوجی افسران بھی اس نقطۂ نظر کے حامل ہوتے ہیں اور سویلین لوگوں اور اداروں کی نااہلی کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ تو نہروں کی صفائی اور اسکولوں☆29 کی دیکھ بھال کا کام بھی نہیں کرسکتے، جس کے لیے فوج کو بلایا جاتا ہے۔تاہم ایسے ثانوی کام تو فوج ساری دنیا میں کرتی ہے لیکن خود کو سویلین سے بہتر نہیں سمجھتی۔

فوج سیاست اور نظم ونسق میں

بہرحال، درجِ بالا نقطۂ نظر کی سب لوگ توثیق نہیں کرتے۔ پاکستانی سیاست پر بعض دیگر لکھنے والے سیاست اور نظم ونسق میں فوج کے کردار کو اس کی تنظیمی صلاحیتوں کا تسلسل نہیں سمجھتے

اور نہ ہی سیاسی قیادت کی نااہلی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ دوسری قسم کی تصنیفات جنھیں یہاں جوابی سازشی کہا گیا ہے، فوج کے متعدد کرداروں کا تجزیہ بڑے تنقیدی نقطۂ نظر سے کرتی ہیں۔☆[30] ان مصنّفین میں عائشہ جلال، سعید شفقت، حسین حقانی، حسن عباس وغیرہ شامل ہیں جو فوج کو انتہائی سازشی گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں فوج خود اپنے مفادات کے لیے ریاست اور اس کے سیاسی نظام کو کھوکھلا کر کے اپنے کردار میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔

مثال کے طور پر عائشہ جلال فوج کے سیاسی اثر و رسوخ کو فوج کے امریکا اور برطانیہ سے تعلقات کا تسلسل سمجھتی ہیں۔ ان دونوں ملکوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پاکستانی فوج کو استعمال کیا۔ یہ باہمی تعلق پاکستانی فوج کے مفاد میں تھا، اس لیے فوج نے خود کو ان دو عالمی طاقتوں کا آلۂ کار بنا کر اندرونی طور پر بھی خود کو مضبوط کیا۔ یعنی فوج نے خود کو کرایے پر اٹھا کر مادّی فوائد حاصل کیے اور امریکا اور برطانیہ نے پاکستانی فوج کے ہاتھوں جمہوریت کی بیخ کنی پر خاموشی سادھے رکھی۔ اس طرح ایک طرف تو ہتھیار ملے اور دوسری طرف سیاسی اداروں کے بجائے سول اور فوجی افسر شاہی دونوں مضبوط ہوئیں۔ عائشہ جلال کے خیال میں 1947ء کے بعد فوج جس کمزوری کو محسوس کر رہی تھی، بیرونی امداد نے اُسے مضبوطی میں بدل دیا۔☆[31]

سعید شفقت بھی عائشہ جلال کے خیالات کی تائید کرتے ہیں۔☆[32] ان کے مطابق واشنگٹن کی مدد سے ہی پاکستانی فوج سیاسی طور پر مضبوط ہوئی ہے۔ یہ مدد ہتھیاروں اور تکنیکی امداد کی شکل میں دی گئی جس سے سول سوسائٹی کے مقابلے میں فوج حاوی ہوگئی۔ ہتھیاروں کا لالچ دے کر امریکا نے اسلام آباد کو اپنا مطیع بنایا اور فوج بھی بھارتی خطرے کا ہوّا کھڑا کر کے اپنے مفادات پورے کرتی رہی۔ چین کے ساتھ تعلقات بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

امریکا کے ساتھ تعلقات بطورِ خاص سیاسی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ پاکستان میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مسلح افواج نے امریکا کی مدد سے ہی سویلین اداروں اور دیگر فریقین کو کمزور کیا۔ تاہم ایک سابق امریکی سفارت کار ڈینس ککس (Dennis Kux) جوابی سازش والے نظریے سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ پاکستانی فوج کے لیے امریکی مدد کو ایک تاریخی حادثہ یا پاکستان میں فوجی حکومتوں کی ایک بہتر صلاحیت کا ثبوت سمجھتے ہیں۔☆[33]

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکا کے فوجی مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر امریکی حکومتوں نے ضمیر میں کسی چبھن کے بغیر پاکستان اور دوسرے ملکوں کی فوجی حکومتوں کی بھرپور مدد کی اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کسی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ فوج کو امریکی تربیت اور تکنیکی امداد سے افواج سماجی و معاشی طور پر زیادہ متحد ہوکر ریاست پر قبضے کے قابل ہوجاتی ہیں۔ درجِ بالا دونوں مکاتبِ فکر پاکستانی سیاست کے صرف فوجی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن مکمل تصویر پیش نہیں کرتے۔☆[34]

فوج تو ریاست کو چلا رہی ہے لیکن دیگر فریقین کے کرداروں کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ یہ تجزیہ ہونا چاہیے کہ سول سوسائٹی نے فوج کا مقابلہ کیوں نہیں کیا جیسا کہ بنگلہ دیش میں ہوا تھا۔ پاکستان میں 1960ء کے عشرے کے اواخر کے بعد سول سوسائٹی نے فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجنے کی کوئی بڑی جدوجہد نہیں کی ہے۔

یہاں سیاسی اداروں کی کمزوری کا بھانڈا پھوڑنا ضروری ہے۔ کیا سیاسی قوتیں فطری طور پر کمزور تھیں یا انھیں کھوکھلا کیا گیا؟ پاکستانی ماہرینِ سیاسیات سعید شفقت☆[35] اور محمد وسیم سویلین اداروں کی کمزوری اور فوجی اثر و رسوخ میں اضافے کا ذمے دار سول افسر شاہی کو ٹھہراتے ہیں۔ سول افسر شاہی کے کاندھوں پر چڑھ کر ہی فوج عوام پر نازل ہوئی۔ اقتدار پر پہلا شب خون 1958ء میں سول اور فوجی افسر شاہی کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے اقتدار سول انتظامیہ میں اعلیٰ ترین افسر شاہی کے پاس ہی تھا۔☆[36]

اقتدار پر فوجی قبضے کی اصل وجہ سیاسی قوتوں اور سول افسر شاہی کی جنگ ہی تھی۔ آزادی کے بعد پاکستان میں انتظامیہ یا افسر شاہی کا مطلب تھا، ''دفاتر میں بیٹھنے والے ایسے عہدے دار جو سیاسی جماعتوں کو دلّال بنادیں جو عوامی تعلقات کو اپنے مفاد میں موڑ دیں۔''☆[37]

انتظامیہ اور مقنّنہ کے درمیان طاقت کا توازن برطانوی دور سے ورثے میں ملا تھا۔ برطانیہ نے بھارت پر ریاستی افسر شاہی کے ذریعے ہی حکومت کی تھی۔☆[38] آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا اور سول اور فوجی افسر شاہی نے ریاست اور سیاست میں دخل دینا شروع کردیا۔ سیاسی قوتوں کی کمزوری دراصل سول سوسائٹی اور سیاسی طبقے کے انتشار کی نشانی تھی۔☆[39]

سیاسی قوتوں کے گہرے اختلافات سے پاکستانی معاشرے کی منقسم نوعیت ظاہر ہوتی تھی جس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔☆[40] سیاسی تجزیہ نگار ایڈورڈ فیت کے مطابق ایسے معاشرے افسر شاہی کی آخری حدوں کو چھونے لگتے ہیں۔☆[41] معاشرے کا ہر گروہ اپنے مفادات کے لیے عارضی اتحاد بناتا اور توڑتا رہتا ہے۔ اس طرح اداروں کی تعمیر نہیں بلکہ تباہی ہوتی ہے۔ کسی غیر جانب دار سیاسی ثالث کے نہ ہونے سے مختلف سماجی گروہ فوج کو ایک ایسا ریفری سمجھنے لگتے ہیں جو مختلف سیاسی قوتوں کے مابین تصفیہ کرا سکے۔☆[42]

مختلف گروہوں کے درمیان اس جوڑ توڑ پر حمزہ علوی نے خوب بحث کی ہے۔ اُن کے خیال میں پاکستان کے سیاسی اداروں کی کمزوری دراصل ضرورت سے زیادہ بڑھنے والی ریاست کا بحران ہے۔ ان کے مارکسی تجزیے میں نوآبادیاتی قبضے سے آزاد ہونے والی ریاستیں ضرورت سے زیادہ پھل پھول کر مضبوط سول اور فوجی افسر شاہی کو پروان چڑھاتی ہیں جس سے سیاسی ادارے کمزور ہوئے اور جس سے کبھی نہ ختم ہونے والا سیاسی بحران پیدا ہوا۔☆[43] اس طرح حتمی ثالث کا کردار جمہوری ادارے نہیں بلکہ سول اور فوجی افسر شاہی ادا کرتی ہے۔

حمزہ علوی کے خیال میں ریاست کا مرکزی کردار یہ ہے کہ وہ دیگر گروہوں کے مفادات کے لیے کام کرے جن میں تین بالادست طبقات یعنی جاگیردار، مقامی سرمایہ دار اور شہری سرمایہ دار شامل ہیں، جو طاقت کے لیے نبرد آزما رہتے ہیں۔☆[44] گو کہ تھوڑی بہت معاشی تقسیمِ نو بھی ہو جاتی ہے اور جدید طریقۂ پیداوار بھی آجاتے ہیں پھر بھی سرمایہ داری سے پہلے کا نظام چلتا رہتا ہے۔☆[45]

فوج بھی ان تینوں گروہوں سے ملی بھگت کر لیتی ہے اور سب ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ چونکہ بالادست طبقات فوج پر انحصار کرتے ہیں، اس لیے فوج تو آسانی سے سویلین اداروں میں سرایت کر جاتی ہے لیکن سویلین ادارے فوج میں داخل نہیں ہو پاتے۔

حمزہ علوی کے خیال میں ذوالفقار علی بھٹو جیسے رہنماؤں کی سیاسی غلطیاں اُن کی شخصی غلطیاں نہیں بلکہ ایک ایسے سیاسی و معاشی نظام کی عکاس ہوتی ہیں جسے ضمنی سرمایہ کاری یا Peripheral Capitalism کہا جا سکتا ہے۔☆[46] سوشلسٹ نظریے کا نعرہ لگائے بغیر بھٹو

بائیں بازو کے لوگوں کو اپنا ساتھی نہیں بنا سکتا تھا۔☆47 لہٰذا حسین حقانی کے مطابق فوج کے مقابلے میں سیاست دانوں کی نااہلی صرف ان کے بھولے پن کے باعث نہیں ہوتی بلکہ اس کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔☆48

حمزہ علوی کے خیال میں سول اور فوجی افسر شاہی کی تربیت میں یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ اُن کا کام ''پیشہ ور'' سیاست دانوں سے ملک وقوم کو بچانا ہے۔☆49 اسی لیے فوج نے ریاست پر بالادستی کو اپنا حق سمجھنا شروع کر دیا۔☆50 اور اس عمل کے دوران گزرتے کے وقت ساتھ ساتھ زمینوں اور پُرکشش عہدوں پر قبضے شروع کر دیے۔☆51

علوی کا نظریہ اس تعاون اور تصادم کی وضاحت کرتا ہے جس کا مسلح افواج سمیت مختلف کرداروں میں مشاہدہ کیا جاسکتا تھا۔ مصنف کے بیرونی سرمایہ داری کے حدود میں دیکھنے سے تینوں غالب کرداروں کے درمیان تناؤ کو اور مختلف اوقات میں مسلح افواج پر ان کے قابو پانے کی کوشش کو دیکھنا قابلِ فہم تھا۔ ذاتی مفادات سے متاثر ہوکر اور ریاستی آلات میں بیوروکریسی کی مرکزیت سے واقف ہوکر سیاسی کھلاڑی فوجی اداروں اور تشدد کے ہتھیاروں پر مختلف ذرائع سے قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، نئے قانونی کنٹرول کی تخلیق جن میں سینئر افسروں کو خریدنا، فوجی سربراہ کو بدلنا اور متبادل فوجی ادارے قائم کرنا شامل ہیں، بعض ایسے کام ہیں، جن سے مسلح افواج پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔

چنانچہ پاکستان میں اُن بے ڈھنگے قسم کے سول فوجی تعلقات اُن کے مخصوص سماجی معاشی حالات کے پس منظر میں اور ایک خاص ریاستی ساخت کے حوالے سے سمجھنے جانے چاہییں۔ فوج حادثاتی طور پر اقتدار میں نہیں آئی بلکہ مختلف گروہوں کی غیر ارادی طور پر رسّا کشی میں خود کامیاب ہوئی۔ فوج کو اقتدار کے واسطے استعمال کرنے کی خواہش ریاست اور اس کی بیوروکریسی کی غیر جانب داریت کو ختم کر دیتی ہے۔ وہ فوج کو اپنے اقتدار کے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے، لہٰذا سیاست داں یا دوسرے سویلین کردار عامل اور نمائندے والی ایسی شراکت قائم کرنے میں ناکام رہتے ہیں جس میں فوج سویلین ریاست کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس باب کے اگلے حصے میں ہم دیکھیں گے کہ فوج پر حکمران طبقات کے انحصار سے کس طرح مسلح افواج مضبوط ہوئی ہیں؟

اقتدار کی ابتدا (1947-1958ء)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی بھارت سے اس کی جو پہلی جنگ ہوئی، اس کے نتیجے میں فوج شروع سے نمایاں حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ 1948ء میں بابائے قوم کی وفات کے بعد پاکستانی سیاست گروہ بندی کا شکار ہوگئی۔ سیاسی معرکہ آرائی تین محاذوں پر ہوئی:

(1) ریاست پر اختیار کے لیے مختلف سیاسی گروہوں کے درمیان

(2) سیاسی طبقے اور سول اور فوجی افسر شاہی کے درمیان

(3) فوج اور دیگر بالادست سویلین فریقین کے درمیان

سیاسی قیادت نے اپنے استحکام کے لیے آمرانہ ہتھکنڈے استعمال کیے اور ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کیا، مثلاً پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان اپنے مفادات کے لیے پنجاب میں سیاست دانوں کے ساتھ جوڑ توڑ کرتے رہے۔ تاہم جب پنجاب میں مسلم لیگ کے سرکردہ رہنما ممتاز دولتانہ کا پلّہ بھاری ہونے لگا تو لیاقت علی خان نے گورنر جنرل سے صوبائی اسمبلی تحلیل کرادی اور صوبے پر مرکزی حکومت کا راج مسلط کردیا۔ یہ صورتِ حال دوسال تک رہی اور مارچ 1951ء میں پنجاب کے انتخابات پر ختم ہوئی۔☆[52]

مختلف گروہوں میں کشیدگی، مرکزی سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ میں شہری اور دیہی عناصر کی رساکشی اور مرکز اور وفاق کی اکائیوں کے درمیان کھینچا تانی کی وجہ سے ملک کا آئین بنا مشکل ہوگیا۔ پہلا آئین آزادی کے نو سال بعد 1956ء میں نافذ کیا گیا۔ سیاسی جماعتوں کے درمیان گروہ بندی نے سیاست کو علاقہ واری خطوط پر بھی تقسیم کردیا۔☆[53]

عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کو اپنا محور بنایا تو مسلم لیگ نے مغربی پاکستان کو۔ اس قسم کی سیاسی گروہ بندیوں کی وجہ سے حکومت بار بار ختم ہوتی رہی۔ 1947ء سے 1958ء تک پاکستان میں سات وزرائے اعظم اور آٹھ کابینہ حکومت میں رہیں۔☆[54] تاہم سیاسی اشرافیہ کے شاہانہ رویے اسے عوام سے ممتاز کرتے رہے۔ نہ صرف یہ کہ برطانوی عہد کے روایتی ''ملٹری

سیکریٹری'' وغیرہ قائم رکھے گئے بلکہ اُن تک عوام کی رسائی ناممکن ہوگئی۔☆[55] ان رویوں سے سیاست دانوں کی ساکھ خراب ہوتی گئی۔

اس سیاسی افراتفری کا فائدہ دیگر داخلی قوتوں، خاص طور پر افسر شاہی نے اٹھایا اور ریاست پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔ سول افسر شاہی بھارت میں اتنی ہی مضبوط تھی جتنی ہندوستان میں تھی مگر فرق یہ تھا کہ وہاں بھارتی سیاست دانوں کی بالادستی کو تسلیم کیا جاتا تھا، نہ کہ فوج کی۔ پاکستانی سول افسر شاہی نے فوج کا ساتھ دے کر سیاسی قیادت کو دبایا۔ سول افسر شاہی کو غلام محمد جیسے نمائندے مل گئے جو افسر شاہی سے سیاست داں میں تبدیل ہو گئے تھے اور سیاست دانوں کو قابو میں رکھنے کے لیے وہ سویلین وزرائے اعظم کے بجائے فوجی جرنیلوں پر بھروسا کرتے رہے۔

1954ء میں غلام محمد نے وزیراعظم بوگرہ سے ناراض ہونے کے بعد جنرل ایوب خان سے کہا کہ وہ حکومت پر قبضہ کر لے۔☆[56] غلام محمد کا جانشین اسکندر مرزا بھی جو افسر شاہی سے تعلق رکھتا تھا، فوج پر اتنا ہی بھروسا کرتا تھا۔ مرزا اور ایوب خان کی دوستی کی بدولت فوج ریاستی کاموں میں دخیل ہوتی گئی۔☆[57] لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) چشتی کے مطابق سویلین حکومت نے جب 1954ء میں ایوب خان کو ریٹائر کرنے کے بجائے کابینہ میں عہدہ دیا تو اس سے سیاسی اقتدار کمزور ہوا۔☆[58] فوج کے سربراہ کو رعایتیں دینے سے ایوب خان اور گورنر جنرل کے درمیان سازشی تعلق مضبوط ہوا جس سے سول اور فوجی افسر شاہی دونوں کو فائدہ پہنچا۔

سعید شفقت کے خیال میں ایوب۔مرزا اتحاد کے ذریعے سول افسر شاہی نے مسلح افواج کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کی۔☆[59] 1956ء میں پہلا آئین نافذ ہونے کے بعد گورنر جنرل کا عہدہ ختم ہوگیا تو اسکندر مرزا ایک طاقتور صدر بنے رہنے پر اصرار کرنے لگا۔ اپنے فوجی دوست کی وفاداری برقرار رکھنے کے لیے مرزا نے ایوب خان کی کمانڈر ان چیف کے عہدے پر دو مرتبہ یعنی پہلی بار 1954ء میں اور دوسری بار 1958ء میں توسیع کی۔☆[60] ان ذاتی مراعات سے سویلین قیادت کو بڑا نقصان پہنچا۔ فوج سے جونیئر پارٹنر والا سلوک نہیں کیا جاسکتا تھا اور بلند منصب اور ماتحت والا رشتہ الٹ گیا۔ 1958ء کے آتے آتے سول حکمران اسکندر مرزا نے مارشل لا لگایا تھا۔ صرف بیس دن بعد 27 اکتوبر کو ایوب خان نے اسکندر مرزا کا تخت الٹ

دیا اور فوج کی بالادستی قائم کر دی۔

اس سے اعلیٰ فوجی قیادت کو بہت فائدہ پہنچا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ فوج کی ابتدائی قیادت اتفاق سے ہی اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچی تھی۔ ایوب خان اور جنرل یحییٰ دونوں اپنے شان دار پیشہ ورانہ ماضی کی بنیاد پر کمانڈر اِن چیف نہیں بنے تھے۔ ایوب تو خوش قسمتی سے اس عہدے پر پہنچا جب کہ یحییٰ خان کو ایوب نے فوج میں اپنے وفادار اتحادی کے طور پر پروان چڑھایا۔☆61 بعد کے کمانڈروں نے ان دونوں کی تقرریوں اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر شک و شبہے کا اظہار کیا ہے۔☆62 یہ دونوں موقع پرست اور ذاتی اقتدار کے بھوکے تھے۔ 1958ء کے بعد اعلیٰ فوجی افسروں نے ذاتی معاشی فائدے بھی حاصل کرنے شروع کر دیے، مثلاً متروکہ زمینوں پر قبضے وغیرہ جو پہلے سویلینز کی ملکیت تھیں اور جنھیں ہندو تارکینِ وطن نے فوجی چھاؤنیوں میں چھوڑا تھا۔☆63 یوں اب وہ موقع آیا جب فوج نے ان جائیدادوں پر قبضے کے ریاستی حقوق کو چالاکی سے ختم کر دیا۔

رفتہ رفتہ فوج نے دفاع اور خارجہ پالیسی کا اختیار حاصل کر کے خود کو ریاستی کاموں کے لیے موزوں بنانا شروع کر دیا۔ سیاسی قیادت اتنی منتشر تھی کہ فوج اور قومی سلامتی کے مسائل کو اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکی۔ سینئر جنرلوں اور خصوصاً ایوب خان نے جو پہلے کمانڈر اِن چیف تھے، دفاعی معاملات کو فوجی اختیار میں رکھنے پر زور دیا۔ حمیدہ کھوڑو نے اپنے والد محمد ایوب کھوڑو کی سوانحِ حیات میں، جو سندھ میں ایک مسلم لیگی رہنما تھے، لکھا ہے کہ ایوب خان مسلح افواج سے متعلق تمام معاملات پر اپنی گرفت قائم رکھنا چاہتا تھا، مثلاً ایوب خان نے وزیرِاعظم سر فیروز خان نون کے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا کہ ایک سویلین وزیرِ صنعت فوجی ساز و سامان کی خریداری کے فیصلے کرے۔ ایوب خان کی یہ بھی خواہش تھی کہ وزیرِاعظم ایوب خان کے عہدے میں تیسری مرتبہ توسیع کرے۔☆64 سیاسی اور فوجی قیادت کے درمیان تضاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1958ء میں فوج نے پہلی مرتبہ براہِ راست ملکی اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

فوج کے لیے دفاع اور خارجہ پالیسی پر بالادستی اس لیے بھی ضروری تھی کہ دفاعی بجٹ مرکزی حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ یعنی تقریباً 68 فی صد تھا۔☆65 ترقیاتی اخراجات اور

مرکز اور صوبوں کے تعلقات کو بھارتی خطرے کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ مرکزی حکومت کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ صوبوں کو مجبور کر کے وسائل فوج کو مضبوط کرنے پر لگائے۔

مسلح افواج نے اپنے ادارے مضبوط کرنے کے لیے امریکا سے اپنے اتحاد کو مضبوط کیا۔ بھارتی خطرے کا احساس کم کرنے کے لیے سول اور فوجی قیادت نے بڑی فوجی طاقتوں سے رابطے استوار کیے۔☆[66] آزادی کے بعد جناح کے دور سے ہی سیاسی رہنماؤں نے امریکا کو ایسا ''سرپرست'' بنانا چاہا جو بھارت کو دور رکھنے کے لیے فوجی اور سفارتی مدد دیتا رہے۔☆[67]

کہا جاتا ہے کہ فوج کے کمانڈر اِن چیف ایوب خان نے کابینہ کی منظوری کے بغیر اپنی مرضی سے امریکا کا دورہ کیا تاکہ فوجی اور معاشی مدد مانگی جاسکے۔☆[68] بعد میں ایوب خان نے سینٹو (CENTO) میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا جس سے فوج کو بہت فائدہ ہوا۔ دوسری جانب واشنگٹن بھی پاکستانی فوج کو کمیونسٹ سوویت یونین کے مقابل اپنے مفادات کی تکمیل کا آلۂ کار سمجھتا تھا۔ امریکا سے ملنے والی مالیاتی اور فوجی مدد سے مسلح افواج کو بہتر تربیت اور ٹیکنالوجی حاصل ہوئی۔ کوہن کے مطابق اس فوجی اور تکنیکی تعاون سے مسلح افواج کا تنظیمی ڈھانچا بھی مضبوط ہوا اور ساکھ بھی بہتر ہوئی۔☆[69]

بہتر تنظیمی صلاحیتوں کی بدولت فوجی قیادت کا دیگر فریقین کے مقابلے میں اعتماد بڑھا اور فوج کی ساکھ ایک مستعد ادارے کے طور پر بننے لگی۔ دراصل مغربی ممالک تکنیکی مہارت کو جدید رویوں کی علامت سمجھنے لگے تھے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سیاسی قیادت نے بھی فوجی سیکورٹی کے علاوہ اور کوئی متبادل قومی لائحۂ عمل ترتیب دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے قیامِ پاکستان سے اب تک یہ مسلمانوں کا ایک ایسا غیر محفوظ ملک ہے جسے صرف فوجی طاقت سے بچایا جاسکتا ہے۔ اسی سوچ کے باعث مسلح افواج مسلسل مضبوط ہوتی رہیں۔

اقتدار میں شمولیت (1958-1971ء)

1958ء سے 1971ء کے درمیان پاکستان میں سول فوجی تعلقات فیصلہ کن طور پر

تبدیل ہوئے اور فوج نے خود کو کلیدی قوت کے طور پر مستحکم کرلیا۔ فوج نے شروع میں تو مارشل لا نافذ کر کے براہِ راست حکومت کی پھر ایوب خان نے 1962ء میں ملک میں دوسرا آئینہ نافذ کر کے اپنا شخصی اقتدار مسلط کر دیا جس میں وہ فوج کا سربراہ اور پھر فیلڈ مارشل کے عہدے پر فائز رہا۔ تیسری تبدیلی 1969ء میں آئی جب ایوب خان کو فوج کے سربراہ یحییٰ خان نے ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرلیا اور پھر بالآخر 1971ء میں شرم ناک شکست کے بعد فوج کو سیاست سے نکلنا پڑا۔

عام طور پر ایوب خان اور یحییٰ خان کے فوجی اقتدار کو دو الگ الگ حکومتیں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ ایک ہی فوجی حکمرانی کا تسلسل تھا اور فوج لمبے عرصے تک ریاست پر قبضہ برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ تبدیلی صرف اعلیٰ ترین قیادت میں ہوئی تھی۔ 1962ء میں جمہوریت کی بحالی، انڈونیشیا کی طرح پابند جمہوریت کی بحالی تھی جس میں فوج عوام کو جمہوریت کے رستے پر چلنا سکھاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستانی تجزیہ نگار پرویز چیمہ کے خیال میں تمام فوجی سربراہوں نے منتخب حکومتوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔☆70 یعنی انھوں نے جمہوریت کی مدد کی۔ تاہم ہمارے خیال میں ایوب کا خیالی طور پر جمہوری اقتدار اور پھر یحییٰ کی فوجی حکمرانی کا مطلب تھا کہ فوج اقتدار اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ ایوب کے دور میں فوج سیاسی و مالیاتی خودمختاری حاصل کر چکی تھی جس سے فوج کو اتنا اعتماد حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ریاست پر مستقل حکومت کے خواب دیکھ سکے۔

فوج کا اقتدار پر قبضہ دراصل سول اور فوجی افسر شاہی کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ سول افسر شاہی نے مسلح افواج کے عزم و ہمت کا غلط اندازہ لگایا۔ صدر اسکندر مرزا نے اکتوبر 1958ء میں فوج کو اپنے مفاد میں سیاسی میدان صاف کرنے کے لیے بلایا۔ برطانیہ میں منظرِ عام پر آنے والی چند دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفارت کاروں کو خدشہ تھا کہ انتخابی نتائج صدر کے لیے سودمند نہ ہونے کی صورت میں ''ناپسندیدہ عناصر'' سے نجات حاصل کرنے کے لیے صدر فوج کو استعمال کر سکتا ہے۔ خدشہ یہ تھا کہ خود صدر کی طرف سے درپردہ گڑبڑ کرائی جائے گی تاکہ فوجی مداخلت کی راہ ہموار ہو اور انتخابات ملتوی کیے جائیں۔☆71 تاہم اسکندر مرزا

فوج پر حکم نہ چلا سکا اور اسے فوج کو اقتدار منتقل کرتے ہی بنی۔ ایوب خان نے اپنے دوست اسکندر مرزا کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننے کے بجائے جلد ہی سیاسی صورتِ حال کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

ایوب خان کے دور میں پاکستانی فوج نے سول افسر شاہی سے مساوی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تا کہ سیاسی صورت حال خراب نہ ہو اور ملک کو ایک ایسی قانونی حکومت فراہم کی جا سکے جو سول اور فوجی افسر شاہی دونوں کو قابلِ قبول ہو اور اسے سیاست دانوں کی نسبت بہتر طریقے سے چلایا جا سکے۔ حکومتی کاموں سے ناواقفیت کی بنا پر فوج نے سول افسر شاہی کو اہم حکومتی عہدوں سے نہیں ہٹایا۔ جرنیلوں کو افسر شاہی کی ضرورت تھی تا کہ سیاسی طبقے کی حیثیت کو گھٹایا جا سکے۔ ترکی کی طرح پاکستانی فوج کے افسران بھی سیاست دانوں پر بھروسا نہیں کرتے تھے اور ملک کو خود چلانا چاہتے تھے۔ اسی لیے ایوب خان کی رہنمائی میں فوج نے سیاست کی تشکیلِ نو کا آغاز کیا تا کہ سول اور فوجی افسر شاہی کے لیے قابلِ قبول اور بظاہر قانونی حکومت قائم کی جا سکے۔☆72

اس عمل میں سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کو دبایا گیا۔ کچھ کو ساتھ ملایا گیا اور کچھ بالکل نئی سیاسی قوتیں سامنے لائی گئیں تا کہ فوج کے لیے قابلِ قبول ''صاف ستھری'' سیاست شروع کی جائے جو فوجی مفادات میں رخنے نہ ڈالے۔

1959ء میں منتخب نمائندوں کی نااہلی کا قانون (EBDO) متعارف کرایا گیا جس کا مقصد سیاست دانوں کو دباؤ میں لینا تھا۔ بظاہر یہ قانون بدعنوان عہدے داروں کو سزا دینے کے لیے تھا☆73 لیکن اس کے ذریعے کلیدی سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو مرکزی دھارے سے نکال دیا گیا۔

ایوب خان کی حکومت کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 58ء سے 62ء تک خالص فوجی دور — اور دوسرا 62ء سے 69ء تک سول ملاوٹ کے ساتھ فوجی دور — جس میں انتہائی مرکزیت پر مبنی صدارتی نظام چلایا گیا۔ اس بات کی تائید میں کہ 1962ء کے بعد بھی ایوب کا دور دراصل فوجی دور ہی تھا☆74 ایڈورڈ فیٹ نے بہت صحیح کہا ہے کہ، ''اگر کوئی شخص

اقتدار میں آنے سے فوراً پہلے فوجی افسر رہا ہے اور بعد میں بھی اس کے فوج سے رابطے رہے، پھر اُس کا انداز بھی فوجی رہا اور اس کا دل بھی فوج کے ساتھ وابستہ رہا تو اس کی حکومت کو فوجی حکومت ہی کہا جائے گا، چاہے اس نے فوجی عہدہ چھوڑ ہی کیوں نہ دیا ہو، جو فوجی سیاست میں آ کر فوج کو استعمال کرتے ہیں، وہ فوجی ہی سمجھے جائیں گے، چاہے انھوں نے ظاہری طور پر عہدہ چھوڑ دیا ہو۔ یہاں فیصلہ کن امر یہ ہے کہ آیا فوج کو اقتدار میں رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یا نہیں؟☆75

فوجی حکومت نے کئی اقدام کر کے سیاست دانوں اور سول سوسائٹی کو زیرِ نگیں کیا۔ اس کے لیے سازشیں اور جوڑ توڑ کیے گئے اور زور زبردستی کر کے دیگر طبقوں کا استحصال کیا گیا۔ ذرائعِ ابلاغ اور مزدور یونینوں کو کچلنے کے بعد جمہوری اداروں کے استحکام کی بچی کھچی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ اکتوبر 1959ء میں شروع کیا جانے والا بنیادی جمہوریتوں کا نظام بظاہر تو جمہوریت کو نچلی سطح تک لے جانا چاہتا تھا لیکن درحقیقت اس نے سول افسر شاہی کو تقویت دی اور نمائندہ حکومت کی طاقت کو مزید کمزور کیا— پابند جمہوریت کے اس نظام میں جس میں منتخب اور غیر منتخب نمائندوں نے مقامی انتظامیہ کی آنکھ، کان اور اعضائے منصبی کے علاوہ مرکزی حکومت کے کارندوں کا بھی کام کیا جس سے سیاست دان کمزور ہوئے—اسی طرح 1962ء میں پارلیمانی سے صدارتی نظام میں تبدیلی نے بھی پابند جمہوریت کی داغ بیل ڈالی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ یہ نظام کہیں اور ایک دوسرا جنرل جو سیاست داں بن گیا تھا، چلا رہا تھا یعنی انڈونیشیا کا صدر سوئیکارنو۔

سوئیکارنو نے 1957ء میں پارلیمانی نظام ترک کر کے ایک ایسی پابند جمہوریت متعارف کرائی جس میں سیاست و معیشت دونوں سوئیکارنو اور اس کے حواریوں کے ماتحت تھے۔☆76

1965ء کے صدارتی انتخابات نے پاکستان پر ایسا صدارتی نظام مسلط کیا جو مکمل طور پر ایوب خان کے ماتحت تھا۔ پارلیمانی نظام کی صدارتی نظام میں تبدیلی کا مطلب تھا کہ اب فوج ایک قانونی جواز کے ساتھ حکومت کرے گی۔ اعلیٰ فوجی قیادت نے سول افسر شاہی سے رابطے بڑھا کر ریاست پر قبضے کو مضبوط کیا۔ ایوب خان نے سول افسر شاہی سے سمجھوتا کر کے اس کے

اختیارات میں کمی نہیں کی۔[77] اس کے علاوہ سول اور افسر شاہی کے رابطے اس وقت اور بڑھ گئے جب سول سروس میں فوجی افسران تعینات کیے جانے لگے۔

ایوب حکومت نے فوج کے کاروباری مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے افسروں اور جوانوں کو زمین اور پلاٹ بھی دیے اور فوج کے زیرِ انتظام صنعتوں میں ملازمتیں بھی۔[78] اگر ایک جانب ایوب خان اور اس کے خاندان کو براہِ راست معاشی فائدے ہوئے تو دوسری طرف فوج کو حکومت سے آزاد کرنے کے لیے معاشی فوائد بھی وضع کیے گئے۔

جب ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا تو سیاسی قوتوں کی کمزوری اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے سیاسی قوتوں کی جانب سے تگ و دو شروع نہ کرسکنے کے باعث کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ تقسیمِ ہند کے سلسلے میں تحریک کے علاوہ پاکستان کی سیاست شروع سے ہی اشرافیہ کے قبضے میں رہی جس کا ایک سبب یہ تھا کہ حکمران اشرافیہ نے اپنے سیاسی و معاشی مفادات کے لیے فوج سے شراکت کرلی تھی۔ دراصل سول اور فوجی افسر شاہی نے ہی مقامی سرمایہ دار، تجارتی اور کاروباری طبقے کے ظہور میں مدد دی جس کی نشاندہی حمزہ علوی نے کی ہے۔ پاکستان کے صنعتی ترقیاتی ادارے، مثلاً PIDC نے اس کاروباری اور صنعتی طبقے کو آگے لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سے معاشی ترقی بھی ہوئی اور افسر شاہی کے لیے نئے پارٹنر بھی وجود میں آئے۔

1960ء کے عشرے کے دوران میں پاکستانی صنعتوں کا دو تہائی حصہ صرف 22 خاندانوں کے پاس تھا اور یہی صورتِ حال تقریباً ستاسی فی صد بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کی تھی۔[79] جاگیردار اور زمیں دار طبقے نے جو روایتی طور پر سیاست پر قابض تھے، افسر شاہی اور صنعت کار طبقے سے بھی روابط استوار کرلیے۔ یہ خیال غلط ہے کہ ایوب خان کی اصلاحاتِ اراضی سے زمیں داروں کی طاقت کم ہوئی یا کچھ سماجی بہتری ہوئی۔ زرعی اصلاحات سے صرف یہ ہوا کہ بڑے زمیں دار کچھ مالکانہ رد و بدل پر آمادہ ہوئے۔ زمینی ملکیت کی حد بندی لامحدود نہیں رہی بلکہ چھتیس ہزار پیداواری اکائیوں تک محدود کردی گئی۔ لیکن بڑے زمیں داروں نے اپنے خاندان اور قبیلے کے دیگر لوگوں کے نام زمینیں منتقل کردیں۔ اس طرح سیاسی طاقت کے ڈھانچے کا جاگیردارانہ کردار بری طرح کمزور ہوگیا۔

حکمران فوج نے حکمران طبقے کو زک پہنچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حکمران فوج خود ریاستی زمین کے وسائل کے استحصال میں ملوث تھی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ایوب خان اور دیگر اعلیٰ فوجی جرنیلوں نے سندھ اور دیگر صوبوں میں زرعی زمینوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس لیے زرعی اصلاحات صرف زمیں داروں کی حمایت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھیں۔ یاد رہے کہ بھارت نے بڑی زمیں داری کو آزادی کے فوراً بعد صرف دس ایکڑ فی خاندان تک محدود کردیا تھا۔ بہرحال نہروؔ کا سوشلسٹ لائحۂ عمل بڑی زمیں داری کا تسلسل توڑنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان کی قیادت نے کوئی قابلِ ذکر سماجی و سیاسی لائحۂ عمل پیش نہیں کیا۔

پاکستان کے تین بالادست طبقے یعنی زمیں دار، مقامی سرمایہ دار اور شہری سرمایہ دار فوج کے ساتھ مل گئے اور ایوب اور یحییٰ کے دور میں اپنے مشترکہ مفادات کے لیے کام کرنے لگے۔ ایوب خان کی کئی معاشی پالیسیاں مثلاً ''بونس واؤچر'' اور روپے کی قیمت میں کمی سے صنعت کاروں اور زمیں داروں کو فائدہ ہوا۔ زراعت میں مشینیں آنے سے چھوٹے زمیں دار نقصان میں رہے اور بڑے زمیں دار فائدے میں۔ ان جدید مگر جابرانہ معاشی پالیسیوں سے سول افسر شاہی مزید مضبوط ہوئی کیوں کہ تبدیلیوں کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔[☆80] خود فوج نے بھی زرعی اور صنعتی شعبوں کے علاوہ سول افسر شاہی میں بھی اپنے مفادات مستحکم کیے۔ حکمران طبقوں میں سے کسی نے بھی سیاست کی جاگیردارانہ اور ضمنی سرمایہ دارانہ نوعیت بدلنے کی کوشش نہیں کی اور فوج بدستور ذاتی اقتدار کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ ایوب خان کے اقتدار پر قبضے اور 1962ء میں پارلیمانی نظام کو صدارتی نظام میں بدلنے سے سیاست دان ناخوش تو ہوئے لیکن انھوں نے صورتِ حال کا مکمل تجزیہ نہیں کیا اور نہ ہی فوجی مطلق العنانیت کو روکنے کی کوشش کی۔

سیاست دان اب بھی یہ غلطی تسلیم نہیں کرتے کہ فوج کو سیاست میں لانے کے وہ خود بھی ذمے دار ہیں۔ ساری کوشش اس بات کی ہے کہ مسلح افواج کو منتخب حکومتوں کے ماتحت لایا جائے یا ایک مساویانہ شراکت اس مقصد سے قائم کی جائے کہ کسی موزوں وقت پر دفاعی اداروں کو مکمل قبضے میں لیا جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس امر کے باوجود کہ انھیں فوجی ڈکٹیٹر

ایوب خان نے بنایا تھا، 1966ء میں ان سے تعلقات توڑ لیے اور ملک کی پہلی عوامی جماعت کے طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ بھٹو نے عوامی احتجاج کو اپنی طاقت کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر بھٹو نے ایوب مخالف اور عوام دوست قوتوں کو آواز دی۔ اس دوران میں ملک کے مشرقی حصے میں فوجی حکومت اور مغربی پاکستان کے غلبے کے خلاف مزاحمت بڑھتی گئی۔ بنگالی رہنما شیخ مجیب الرحمٰن نے پنجابی بالادستی کے خلاف احتجاج کیا اور سیاسی خودمختاری کا مطالبہ کیا۔ لیکن فوجی حکومت نے مفاہمانہ اقدام کے بجائے طاقت کے استعمال کے ذریعے ردِعمل ظاہر کرنے کا انتخاب کیا۔☆81

اس طرح فوج کو پہلی بار بڑے پیمانے پر عوامی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ گلی گلی میں ہونے والے عوامی احتجاج سے ایوب خان کی بظاہر ناقابلِ تسخیر ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ اس بگڑتی صورتِ حال نے فوج کو چہرے بدلنے کی ضرورت کا یقین دلا دیا لیکن فوج کسی سویلین رہنما کو جلدی اقتدار منتقل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایوب کی جگہ یحییٰ خان کو لا کر فوج اپنے ادارے کی ساکھ برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ ایوب خان کی پالیسیوں کے پیدا کردہ معاشی و سیاسی بحران نے فوج کی غیر سیاسی اور غیر جانب دار حیثیت کو بری طرح متاثر کیا۔

1969ء میں ایوب خان کے ہٹنے سے فوج کے مفادات پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ یحییٰ خان نے یونی فارم والے رفقائے کار کو اور زیادہ تعداد میں نئے سرے سے ملک چلانے پر تعینات کیا۔ نیا جنرل اپنے جابرانہ سیاسی نظام پر نظرِ ثانی کرنے میں بھی ناکام رہا۔ یحییٰ نے 1970ء کے انتخابات اس امید پر کرائے کہ نئی سویلین حکومت فوج سے مفاہمت کرے گی۔ حسین حقانی کے مطابق فوج مسلم لیگ اور مذہبی جماعتوں کے اتحاد کو ترجیح دینا چاہتی تھی۔☆82 تاہم انتخابات کے نتائج مختلف نکلے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی بالترتیب مجیب الرحمٰن اور بھٹو کی قیادت میں ابھریں۔ ان انتخابات کے نتائج سے ملک کے دونوں حصوں کی سیاسی تقسیم واضح ہوگئی جس نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں نسلی کش مکش بھی ظاہر کردی۔

عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں 300 میں سے 288 نشستیں اور قومی اسمبلی میں 300 میں سے 167 نشستیں حاصل کیں (مشرقی پاکستان سے قومی اسمبلی کی نشستوں کی

کل تعداد 169 تھی) اس طرح عوامی لیگ کو مرکز میں حکومت قائم کرنے کے لیے واضح اکثریت حاصل ہوگئی۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی نے پنجاب اور سندھ سے 85 نشستیں حاصل کیں۔ (مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کی نشستیں 144 تھیں۔ یعنی پنجاب سے 85، سندھ سے 28، سرحد سے 19، بلوچستان سے 5 اور قبائلی علاقوں سے 7)۔☆[83] تاہم پاکستان کے بارے میں ایک نمایاں سیاسی مبصر لارنس زائرنگ کے مطابق ''بنگالی نہ صرف پاکستان کے 'مرکز' سے دور تھے بلکہ وہ مغربی پاکستان کے لوگوں اور رہنماؤں کی ترجیحات سے بھی ناواقف تھے۔''☆[84]

جمہوریت کی طرف واپسی (1971-1977ء)

1970ء کے انتخابات کے نتائج نہ تو فوجی حکومت نے تسلیم کیے اور نہ ہی مغربی پاکستان کی سیاسی اشرافیہ نے۔ اس پر بنگالی رہنماؤں نے بھی جارحانہ ردِعمل کا اظہار کیا اور سیاسی بحران شدید ہوگیا۔ 1971ء سے 1977ء کے دوران سیاسی ماحول تبدیل تو ہوا لیکن اس سے پہلے سیاسی عاقبت نااندیشی اور عدم رواداری نے ایک بڑے سانحے کو جنم دیا۔

گو کہ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ انتخابات میں اکثریت حاصل کر چکی تھی لیکن مغربی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ جس میں فوج اور دوسرے مقتدر طبقے شامل تھے، بنگالیوں کو جنھیں وہ نسلی اعتبار سے کمتر سمجھتے تھے، اقتدار دینے میں بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

ایک سابق فوجی افسر اور دانشور صدیق سالک نے 1971ء کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ پاکستانی فوج کا ایک اعلیٰ افسر کہتا تھا، ''فکر نہ کرو، ہم ان کالے حرامیوں کو اپنے اوپر حکومت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔''☆[85] ان توہین آمیز باتوں سے فوج کے علاوہ پنجابیوں کی اکثریت اور مغربی پاکستان کی قیادت کے نسلی تعصب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فوجی قیادت کو مجیب یا بھٹو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا جو مشکل تھا اور اسی لیے انتخابی نتائج کے اعلان کے باوجود اقتدار کی منتقلی میں تاخیر کی جاتی رہی۔

بھٹو نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے بنگالیوں سے فوج کے تعصب کا فائدہ اٹھایا۔ بھٹو کے جارحانہ رویے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یحییٰ خان نے مارچ 1971ء کو بلایا جانے والا قومی

اسمبلی کا پہلا اجلاس ملتوی کر دیا۔[86] بھٹو نے تمام سیاست دانوں کو دھمکی دی تھی کہ اجلاس میں شرکت کے سنگین نتائج بھگتنے ہوں گے۔ یہ دھمکی بنگالیوں کے لیے توہین آمیز تھی جو ملک کی آزادی کی ابتدا ہی سے مغربی پاکستان کی اشرافیہ کی جانب سے توہین آمیز سلوک کا تجربہ کر رہے تھے۔

بھٹو کے رویے سے سیاسی بحران شدید ہوا اور ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان تعطل پیدا ہو گیا۔ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے صورتِ حال کو اس طرح پیش کیا جیسے ملک کی سالمیت کو شدید خطرہ لاحق ہو۔ اسلام آباد نے مشرقی پاکستان میں بے چینی کو بھارتی سازش قرار دیا۔ 15 مارچ 1971ء کو فوج نے بنگالیوں کے خلاف فوجی آپریشن ''سرچ لائٹ'' شروع کیا جس کے ذریعے ہر قسم کے اختلافِ رائے کو مکمل طور پر کچلنے کی کوشش کی گئی۔[87] مشرقی پاکستان میں انسانی حقوق کی پامالی اتنی بڑھ گئی کہ ڈھاکا اور خطے میں موجود دیگر سفارت کاروں نے اُسے دیکھا اور رپورٹ بھی کیا۔ واشنگٹن میں موجود مختلف امریکی حکومتی شعبوں نے نکسن انتظامیہ کو خبردار کیا کہ عوامی لیگ کے منتخب حامیوں، ہندوؤں اور یونی ورسٹی کے طلبہ کو قتل کیا جا رہا ہے۔[88] ڈھاکا میں امریکی قونصل جنرل آرچر بلڈ (Archer Blood) کے مشہور ''خونی ٹیلی گرام'' نے امریکی حکومت کی طرف سے پاکستانی فوج کی مسلسل حمایت پر شدید اختلاف کیا۔[89]

راول پنڈی میں پاکستانی فوج کا مرکزی دفتر داخلی طور پر اپنی حیثیت مستحکم رکھنے کے لیے امریکی حمایت پر انحصار کر رہا تھا۔ ایوب خان نے مسلح افواج کو مضبوط رکھنے کے لیے امریکا سے فوجی اتحاد کیا تھا اور 1958ء سے 1971ء تک امریکا سے بڑی فوجی اعانت حاصل کی تھی۔ اس اتحاد سے امریکا کا مقصد کمیونسٹ سوویت یونین کا مقابلہ کرنا تھا۔ اب امریکا اس اتحاد کو توڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ طاقت کا توازن بھارت کے حق میں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ بھارت امریکا کے اتحاد کو ٹھکرا چکا تھا۔ اسی لیے 1971ء کے بحران میں امریکا بھارت کے مقابلے میں پاکستانی فوجی حکومت کو زیادہ دباؤ میں نہیں لینا چاہتا تھا۔ اسی لیے صدر نکسن نے امریکی انتظامیہ میں سارے متعلقہ افسران کو لکھا، ''یحییٰ کو اس موقع پر زیادہ نہ دباؤ۔''[90] مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا جواز پیش کرتے ہوئے امریکا میں پاکستانی سفیر آغا ہلالی نے کہا، ''پاکستان ایک بڑے سانحے سے گزر رہا ہے اور ملک کو متحد رکھنے کے لیے فوج لوگوں کو

قتل کرنے پر مجبور ہے۔''☆91 ہزار ہا بنگالی قتل ہوئے، عورتوں کی عصمت دری ہوئی جس سے گڑبڑ اور کشیدگی میں بہت اضافہ ہوا اور بالآخر ملک ٹوٹ گیا۔

جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو بھٹو نے پاکستان کا دفاع کرتے ہوئے پاکستانی فوج کی وحشیانہ کارروائیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ 15 دسمبر 1971ء کو بھٹو نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بڑی جذباتی تقریر کرتے ہوئے بھارت اور تمام دنیا کی مذمت کی اور اپنے کاغذات پھاڑتے ہوئے اعلان کیا کہ ''میں جارحیت کو قانونی حیثیت دینے میں ایک فریق نہیں بنوں گا۔''☆92 اس پر مسلح افواج نے اسے بڑی داد و تحسین سے نوازا۔ اس سے قبل نومبر 1971ء میں جنرل یحییٰ نے بھٹو کو سرکاری نمائندے کی حیثیت سے چین بھیجا تھا تاکہ بھارت کے خلاف جنگ میں مدد مانگی جائے۔☆93

16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے کمانڈر نے بھارتی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور پاکستان کو کاٹ کر اس کے اندر سے بنگلہ دیش کی ایک نئی ریاست قائم کی گئی۔ اس کے نتیجے میں فوج سیاست سے دور ہونے پر مجبور ہوگئی۔ سعید شفقت کا کہنا ہے کہ بھٹو کو اقتدار منتقل ہونے کی وجہ اُن کی انتخابی فتح نہیں تھی بلکہ فوج شکست کے بعد اقتدار چھوڑنے پر مجبور ہوگئی تھی۔☆94 فوج کے پاس اب بھٹو کا کوئی متبادل بھی نہیں تھا اور وہ بھٹو کو اس کے بھارت دشمن اور اسلام پسند لائحۂ عمل میں اتحادی سمجھتی تھی۔☆95 یہ دونوں مسائل فوج کے نظریے کے مطابق مرکزی حیثیت نکلتے تھے۔ اس کا بھٹو نے ایوب خان کے دور میں وزیرِ خارجہ کے طور پر فوج میں اپنے حامی بھی بنائے تھے۔ 1962ء کا آئین یحییٰ نے منسوخ کر دیا تھا، اس لیے بغیر کسی آئین کے بھٹو نے دسمبر 1971ء میں اقتدار سنبھالا اور صدر کے علاوہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھا۔

انقلابی نعروں کے باوجود بھٹو کے اقتدار میں آنے سے ملک کے سیاسی ماحول میں کسی بڑی نوعیت کی تبدیلی نہیں آئی۔ بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا اور اقتدار میں آ کر صنعتوں کے علاوہ تعلیم جیسے اہم شعبوں کو بھی ریاستی ملکیت میں لے لیا۔ ان اقدامات کا مقصد بظاہر ملک میں صنعتی اور کاروباری اشرافیہ کے اثر و رسوخ کو کم کرنا اور عوام کو بظاہر طاقتور بنانا تھا۔ بھٹو

کی عوامی مقبولیت سے عوام خود کو نفسیاتی طور پر سہی، کچھ بااختیار محسوس کرنے لگے لیکن عوامی نعروں کے کاندھوں پر سوار ہو کر اقتدار حاصل کرنے کے باوجود بھٹو اس تبدیلی کو قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ سماجی و سیاسی ماحول مطلق العنان ہی رہا۔ بھٹو کی آمد کے بعد بھی ملک کی سیاسی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ آئی، جو فیوڈل تھی، وہ فیوڈل ہی رہی۔

بھٹو کا دورِ حکومت فوج اور جاگیرداروں کے اتحاد کی ایک واضح مثال تھا۔ 1960ء کے عشرے کے وسط میں پاکستان میں برطانوی ہائی کمشنر سر مورس جیمز نے بھٹو کو ایک ''شیطان اور ایک خراب فرشتہ'' قرار دیا تھا۔☆[96] حقیقت یہ ہے کہ بھٹو بیک وقت جمہوریت پسند بھی تھے اور مطلق العنان بھی۔ بھٹو کی شخصیت کے اندرونی تضادات اُن کی سیاست میں نظر آتے تھے۔ بھٹو ایک کرشمہ ساز شخصیت تھے مگر وہ جمہوریت مستحکم کرنے اور عوام کو مقتدر بنانے میں ناکام رہے، اور مسلح افواج کی اہمیت بھی وہ کم نہ کر سکے۔

میکیاویلی کے 'بادشاہ' کی طرح بھٹو نے دُہری پالیسی اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ اختیار اپنے قبضے میں رکھنے کی کوشش کی یعنی عوامی اقدامات کر کے مقبولیت حاصل کی اور دیگر فریقین کو بری طرح کچلا۔ زرعی اصلاحات کرنے اور نجی صنعت و تجارت کو ریاستی ملکیت میں لینے سے بھٹو کا مقصد خود اپنے طبقے کے ساتھ دیگر طبقات کی قوت کو توڑنا تھا نہ کہ زمین اور دوسرے وسائل کو حکمراں اشرافیہ سے عوام کو منتقل کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھٹو اور ایوب خان، دونوں کی زرعی اصلاحات بے معنی رہیں، کیوں کہ دونوں کا مقصد اپنے سیاسی مخالفین کو دباؤ میں لینا تھا، نہ کہ کوئی نتیجہ خیز تبدیلی لانا۔

بھٹو نے سویلین اداروں کو مستحکم کرنے کا شان دار موقع گنوا دیا اور خود اپنی جماعت کے سماجی و سیاسی نظریہ سازوں سے بدسلوکی کی۔ تنقید کرنے والوں کو کچلا اور پیپلز پارٹی کے اندر مارکسی عناصر کو برطرف کیا۔ اپنے دورِ حکومت کے آخری عرصے میں بھٹو نے اپنا سیاسی لائحۂ عمل بالکل بدل دیا تھا اور 1970ء کے مقابلے میں 1977ء کے انتخابات میں بڑی تعداد میں جاگیرداروں کو امیدوار بنایا۔☆[97]

شفقت، بھٹو کی پالیسیوں کا ایک کمزور دفاع یہ کہہ کر کرنا چاہتے ہیں کہ بھٹو کی مطلق

العنانیت ملکی استحکام کے لیے تھی لیکن مخالفین کا کہنا ہے کہ بھٹو کی غلطیاں دراصل ریاستی ڈھانچے میں خرابیوں کے باعث تھیں اوران میں ایوب خان کی ابتدائی پالیسیوں کا اثر نظر آتا ہے۔[98☆] وسیع تر نظامی مسائل کی بنا پر بھٹو کے لیے یہ غلطیاں کرنا ناگزیر تھا۔ بالآخر وہ حکمران طبقے کے رکن تھے جس کے مفادات نے انھیں یرغمال بنا رکھا تھا۔[99☆] سیاسی معیشت کی قبل از سرمایہ داری ساخت کے باعث جاگیرداراور دیگر طبقات سماجی، سیاسی و معاشی ماحول کی تبدیلی سے نقصان میں رہتے۔ لہٰذا بھٹو نے اقتدار میں رہنے کے لیے سول اورفوجی افسر شاہی سے مفاہمت کر لی۔ انھوں نے سرکاری شعبے کی صنعت وتجارت کوسول افسر شاہی کے حوالے کیا اور ساتھ ہی فوج کو بھی مضبوط بنایا۔ بھٹو نے مسلح افواج کے بارے میں غلط اندازے لگائے۔ انھوں نے فوج کے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیاں کی تھیں، مثلاً جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی بنائی اور تینوں افواج کو وزارتِ دفاع کے ماتحت کردیا۔ کمانڈر اِن چیف کا عہدہ بدل کر چیف آف اسٹاف کردیا اور ساتھ ہی وزیراعظم کو مسلح افواج کا سپریم کمانڈر بنا کر تمام افواج کے سربراہوں کو مساوی رُتبے دے دیے۔ اس کے علاوہ 1973ء کے آئین کے تحت آئین توڑنے کو بغاوت کہا گیا اوراس کی سزا موت رکھی گئی۔

بھٹو نے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کی تو اُس میں بھی ناکامی ہوئی۔ وہ فوج کو طاقت کے کھیل میں جونیئر پارٹنر سمجھنے لگے جسے وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرسکتے تھے۔ فوج نے بھٹو کے ان غلط اندازوں کا فائدہ اٹھایا اور 1977ء میں پھر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

بھٹو کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ریاست کی نئی ترجیحات متعین نہیں کیں اور نہ ہی سیاست کی نوعیت کو تبدیل کیا۔ ریاستی ترجیحات میں وہی پرانی خارجہ پالیسی اور سلامتی کے مسائل چلتے رہے اور بھارت سے کشیدگی برقرار رہی۔ انھوں نے مسلح افواج کو جدید ترین اسلحہ فراہم کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ حالانکہ ملک سماجی و مالیاتی طور پر ابھی جنگ کے اثرات سے باہر نہیں نکلا تھا۔ انھوں نے جوہری ہتھیاروں کا منصوبہ بھی شروع کیا تاکہ بھارت کی بالادستی کو للکارا جاسکے۔ چاہے اس کے لیے ''گھاس ہی کیوں نہ کھانی پڑے۔''[100☆]

بھٹو کے اس رویے کی دو وجوہ تھیں، ایک تو یہ کہ بھٹو ریاستی طاقت کے کھیل سے پوری طرف واقف تھے۔ وہ طاقت اور خاص طور پر فوجی طاقت کی اہمیت کو جانتے تھے۔ دوسرے یہ کہ فوج کو مضبوط کر کے بھٹو جرنیلوں کا اعتماد بحال رکھنا چاہتے تھے۔ وہ جرنیلوں کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ صرف عوامی رہنما ہیں اور سوشل ازم لا کر حکمران طبقے کے مفادات کو خطرے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

ان سب اقدامات کے باوجود بھٹو فوج کو اقتدار میں آنے سے نہ روک سکے۔ بھٹو نے فوج کو اپنے سیاسی معاملات کی کمزوریاں دکھائیں۔ فوج کے ساتھ بھٹو کے معاملات پر جنرل گل حسن جیسے جرنیلوں نے کتابیں لکھ کر بتایا ہے کہ کس طرح بھٹو نے فوج کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ گل حسن نے بتایا ہے کہ انھوں نے بھٹو کو سیاست میں فوج کو ملوث کرنے سے باز رکھنے کی کیسے کیسے کوششیں کیں۔☆101

بھٹو نے اپنی بقا کے لیے فوج کو ساتھ ملا کر کراچی، لاہور اور حیدر آباد جیسے بڑے شہروں میں مارشل لا لگا دیا تاکہ سیاسی بے چینی اور عوامی مظاہروں کو دبایا جا سکے۔ فوج کو مظاہرین پر گولیاں چلانے کے لیے کہا گیا۔ اس طرح فوج سیاست میں ملوث ہوئی۔ تاہم اعلیٰ افسران کا خیال تھا کہ اس طرح فوج تقسیم ہو جائے گی۔ چنانچہ انھوں نے بھٹو کی حمایت سے انکار کیا۔ تین فوجی بریگیڈیئروں نے مبینہ طور پر استعفے دے دیے اور بھٹو مخالفین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔☆102 بھٹو فوج کو یہ سمجھانے میں ناکام رہے کہ حزبِ اختلاف کی تحریک ریاست کے خلاف سازش تھی۔ ان استعفوں سے سینئر جرنیل پریشان ہو گئے کیوں کہ اس طرح فوج کے نظم و ضبط پر اثر پڑ رہا تھا۔

وزیرِاعظم کی عادت بن گئی تھی کہ سیاسی صورتِ حال پر اعلیٰ جرنیلوں سے گفتگو کی جائے۔ جنرل گل حسن کے الفاظ میں:

> وزیرِاعظم کا فوج سے باضابطہ رابطہ تو چیف آف آرمی اسٹاف کے ذریعے ہونا چاہیے لیکن ہر ایرے غیرے کو، جو کمانڈر ہو یا صرف PSO، اسے بھی بھٹو صاحب بلانے لگے۔ یہ بھٹو کی بہت بڑی غلطی تھی

جس سے فوج سیاست میں آئی اور جرنیلوں کو بھٹو کے عدم تحفظ کا پورا
ادراک ہوگیا۔☆103

بھٹو کی پالیسیاں فوجی طاقت اور مطلق العنانیت پر انحصار کرنے لگی تھیں۔ اس کا اندازہ ان کے بلوچستان کے سیاسی بحران سے نمٹنے سے بھی لگایا جاسکتا۔ بھٹو نے مرکز اور بلوچستان کے درمیان کشیدگی کو فوجی طاقت سے حل کرنے کی کوشش کی اور مئی 1973ء میں فیڈرل سیکورٹی فورس (FSF) بھی بنا ڈالی۔ بھٹو نے FSF کو براہِ راست اپنی ماتحتی میں رکھا۔ بلوچستان میں 1973ء کے فوجی آپریشن میں کوئی چھ ہزار بلوچی مارے گئے۔

پیپلز پارٹی اندرونی طور پر بھی جمہوری نہیں تھی۔ ایف ایس ایف بھٹو کی ذاتی فورس کے طور پر کام کرتی تھی اور سیاست میں فوجی طاقت کا عکس تھا۔ بہرحال ایف ایس ایف کے قیام سے جرنیل بھی سمجھنے لگے کہ بھٹو فوج کی اہمیت کم کرنا چاہتے ہیں۔☆104

بالآخر فوج ریاستی کنٹرول اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے ایک بار پھر حرکت میں آگئی۔ منتخب وزیراعظم سول اور فوجی اتحاد قائم کرنے میں ناکام رہے اور جرنیلوں کی طاقت صرف سویلین فریقین کے فائدے میں نہیں گئی۔ اعلیٰ ترین جرنیل بھی اب بھٹو کو غیر ضروری سمجھنے لگے اور اتنے پُراعتماد ہوگئے کہ 1977ء میں دوبارہ ایوانِ سیاست پر قبضہ کرلیا۔

1979ء میں فوج نے قتل کے الزام میں بھٹو کو پھانسی دلوا کر عوامی سیاست کی جڑیں کاٹ دیں۔ میکیاویلی کا 'بادشاہ' اب کرسٹوفر مارلو کے کردار فاؤسٹس کی طرح ایک الم ناک انجام سے دوچار ہوا جس نے اقتدار کی خاطر اپنی روح شیطان کو فروخت کردی تھی اور خود اپنی ذہانت کا شکار ہوا۔ عجیب بات ہے کہ فوج نے اس رہنما کو قتل کردیا جس نے اس کی تعمیرِ نو کی تھی۔ بھٹو حکومت کی کابینہ کے ایک نمایاں رکن عبدالحفیظ پیرزادہ کا کہنا تھا کہ فوج نے شروع سے ہی بھٹو کے خلاف سازشیں شروع کردی تھیں اور اُسے خود اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے استعمال کیا۔☆105

بھٹو کی اقتدار سے محرومی اور موت سے عوامی سیاست کے ایک دور کا خاتمہ ہوا۔ ایک طرف تو فوج نے سویلین اقتدار کو اچانک ختم کردیا اور دوسری طرف پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ

کو برخاست کر دیا۔ اس کے علاوہ آنے والے برسوں میں مسلح افواج کا بنیادی کردار ہی بدل گیا، اور اس نے سیاسی سودے بازی کے لیے نئے ہتھکنڈے سیکھ لیے۔

1971ء سے 1977ء کے دور میں کئی اچھے مواقع ضائع ہوئے۔ چھ سالہ سویلین دور میں ابتدائی انقلابی سوچ قدامت پسندی میں بدلتی گئی۔ بھٹو نے دائیں بازو کے مذہبی عناصر کو بڑی رعایتیں دیں۔ سیاسی حکومت کا مذہب کی طرف جھکاؤ فوج کے اپنے مفاد میں تھا جو ایک نظریاتی ریاست کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے بچانے کی دعوے دار تھی۔ اس کے علاوہ فوج کی مدد طلب کرنے سے فوج کو اپنی طاقت کا احساس بار بار ہوا اور وہ دوبارہ سویلین حکومت کی حکم عدولی کرنے کے قابل ہوگئی۔ اس فیصلہ کن دور میں فوج سیاسی نظام کی خامیاں سمجھ کر ریاست پر پھر بالادستی حاصل کرنے پر تل گئی۔

تاہم مسلح افواج کو مضبوط کرنے کا ذمے دار صرف بھٹو کو ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ ملک کے سیاسی ڈھانچے کی کمزوری 1947ء میں قیامِ پاکستان ہی کے وقت سے چلی آ رہی تھی۔ قومی سلامتی کا ہوّا فوج کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا رہا۔ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں سماجی ترقی کو ایجنڈے پر نمایاں مقام دینے کے بجائے اپنے ذاتی سیاسی مفاد کے لیے قومی سلامتی کا راگ الاپتی رہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ فوج کو ہوا۔ سیاست کی استبدادیت نے سیاسی قیادت کو فوج سے شراکت کرنے اور ریاست کے دوسرے اداروں کی بجائے فوج کو زیادہ اہمیت دینے پر یوں مجبور کر دیا کہ فوج مرکزی حیثیت حاصل کر لے۔ اس طرح شروع سے ہی سیاسی قوت کی کمزوری نے جنرلوں کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ دعویٰ کر سکیں کہ ریاست کے تحفظ اور اسے چلانے کے لیے فوج ایک اہم ادارہ ہے۔ اور یوں فوجی بالادستی کی راہ ہموار ہوگئی۔

باب–3

فوجی طبقے کا ارتقا

(1977ء سے 2005ء)

1977ء میں فوج نے ایک بار پھر سیاست میں براہِ راست مداخلت کی تا کہ ریاست اور سول سوسائٹی پر اپنے کنٹرول کو باقاعدہ شکل دی جا سکے۔ عشرۂ 1960ء کے اواخر میں چلنے والی عوامی تحریکوں نے ریاست پر فوج کے اقتدار اور بالادستی کو بڑے خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ سول سوسائٹی اتنی کمزور نہیں تھی کہ فوج اپنے اقتدار کو مستقل قائم رکھ سکتی۔ اگرچہ تین غالب طبقات جن پر علوی نے بحث کی ہے اور جنھیں گزشتہ باب میں ظاہر کیا گیا ہے، آمریت پسند تھے اور اپنے فائدے کے لیے طاقت استعمال کر رہے تھے لیکن یہ تینوں طبقات فوج کو ایک ثالث سے زیادہ کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

سیاسی بحرانوں نے فوج کو عوامی طاقت اور سیاسی فریقین کی قوت سے آگاہ کر دیا تھا۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں جنرلوں کو پتا چل گیا تھا کہ اُن کے ادارے میں مداخلت کی جا سکتی ہے اور اس مداخلت کو روکنا ضروری سمجھا گیا۔ اس طرح دفاعی انتظامیہ سویلین فریقوں پر پورا بھروسا نہیں کر سکتی۔ جنرل سول سوسائٹی اور دیگر طبقوں کو بذریعہ قوت اپنا مطیع بنائے رکھنا چاہتے تھے۔

زیرِ بحث دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ 1977ء سے 1988ء کا پہلا دور۔ 1988ء سے 1999ء کا دوسرا اور 1999ء سے 2005ء تک کا تیسرا دور۔ پہلے دس سالہ دور

میں فوج جبر کے ذریعے انسانی حقوق پامال کرتی رہی۔ لیکن ایسا کرنے سے فوج کی ثالث والی حیثیت کو دھچکا لگ رہا تھا۔ اس لیے فوج نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر کے بالا دست طبقوں کے کچھ ارکان سے زبردستی یا لالچ دے کر ملی بھگت کر لی۔ جبر کا استعمال تیسرے دور میں بھی کیا جاتا رہا اور اس عرصے میں فوج کی بالادستی بہت مستحکم ہوگئی۔

فوج نے بار بار قانون اور آئین کو توڑ مروڑ کر طاقت کے کھیل میں اپنی خودسری برقرار رکھی۔ فوج نے ایک ایسا قانونی ڈھانچا تیار کیا جس میں اُسے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سویلین حکام کی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح مسلح افواج صرف پالیسی پر عمل کرنے والا ادارہ نہیں رہیں بلکہ فیصلہ سازی میں حصہ لینے لگیں۔

اس طرح وہ سیاسی طور پر پہلی صف میں رہے بغیر سلامتی اور داخلی استحکام کا تعین کر سکتی تھیں۔ فوجی برادری اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے اقتدار سے بے دخل نہیں ہونا چاہتی تھی اور قانونی و آئینی ہتھکنڈے استعمال کر کے جمہوریت کا بھرکس نکالتی رہی۔

یہ بات واضح ہے کہ فوجی اقتدار کا استحکام دیگر بالادست طبقوں کے تعاون کے بغیر ناممکن تھا۔ ملک کا سیاسی وسماجی نظام ہی ایسا تھا کہ جس میں فوج اپنی طاقت اور اختیار کو بڑھاوا دے سکتی تھی۔

جابر فوج (1977-1988ء)

ملک میں فوجی حکمرانی کا دوسرا دور ظلم و زیادتی اور انسانی حقوق کی شدید پامالی کا دور تھا جس میں فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے عوام کے پسندیدہ وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو کو دھاندلیوں اور زیادتیوں کا مجرم ٹھہرا کر برطرف کر دیا۔ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلیوں کو بہانہ بنا کر دائیں بازو کی مذہبی اور دیگر مخالف جماعتوں نے بھٹو کے خلاف سڑکوں پر مظاہرے شروع کر دیے اور فوج سے مداخلت کا مطالبہ کیا۔ حزبِ اختلاف نے بڑی چالاکی سے مذہب اور سیاست کو ملا کر اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کیے۔

شہری علاقوں کے غریب عوام کو سیاسی ایندھن بنا کر حزبِ اختلاف نے اپنے مقاصد پورے کیے۔ پاکستان قومی اتحاد نے مذہبی عناصر، شہری علاقوں کے غریب مزدوروں اور فوج

میں مذہبی رجحان رکھنے والوں کو نظامِ مصطفیٰ کے نام پر اُکسایا۔ اس تحریک کی کامیابی میں فوج کے مذہبی عناصر نے بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ بعض فوجی کمانڈروں نے عوامی تحریک کے مقابلے میں فوجی نظم وضبط متاثر ہونے کا واویلا کیا۔☆[1] بھٹو کے بعض مخالف سیاست دان بھی فوج کو مداخلت کے لیے پکارتے رہے۔ مگر اس تحریک سے بھٹو کی عوامی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی اب بھی عوام میں ایک نسبتاً سیکولر اور قومی جماعت کا درجہ رکھتی تھی اور پورے ملک میں مقبول تھی۔

جنرل ضیاء الحق نے پیپلز پارٹی کی مقبولیت ختم کرنے کے لیے بنیادی طور پر چار مختلف طریقے آزمائے۔

پہلا طریقہ یہ تھا کہ سول سوسائٹی کو توڑ پھوڑ دیا جائے۔ حکومت کے استبدادی طریقوں میں حسبِ ذیل تھے:

- ایک جعلی قانونی مقدمے میں پھنسا کر منتخب وزیراعظم کو قتل کر دیا گیا۔
- ذرائع ابلاغ پر پابندیاں لگا دی گئیں۔
- 1973ء کے آئین کے تحت بھٹو نے جو انسانی حقوق متعارف کرائے تھے، وہ معطل کر دیے گئے۔
- مزدور اور طلبہ کی یونینوں پر پابندی لگائی گئی۔
- ہر قسم کے عوامی احتجاج پر حملے کیے گئے۔

بھٹو کو اپنے ایک سیاسی حریف کو قتل کرنے کے الزام میں ستمبر 1977ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ سپریم کورٹ کا بازو مروڑ کر بھٹو کو سزائے موت دلائی گئی اور انھیں اپریل 1979ء میں پھانسی دے دی گئی۔☆[2] بھٹو کی پھانسی سے عوام کو یہ پیغام دیا گیا کہ کوئی مزاحمت برداشت نہیں کی جائے گی۔ منتخب وزیراعظم کی پھانسی سے فوج اور سیاسی قیادت کے درمیان تعلقات کی نوعیت یکسر بدل گئی۔

بھٹو نے مسلح افوج کو مضبوط کرنے کی جو کوششیں کیں، اُن سے بھٹو کو فوج کا ہیرو بن جانا چاہیے تھا لیکن بھٹو کو شاید فوج کے سربراہ کی بے عزتی کرنے کی سزا ملی۔ امریکی سفیر ہمل

(Hummel) کے مطابق ضیا کے پاس بھٹو کو مارنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ کہتا ہے، ''اگر میں ضیا کی جگہ ہوتا تو میں بھی بھٹو کو کسی جیل میں زندہ نہ رہنے دیتا جہاں سے وہ کسی بھی وقت فرار ہوسکتا تھا۔''☆[3]

فوج پاکستان کے وزیراعظم کو قتل کر کے بھی مطمئن نہ ہوئی اور ملک میں عوامی سیاست کو بالکل ختم کرنے پر تُل گئی اور نہ صرف سیاسی رہنماؤں کو بلکہ ان کو ووٹ دینے والوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ تمام سیاسی رہنماؤں کے اجلاسوں کو فوج کے جاسوسی کے ادارے اپنی نظر میں رکھتے یا اُنھیں چوری چھپے ریکارڈ کیا جاتا یا خود جاسوس ''بنفسِ نفیس'' وہاں موجود ہوتے۔ کہا جاتا ہے پاکستان قومی اتحاد اور تحریکِ بحالیِ جمہوریت کے اہم سیاسی رہنما مسلسل جاسوسوں کی نگرانی میں ہوتے۔☆[4] ضیا حکومت نے ہر طرح کے عوامی احتجاج پر بشمول طلبہ اور مزدور تنظیموں کے پابندی لگا دی۔ معروف پاکستانی صحافی مشاہد حسین کا جو بعد میں مشرف کے نمائندے بن گئے، کہنا ہے کہ جنرل ضیا نے ترکی کی طرح طلبہ تنظیموں پر پابندی لگائی۔ ضیاء الحق نے 1984ء میں محکمۂ تعلیم کے سرکردہ منتظمین کے ساتھ ترکی کا دورہ کیا تاکہ ترکی سے طلبہ تنظیموں پر قابو پانے کے طریقے سیکھے جاسکیں۔☆[5] جنرل ضیا نے مزدور تنظیموں کو کچلنے میں بھی ترکی کا راستہ اپنایا۔ پیپلز پارٹی کی اصل حمایت شہری اور دیہی علاقوں کے غریبوں اور مزدوروں میں تھی جنھیں فوج اور دیگر بالادست طبقوں کے مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ذرائعِ ابلاغ پر تو اور بھی سختیاں کی گئیں۔ فوجی حکومت نے پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 499 میں ترمیم کردی تاکہ حکومت کے مفادات کے خلاف خبریں چھاپنے پر اخبارات کے مدیروں پر مقدمہ چلایا جاسکے۔☆[6] ضیا حکومت نے ذرائع ابلاغ پر سختیوں کی انتہا کردی، مثلاً 1978ء میں ملک کی تاریخ میں پہلی بار فوجی عدالتوں کے حکم پر صحافیوں کو کوڑے لگائے گئے۔☆[7]

فوج نے دوسرا کام یہ کیا کہ مذہب کا ڈھونگ رچا کر عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی عناصر سے ملی بھگت اور اسلامی کلچر کا پروپیگنڈا کر کے سول سوسائٹی پر فوجی بالادستی کی راہ ہموار کی گئی۔☆[8] ناظمِ صلوٰۃ جیسے عہدے قائم کر کے اور قانونِ شریعت اور اسلامی بینکاری جیسے شوشے چھوڑ کر بھٹو اور پیپلز پارٹی کی سیکولر ساکھ کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح

ایک فوجی آمرانہ علامتی قانونی جواز استعمال کرتا رہا۔[☆9] ریاستی پروپیگنڈے کے ذریعے بھٹو کی شراب نوشی کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ یہ دعوے کیے جاتے رہے کہ فوج نے ریاست کو عیاش قیادت سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا ہے جو معاشرے کو اسلام سے دور لے جا رہی تھی۔

فوج نے دائیں بازو کے مذہبی عناصر اور سیاسی و سماجی طور پر پس ماندہ ذہنیت رکھنے والوں کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ یاد رہے کہ 1960ء اور 1970ء کے عشروں کا پاکستان سماجی طور پر نسبتاً زیادہ آزاد خیال تھا۔

مسلم افواج اور دائیں بازو کے مذہبی عناصر کے تعلقات آخرکار افغانستان کی جنگ کے نتیجے میں مزید مضبوط ہو گئے۔ مذہبی جماعتوں کو مدرسے کھولنے کی ترغیب دی گئی اور سوویت حملہ آور افواج کے خلاف لڑنے کے لیے عام لوگوں کو بھرتی کیا جانے لگا۔ شہری علاقوں میں بھی ایسے تاجر اور کاروباری طبقے سے تعلقات استوار کیے گئے جو سماجی طور پر قدامت پرست تھا۔[☆10]

فوج اور دائیں بازو کے مذہبی عناصر کے رابطوں سے فوج نے سماجی و سیاسی طور پر قانونی جواز حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ترکی کی مسلح افواج کی طرح پاکستانی فوج معاشی اشرافیہ کے ساتھ سازش کے تحت ایک ایسے بندوبست میں شریک ہوئی جس سے اسے دوام حاصل ہو سکے۔

''سلطنتِ عثمانیہ کی طرح ایک بہت مضبوط انتظامیہ تشکیل دی گئی جو مذہب کی آڑ میں فاشسٹ رویے پروان چڑھاتی تھی تاکہ فوج کے مقابلے میں کوئی آواز نہ اٹھا سکے۔''[☆11]

تاہم مذہبی جماعتوں سے گہرے تعلقات کے باعث فوج کو بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ کیوں کہ مسلح افواج میں مذہبی رجحانات بہت بڑھنے لگے۔ ضیاء الحق نے فوجی تربیت میں مذہبی تعلیم بھی شامل کر دی اور تمام کمانڈروں سے کہا گیا کہ وہ اپنے افسروں اور سپاہیوں کو نماز کا پابند بنائیں۔[☆12]

جنرل ضیا نے تیسرا کام یہ کیا کہ پیپلز پارٹی کی مقبولیت کا توڑ کرنے کے لیے سیاست میں بہت سے نئے چہرے متعارف کرائے تاکہ محنت کش طبقے اور غریب عوام میں بھٹو کی مقبولیت کم ہو۔[☆13] اس لیے ضیاء الحق نے سیاست دانوں کی نئی کھیپ تیار کرائی جو فوجی اسٹیبلشمنٹ کی وفادار تھی۔ اس کام کے لیے مقامی حکومتوں کا نیا نظام متعارف کرایا گیا۔ اس سے اندازہ لگایا

جاسکتا ہے کہ فوج کسی اور ادارے کی نسبت زیادہ چالاکی سے سول سوسائٹی میں سرایت کر سکتی ہے۔ جمہوریت مضبوط کرنے کے بجائے مقامی حکومتوں کے ذریعے پیپلز پارٹی کی قومی سیاست کے جواب میں مقامی سیاست شروع کی گئی۔☆[14]

مقامی حکومتوں کے انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے گئے جس سے جماعتی سیاست کمزور ہوئی اور نچلی سطح کے عوامی نمائندے سامنے آئے۔ اس کے علاوہ مقامی حکومتوں کو ترقیاتی رقوم دے کر سیاسی جماعتوں کا روایتی کردار ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔

1985ء میں قومی انتخابات بھی غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے گئے جس میں زمیں دار اور فیوڈل طبقے کے ارکان نے ہی زیادہ نشستیں حاصل کیں، ان کے علاوہ قبائلی سرداروں اور مذہبی رہنماؤں نے بھی اپنا حصہ حاصل کیا۔☆[15] سیاسی نمائندگی میں سوچے سمجھے طریقے سے کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی گئی تاکہ حکمران اشرافیہ کے امیدوار سیاسی جماعتوں سے ہٹ کر فوجی اسٹیبلشمنٹ کی طرف آجائیں۔ اپنی سیاسی بقا کے لیے یہ سیاست دان سیاسی جماعتیں چھوڑ کر اسٹیبلشمنٹ کے حامی ہو گئے۔

ان غیر جماعتی انتخابات سے کمزور سویلین حکومت وجود میں آئی۔ جنرل ضیا نے محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم بنایا اور ایک کمزور پارلیمنٹ سے 1973ء کے آئین میں آٹھویں ترمیم منظور کرائی۔ 1985ء میں منظور کی جانے والی اس ترمیم کے ذریعے وزیر اعظم کے بجائے صدرِ مملکت کو مسلح افواج کا سپریم کمانڈر بنایا گیا جس کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ پارلیمنٹ کو برخاست کر سکے۔ علاوہ ازیں پارلیمنٹ کو دھونس، دھمکی اور ترغیبات کے ذریعے اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ 1977ء کے بعد جنرل ضیا اور اس کے ساتھی جرنیلوں کے تمام اقدامات کو قانونی تحفظ فراہم کرے۔☆[16] فوجی قوت نے پارلیمنٹ کے ان ممبروں سے خوب کام لیا جن کے اتنے ذاتی مفادات وجود میں آچکے تھے جنھیں وہ جمہوریت کی خاطر کھونے پر تیار نہیں تھے۔ جنرل ضیا نے منتخب نمائندوں کو اپنا سیاسی راستہ منتخب کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔

جب اپریل 1988ء میں راولپنڈی کا اوجھڑی کیمپ دھماکوں کا شکار ہوا اور اس پر جونیجو نے تحقیقات کا حکم دیا تو جنرل ضیاء الحق کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان دھماکوں میں سیکڑوں

بے گناہ لوگ مارے گئے تھے مگر جنرل ضیا تحقیقات نہیں کرانا چاہتا تھا۔ جنرل ضیا کو جونیجو کی افغان پالیسی پر بھی اعتراض تھا، اس لیے ضیا نے جونیجو کی حکومت مئی 1988ء میں بدعنوانی کے الزامات لگا کر برطرف کر دی۔

جنرل ضیا کے دور میں فوج نے سیاسی جماعتوں کے خلاف اپنے جاسوسی کے ادارے خوب استعمال کیے۔ 1980ء کے عشرے میں آئی ایس آئی افغان جنگ کے طفیل بہت مضبوط ہوگئی۔ پھر اس نے اسلامی جمہوری اتحاد اور مہاجر قومی موومنٹ جیسی جماعتیں بھی پیپلز پارٹی کے مقابلے میں کھڑی کیں۔☆[17] فوج نے مذہب اور لسانیت کو سیاسی گروہ بندیوں کے لیے استعمال کیا جس سے فوج کا سیاسی کنٹرول مزید مضبوط ہوا۔☆[18] ایم کیو ایم اور آئی جے آئی نے نہ صرف پیپلز پارٹی کا مقابلہ کیا بلکہ ایم کیو ایم پر تو سندھ میں تشدد کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔☆[19]

جنرل ضیا نے چوتھا کام یہ کیا کہ اپنی حکومت کے ساتھ دیگر طبقوں کو ملایا۔ بڑے کاروباری لوگ جو بھٹو کی قومی ملکیت والی پالیسیوں سے متاثر ہوئے تھے، اُنھیں فوج نے ساتھ ملایا اور مراعات دیں۔ بڑے کاروباری اداروں کی مضبوطی فوج کے اندرونی اور بیرونی جنگی کاوشوں کے لیے بڑی معاون تھی۔ بی سی سی آئی کے آغا حسن عابدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس دور میں فوجی ساز و سامان کی خریداری میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔☆[20] سیٹھ عابد کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اُس نے جوہری پروگرام کا ساز و سامان حاصل کرنے میں فوج کی مدد کی۔ ان جیسے کاروباری افراد نے فوج سے بہت فائدے بھی اٹھائے۔ جنرل ضیا نے بھٹو کے ریاستی ملکیت میں لیے گئے ادارے واپس کرنے شروع کر دیے اور اس سے کاروباری طبقے کو بہت فائدہ پہنچا۔

فوجی حکومت نے کاروباری طبقے کی مدد کر کے دراصل بھٹو کی اس طبقے میں غیر مقبولیت سے فائدہ اٹھایا، کیوں کہ بھٹو کی اصل مقبولیت مزدوروں اور طلبہ تنظیموں میں تھی۔ تاجروں اور بڑے کاروباری طبقوں سے اتحاد کر کے فوج نے پیپلز پارٹی کا متبادل تیار کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ایک مثال نواز شریف کی ہے جو 1990ء کے عشرے میں دو بار وزیراعظم رہے۔ نواز شریف کا خاندان اتفاق گروپ کے نام سے صنعتیں اور دیگر کاروبار چلاتا تھا جسے فوج نے

دوبارہ مدد دے کر اس کے پیروں پر کھڑا کیا۔ شریف خاندان کے سربراہ میاں محمد شریف کے بڑے فرزند میاں نواز شریف نے پنجاب اور پھر قومی سیاست میں اُسی طرح قدم جمائے جس طرح ایوب خان کی زیرِ سرپرستی ذوالفقار علی بھٹو نے جمائے تھے۔ نواز شریف کو زمیں دار اور فیوڈل طبقے کا اثر کم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا جس کی حمایت پی پی کے ساتھ تھی۔ تمام فوجی حکومتیں ایسے سویلین چہرے سامنے لاتی ہیں جو فوجی اقتدار کو قانونی جواز فراہم کر سکیں اور اس کے متبادل کے طور پر اس وقت کام کر سکیں جب فوج کے بڑے حصے کو اپنی بیرکوں میں واپس جانا پڑے۔

اس کے علاوہ فوج کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنی سیاسی طاقت اور کردار کو مضبوط کرنے کے لیے قانونی اور آئینی ڈھانچے میں مطلوبہ ترامیم کی جاتی رہیں۔ ضیا حکومت نے بھی ماورائے آئین اقدامات کرتے ہوئے دسمبر 1984ء میں ریفرنڈم کرایا تاکہ عوامی حمایت کا ڈراما رچایا جاسکے۔ ضیا نے اس صدارتی ریفرنڈم میں عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے اسلام کو بطور ڈھال استعمال کیا۔ جنرل ضیا کے صدارتی ریفرنڈم کا سوال ایسے الفاظ پر مشتمل تھا کہ اگر عوام اسلام کی حمایت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جنرل ضیا اگلے پانچ سال تک صدارتی عہدے پر براجمان رہیں گے۔ ایوب خان کی طرح جنرل ضیاء الحق نے بھی فوجی حکومت کے لیے عوامی حمایت کا سوانگ بھرا۔

1980ء کے عشرے میں بھی فوج نے 1960ء کے عشرے کی طرح اپنے اقتدار کو دوام دینے کی کوشش کی۔ ضیا اپنی وردی میں ہی صدر بن گئے تاکہ فوج سے اُن کا تعلق برقرار رہے۔ جنرل ضیاء الحق کسی بھی قیمت پر اقتدار چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بالآخر 17/اگست 1988ء کو طیارے کے ایک پُراسرار حادثے میں اُن کی موت ہوگئی۔ حادثے کی تحقیقات کو منظرِعام پر نہیں لایا گیا اور نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت ملا کہ شاید اعلیٰ فوجی قیادت میں بے چینی کے باعث حادثہ جان بوجھ کر کرایا گیا ہو۔ فوجی قیادت کبھی بھی اپنے سربراہ کے اقتدار کو کھلم کھلا نہیں للکارتی۔

جنرل ضیا کے اپنے مذہبی رجحانات تو تھے ہی لیکن اس کے علاوہ مذہبی جماعتوں سے

تعاون بھی وقت کی ضرورت بن گیا۔ جنرل ضیا نے مذہبی جماعتوں کو اپنے سویلین چہرے کے طور پر استعمال کیا۔☆[21] اور مذہب کی آڑ میں پارلیمانی جمہوریت کے نظام کو کھوکھلا کر دیا۔ کہا جاتا ہے جنرل ضیا شرعی قانون استعمال کر کے خلافت کی کوئی جدید شکل قائم کرنا چاہتا تھا جس میں منتخب نمائندوں کے بجائے ایک شخص مقتدر ہوتا ہے۔

ان ریشہ دوانیوں کے باوجود فوجی حکومت کو مزید قانونی اور آئینی راستوں کی ضرورت تھی تاکہ دفاعی انتظامیہ کے مفادات کا مستقل تحفظ کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ فوج صرف ثالث کے طور پر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ سیاست دانوں اور سول سوسائٹی کے بہت سے لوگوں نے فوج کو پیپلز پارٹی کا متبادل فراہم کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ نئے سویلین چہرے پیپلز پارٹی کا متبادل تو تھے مگر وہ عوام کے لیے فوج سے زیادہ قابلِ قبول ہو گئے اور فوج ان پر بھی بھروسا کرنے سے کترانے لگی۔

1973ء کے آئین میں آٹھویں ترمیم کر کے فوج کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے تحت صدر کو حکومتیں برطرف کرنے کا اختیار مل گیا اور وہ مسلح افواج کے سپریم کمانڈر بننے کے علاوہ تینوں افواج کے سربراہ اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کا تقرر بھی کر سکتے تھے۔ دفعہ اٹھاون دو (بی) جس کے تحت صدر حکومت کو برطرف کر سکتے تھے، ایک متنازع فیہ دفعہ تھی لیکن یہ فوجی مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے انتہائی مؤثر تھی۔ اس ترمیم کے مطابق:

> ''وزیراعظم کے کہنے پر صدر قومی اسمبلی تحلیل کر دے گا اور قومی اسمبلی اگر پہلے تحلیل نہیں ہوئی تو وزیراعظم کے مشورے کے اڑتالیس گھنٹے بعد خود تحلیل ہو جائے گی۔ ذیلی دفعہ (2) کے باوجود صدر اپنی صوابدید پر بھی قومی اسمبلی کو تحلیل کر سکتا تھا اگر اس کے خیال میں ایسی صورت پیدا ہو گئی ہو کہ حکومت کو آئین کے مطابق چلانا ممکن نہ رہا ہو اور عوام کی رائے طلب کرنا ضرور ہو گیا ہو۔''☆[22]

آنے والے برسوں میں پانچ مرتبہ منتخب حکومتوں کو بدعنوانیوں کے الزامات لگا کر

برطرف کیا گیا اور ایسا ایک بار بھی وزیراعظم کے کہنے پر نہیں کیا گیا۔ منتخب وزیراعظم طاقت کا مرکز ہوتا تھا جسے قابو میں کرنے کے لیے صدر کو یہ اختیار دیا گیا۔ جنرل ضیا نے اپنے من پسند وزیراعظم محمد خان جونیجو کی پارلیمنٹ سے یہ متنازع ترمیم منظور کرائی جس سے جمہوری عمل ہمیشہ کے لیے کمزور ہو گیا۔ ان قانون کے طفیل اب فوج کو بار بار شب خون مار کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ فوجی جنرل اس صدر پر جو فوجی نہ ہو، دباؤ ڈال کر منتخب حکومتیں برخاست کرا سکتے تھے۔ صرف 1990ء کے عشرے میں چار حکومتیں برطرف کی گئیں حالانکہ فوج کا سربراہ براہِ راست اقتدار پر قابض نہیں تھا۔

اقتدار میں فوج کے کردار کو مزید مستحکم کرنے کے لیے قومی سلامتی کونسل بنائی گئی۔ ترکی کے ماڈل پر مبنی اس کونسل کا کردار مشاورتی نوعیت کا تھا جس کے مشورے سے ہنگامی حالات نافذ کیے جا سکتے تھے اور گو کہ جنرل ضیا نے یہ کونسل نہیں بنائی تھی پھر بھی 2004ء میں یہ کونسل بالآخر تشکیل دے دی گئی۔ اس طرح فوجی افسروں نے سویلین قیادت کے مقابلے میں خود کو مضبوط کر لیا اور جمہوری اداروں کی قربانی دے دی گئی۔ 1977ء سے 1988ء تک کا دور وہ ہے جس میں فوج نے ریاست پر اپنی بالادستی دوبارہ قائم کی۔

جنرل ضیاءالحق نے قومی سلامتی کونسل کے قیام پر غالباً دو وجوہ کی بنا پر زور نہیں دیا۔ پہلی تو یہ کہ قومی اسمبلی نے 1973ء کے آئین میں متنازعہ ترمیم کی منظوری کے لیے قومی سلامتی کونسل قائم نہ کرنے کی شرط رکھ دی تھی۔ اس ترمیم کے ذریعے مسلح افواج کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکتا تھا۔ دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ جنرل ضیا کے لیے اب بین الاقوامی ماحول پہلے کی طرح سازگار نہیں رہا تھا اور مسلح افواج کی قوت میں مزید اضافے کی کوشش کرنا خاصا مشکل تھا۔ اپریل 1988ء میں جنیوا معاہدے پر دستخط کے بعد سوویت افواج افغانستان سے نکلنا شروع ہو گئیں اور پاکستان کی اہمیت فرنٹ لائن ریاست کے طور پر نسبتاً کم ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب پاکستانی فوج امریکا کے لیے اتنی کارآمد نہیں رہی۔

اب امریکا افغانستان میں مزید مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے پاکستان کی سول حکومت سے بات چیت شروع کی۔ جونیجو حکومت نے سوویت افواج کے انخلا کے لیے امریکا

سے تعاون کیا اور جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیے جس سے پاکستانی فوج خوش نہیں تھی کیوں کہ فوج اپنے معاملات میں سول مداخلت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دراصل جنیوا معاہدے پر دستخط کر کے جونیجو حکومت نے امریکا کو خوش کیا تھا جس سے حکومت کا اعتماد بڑھ رہا تھا۔ امریکا نے بڑے عرصے بعد پاکستان میں فوج پر سویلین حکومت کو ترجیح دی تھی کیوں کہ اب سوویت انخلا کے بعد امریکا کی پالیسی بدل رہی تھی۔

ان حالات میں جنرل ضیاء الحق قومی سلامتی کونسل کو سویلین حکومت پر تھوپنے کی طاقت سے محروم تھے۔ یاد رہے کہ جنرل ضیا نے جنیوا معاہدے کی مخالفت کی تھی کیوں کہ اُن کے خیال میں افغانستان کے مستقبل کے بارے میں پاکستانی خدشے دور نہیں کیے گئے تھے۔ اس طرح جنرل ضیاء الحق نے 1988ء میں اپنی موت سے پہلے پاک امریکا اتحاد میں دراڑیں پڑتی دیکھ لی تھیں۔

1980ء کے عشرے میں امریکا نے پاکستان میں حکمران فوج کو بڑی مدد دی تھی۔ ریگن انتظامیہ نے پاکستان کو دو امدادی منصوبوں کے تحت بالترتیب تین اعشاریہ دو ارب امریکی ڈالر (ایک سو پچاس اعشاریہ چھ ارب پاکستانی روپے) دیے۔ پاکستان کو جدید ترین ایف سولہ طیارے بھی دیے گئے اور اواکس (Awacs) طیارے بھی فراہم کرنے کی بات کی گئی۔ اگرچہ اواکس ٹیکنالوجی نہیں دی گئی، پھر بھی مجموعی فوجی تکنیکی اور مالیاتی تعاون سے پاکستانی فوج کی صلاحیت نہ صرف داخلی طور پر بلکہ پورے خطے میں خاصی بہتر ہو گئی۔

1980ء کے عشرے میں امریکا اور پاکستان کا باہمی تعاون اس قدر تھا کہ کہا جانے لگا کہ پاکستان کو چلانے والے ''اللہ، آرمی اور امریکا'' ہیں۔ یہ رشتہ 1980ء میں رونالڈ ریگن کے انتخابات جیتنے سے شروع ہوا اور اس سے پاکستانی فوج نے خوب فائدہ اٹھایا۔ دسمبر 1979ء میں سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے باعث جنرل ضیاء الحق جو کبھی قابلِ نفرت تھے، اچانک امریکا اور مغربی دنیا کے منظورِ نظر بن گئے۔ 1980ء سے قبل امریکا اور پاکستان کے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے مگر افغانستان پر سوویت حملے نے صورتِ حال بدل دی اور پاکستان کے فوجی آمر کے دن پھر گئے۔

1988ء میں عام انتخابات کے بعد پاکستان میں جمہوریت بحال کر دی گئی اور پیپلز پارٹی

اقتدار میں واپس آ گئی۔ تاہم متنازعہ دفعہ اٹھاون دو بی نے ضیا کی موت کے بعد بھی فوج اور سیاسی طبقوں کے درمیان کشیدگی باقی رکھی۔

تکلیف دہ شراکت داری (1988-1999ء)

نومبر 1988ء میں ہونے والے انتخابات کے بعد ایک نازک سی جمہوریت کا آغاز ہوا اور اس دور میں جلدی جلدی حکومتیں بدلتی گئیں۔ ان دس برسوں میں پاکستان نے آٹھ وزیراعظم دیکھے جن میں چار نگراں وزیراعظم بھی شامل تھے۔ ایک نگراں وزیراعظم کو عالمی بینک سے بلایا گیا تاکہ وہ تین ماہ کے لیے ملک کو چلائیں۔☆[23] فوج پسِ پردہ رہ کر ہر دو سال بعد سیاسی نظام سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی، خاص طور پر جب بھی سویلین حکومت نے دفاعی انتظامیہ کے اختیارات کو ذرا سا بھی للکارنے کی کوشش کی۔

مثلاً فوج پر الزام ہے کہ اس نے بےنظیر بھٹو اور نواز شریف کی پہلی حکومتوں کو اس لیے برطرف کرایا کہ وہ فوج کی بالادستی کو للکارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ 1990ء میں جب فوج نے بےنظیر حکومت کو برطرف کرنے کی سازش کی تو بےنظیر بھٹو بالکل بےبس نظر آئیں اور ان کی حکومت کو ایک انقلاب کی شکل میں بدل دیا گیا۔☆[24] فوج سے ایسے مسائل کی وجہ سے وہ مشکل کا شکار ہوئیں کہ وہ کور کمانڈروں اور جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے سربراہ کے تقرر میں دخل دینا چاہتی تھیں۔ انھوں نے آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کی جگہ اپنی مرضی کے میجر جنرل شمس الرحمٰن کلّو کو تعینات کیا۔ اس سے فوج خوش نہیں ہوئی اور اس نے جوابی کارروائی کر ڈالی۔☆[25]

کہا جاتا ہے اعلیٰ فوجی قیادت اپنے معاملات میں بےنظیر کی مداخلت سے خوش نہیں تھی اور اس نے سول حکومت کے خلاف آئی ایس آئی کو استعمال کیا۔ فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اسد درّانی نے ایک نجی بینک سے چھ کروڑ روپے ایک اعشاریہ صفر تین ملین امریکی ڈالر حاصل کر کے مس بھٹو حکومت کی برطرفی کے منصوبے پر خرچ کیے۔☆[26] یہ رقم آئی ایس آئی کو دی گئی تاکہ وہ سویلین حکومت کے خاتمے کے لیے استعمال کرے۔

بعد میں فوج نے صدر اور وزیراعظم کے درمیان بحران میں ثالثی کا کردار ادا کیا۔فوج کی مداخلت سے ہی بے نظیر بھٹو کے جانشیں نواز شریف کو برطرف کیا گیا۔فوج نے صدر غلام اسحاق خان کو تیار کیا کہ وہ وزیراعظم نواز شریف کو استعفے پر مجبور کریں۔لیکن سپریم کورٹ نے صدر کی طرف سے نواز شریف کی برطرفی کو غیر قانونی اور غیر آئینی قرار دیا جس سے ایک شدید سیاسی بحران پیدا ہوا۔☆27 فوج کے سربراہ نے ایک ریفری یا ثالث کی طرح غلام اسحاق خان اور نواز شریف دونوں کو استعفے پر مجبور کر دیا۔یہ محض ساکھ بحال رکھنے کی ایک کوشش تھی جسے فوج نے بحران کو حل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ سیاست دانوں نے پچھلے تجربات سے کچھ نہیں سیکھا اور نہ ذوالفقار بھٹو کے حشر ہی سے کوئی عبرت حاصل کی۔ہر سویلین حکومت خود کو اپنے پیش رو سے زیادہ چالاک سمجھ کر جنرلوں کو زیادہ سے زیادہ معاشی ترغیبات اور مواقع فراہم کرتی رہی۔ان دس برسوں میں حکومتوں نے فوج کو بار بار اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ریٹائرڈ جنرل طلعت مسعود کے مطابق سیاست دان اپنے مخالفین کے خلاف فوج کو استعمال کرتے رہے جس سے مسلح افواج کی سیاست میں حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔☆28

اب سوال یہ ہے کہ کیا سیاست دان سیاسی سوجھ بوجھ سے بالکل عاری تھے؟ کیا بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں مل کر کوئی سیاسی ضابطۂ اخلاق نہیں بنا سکتے تھے جس کی مدد سے فوج کو سیاست سے دور رکھا جاسکتا؟ سیاسی قیادت فوج کو سیاسی و معاشی ترغیبات کیوں دیتی رہی؟ ان سوالوں کے دو ممکنہ جواب دیے جاتے ہیں۔

پہلا اور فوج کا پسندیدہ جواب تو یہ ہے کہ سیاست دانوں کی نااہلی کے باعث سیاسی بحران پیدا ہوتے ہیں۔ملک کو لاحق تمام بیماریوں کے ذمے دار سیاست دان اور سول سوسائٹی ہیں۔مسلح افواج کے بہت سے جونیئر افسر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ سیاست دانوں کی نااہلی اور لالچ سے ملک کو بچانے کے لیے فوج مداخلت پر مجبور ہوتی ہے۔فوج کے سویلین پٹھو بھی اسی رائے کے حامل ہیں، مثلاً نواز شریف کی دوسری حکومت میں وزیرِ اطلاعات رہنے والے مشاہد حسین پرویز مشرف کے ساتھ شامل ہونے کے بعد کہتے ہیں:

''دونوں طرف کے سیاست دان گروہ بندیوں کا شکار رہے ہیں اور وہ صرف اسی وقت صحیح رویوں کا مظاہرہ کرتے ہیں جب فوج اُنھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ سیاست دانوں کی اپنی ساکھ بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود ہی باہمی تصفیے کرلیا کریں تا کہ انھیں اوپر سے ڈنڈا نہ مارنا پڑے۔''☆29

گو کہ مشاہد حسین کے اس بیان کو مشرف حکومت کے دباؤ کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے، پھر بھی اس سے ملک کے سیاست دانوں کی کارکردگی کا معیار جانچا جاسکتا ہے۔ فوجی افسر شاہی کا خیال ہے کہ چونکہ سیاست دانوں کو ریاستی نظم و نسق کی مناسب تربیت نہیں دی جاتی، اس لیے وہ بالکل نااہل ہوتے ہیں۔ مشرف کے قائم کردہ قومی تعمیرِ نو بیورو کے سابق سربراہ جنرل تنویر نقوی کا کہنا ہے:

جب میں قومی تعمیرِ نو بیورو کا سربراہ بنا تو بہت سے لوگوں اور اداروں سے ملا تا کہ اُن کے بہترین طور طریقے جان سکوں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ مختلف سیاسی جماعتیں ارکانِ پارلیمنٹ کے لیے تعلیم و تربیت کا باقاعدہ بندوبست کرتی ہیں۔ جرمنی میں پارلیمنٹ کا ہر رُکن تربیت حاصل کرتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو اقتدار میں آنا چاہتے ہیں، اُنھیں اقتدار کے لیے خود کو تیار بھی کرنا چاہیے۔ اس تعلیم و تربیت کی کمی کے باعث وہ اخلاقی اور ذہنی طور پر اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کر پاتے۔ ہمیں پارلیمنٹ کے ارکان کی تعلیم و تربیت میں وسائل لگانے ہوں گے تا کہ مسلح افواج پر سویلین بالادستی قائم رہ سکے۔☆30

جنرل تنویر نقوی کے یہ خیالات فوجی افسروں کے احساسِ برتری کی عکاسی کرتے ہیں جس کے باعث وہ سویلین لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔ فوج کے تعلقاتِ عامہ کے ادارے آئی ایس پی آر (ISPR) کے سابق ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل راشد قریشی کا کہنا ہے کہ ''ایک اوسط درجے کا فوجی افسر ایک اوسط درجے کے سول افسر سے بہت بہتر اور زیادہ

ذہین ہوتا ہے اور سیاست دانوں کے مقابلے میں تو وہ کہیں زیادہ بہتر کام کرسکتا ہے۔''☆31

چونکہ سیاست دان مسلح افواج کو قابو میں نہیں رکھ سکتے، اس لیے فوی افسروں کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ اُن کی تنظیمی تربیت اور نظم وضبط کی بدولت وہ سیاست دانوں کی نسبت بہت بہتر طریقے سے ریاست کے معاملات چلا سکتے ہیں۔ فوجی حکومتوں سے فائدے اٹھانے والے سویلین آلۂ کار بھی یہی راگ الاپتے ہیں۔ مثال کے طور پر قومی اسمبلی میں خواتین کی نشستوں پر نامزد کی جانے والی رکنِ اسمبلی (نامزدگی کا یہ طریقہ مشرف نے متعارف کرایا تھا) دونیا عزیز کے خیال میں فوج بہت زیادہ منظّم اور مستعد ہوتی ہے جب کہ سیاست دان اپنے مقاصد کے لیے پُرخلوص نہیں ہوتے۔☆32 ان کے علاوہ کراچی کی معروف کاروباری شخصیت رزاق تبّا کے خیال میں سیاست دانوں کی نااہلیت کی اصل وجہ اُن میں تعلیم کی کمی ہے۔☆33

بہرحال درجِ بالا نقطۂ نظر پر بہت سے سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں اور اس دعوے کے دفاع میں کافی ثبوت موجود نہیں ہیں۔ آخر پاکستان کے جیسے دیگر ملکوں میں بھی تو جمہوریت چل رہی ہے، مثلاً ہمسایہ ملک بھارت کی تاریخ بھی کم وبیش پاکستان جیسی ہی ہے لیکن وہاں تو فوج تمام بحرانوں کے باوجود سیاست دانوں کے کام خود کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ گو کہ بھارتی افواج بھی داخلی تنازعوں سے نبٹتی ہے اور سویلین حکام سے ناخوش بھی رہتی ہے لیکن پھر بھی بھارت کی سیاسی وفوجی قیادت فوج کو سویلین حکام کی ماتحتی میں ہی رکھتی ہے۔ پاکستانی مسلح افواج کے افسروں کے خیال میں بھارتی سیاست دان اپنے ملک سے زیادہ مخلص ہیں۔☆34 بھارت کے فوجی افسر بھی اپنے ملک میں جمہوری اصولوں کی پاس داری کرتے ہیں۔ مثلاً بھارتی فوج کے سربراہ جنرل مانک شا نے وزیراعظم اندرا گاندھی کے نافذ کردہ ہنگامی حالات میں اُن کی مدد کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ بھارت کے زیرِ اہتمام کشمیر میں اعلیٰ فوجی قیادت نے فوجی افسروں کو زیادہ اختیارات دینے سے۔ اس لیے انکار کردیا کہ وہ فوج کو غیر سیاسی رکھنا چاہتے تھے۔☆35

دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان میں فوج نے سیاسی تربیت بھی شروع کردی۔ مشرف حکومت نے نیشنل ڈیفنس کالج میں سیاست دانوں، صحافیوں، سول ملازمین اور کاروباری افراد

کے لیے قومی سلامتی کے موضوع پر ورکشاپ کرائے۔ اور خواتین اراکانِ اسمبلی کے لیے ایک ''سیاسی اسکول'' کھولنے کی تجویز پر بھی سنجیدگی سے غور کیا گیا۔☆36 ان لوگوں کو صاف ستھرے فوجی ماحول میں اہم موضوعات پر لیکچر دیے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ شرکا فوج کی برتری کے قائل ہوجائیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) کی رکنِ اسمبلی آسیہ عظیم کے مطابق اس طرح کے ورکشاپ میں شرکت کرنے والے ارکانِ اسمبلی میں سے 90 فی صد پارلیمانی طور طریقوں سے واقف نہیں تھے۔☆37 ایسا کرتے ہوئے یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ سیاست دانوں کی ذہنی نشوونما روکنے کی ذمے داری فوج پر بھی عائد ہوتی ہے۔ فوج خود مطلق العنانیت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور سیاسی جماعتیں فوج کے زیرِ سایہ رہنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ان مطلق العنان رویوں کے باعث صرف تربیتی ورکشاپ سے کوئی فائدہ ممکن نہیں۔ جسٹس ساجدہ رضوی کے مطابق سیاست میں فوج کا کردار اس لیے کم نہیں کیا جاسکتا کہ اشرافیہ اور فوج کے مفادات ایک ہی ہوتے ہیں۔☆38

ایک متبادل نقطۂ نظر کے مطابق جسے امریکا کے تحفظاتی ماہر، ڈاکٹر ایشلی ٹیلس نے پیش کیا ہے، پاکستان کے سیاسی بحرانوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ سیاست دانوں کی نظر وسیع نہیں ہوتی اور وہ ایک بہت محدود بصیرت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس محدود بصیرت کے باعث سیاست دان اپنے ذاتی مفادات سے پرے نہیں دیکھ سکتے۔ جب کہ ضرورت وسعتِ نظری کی ہوتی ہے تاکہ ملکی حالات کو علاقائی اور عالمی پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جاسکے۔

ٹیلس کے مطابق اس کوتاہ نظری کی ایک وجہ فوج کی مسلسل حکمرانی ہے۔ سالہا سال کی فوجی بالادستی کے باعث سیاسی قیادت مستقبل میں دور تک دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوچکی ہے۔☆39 یعنی سیاست دان خود اپنے مطلق العنان رویوں کے باعث بھی فوج کو پیچھے ہٹانے کی منصوبہ بندی نہیں کر پاتے۔ یہ نقطۂ نظر پاکستانی سیاست کو صرف ایک جہت سے دیکھتا ہے۔ چونکہ فوج مسلسل سول حکام کے پیچھے لگی رہتی ہے، اس لیے سیاست دان نہ تو سیاسی صورتِ حال میں استحکام لا پاتے ہیں اور نہ طویل مدت کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی برطرفیوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ گو کہ نواز شریف جنرل ضیاء الحق ہی کی پیداوار

تھے اور اُنھیں فوج نے 1990ء میں بے نظیر کے متبادل کے طور پر اقتدار سونپا۔☆40 پھر بھی 1993ء میں اُن کی معزولی فوج کے سربراہ سے اختلافات کے باعث ہوئی جس کا تعلق کویت پر عراقی حملے کے خلاف امریکی کارروائی سے تھا۔ فوج اور نواز شریف کے درمیان ایم کیو ایم کے خلاف فوجی آپریشن پر بھی اختلافات تھے کیوں کہ ایم کیو ایم حکمران جماعت کی اتحادی تھی۔☆41 ظاہر ہے کہ فوج کے فیصلوں پر ہی عمل ہوتا رہا اور حکومتیں برطرف ہوتی رہیں۔ اس لیے ضیاء الدین جیسے تجزیہ نگاروں کے خیال میں سیاسی حکومتوں کے پاس کام کرنے کے مواقع ہی نہیں ہوتے۔☆42

بے نظیر بھٹو 1993ء میں دوبارہ اقتدار میں آئیں لیکن 1996ء میں دوبارہ برطرف کر دی گئیں۔ اُن کی حکومت کے ابتدائی برسوں کی مایوس کن معاشی کارکردگی اور اُن کے شوہر پر بدعنوانی کے الزامات نے سربراہِ حکومت کے طور پر اُن کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا۔☆43 اس بار انھوں نے فوج سے ٹکر بھی نہیں لی تھی اور کشمیر جیسے مسائل پر فوج کی ہاں میں ہاں ملائی تھی لیکن پھر بھی برطرفی سے نہ بچ سکیں۔☆44 حقانی کے خیال میں اُن کی برطرفی کا سبب مذہبی قوتوں کی طرف سے اُن کی مخالفت بھی تھی اور فوج کا یہ خیال بھی کہ وہ امریکا سے مزید امداد حاصل نہیں کر سکتیں۔ افغانستان اور جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے متعلق امریکی اور پاکستانی حکومتیں اختلافِ رائے رکھتی تھیں۔☆45 بے نظیر کے دوسرے دورِ حکومت میں امریکا نے براؤن ترمیم منظور کی جس کے تحت مزید ہتھیار اور فاضل پرزہ جات پاکستان کو دیے جا سکتے تھے لیکن اس ترمیم کے باوجود دوطرفہ تعلقات میں سرد مہری رہی۔

1990ء اور پھر 1996ء میں بے نظیر حکومت کا برطرف کیا جانا فوج کی طرف سے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کا حصہ تھا۔ بے نظیر کے وزیر اعظم ہونے کے باوجود مرکز اور صوبۂ سندھ میں فوج نواز شریف کی مسلم لیگ کو استعمال کرتی رہی۔ اس کے علاوہ جب فوج نواز شریف سے ناخوش ہوتی تو بے نظیر متبادل کے طور پر حاضر تھیں۔

فوج کے جاسوسی کے ادارے سیاسی فریقین کے درمیان اختلافات بڑھاتے رہتے۔☆46 ان اداروں کی مضبوطی کا سبب علاقائی اور عالمی صورتِ حال میں ان کا کردار بھی تھا۔ ان دس

برسوں میں آئی ایس آئی اور دیگر ادارے سیاست دانوں کی خرید و فروخت میں اہم کردار ادا کرتے رہے جس سے سیاسی و معاشی بدعنوانیوں میں بہت اضافہ ہوا۔ اس پر طرہ یہ کہ سیاسی حکومتوں کو برطرف کرتے ہوئے ان پر مالیاتی بدانتظامیوں کے الزامات لگائے جاتے۔ اس دوران خود فوج نے سیاسی نظام کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور سیاست دانوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ہوئے اپنی طاقت مضبوط رکھی۔

استحکامِ اقتدار 1999-2005ء

1999ء میں بچے کھچے سویلین اقتدار کا بھی خاتمہ ہوگیا، اور فوج ایک بار پھر مسندِ اقتدار پر براجمان ہوگئی۔ اس دوران فوج نے مزید قانونی اور آئینی جوڑ توڑ کے ذریعے سیاسی قوتوں کو بہت پیچھے ہٹا دیا۔

نواز شریف 1997ء میں اقتدار میں آنے کے بعد فوج کے سربراہوں سے براہِ راست متصادم ہوئے۔ پہلے جنرل جہانگیر کرامت کو برطرف کیا اور پھر فوج کے نئے سربراہ جنرل پرویز مشرف کو برطرف کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں نواز شریف پر سری لنکا سے آنے والے پی آئی اے کے طیارے میں سوار مسافروں کی زندگیاں خطرے میں ڈالنے کا الزام لگایا گیا۔

اس طیارے میں فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف بھی سوار تھے اور مبینہ طور پر نواز شریف نے اس طیارے کو کراچی میں اترنے سے روکا۔ اس سے قبل نواز شریف نئے فوجی سربراہ کی تقرری کا اعلان کر چکے تھے۔ لیکن نواز شریف کے مخالف چند کور کمانڈروں نے مشرف کی حمایت میں نواز شریف کا تختہ الٹ دیا اور اس طرح فوج دوبارہ براہِ راست مسندِ اقتدار پر بیٹھ گئی۔

نواز شریف کی حکومت کے آخری دنوں میں فوج اور سویلین حکام کے درمیان بالادستی کی شدید جنگ چل رہی تھی۔ وزیر اعظم 1997ء کے عام انتخابات میں دو تہائی اکثریت حاصل کر کے 73ء کے آئین کی دفعہ اٹھاون دو (بی) ختم کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ مشرف سے پہلے جنرل جہانگیر کرامت کو ہٹا کر اور جنرل پرویز مشرف کو فوج کا سربراہ بنا کر نواز شریف سمجھنے لگے کہ وہ فوج کی قوت کم کر سکتے ہیں۔ جہانگیر کرامت نے قومی سلامتی کونسل کے قیام سے

متعلق ایک بیان دیا تھا جس سے نواز شریف ناخوش تھے کیوں کہ ایسی کونسل فوج کو مستقل سیاسی کردار دے سکتی تھی۔ نواز شریف کا کہنا تھا کہ وہ فوج میں اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھتے کہ فوج کے سربراہ کے لیے صرف دو تین اعلیٰ ترین جرنیلوں پر غور کیا جائے۔☆[47] جب کہ دیگر کمانڈروں کا کہنا تھا کہ نواز شریف نے مشرف کا تقرر اس لیے کیا کہ وہ مشرف کو اپنا وفادار سمجھتے تھے۔☆[48]

نواز شریف نے مشرف کو نہ صرف بری فوج کا سربراہ بنایا بلکہ جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے سربراہ کا عہدہ بھی دے دیا (ایڈمرل فصیح بخاری جو بحریہ کے سربراہ ہونے کے علاوہ سینئر ترین کمانڈر تھے، انھوں نے خود کو نظر انداز کیے جانے پر استعفیٰ دے دیا)۔ تاہم نواز شریف نے فوج کو قابو میں رکھنے کے سلسلے میں اپنی اہلیت کا غلط اندازہ لگایا۔ انھوں نے سیاسی خود مختاری کا دفاع کرنے میں فوج کی قوت کا بھی غلط اندازہ لگایا۔ 1999ء کے آنے تک فوج ایک خود مختار طبقے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ جب مشرف نواز شریف کے قابو میں نہیں آئے تو انھوں نے جنرل ضیاء الدین بٹ کو فوج کا سربراہ نامزد کر دیا۔ جنرل بٹ سینئر جرنیل تو تھے لیکن وہ فوج کے لڑنے والے شعبے سے نہیں تھے اور ان کے تقرر سے فوج کے عام طریقۂ کار کی نفی ہو رہی تھی۔

نواز شریف اور مشرف کے درمیان تنازعے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نواز شریف فوج کو اعتماد میں لیے بغیر بھارت سے امن مذاکرات کر رہے تھے جس سے فوج بڑی ناخوش تھی۔ حکومت نے بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کے لیے سرحد پر استقبالیہ تقریب کی اور پھر مشہور 'اعلان نامۂ لاہور' پر دستخط ہوئے۔ اس کے مطابق دونوں ممالک نے تمام متنازعہ معاملات پر جامع مذاکرات کرنے اور باہمی تجارت و سیاحت میں فروغ کی طرف قدم بڑھائے۔ مشرف نے اس تقریب میں شرکت سے انکار کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

واجپائی کے دورے کے بعد پاکستان کی سویلین حکومت کو اس وقت خفت اٹھانی پڑی جب مشرف کی ایما پر جنرلوں نے بھارت کے خلاف ایک فوجی پیش قدمی شروع کر دی جسے اب ''کارگل بحران'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس امر کی اب تک کوئی حتمی وضاحت موجود نہیں ہے کہ جس وقت پاکستانی حکومت بھارت کے ساتھ امن کی جانب پیش رفت کر رہی تھی

تو عین اسی وقت جنرل مشرف نے کارگل میں جنگی کارروائیاں کیوں شروع کیں۔ اس کی وجہ چاہے جو بھی ہو، کارگل بحران سے سویلین اور فوجی حکام کے درمیان کشیدگی کھل کر سامنے آ گئی۔

بحریہ کے سابق سربراہ ایڈمرل بخاری کے خیال میں مشرف نے نواز شریف کو اس لیے ہٹایا کہ وہ کارگل بحران کی تحقیقات شروع کرنے والے تھے۔☆49 جس سے فوج کے سربراہ کی سبکی ہوتی، اس لیے فوج نے 12 اکتوبر 1999ء کو براہِ راست اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اب فوج اپنی پسند کے قواعد وضوابط لاسکتی تھی اور اسی لیے آئین کی دفعہ اٹھاون (دو) (بی) کو بحال کر کے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو برطرف کرنے کا اختیار حاصل کرلیا گیا۔ کور کمانڈروں نے مشرف کی شکل میں صرف ایک شخص کو نہیں بچایا بلکہ اپنے ادارے کی بالادستی کا تحفظ کیا۔ نواز شریف کو بار بار فوج کے سربراہ بدلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔

ایڈمرل بخاری کی درجِ بالا وضاحت صرف جزوی داستان سناتی ہے۔ بھارت کے ساتھ حکومت کے مذاکرات کو دراصل سیاسی قوتوں اور فوج کے درمیان رسا کشی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ نواز شریف کے دور میں سیاسی قوتیں بتدریج مضبوط ہو رہی تھیں۔ فوج کے سربراہوں سے استعفیٰ لیے جا رہے تھے، آئینی ترامیم کو پلٹا جا رہا تھا اور اسی دوران امن مذاکرات بھی کیے جا رہے تھے۔ ایک سویلین وزیراعظم کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مطلب تھا کہ اب کارگل آپریشن میں فوج کے سربراہ کے فیصلوں پر کھلے عام سوالات اٹھائے جاسکتے تھے۔ اس متنازعہ فوجی کارروائی کی تحقیقات سے پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا اور اس سے فوج پر سویلین قوتوں کی حتمی بالادستی ثابت ہوجاتی۔

فوج اپنے اختیارات کو للکارے جانے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی۔ جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ سے فوجی افسروں میں بے چینی پھیل گئی تھی اور وہ اسے مسلح افواج کی توہین سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ بھارت سے امن مذاکرات جن میں کشمیر سمیت تمام امور پر گفتگو ہو، فوج کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے۔ فوج صرف کشمیر کے مسئلے کو نمایاں رکھنا چاہتی تھی کیوں کہ یہی فوج کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اس طرح نواز شریف کی برطرفی سے دراصل فوج نے خارجہ اور دفاعی پالیسی جیسے نازک امور پر اپنی اجارہ داری دوبارہ قائم کرلی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ مشرف حکومت نے نئی دہلی کے ساتھ 2004ء میں تمام امور پر مذاکرات شروع کیے۔ تاہم نواز شریف اور مشرف کے مذاکرات میں فرق یہ تھا کہ فوج کے سربراہ نے مسلح افواج کو قائل کرلیا تھا کہ یہ مذاکرات فوج کی وسیع حکمتِ عملی کا حصہ تھے یعنی ملک کو معاشی اور سیاسی استحکام کی ضرورت اور یہی وہ امن مذاکرات کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مزید برآں ہندوستان کے ساتھ گفت وشنید کو تنازعۂ کشمیر کے حل کے ایک نئے طریقے کے طور پر پیش کیا گیا۔ فوج کو ملکی خودمختاری اور قومی عزت کے ثالث کے طور پر پیش کیا گیا۔

دوسری طرف امن کے بارے میں مشرف کی نیک نیتی پر بھی سوال اٹھائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مشرف نے امن کی بات چیت صرف اس لیے شروع کی کہ ملک کی معاشی حالت اور وسیع تر سیاسی ماحول ایسا نہیں تھا کہ تنازع کو مزید بڑھایا جاتا۔☆[50] امن مذاکرات سے اسلام آباد میں بھارت کی جانب پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی پاکستان دیگر امور مثلاً تجارت وسیاحت کو کشمیر کے مسئلے سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ گو کہ فوج کشیدگی میں اضافہ نہیں چاہتی اور نہ ہی جنگ شروع کرنا چاہتی ہے لیکن پھر بھی وہ اس مسئلے کو چھوڑنا نہیں چاہتی، کیوں کہ اس سے فوج کی اہمیت بھی کم ہوگی اور اس کے لیے خود کو قوم کا محافظ ثابت کرنا مزید مشکل ہوجائے گا۔ جب کہ خود بھارت بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں دے رہا کہ وہ کچھ جغرافیائی تبدیلیاں کرکے اس مسئلے کو حل کرنے پر راضی ہے اور پھر اگر یہ مسئلہ حل ہو بھی گیا تو ضروری نہیں کہ تعلقات میں بہتری آئے۔ باہمی عدم اعتماد اتنا زیادہ ہے کہ دونوں ہمسایے تعلقات جلدی ٹھیک نہیں کر پائیں گے۔

اپنے سے پیش تر کے فوجی حکمرانوں کی طرح مشرف نے خود کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر نہیں کیا بلکہ چیف ایگزیکٹو کا ایک غیر جانب دار عہدہ تخلیق کیا۔ پھر بھی 1999ء میں مسلط کیا جانے والا فوجی اقتدار ایک طرح کا فوجی شب خون ہی تھا۔ مگر اس کے انداز سے سمجھا جاسکتا ہے کہ فوج کس چابک دستی سے خود کو داخلی اور خارجی حالات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ کھلم کھلا مارشل لا کا اعلان کرکے مزید غیر مقبول ہونے کے بجائے فوج کی اعلیٰ قیادت نے بڑے محتاط طریقے سے سیاسی نظام اور سماج میں سرایت کرنے کو ترجیح دی۔ اس فوجی

حکومت نے ذرائعِ ابلاغ کو بھی ضیا حکومت کی طرح ڈرایا دھمکایا نہیں۔ مشرف کے دور میں ذرائع ابلاغ اتنے آزاد رہے ہیں جتنے کہ پچھلی سویلین حکومتوں میں بھی نہیں تھے۔ تاہم اس کے باوجود یہ فوجی حکومت بھی ایسی خبروں پر ناراض ہوتی ہے جن سے اس کی ساکھ متاثر ہوتی ہو۔ اب بھی صحافیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس حکومت میں اب تک کوئی اڑتالیس صحافی غائب ہو چکے ہیں۔☆[51] صرف 2006ء میں سرحد اور بلوچستان میں داخلی تصادم کی اطلاعات دینے والے سات صحافیوں کو قتل کردیا گیا۔ صحافیوں کی تنظیم مجلسِ تحفظِ صحافیاں (Committee to Protect Journalists) کے مطابق ان صحافیوں کے جسم سے برآمد ہونے والی گولیاں وہی تھیں جو عام طور پر جاسوسی کے ادارے استعمال کرتے ہیں۔☆[52]

فوج نے ایک طرف تو اپنی ساکھ کو مثبت بنانے کی کوشش کی اور دوسری طرف سیاست میں نئے چہرے متعارف کرا کے ایک متبادل سیاسی نظام تشکیل دیا جو فوج کے اشاروں پر چلتا رہا۔ پچھلی فوجی حکومتوں کی طرح اس بار بھی ''مقامی سطح کی سیاست'' شروع کی گئی۔ مشرف حکومت نے اسے اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کا نام دیا۔ اس کے نتیجے میں ملک کے چھیانوے اضلاع، تین سو سات تحصیلوں، تیس شہری ٹاؤن کاؤنسلوں اور چھ ہزار بائیس یونین کاؤنسلوں میں مقامی حکومتوں کا نظام شروع کیا گیا۔

غیر جماعتی بنیادوں پر مقامی حکومتوں کے انتخابات سے سیاست میں نئے چہرے وارد ہوئے مگر اس سے بالادست طبقوں کی گرفت کمزور نہیں ہوئی۔ نئے عوامی نمائندے اپنی خالق ''مشرف حکومت'' کے وفادار تھے نہ کہ سیاسی جماعتوں کے۔ اس منصوبے کے تحت مقامی طور پر منتخب نمائندے ترقیاتی منصوبے بنانے کے ذمے دار تھے اور اس عمل میں مقامی انتظامیہ معاون تھی۔ سنہ 2002ء میں منتخب ہونے والے اسمبلیوں اور سینیٹ کے ارکان کا مقامی حکومتوں میں کوئی کردار نہیں تھا۔ تجزیہ نگار محمد وسیم کے مطابق اس طرح کی مقامی سیاست انتہائی مضبوط مرکزی حکومت کو جنم دیتی ہے۔☆[53] بظاہر کسی جماعت سے تعلق نہ رکھنے والے یہ سیاست دان سیاست پر حکومت کے انتظامی اختیار میں اضافے کا باعث بنے۔ مقامی حکومت کے یہ نمائندے اس وقت بہت کام آئے جب مئی 2002ء میں صدارتی ریفرنڈم کرایا گیا۔

انھوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ بیلٹ بکس مشرف کی حمایت میں ڈالے جانے والے ووٹوں سے بھرے ہوں۔ جنرل ضیا کی طرح مشرف نے بھی عام لوگوں کے لیے کوئی متبادل نہیں چھوڑا۔ ریفرنڈم کا سوال یہ تھا:

مقامی حکومتوں کے نظام کی بقا کے لیے، جمہوریت کے قیام کے لیے، اصلاحات کے تسلسل کے لیے، فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے اور قائداعظم کے مقصد کی تکمیل کے لیے آپ صدر جنرل پرویز مشرف کو پانچ سال کے لیے صدرِ پاکستان منتخب کرنا چاہتے ہیں؟''☆54

مشرف نے ملک میں اچھے نظم ونسق کے قیام کا وعدہ کیا تھا لیکن عوام نے فوج کے ماتحت سیاسی نظام پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے بہت کم تعداد میں ووٹ ڈالے۔ ایک ذریعے کے مطابق صرف پندرہ فی صد لوگ ووٹ ڈالنے گئے۔☆55 حزبِ مخالف کی جماعتوں کے مطابق یہ تعداد صرف پانچ فی صد تھی۔☆56 تاہم حکومت نے دعویٰ کیا کہ ستر فی صد لوگوں نے ووٹ ڈالے جن میں اٹھانوے فی صد ووٹ صدر کی حمایت میں تھے۔☆57 ظاہر ہے کہ مشرف سیاست دانوں کو اقتدار منتقل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

ریفرنڈم کے بعد 2002ء کے اواخر میں عام انتخابات ہوئے جن میں فوج نے دل کھول کر دھاندلی کی۔ نہ صرف انتخابات کے دوران بلکہ اس سے بہت پہلے ہی دھاندلی شروع کردی گئی تھی۔ سب سے بڑی دو سیاسی جماعتوں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (نواز) کے رہنماؤں کو انتخابات کے لیے پاکستان آنے سے روکا گیا اور بے نظیر اور نواز شریف کے خلاف ذرائع ابلاغ میں بڑی بھاری مہمیں چلائی گئیں۔☆58 اس کے علاوہ انتخابات پر نظر رکھنے والے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مذہبی جماعتوں کے نوتشکیل شدہ اتحاد متحدہ مجلسِ عمل کے کلیدی ارکان کو انتخابات میں حکومت نے مدد دی۔ اگر متحدہ مجلسِ عمل نشستیں جیت لیتی تو پی پی اور نواز شریف ایک کونے سے لگ جاتیں اور یہی دونوں مشرف کی اصل مخالف سمجھی جاتی تھیں۔☆59 متحدہ مجلسِ عمل کے امیدواروں کے خلاف قانونی مقدمے واپس لینا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

اگرچہ مشرف نے خود یہ انتخابات نہیں لڑے لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ بے نظیر بھٹو

اورنواز شریف یا ان کی جماعتوں کو عوامی مینڈیٹ حاصل ہو جائے، اس طرح متحدہ مجلسِ عمل اور ایم کیو ایم (اس پارٹی کو سندھ میں حمایت حاصل تھی) کی مدد کر کے دو بڑی جماعتوں کی حیثیت کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ فوجی حکومت نے سیاست دانوں کو دباؤ میں لینے کے لیے قومی احتساب بیورو جیسے ادارے بنائے۔

1999ء میں بنائے جانے والے اس ادارے کو اختیارات دیے گئے کہ وہ بدعنوانیوں میں ملوث عناصر کو گرفتار کریں، سزا دیں، نااہل قرار دیں اور انتخابات میں حصہ لینے یا کوئی عہد حاصل کرنے سے روکیں۔☆[60] بعد ازاں نیب کو اس لیے استعمال کیا گیا کہ وہ سیاست دانوں کو ہراساں کر کے اپنے تابع بنائیں۔ اس طرح پی ایم ایل (کیو) کے نام سے ایک ''بادشاہ کی پارٹی'' بنائی گئی، جس کے ارکان کو بدعنوانیوں سے پاک قرار دے دیا گیا۔ اس اثنا میں حزبِ اختلاف کے ارکان بدستور مقدمات میں پھنسے رہے اور انھیں قومی احتساب کی عدالتوں سے نااہل قرار دینے کی کوششیں جاری رہیں۔☆[61] اس کی ایک مثال پی پی کے رہنما یوسف رضا گیلانی ہیں جن پر سرکاری گاڑیاں اور ٹیلی فون غلط استعمال کرنے کے الزامات لگائے گئے۔☆[62]

ان کارستانیوں کے باوجود حکومت مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکی اور پیپلز پارٹی پر دباؤ ڈال کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مزید جوڑ توڑ کیا گیا۔ مراعات سے محروم ہو جانے یا عدالتی مقدمات میں پھنسائے جانے یا نیب کی طرف سے ہراساں کیے جانے کے خوف سے پی پی کے بیس ارکانِ اسمبلی نے پیٹریاٹ گروپ بنا کر پی ایم ایل (کیو) کی حمایت کی اور اُن کی حکومت بن گئی۔ پی پی کے ارکان کا اس طرح ٹوٹنا فوج کے سیاسی جوڑ توڑ کی غیر معمولی مثال تھی۔ یہ پی پی کے ارکانِ اسمبلی کی اپنی جماعت سے علیحدہ ہونے کی پہلی مثال تھی۔

پارلیمنٹ اور حکومت، دونوں میں سے کوئی بھی اپنے عمل میں آزاد نہیں تھا اور منتخب نمائندوں کو فوجی صدر کے ماتحت انتظامیہ نے کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ صدر نے خود حکمران جماعت کے اندرونی معاملات کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھی۔ پی ایم ایل (کیو) کے قائدین اور ان کے اتحادیوں مثلاً ایم کیو ایم وغیرہ کے درمیان معاملات کو کسی بھی سویلین آمر یا وڈیرے کی طرح صدر نے بذاتِ خود سلجھایا۔

فوج نے نئے چہروں کی ایک کھیپ تیار کی جس نے صدر کی شکل میں فوج کے سربراہ کی مدد کی۔ پی ایم ایل (کیو) کے رہنماؤں چودھری شجاعت حسین اور پرویز الٰہی نے مختلف مواقع پر بے نظیر سے تعاون نہ کرنے کے بار بار اعلان کیے۔☆63 جسے مشرف بے انتہا ناپسند کرتے تھے۔ اور مشرف کو بار بار وردی میں صدر منتخب کرانے کا اعلان کیا۔☆64 مشرف کا ارادہ تھا کہ وہ 2007ء کے بعد بھی بحیثیت صدر اپنے عہدے پر توسیع حاصل کریں۔ فوج کے غلبے کو یقینی بنانے کے لیے مشرف کا اقتدار ضروری تھا لیکن اسے صرف سیاسی جماعتوں کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔

فوج کے سربراہ کی حیثیت سے ہی مشرف سیاست دانوں کو استعمال کر سکتے تھے۔ فوجی صدر نے سیاسی نظام کو اغوا کر لیا اور پی ایم ایل (کیو) بار بار صدر کو یقین دلاتی رہی کہ صدر کے اختیارات کو للکارا نہیں جائے گا۔ پی ایم ایل (کیو) کی فیصلہ سازی میں مطلق العنانیت صاف نظر آتی تھی جس کی شکایت اس کے بعض ارکان بھی کرتے تھے۔☆65 بعض ارکان نے حکومت اور پارٹی پر یہ الزام بھی لگایا کہ انھیں صرف فیصلوں پر مہریں لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔☆66 اندرونی تضادات کے باعث 1999ء سے 2005ء تک ملک نے تین وزرائے اعظم اور ایک نگراں وزیر اعظم دیکھے۔ یہ وزرائے اعظم صدر کے پارلیمنٹ کو برطرف کیے بغیر اندرونی سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے بدلے گئے۔ پارلیمنٹ قائم رہنے کو جمہوریت کے استحکام کی نشانی بتایا گیا۔ فوج نے پاکستان کو ایسی افسر شاہانہ اور مطلق العنان ریاست بنا دیا تھا جس میں صدر فوج کا آدمی تھا اور وزیر اعظم ایک بین الاقوامی بینکار، جسے سٹی بینک امریکا سے بلا کر بظاہر معاشی و سیاسی استحکام کے لیے مقرر کیا گیا تھا کیوں کہ یہی استحکام اتحاد کے فائدے میں تھا۔ پارلیمنٹ اور حکمران جماعت کی سیاست انتظامیہ کے ماتحت تھیں۔ ان حالات سے ڈاکٹر وسیم کی اس دلیل کو تقویت ملتی ہے کہ:

> ''پاکستان میں پارلیمنٹ ایک ماتحت مقنّنہ ہے۔ یہاں انتظامیہ بلاشبہ
> قومی منظر پر ایک نمایاں ترین فریق ہے۔ وہی فیصلوں کا آغاز کرتی ہے
> جنھیں قانون سازی کے عمل سے گزار کر قانون بنا دیا جاتا ہے اور پھر

> ان قوانین کی تشریح اور تعمیل کا اختیار افسر شاہی کے پاس ہوتا ہے۔ پاکستانی سیاسی ڈھانچے پر ماورائے پارلیمنٹ قوتوں کی بالادستی کے باعث اکثر پارلیمانی اداروں کو سیاسی فریق محض ضمنی سی چیز گردانتے ہیں۔ باالفاظِ دیگر یہ ادارے موجودہ سیاسی نظام کو قانونی جواز فراہم کرتے ہیں۔ اگر طاقت کا مرکز مقننہ سے باہر ہو تو بھی حکمرانوں کو قانونی و اخلاقی اختیار چاہیے ہوتا ہے۔ اسی لیے چاروں فوجی حکومتوں نے قانونی خلا پُر کرنے کے لیے بالترتیب 1962ء، 1970ء، 1988ء اور 2002ء میں انتخابات کرائے۔''☆67

ظاہر ہے کہ ان حالات میں سیاست دانوں کے پاس کچھ زیادہ متبادل موجود نہیں تھے۔ تاہم سیاست دانوں کے رویے صرف فوج کے باعث خراب نہیں ہوئے۔ اسی لیے سوال کیا جاسکتا ہے کہ سیاست دان کیوں فوج کی زیادتی کا شکار ہوئے اور کیوں عوام یا سیاسی کارکنوں کو متحرک نہیں کیا؟

دراصل اب عوام سیاسی طبقے کے سحر سے نکل چکے تھے۔ پاکستان سے عوامی سیاست کا غائب ہوجانا ملک کے سیاسی وسماجی نظام کے نقائص کا شاخسانہ ہے۔

سیاسی نظام اب بھی پوری طرح سرمایہ دارانہ دور میں داخل نہیں ہوا ہے اور حکمران اشرافیہ بھی مطلق العنان طریقے سے طاقت استعمال کرکے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔ چونکہ بالادست طبقات مسلسل اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش میں رہتے ہیں، اس لیے فوج آسانی سے انھیں اپنے ساتھ شامل کرلیتی ہے۔ ہمارے خیال میں سیاست دان اپنے مشترکہ مفادات کے باعث فوج کے ساتھ تعاون کرتے ہیں کیوں کہ اس طرح بڑے زمیں دار اور کاروباری لوگ مراعات کے بدلے فوج کا ساتھ دیتے ہیں۔

مشرف نے 2007ء کے انتخابات سے قبل بھی مسلم لیگ (ق) کے امیدواروں کے لیے کھلم کھلا عوامی حمایت طلب کی، مثلاً پنجاب کے ایک ضلع چکوال میں ایک جلسے کے دوران صدر نے عوام سے کہا کہ وہ صدر کے حمایتی امیدواروں کو ووٹ دیں تاکہ صدر کا سیاسی نظام

چلتا رہے جس سے بقولِ صدر جمہوریت مضبوط ہوتی ہے۔ صدر نے نہ صرف اپنے سیاسی ساتھیوں کی حمایت کی بلکہ مخالف جماعتوں کے خلاف منفی مہم بھی چلائی۔ صدر نے عوام کے قوم پرستانہ جذبات کو ابھارتے ہوئے مخالف رہنماؤں کو فوج دشمن قرار دیا جو قومی مفاد کے خلاف تھے۔ صدر کا زور اس بات پر رہا کہ مضبوط فوج مستحکم پاکستان کی ضامن ہے، اسی لیے فوج کو مزید مضبوط بناتے رہیں گے۔☆68

مشرف کی قیادت سے ملکی سیاست میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور مطلق العنانیت جاری رہی۔ نئی پارلیمنٹ کی مثال بھی ایسی تھی جیسے نئی بوتل میں پرانی شراب۔ صدر کے حامی قانون کی دھجیاں بکھیرتے رہے اور اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرتے رہے۔ مثال کے طور پر وفاقی وزیرِ قانون کے بیٹے نے اپنے باپ کے سامنے پی آئی اے کے ایک مسافر کی پٹائی اس لیے کی کہ اس نے یہ پوچھنے کا گناہ کیا تھا کہ کیا اس کے جہاز پر بیٹھنے سے پہلے ایئر پورٹ کی سیکیورٹی کے عملے نے اس کی تلاشی لی تھی۔☆69

وزیر نے معافی نہیں مانگی اور ان کے صاحبزادے نے اپنی حرکتیں جاری رکھیں اور بعد میں دارالحکومت کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک بیرے کو مارا۔☆70 دل چسپ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ (ق) کی قیادت نے بھی وزیرِ قانون کی سرزنش نہیں کی۔☆71 دراصل مسلم لیگ (ق) کا رویہ بھی مسلم لیگ (ن) جیسا ہی تھا جسے بدعنوانیوں اور سیاسی خودسری کے الزامات لگا کر برطرف کیا گیا تھا۔ جس طرح مسلم لیگ (ن) کے ارکان نے 1997ء میں سپریم کورٹ پر حملہ کیا تھا، اسی طرح ق لیگ کے کارکنوں نے اپنی جماعت کے باغیوں کی پریس کانفرنس روکنے کے لیے پشاور پریس کلب پر توڑ پھوڑ کی اور درجنوں صحافی زخمی ہوئے۔☆72

ان حرکتوں کے علاوہ ق لیگ کی قیادت کو مشرف کی حمایت کے بدلے بڑے مالیاتی فائدے بھی پہنچے۔ مشرف کے حامی سیاست دانوں کی معاشی چیرہ دستیاں صدر نے نظر انداز کردیں، کیوں کہ صدر کو اپنے اقتدار کے لیے ان کی ضرورت تھی۔

ان رویوں سے ملک میں جاری ''نیم مطلق العنانیت'' کا اظہار ہوتا ہے۔ ''نیم مطلق العنانیت'' کی اصطلاح مائیکل مان نے اپنی ایک اہم کتاب (Sources of Social Power)

میں شاہی جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور جاپان کے لیے استعمال کی تھی جہاں پرانی بادشاہتیں بھی قائم تھیں اور ایک ایسا نظام بھی چل رہا تھا جس میں صرف مرد انتخابات میں ووٹ ڈال سکتے تھے، اس طرح کے سیاسی نظام میں انتخابات تو ہوتے ہیں لیکن عوام کے مفادات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔☆73

اسی طرح پاکستان میں سیاسی جماعتیں اپنے رہنماؤں کے مفادات کے لیے کام کرتی ہیں اور اسی لیے باآسانی فوج کی ساتھی بن جاتی ہیں۔ ملک کی پوری تاریخ میں سیاسی فریقین نے اپنے مفاد کے لیے اختیارات فوج کے حوالے کر دیے، اس طرح فوج بسمارک کے دور میں جرمنی کی مسلح افواج کی طرح کی فوج بن گئی جو خود مختار اور ریاست یا سماج کے دائرۂ اختیار سے باہر تھیں۔ ایک نیم مطلق العنان نظام فوج کی طاقت بڑھاتا رہتا ہے۔ بالادست طبقوں اور فوجی اداروں کے باہمی تعلقات اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ سویلین فریق فوج پر انحصار ختم نہیں کر سکتے۔

اسٹیون کوہن نے اپنی نئی کتاب ''تصورِ پاکستان'' (The Idea of Pakistan) میں بھی اسی اشرافیہ کی ملی بھگت کا ذکر کیا ہے۔ کوہن کے خیال میں پاکستان پر ایک چھوٹی مگر ''ثقافتی اور سماجی'' طور پر متحد اشرافیہ کی حکومت ہے۔ یہ اشرافیہ بمشکل پانچ سو خاندانوں پر مشتمل ہے جو اسٹیبلشمنٹ کا حصہ ہیں۔ ان کے کچھ ذیلی گروہ بھی ہیں مگر یہ سب ''مرکزی ریاست کے بنیادی اصولوں'' کی پاس داری کرتے ہیں۔☆74

بالادست طبقوں اور خاص طور پر سیاسی قیادت کا بے ڈھنگا پن فوج کے بڑھتے ہوئے عمل دخل کی ایک وجہ ہے۔ چونکہ نمایاں سیاست دان فوج کو طاقت کے توازن کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جمہوری ذریعے استعمال نہیں کرتے، اس لیے مسلح افواج کی بالادستی برقرار رہتی ہے۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف جیسے بڑے سیاست دان بھی ایک دوسرے کو کام کرنے کا موقع دینے کی بجائے فوج کو ریفری کے طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف بدعنوانیوں کے الزامات لگا کر مقدمے شروع کرائے۔ نواز شریف نے آصف زرداری کو اپنے دورِ حکومت میں

بدعنوانی کے الزامات کے تحت جیل میں رکھا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی پیپلز پارٹی میں جمہوری عمل مضبوط کرنے کے بجائے مطلق العنانیت برقرار رکھی اور اس پر قومی اخبارات نے انھیں شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ نامور صحافی نجم سیٹھی کے مطابق بے نظیر بھٹو "ایک خودسر، بے رحم، من موجی اور بدعنوان حکمران تھیں جنھوں نے اپنے گرد خوشامدیوں اور چاپلوسی کرنے والوں کو جمع کر کے عوام کی خدمت کے موقعے گنوائے۔"☆75

یہاں یہ بتلانا برمحل ہوگا کہ صدر اسحاق خان اور وزیراعظم نواز شریف کے درمیان سیاسی بحران میں بے نظیر بھٹو نے دارالحکومت اسلام آباد پر دھاوا بولنے کی دھمکی دی۔ کہا جاتا ہے کہ ابھرتے ہوئے سیاسی بحران کو دیکھ کر فوج کے سربراہ وحید کاکڑ اس تصادم میں کود پڑے اور متعلقہ فریقوں کو یقین دلاتے ہوئے کہ وہ براہِ راست کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے، انھوں نے نواز شریف کو استعفیٰ دینے پر راضی کرلیا۔ وزیراعظم اس شرط پر راضی ہوئے کہ اسحاق خان بھی استعفیٰ دیں۔ اس طرح فوج کے سربراہ کے ہاتھوں صدر اور وزیراعظم دونوں کی چھٹی ہوگئی۔☆76

نواز شریف کا رویہ بھی کوئی مختلف نہیں تھا، ان کی پارٹی کے غنڈوں نے حکومت کے خلاف ایک مقدمے کی سماعت کے دوران سپریم کورٹ پر حملہ کیا۔ اس میں پارٹی کے اعلیٰ عہدے دار اور پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ اور وزیراعظم کے بھائی شہباز شریف بھی شامل تھے۔☆77 عدالتِ عالیہ پر حملے کا یہ بھیانک ترین واقعہ تھا۔ عدالتوں کو پہلے بھی فوجی حکومتیں ڈراتی دھمکاتی رہی تھیں لیکن ان کے خلاف طاقت اس طرح پہلے استعمال نہیں ہوتی تھی۔

نواز شریف نے سیاسی مخالفین کو نشانہ بنانے کے لیے مئی 1977ء میں احتساب کا نیا قانون بھی منظور کیا۔ اس کے بعد اگست میں انسدادِ دہشت گردی کا بھی ایک اور قانون منظور کیا گیا جس کے تحت قانون نافذ کرنے والے اداروں کو کسی وارنٹ کے بغیر صرف شک کی بنیاد پر گرفتاری اور تلاشی کے اختیارات مل گئے۔ خود کو مستحکم کرنے کے لیے 1973ء کے آئین میں چودھویں ترمیم کے ذریعے پارٹی کے اندر اختلافِ رائے کو کچلا گیا۔ اب سیاسی جماعت کے رہنما کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ وفاداری بدلنے پر کسی رکن کو جماعت کے علاوہ پارلیمنٹ سے بھی خارج کرا دے۔☆78 اس کا مقصد بدعنوانی روکنے سے زیادہ یہ تھا کہ پارٹی رہنماؤں کی

طاقت میں اضافہ کیا جائے۔

اس کے علاوہ فوج بھی سیاسی طبقے کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے میں لگی رہی۔☆79 اور یہ وہ رویہ ہے جس میں متعدد سیاسی کارکنوں نے فوج کا ساتھ دیا جو اگرچہ عارضی نوعیت کا تھا لیکن اس کے ذریعے وہ اپنے مخالفین کے خلاف اپنے مفادات پختہ کرتے رہے۔ اس رویے کو، اُس رویے سمیت جو پہلے بیان کیا گیا ہے، اشرافیہ کی غارت گری کہا جاسکتا ہے جس میں غالب طبقات اپنے عمل کی طویل المدت قوت کا خیال کیے بغیر اپنے مختصر مدت کے مفادات کا شکار ہوتے رہے۔ سیاسی قیادتیں ایک دوسرے کے سیاسی قائدین کے عمل کو متوازن کرنے کے لیے اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ ریاست پر اس کے منفی اثرات پڑیں گے، فوج کو سیاست میں بار بار ملوث کرتی رہیں۔ غالب طبقات کی مشغولیت ریاست کی صورت کو بدلتی رہی۔ اس قسم کا رویہ صرف جمہوریت ہی کو کمزور نہیں کرتا رہا بلکہ ریاست اور سیاسی نظام کو بھی غارت گر بناتا رہا۔ اس کے نتیجے میں عوامی مفادات مجروح ہوتے رہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ فوج کے ساتھ صرف سیاسی اشرافیہ ہی نے قلیل المدت مفادات کے لیے ملی بھگت نہیں کی بلکہ کاروباری طبقے اور ذرائع ابلاغ سے وابستہ لوگ بھی عارضی فائدوں کے لیے فوج کے آلۂ کار بنتے رہے ہیں۔ ترکی میں بھی فوج نے پاکستان ہی کی طرح کاروباری طبقے کو اپنا پارٹنر بنایا۔ 1980ء میں جب ترکی میں فوج نے اقتدار پر قبضہ کیا تو ایک نیا سماجی معاشی و سیاسی نظام سامنے آیا جس میں نئے سرمایہ دار اور فوج ایک دوسرے کے شریکِ کار تھے۔ ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے نے فوج کے اثر کو تسلیم کیا، کیوں کہ اس کے خیال میں فوج ہی ایک ایسا قابلِ اعتماد ادارہ تھی جو سول سروس اور منتخب عہدے داروں کے انہدام سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرسکتا تھا اور مسلح افواج کے ساتھ پارٹنر شپ ہی بہتر مستقبل کی ضمانت تھی۔☆80

پاکستان میں بھی بڑے کاروباری لوگوں نے فوج سے اتحاد کرکے فائدے اٹھائے ہیں اور ان پر جنرل ایوب اور جنرل ضیا کے بڑے احسانات ہیں۔ ایوب خان نے بڑے کاروباری لوگ تخلیق کیے اور ضیا نے بھٹو کی ریاستی ملکیت والی پالیسی پلٹ کر کاروباری لوگوں کو فائدے

پہنچائے۔ بعد میں بڑے کاروباری اداروں نے سویلین حکومتوں سے بھی اتحاد کیا اور مشرف حکومت سے بھی تا کہ وہ ریاستی صلاحیت کے مطابق دونوں سے فائدہ اٹھائیں۔ آزاد معیشت کی پالیسی سے سرکاری شعبے کے صنعتی اور مالیاتی ادارے نجی ملکیت میں دیے گئے جس سے نجی کاروبار کے علاوہ فوج کے زیرِ انتظام کمپنیوں کو بھی فائدہ پہنچا۔ فوجی حکومتوں نے بھی سول حکومتوں کی طرح اپنے حواریوں کو فائدے پہنچائے۔

پاکستان کے ایک کالم نگار شاکر حسین کے مطابق دنیا بھر میں کاروبار کا بنیادی اصول بقائے اصلح ہے یعنی یہ اصول کہ صرف ''سخت جان باقی رہتے ہیں'' جب کہ پاکستان میں صرف ''موٹے تازے اور تعلقات والے'' کاروبار ہی پھلتے پھولتے ہیں۔☆[81] حکمران طبقوں کے ساتھ روابط وسائل پر اجارہ داری کے لیے بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔ وسائل پر اجارہ داری کا ایک مظاہرہ اُن قرضوں کی شکل میں ہوتا تھا جو بڑے بیوپاریوں اور زمین داروں کو دیے جاتے تھے۔ چونکہ بینکاری کا شعبہ ریاست کے ضابطوں کے تحت چلتا ہے، اس لیے حکومتیں اپنے حامیوں کو بڑے بڑے قرضے دلواتی تھیں یا قرض نادہندگان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتی تھیں۔ 1993ء میں نگراں وزیراعظم معین قریشی کی حکومت نے پہلی مرتبہ قرضے کھانے والوں کی فہرست تیار کی۔ اس فہرست میں سیاست دانوں کے علاوہ بڑے بیوپاری بھی شامل تھے جنھوں نے دس لاکھ روپے سے زائد کے قرضے لیے تھے۔

سویلین وزرائے اعظم نے بھی ریاستی وسائل لٹائے۔ مثال کے طور پر بےنظیر بھٹو اور نواز شریف نے تقریباً دس ارب مالیت کی زمینیں دوستوں اور عزیز و اقارب میں تقسیم کیں۔☆[82] اگست 1993ء میں معین قریشی نے ایک آرڈیننس کے ذریعے کمیٹی بنائی تا کہ ریاستی زمینیں تقسیم کرنے کا جائزہ لیا جائے۔ اس سے پہلے یہ حق صرف سربراہِ حکومت کو حاصل تھا۔ خود معین قریشی کے مطابق وہ اپنے اس صوابدیدی اختیارات کو دیکھ کر بھونچکا رہ گئے جس کے تحت وہ جسے چاہتے، سرکاری زمین دے سکتے تھے۔ معین قریشی کے بعد بےنظیر حکومت نے اس آرڈیننس کو پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا☆[83] جس وجہ سے آرڈیننس ختم ہو گیا۔ تقسیمِ اراضی کے اس صوابدیدی اختیار سے سول اور فوجی دونوں قیادتوں نے خوب فائدے اٹھائے۔

شاہد الرحمٰن کی کتاب ''پاکستان کا مالک کون؟'' (Who Owns Pakistan) ایک چشم کشا تحریر ہے جس میں نجکاری سے فائدے اٹھانے والے کاروباریوں کی تفصیلات درج ہیں۔ بڑے بڑے سرکاری ادارے کوڑیوں کے مول بیچ دیے گئے، اُن کی مالیاتی ذمے داریاں بھی خریداروں کو منتقل نہیں کی گئیں اور اثاثے اور کاروبار سونپ دیے گئے۔☆[84] مصنف کے مطابق ''پاکستان میں نجکاری'' بدعنوان سیاست دانوں اور افسروں کی ملی بھگت سے ہوئی۔☆[85] اس عمل میں فوج نے بھی خوب ہاتھ رنگے۔ فوج کا ذیلی ادارہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ بھی قرضے معاف کرانے والوں میں سرِفہرست ہے۔

قومی وسائل کی یہ لوٹ مار فوجی حکومتوں کے دور میں بھی بند نہیں ہوئی حالانکہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ سیاسی و معاشی نظام کی صفائی کرنے آئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ طویل عرصوں تک حکومت کرنے کے بعد بھی مسلح افواج کوئی بہتر تبدیلی نہیں دکھا سکیں۔☆[86] فوج نہ صرف خود کھاتی ہے بلکہ دیگر کلیدی گروہوں کے مفادات کا تحفظ بھی کرتی ہے تاکہ اس کی حمایت برقرار رہے۔

فوجی طبقے کا ظہور

اس باب میں ہمارا ایک مرکزی استدلال یہی ہے کہ فوج نے ریاست اور اس کی فیصلہ سازی میں حصہ لینے کے لیے خود کو ایک آزاد طبقے کی صورت میں ابھارا۔ اس لیے پہلے تو ریاست اور اس کے سیاسی نظام پر فوج کی بالادستی قائم کی گئی۔ پھر ایوب خان اور ضیاء الحق کی طرح مشرف نے بھی فوجی اقتدار کو مضبوط کیا اور فوج کا سربراہ صدر بھی بن گیا۔ اس کے لیے صدارتی ریفرنڈم کرایا گیا جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ آئین کی دفعہ اٹھاون دو (ب) بحال کی گئی اور قومی سلامتی کونسل قائم کی گئی۔

اس سارے عمل میں ایک طرف تو یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ سیاسی قوتوں کا وجود ہے جو اقتدار میں حصے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی پھر دوسری طرف فوج نے خود کو فیصلہ سازی میں اہم فریق بنا لیا۔ چونکہ ایوب خان، یحیٰی خان اور ضیاء الحق کے تجربات سے

جنرلوں نے سیکھ لیا تھا کہ سویلین قوتوں کو مکمل طور پر کچلا نہیں جاسکتا اور بین الاقوامی ماحول ایسا نہیں کہ جمہوریت کا گلا بالکل گھونٹ دیا جائے، اس لیے فوج نے دیگر ذرائع سے ریاستی اقتدار میں پارٹنر بننے کو ترجیح دی۔ اس کے لیے آئین کی متنازع شقیں بحال کی گئیں تا کہ صدر پارلیمنٹ کو برطرف کر سکے اور سیاسی فریقین کے سروں پر مختلف تلواریں لٹکائی جاسکیں۔ اب فوج محض ایک ثالث نہیں رہی تھی جو سیاسی استحکام بحال کر کے بیرکوں میں چلی جائے، بلکہ اب اُس نے ایک نگراں سرپرست کی شکل اختیار کر لی تھی جو قومی سلامتی کونسل جیسے ادارے کے ذریعے ریاست اور سماج کو قابو میں رکھ سکتی تھی۔

اپریل 2004ء میں منظور کیے جانے والے قومی سلامتی کونسل ایکٹ نے فوج کو فیصلہ سازی اور نظم ونسق میں مستقل کردار عطا کر دیا۔ اس کونسل کے قیام سے مسلح افواج کی چوالیس سالہ جدوجہد کامیاب ہوئی اور فوج اہم ترین ملکی قوت بن گئی۔ اس ایکٹ کے ذریعے قومی سلامتی کونسل کی سربراہی صدر کے پاس تھی اور قومی سلامتی اور اقتدارِ اعلیٰ جیسے امور پر کونسل غور و خوض کر سکتی تھی۔ اس کونسل میں تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کے علاوہ جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کے سربراہ اور آٹھ سویلین شامل کیے گئے یعنی صدر، وزیر اعظم، سینٹ کے سربراہ، قومی اسمبلی کے اسپیکر اور قائدِ حزبِ اختلاف اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ۔☆[87] اس کونسل کے قیام سے فوج نے ایک الگ طبقہ بن کر ریاست کے نگراں سرپرست کی شکل اختیار کر لی جو امورِ ریاست سویلین طبقے کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کونسل میں چار اعلیٰ ترین فوجی عہدے داروں کے ہونے کی وجہ سے فوج کے مفادات کو مستقل تحفظ ملا اور ریاست کے سماجی و معاشی و سیاسی مستقبل پر فوجی سایہ قائم ہو گیا۔

مسلم لیگ (ق) کے مشیرِ ابلاغ مشاہد حسین کے مطابق یہ کونسل جمہوری اداروں کے خلاف نہیں بنائی گئی تھی اور اس کی نوعیت محض مشاورتی تھی۔ ان کے خیال میں پاکستانی فوج نے ترکی کے جس نمونے پر عمل کیا، اس سے مسلح افواج کی قوت میں اضافہ نہیں ہوا☆[88] حالانکہ ترکی کے قومی سلامتی والے ماڈل کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فوج کی طاقت کس طرح بتدریج بڑھتی گئی۔ ترکی میں بھی آئینی ترمیم کے ذریعے قومی سلامتی کونسل کو ریاستی فیصلہ

سازی کا اعلیٰ ترین غیر منتخب ادارہ بنا دیا گیا۔☆[89] بہر صورت اشرافیہ کے زیرِ تسلط معاشروں میں افسر شاہانہ فوج کا کردار کم کرنا یا اس کے مشوروں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ جب بھی مسلح افواج کو فیصلہ سازی میں شامل کیا جاتا ہے یا انھیں کوئی انتظامی کردار سونپا جاتا ہے تو فوج پر سویلین اختیارات کم ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کی طرح ترکی میں بھی فوج نے سیاسی طاقت آزما کر معاشی فوائد بٹورے ہیں۔

قومی سلامتی کونسل کا تصور ترکی کے ماڈل پر مبنی ہے۔☆[90] اس کونسل کے قیام سے مسلح افواج کی سیاسی غیر جانب داری ختم ہوگئی۔ تاہم فوج کا ساتھ دینے والی سیاسی قیادت نے بھی فوج کو سیاسی کردار دیتے ہوئے بڑی بے حسی کا مظاہرہ کیا۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد یعنی متحدہ مجلسِ عمل نے بھی جس نے شروع میں اس نظریے کی مخالفت کی تھی، بالآخر قومی سلامتی کونسل کو قبولیت سے نوازا۔ گو کہ مذہبی جماعتیں جنرل مشرف کے بیک وقت دو عہدوں یعنی فوج کے سربراہ اور سربراہِ مملکت ہونے کی مخالف تھیں۔ دائیں بازو نے فوج کو سیاست میں مستقل کردار دیتے ہوئے کوئی تأمل نہیں کیا۔ دسمبر 2004ء تک مشرف کے فوجی وردی اتارنے کے وعدے پر متحدہ مجلسِ عمل قومی سلامتی کونسل کو قبول کرنے پر تیار ہوگئی۔ بعد میں مشرف وعدے سے پھر گئے اور داخلی حالات کا رونا رونے لگے اور دہشت گردی کے خلاف پاکستان کے کردار کو بہانہ بنایا گیا۔

مشرف کا دعویٰ یہ تھا کہ قومی سلامتی کونسل جمہوریت کو مستحکم کرے گی اور سیاست دانوں کے غیر ذمے دارانہ رویوں کا سدِباب کرے گی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس دعوے کے برعکس کونسل کا اصل مقصد فوج کے مفادات کا تحفظ کرنا اور اسے ریاست کا سرپرست بنائے رکھنا تھا۔ سنہ دو ہزار چار اور پانچ تک فوج کے سیاسی و معاشی مفادات اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ فوج کے لیے انھیں استحکام دینا ضروری تھا۔ ملک کے دیگر بالادست طبقات کی طرح مسلح افواج بھی منفرد وجود رکھتی تھیں جس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ آسان نہیں تھی۔ اب فوج ایک ایسا طبقہ بن چکا ہے جو سب پر بھاری ہے۔ اب فوج کے ارکان زمیں دار بھی ہیں اور سرمایہ دار بھی۔ تاہم ایسا کوئی قانون نہیں جس کی رو سے دیگر سماجی طبقوں کی فوج میں شمولیت پر پابندی

ہو۔ گزشتہ برسوں میں کم آمدنی والے گھرانوں سے بھی جوان مسلح افواج میں بھرتی ہوکر سماجی طور پر متحرک ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو فوج خاصے مالیاتی مواقع فراہم کرتی ہے تاکہ وہ اپنی حالت بہتر کرسکیں۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طبقے میں شمولیت کو خاموشی سے مخصوص لسانی گروہوں تک محدود کردیا گیا اور اس کا انحصار بڑے سخت انتظامی معیارات پر ہے۔ ویسے تو فوج میں اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے کے لیے بڑا روایتی طرزِ عمل درکار ہوتا ہے لیکن اپنے سیاسی اثر ورسوخ کے باعث فوجی باآسانی دیگر طبقوں میں سرایت کرجاتے ہیں۔ جب کہ دیگر طبقے ایسا نہیں کرسکتے۔ فوجیوں کو زمیں دار یا سرمایہ دار بننے کے لیے پیسے سے زیادہ اپنے عہدوں سے مدد ملتی ہے۔

اس پر طرہ یہ کہ فوج کے روایتی طرزِ عمل کو باہر سے للکارا نہیں جاسکتا۔ اعلیٰ عہدے داروں کا عزت واحترام، فوج کے سربراہ کی بالادستی، فوجی برداری میں وسائل کی تقسیم اور تمام حاضر ملازمت اور سبک دوش ہونے والے فوجیوں کا تحفظ ایسی روایات ہیں جن پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے اور دوسرے طبقوں اور عوام کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان روایات کا احترام کریں۔

گزشتہ برسوں میں فوج ریاست، سماج اور معیشت میں مادی اور ذہنی دونوں طرح سے سرایت کرگئی ہے۔ ذہنی سرایت کا مطلب یہ ہے کہ فوج نے سویلین اداروں کے مقابلے میں بہتر ادارے کے طور پر ساکھ بنانے کی کوشش کی ہے اور خود کو واحد منظّم ادارے کے طور پر مارکیٹ کیا ہے۔ گو کہ فوج کی ساکھ بلوچستان اور سندھ میں بہتر نہیں مگر ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں صورتِ حال مختلف ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ تر سرکاری تعلیمی اداروں میں علاقائی اور بین الاقوامی سیاست کا ایک ہی رخ دکھایا جاتا ہے اور ریاست کی سالمیت کو فوجی طاقت سے جوڑا جاتا ہے اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ فوجی برداری کو ہوتا ہے۔

مسلح افواج کے سیاسی مفادات ان کے معاشی فائدوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ فوج کے معاشی مفادات کو سیاسی حربوں سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ فوج کی طبعی اور ذہنی بالادستی انھیں معاشی مفادات کے لیے بڑھائی جاتی ہے۔ چونکہ فوج ریاست کی محافظ ہے، اس لیے اس کے معاشی مفادات کو شاید ہی کبھی کوئی للکارتا ہو۔ حتیٰ کہ مذہبی جماعتیں بھی جو مشرف کے ریاستی

اقتدار پر سوال اٹھاتی ہیں، فوج کے معاشی مفادات پر خاموش رہتی ہیں۔ جب جماعتِ اسلامی کے سربراہ قاضی حسین احمد سے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے ان سرگرمیوں کو قوم کی سماجی و معاشی ترقی کا حصہ بتایا۔☆91 ایک اور مذہبی جماعت جمعیتِ علمائے اسلام کے رہنما مولانا فضل الرحمٰن فوج کے معاشی مفادات پر کسی حد تک تنقید کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سیاست دانوں نے فوج کی مالیاتی خودمختاری روکنے میں کوتاہی کی۔☆92 تاہم وہ بھی فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی سخت مذمت نہیں کرتے اور نہ ہی انھیں روکنے کا کوئی منصوبہ رکھتے ہیں۔

قاضی حسین احمد اور کئی دیگر سیاسی رہنما فوج کے سیاسی اور معاشی مفادات کا ربط سمجھنے سے قاصر ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مذہبی جماعتیں مسلح افواج کی نظریاتی ساتھی رہی ہیں۔ ان کے علاوہ پی پی اور نواز لیگ بھی اس ربط کو بہت دیر میں سمجھے۔ بے نظیر اور نواز شریف دونوں نے پہلے تو فوج کے معاشی مفادات مستحکم کیے اور پھر اس کے منفی نتائج بھگتے۔ بالآخر مئی 2006ء میں میثاقِ جمہوریت کے ذریعے دونوں رہنما مسلح افواج کی معاشی قوت کم کرنے پر متفق ہو گئے۔

فوج کی اندرونی معیشت ایک سنجیدہ مسئلہ ہے کیوں کہ یہ تنظیم کی مالی خودمختاری کو ظاہر کرتی ہے اور یہ فوج کے سیاسی اثرات کو سہارا دیتی ہے۔ یہ حقیقت کہ فوج سے وابستہ افراد کی باہمی اخوت وسائل کو بڑھا سکتی ہے اور وہ تنہا بہت فوائد پیدا کر سکتی ہے، سویلین حکومتوں اور اداروں پر سے اس کے نفسیاتی انحصار کو گھٹا سکتی ہے۔ فوج کی اندرونی معیشت ملک کی انسٹھ سال کی تاریخ میں بتدریج ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ فوج کی معاشی سلطنت 1954ء میں قائم ہوئی اور اسی سال وہ سیاست میں داخل ہوئی۔ لیکن اس میں بڑی توسیع 1977ء کے بعد ہوئی جب وہ معیشت، سماج اور سیاست میں بڑے منظّم طریقے سے نفوذ کر گئی۔

فوج کا تجارتی دائرۂ عمل مالیاتی اور بینکاری حلقوں اور دوسرے اداروں سمیت تجارت کے نئے دائروں میں پھیلتا رہا۔ فوج کی کاروباری سرگرمیاں مختلف شعبوں میں پھیلنے سے نجی شعبے کے اثاثوں میں فوج کا حصہ بڑھنے لگا اور فوج ملک کے معاشی فریقین میں بالادست ہوتی گئی۔ ایسا تین سطحوں پر ہوا:

(1) فوج کی براہِ راست مداخلت کے ذریعے

(2) ذیلی اداروں کے ذریعے

(3) فوجی برادری کے انفرادی ارکان کے ذریعے

مالیاتی مراعات بانٹتے وقت فوج کے قریبی ساتھیوں کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ پاکستانی فوج کی معاشی سلطنت بھی ترکی کی طرح بڑھنے لگی۔ ترکی میں بھی اعلیٰ فوجی افسروں کو سبک دوش ہونے کے بعد دیگر بڑے اداروں میں اعلیٰ انتظامی عہدے سونپے جاتے ہیں۔ وہاں بھی فوج کی ایک انجمنِ امدادِ باہمی موجود ہے جو 1961ء میں قائم ہوئی اور سبک دوش ہونے والے افسروں کو مالیاتی فائدے پہنچاتی ہے۔ بہرحال اس کے منافع میں 1966ء میں جنرل اسمے کے انتخاب کے بعد اضافہ ہوا۔☆93

ترکی اور پاکستان دونوں ملکوں میں فوج کا سیاسی و معاشی اثر ورسوخ تیزی سے بڑھا اور فوج نے قانونی اور آئینی ہتھکنڈوں سے فیصلہ سازی میں اپنے اختیارات بڑھائے۔ اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں کوئی ایک ہزار سے زائد حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ افسر مختلف انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ کئی ریٹائرڈ فوجی بڑی بڑی سرکاری جامعات کے سربراہ بنائے گئے۔

مشرف کے دور میں فوجی برداری کے لوگ سرکاری عہدوں کے علاوہ شہری اور دیہی علاقوں میں زمینوں کی خرید و فروخت میں بھی بڑے پیمانے پر ملوث ہوئے۔ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد ان سرگرمیوں میں اور اضافہ ہوا اور ہر قسم کی تنقید کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ بات اور زیادہ اہم ہے کہ فوج اپنے تجارتی مفادات کی بہت زیادہ محافظ رہی ہے۔ مسلح افواج اور دفاعی اداروں کے ریٹائرڈ ملازمین نے اپنی معاشی سرگرمیوں پر تمام تنقیدوں کی ہمت شکنی کے لیے آپس میں شراکت کر لی۔ فوج کی حیثیت ایک غالب معاشی عامل کے طور پر تنظیم کے ایک آزاد طبقے کی شکل میں ارتقا کا نتیجہ ہے جو اس کے مفادات کی پوری طرح حفاظت کرتی ہے۔ فوجی اخوت ایک علیٰحدہ طریقہ ہے جو ریاست اور اس کے وسائل کے کنٹرول میں اپنے مفادات کو مستحکم رکھتی ہے۔ مزید برآں اس نے اپنی طاقت کو ایک اداراتی شکل دے دی ہے

اور پالیسی کے نفاذ کے لیے ایک معمولی پرزے کی بجائے دوسرے غالب طبقات کے ساتھ طاقت میں ایک آزاد عامل بن گئی ہے۔

جیسا کہ اس باب میں بیان کیا جاچکا ہے، وسائل اور مواقع کی دوبارہ تقسیم صرف فوج تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں فوج کے متوسلین بھی شامل تھے۔ پاکستان میں سیاسی کارکنان اور دوسرے غالب طبقات جیسے سول اشرافیہ اور کاروباری تنظیم کار فوجی اخوت کے ساتھ شراکت میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ ملک میں جمہوریت کی مضبوطی کے لیے نقصان دہ ہے۔ سیاسی لوگوں کو بطورِ خاص کسی وقت بھی جب اسے فوج کے حکم پر اس طرف سے محسوس ہوتا ہے تو اسے طاقت سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے سیاسی قیادت سینئر جنرلوں کے ساتھ گفت وشنید جاری رکھتی ہے اور اس کے نتیجے میں فوج کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی خود کو ملفوف رکھتی ہے۔

بہرحال یہ بات محسوس نہیں کی جاتی کہ سول اور فوج کے رشتوں کا عدم توازن ایک ساختیاتی مسئلہ ہے جو فوجی معیشت اور سیاسی مفادات کے درمیان مشکل رشتوں کی تفہیم سے پیدا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ملک کا سماجی و سیاسی نظام بدستور مطلق العنانیت پر مبنی ہے اور حکمران طبقے فوج کو ذاتی معاشی و سیاسی مفادات کے لیے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس طرح اشرافیہ بدستور مسلح افواج کو مضبوط کرتی ہے جس سے فوجی برادری خود ایک طبقے کی شکل میں مزید مستحکم ہوتی ہے۔

باب—4

فوج کے کاروباری نظام کی تشکیل

پاکستان میں فوج ایک ایسے منہ زور سیاسی فریق کی حیثیت رکھتی ہے جس کا اثر ورسوخ ملک کے کسی بھی دوسرے فریق سے زیادہ ہے۔ اس ادارے کا سیاسی دائرۂ اختیار جس پر پچھلے دو ابواب میں گفتگو کی گئی، دراصل اس کی مالیاتی خودمختاری کا بھی مظہر ہے۔ گزشتہ برسوں میں فوج نے ایک ایسی معاشی سلطنت تشکیل دے لی ہے جو اسے ایک ادارے کی حیثیت سے مستحکم کرتی ہے۔ پاکستان میں فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی ساخت خاصی پیچیدہ ہے۔ جس کی اس باب میں وضاحت کی جائے گی۔

معاشی سلطنت

پاکستانی فوج کی داخلی معیشت نمایاں طور پر مرکز گریز ساخت کی حامل ہے۔ جو معیشت کی تین سطحوں اور تین شعبوں زراعت، صنعت اور انتظامی شعبے میں بروئے کار آتی ہے (دیکھیے جدول 4.1)۔

فوج کے معاشی کردار پر تنقید کرنے والے اگرچہ اس کے چار ذیلی اداروں—فوجی فاؤنڈیشن، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ، شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن کو تو بے شک موضوعِ گفتگو بناتے ہیں لیکن فوج کی معاشی سلطنت جیسا کہ جدول 4.1 سے واضح ہوتا ہے، ان چار اداروں

سے کہیں زیادہ وسعت رکھتی ہے۔

شفافیت نہ ہونے کے باعث فوج کی داخلی معیشت کا بڑا حصہ مخفی رہتا ہے۔ یہ پوشیدہ حصہ ان تجارتی سرگرمیوں جو افواج کے مختلف ادارے جاری رکھتے ہیں اور ان معاشی فوائد جو فوج کے طبقۂ اشرافیہ کے افراد حاصل کرتے ہیں، پر مشتمل ہے۔ جدول 4.1 پر سرسری نگاہ بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہوگی کہ پاکستان میں فوجی کاروبار کا ڈھانچا خاصا پیچیدہ ہے جس میں متعدد ادارے معاشی مواقع پیدا کرتے رہتے ہیں۔

دفاعی انتظامیہ میں حتمی اختیار وزارتِ دفاع کے پاس ہوتا ہے۔ ادارے کے معاشی نظام میں اس کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔ فوجی کاروبار کے چار اہم شعبوں: سروس ہیڈ کوارٹر، ڈیپارٹمنٹ آف ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ (MLC)، فوجی فاؤنڈیشن، رینجرز (نیم فوجی دستے) کا نظم ونسق وزارتِ دفاع کے تحت ہوتا ہے۔

ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ (MLC) زمینیں حاصل کر کے سروس ہیڈ کوارٹر کو دیتا ہے جو آگے اس کے ارکان میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن بھی ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ کے تحت کام کرتی ہے۔ اس کا سربراہ سیکریٹری دفاع ہوتا ہے۔ ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ کا ادارہ بھی وزارتِ دفاع کے ماتحت ہوتا ہے۔

جدول 4.1

معیشت پر پاکستانی فوج کا اختیار

	ادارے	ذیلی ادارے	افراد
زراعت	✓	✓	✓
صنعت	✓	✓	✓
خدمات	✓	✓	✓

نقشہ: 4.1 فوجی کاروبار کا ڈھانچا
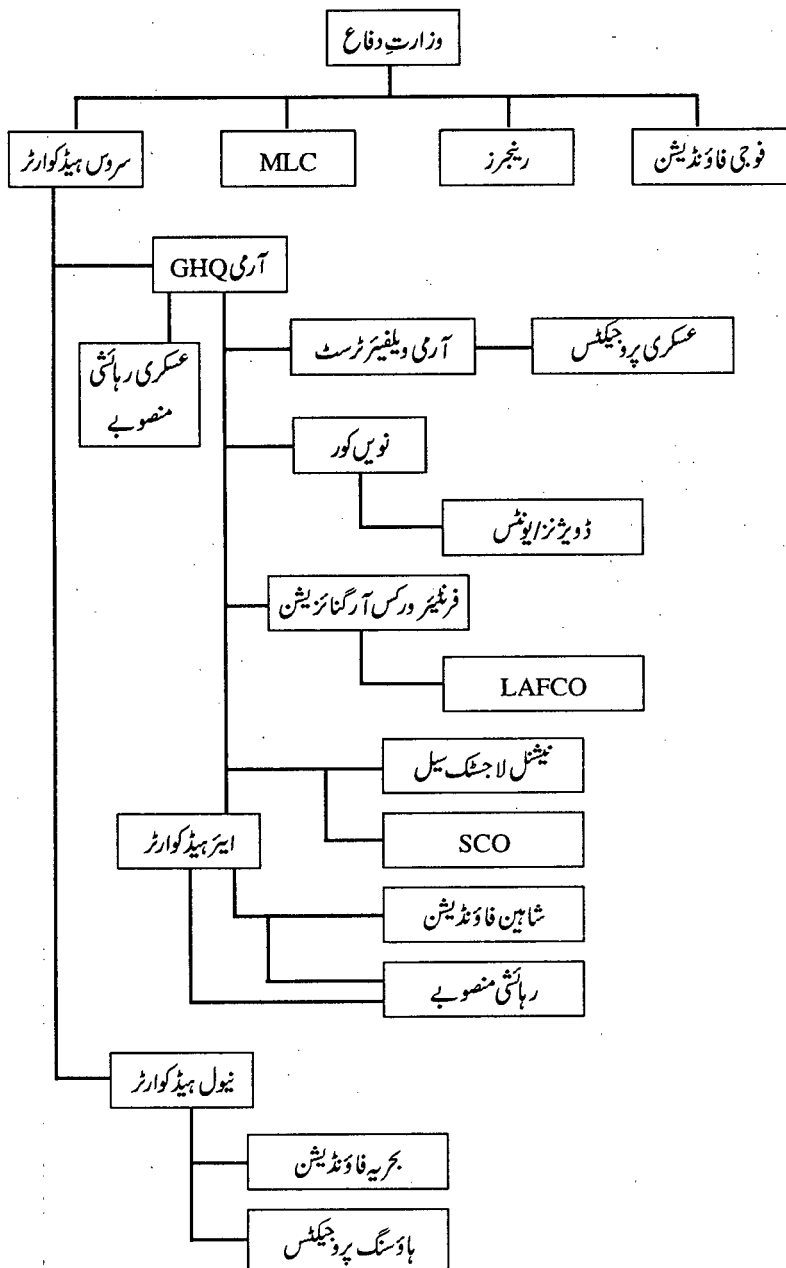
فوج کی معاشی سرگرمیوں کا جال سروس ہیڈکوارٹر کی سطح پر آ کر اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ تینوں افواج کی اپنی اپنی ویلفیئر فاؤنڈیشنز ہیں۔ جنھیں براہِ راست ان افواج کے اعلیٰ عہدے دار سنبھالتے ہیں۔ اس کے علاوہ فوج کی نوکور ہیں جن کی ڈویژنوں اور یونٹوں میں ذیلی تقسیم کی گئی ہے۔ ان سب کی آزادانہ سرگرمیاں ہوتی ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں فوجی کوآپریٹوز کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ نیشنل لاجسٹک سیل (NLC)، فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن (FWO) اور اسپیشل کمیونی کیشن آرگنائزیشن (SCO) ہیں جو فوج کے زیرِ انتظام کام کرتے ہیں۔ پاکستان رینجرز جو نیم فوجی تنظیم ہے، وہ بھی وزارتِ دفاع کے تحت کام کرتی ہے۔

تاہم ان سب اداروں کے وزارتِ دفاع کے ماتحت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمام معاشی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی مرکزی دائرے میں کی جاتی ہے۔ اس سے صرف اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ملک کی دفاعی انتظامیہ کا مجموعی نظام وزارتِ دفاع کے ماتحت ہے۔ ویسے تینوں افواج اپنی منصوبہ بندی آزادانہ طور پر کرتی ہے۔ اصل میں وزارتِ دفاع کو تو صرف معاشی سودے بازی اور وسائل پر اجارے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً اس کے ذریعے صوبائی یا وفاقی حکومتوں سے زمین لے کر تینوں افواج میں تقسیم کی جاتی ہیں جو وہ آگے اپنے افرادِ کار میں بانٹ دیتی ہیں۔ مختلف سرکاری محکمے جیسے وزارتِ دفاع یا ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ دراصل معاشی استحصال کے انتظامی وسیلے ہیں۔

پاکستان میں فوج کی کاروباری سرگرمیاں انڈونیشیا اور ترکی کے فوجی کاروبار کی ملی جلی شکل ہیں۔ انڈونیشیا کے فوجی کاروبار کی طرح یہاں بھی فوج کی داخلی معیشت متعدد پہلوؤں کی حامل ہے۔ انڈونیشیا کی فوج جسے ابری (ABRI) کہا جاتا ہے کئی ویلفیئر فاؤنڈیشنز کے ذریعے کاروباری سرگرمیاں چلاتی ہے۔ وہاں ایسے کئی کوآپریٹو ادارے بھی ہیں جو براہِ راست فوجی عہدے داروں کی سرپرستی میں کام کرتے ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایسے کوآپریٹو ادارے 1980ء میں اُس وقت شروع ہوئے جب فوج کے اعلیٰ سربراہوں کے معاشی استحکام کے لیے اقدامات کیے گئے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے فوجی کوآپریٹو ادارے فوج کے سرکاری وسائل مثال کے طور پر افرادی قوت وغیرہ استعمال کرتے ہیں، تاہم وہ یہ ضروری

نہیں سمجھتے کہ اپنے ہاں ایک ایسا شعبہ الگ قائم کریں جو معاشی وسیاسی انتظام میں مہارت رکھتا ہو۔ ہمارے اور انڈونیشیا کے نظام میں جو کلیدی نوعیت کے امتیازات ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے اور یہی بات یہاں انڈونیشیا سے مختلف ہے۔ ایک اور فرق سویلین سرکاری اداروں سے مالیاتی اور انتظامی رابطوں کا ہے۔ انڈونیشیا کے برعکس پاکستانی فوج کی داخلی معیشت ایک آزاد حیثیت رکھتی ہے۔

پاکستان اور ترکی میں مماثلت زیادہ تر وسائل اور تجارتی منصوبوں کے انتظام کی ہے۔ حاضر ملازمت عہدے داروں کو براہِ راست کاروباری سرگرمیوں میں ملوث کرنے کے بجائے فوج اپنے اثر ورسوخ اور وسائل استعمال کر کے سرمایہ کاری کے لیے ویلفیئر فنڈ فراہم کرتی ہے۔ چاروں ویلفیئر فاؤنڈیشنز سروس ہیڈکوارٹر کے ماتحت کام کرتی ہیں اور انھیں ریٹائرڈ فوجی افسر چلاتے ہیں۔ منافع کی رقوم حصہ داروں میں تقسیم کردی جاتی ہیں اور یہ حصے دار بھی خود ریٹائرڈ فوجی ہی ہوتے ہیں۔

تینوں افواج کے درمیان مسابقت بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار فوج کی داخلی معیشت کی ساخت سے ہوجاتا ہے۔ ترکی میں فوجی فاؤنڈیشن جسے اویاک (OYAK) کہتے ہیں، تمام افواج کے مفادات کی نمائندگی کرتی ہے، اس کے برعکس پاکستان میں فوج کی کاروباری سرگرمیاں تینوں مسلح افواج میں الگ الگ ہیں۔ تینوں افواج کی علیٰحدہ ویلفیئر فاؤنڈیشنز اور رہائشی منصوبے ہیں۔ چونکہ ان کے حجم مختلف ہیں اس لیے بظاہر تو تینوں افواج میں کوئی مقابلہ نظر نہیں آتا۔ تاہم تینوں افواج اپنی تجارتی اور معاشی سرگرمیوں کو بے لگام طریقے سے پھیلانے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔

فوج کی معاشی سلطنت تین منفرد سطحوں پر کام کرتی ہے:

- ادارے کی براہِ راست شرکت کے ذریعے
- ذیلی اداروں کی سطح پر
- انفرادی سطح پر

اگلے حصے میں ان تینوں سطحوں کی ساخت اور عملی سرگرمیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

پہلی سطح: ادارے کی حیثیت میں

اس سطح پر فوج براہِ راست منافع بخش سرگرمیوں میں شامل ہوتی ہے۔ معاشی سرگرمیاں دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں، ان میں ایک تو بڑے سرکاری شعبے کے ادارے ہیں جو فوج کے ماتحت ہیں اور دوسرے کوآپریٹو ادارے ہیں۔ اس حوالے سے تین بڑے سرکاری ادارے ہیں: نیشنل لاجسٹک سیل، فرنٹیر ورکس آرگنائزیشن اور اسپیشل کمیونی کیشن آرگنائزیشن۔

نیشنل لاجسٹک سیل (NLC)

یہ ادارہ اگست 1978ء میں فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل (QMG) نے قائم کیا۔ این ایل سی ملک کی سب سے بڑی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی ہے۔ اس کے پاس 1689 گاڑیاں ہیں اور اس طرح اس کا شمار ایشیا کے بڑے سرکاری بیڑوں میں ہوتا ہے۔ یہ ادارہ سڑکیں، پُل اور گندم ذخیرہ کرنے کے گودام بھی بناتا ہے۔ یوں تو اس ادارے کو منصوبہ بندی کی وزارت کا حصہ بتایا جاتا ہے لیکن دراصل یہ فوج کے زیرِ انتظام ہے۔ (دیکھیے جدول 4.2)

انتظامی طور پر بظاہر این ایل سی کے بورڈ کا سربراہ وفاقی وزیرِ منصوبہ بندی و ترقیات ہوتا تھا۔ بعدازاں اسے بدل کر وزیرِ مالیات کو سربراہ بنا دیا گیا۔ اس ادارے کے بورڈ میں کمیونی کیشن، ریلوے اور خوراک و زراعت کے وفاقی وزرا کے علاوہ ادارۂ منصوبہ بندی کے نائب سربراہ، انھی شعبوں کے وفاقی سیکریٹری اور فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل شامل ہوتے ہیں۔ کوارٹر ماسٹر جنرل اس ادارے کے بورڈ کا سیکریٹری بھی ہوتا ہے۔ این ایل سی کے گراؤنڈ آپریشن فوج کے ماتحت ہوتے ہیں۔ این ایل سی میں فوج کے حاضر ملازمت افسر کام کرتے ہیں اور اس کے چاروں مرکزی شعبوں جن کو نقشہ 4.2 میں نمایاں کیا گیا ہے، کے سربراہ بریگیڈیئر کے درجے کے حاضر ملازمت افسران ہوتے ہیں۔

این ایل سی میں 7,279 لوگ کام کرتے ہیں جن میں 2549 حاضر ملازمت اور بقیہ ریٹائرڈ فوجی اور سول انتظامیہ کے لوگ ہیں۔ سول انتظامیہ کے لوگ کچھ انتظامی عہدوں اور

کلرک کے طور پر کام کرتے ہیں۔ یہ ادارہ نیشنل لاجسٹک بورڈ کے زیرِ انتظام کام کرتا ہے جس کا سربراہ وفاقی وزیر ہوتا ہے۔ این ایل سی کا انتظامی اختیار کوارٹر ماسٹر جنرل کے پاس ہے اور اس کی مالیت کا تخمینہ سنہ 1-2000ء میں 3,964.625 ملین روپے لگایا گیا تھا۔

نقشہ 4.2: نیشنل لاجسٹک سیل کا ڈھانچا
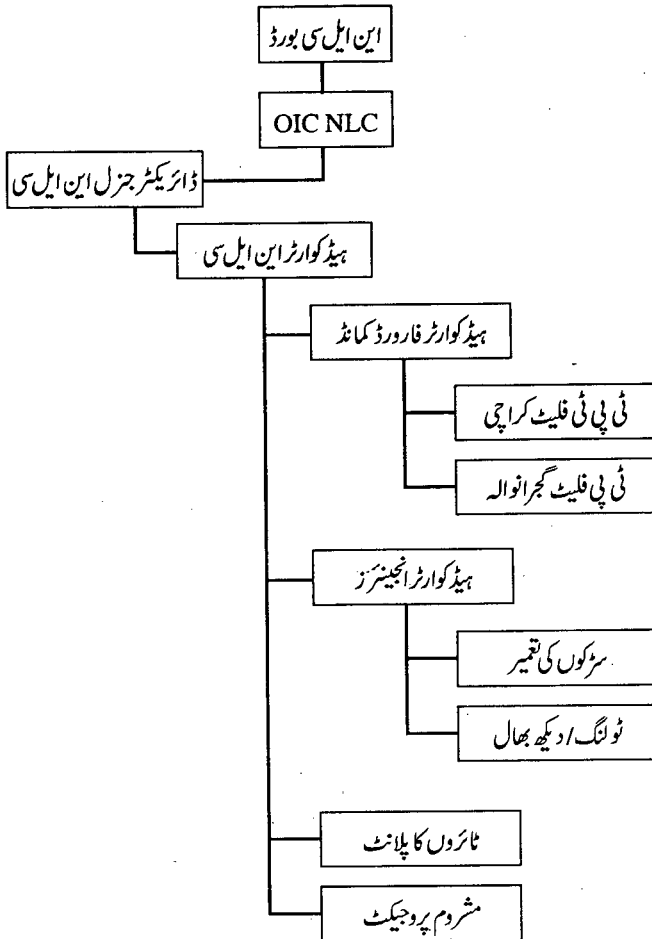
این ایل سی 1978ء میں قائم کی گئی اور اس کا مقصد ملک کی واحد بندرگاہ کراچی سے

آمدورفت کے بحران کو حل کرنا تھا۔کوارٹر ماسٹر جنرل سعید قادر کو جنرل ضیاء الحق نے ہدایت کی تھی کہ وزارتِ مواصلات کے تحت ایک علیٰحدہ سیل قائم کیا جائے جو کراچی کی بندرگاہ سے اشیا کی منتقلی کے لیے سڑکیں وغیرہ بنائے اور گندم کا ذخیرہ کرنے کے گودام تعمیر کرے۔☆[1] اس طرح این ایل سی ''متبادل'' ادارے کی ایک مثال ہے۔''متبادل'' اداروں سے مراد ایسے ادارے ہیں جو فوج کسی خلا کو پُر کرنے کے لیے یا کسی نااہل سول ادارے کے مقابلے میں قائم کرتی ہے۔سعید قادر کا کہنا ہے کہ انھیں شروع سے ہی وسیع اختیار دیے گئے تھے جن میں ملک کے ایک حصے سے دوسرے تک اشیا کی نقل و حمل کے لیے جہاں بھی ضروری سمجھا جائے وہاں سڑکوں کی تعمیر و مرمت کے کام شامل تھے۔☆[2] یہی ادارہ 1980ء کے بعد افغان آپریشن میں بھی معاونت کرتا رہا۔

فرنٹیر ورکس آرگنائزیشن (FWO)

ایف ڈبلیو او 1966ء میں قائم کیا گیا اور اس کا کام آٹھ سو پانچ کلومیٹر لمبی شاہراہِ قراقرم تعمیر کرنا تھا۔ یہ ادارہ اب بھی ملک میں سڑکیں تعمیر کرنے اور محصول وصول کرنے والا سب سے بڑا ادارہ ہے۔☆[3] اس ادارے میں فوج کے انجینئر کام کرتے ہیں جنھیں پہلے پاکستان اور چین کے درمیان رابطہ سڑک بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ گوکہ اس ادارے میں فوجی عملہ کام کرتا ہے لیکن ابتدا میں اسے وزارتِ مواصلات کے تحت رکھا گیا تھا۔ تاہم بعدازاں اسے وزارتِ دفاع کے تحت کردیا گیا۔

شاہراہِ قراقرم کی تکمیل کے بعد اس ادارے کو ختم نہیں کیا گیا۔ اسے ایک ایسی محفوظ قوت قرار دیا گیا جسے مستقبل میں کسی مسئلے سے نمٹنے یا نادیدہ ہنگامی حالات کو سنبھالنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا، لیکن اب یہ ادارہ بھی دراصل کاروباری سرگرمیوں میں مشغول ہے۔ اب یہ ہے کہ حکومت کے تمام بڑے تعمیراتی منصوبے ایف ڈبلیو او کو دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کی تمام چھوٹی بڑی سڑکوں کے منسلکہ مقامات سے ایف ڈبلیو او محصول وصول کرتا ہے۔ یہ کام پہلے نجی شعبے کے ٹھیکے داروں کو دیے جاتے تھے۔ 1990ء کے عشرے سے یہ

ادارہ سرکاری شعبے میں سڑکوں کی تعمیر کا سب سے بڑا ادارہ بن گیا۔ 1990ء کے بعد ایف ڈبلیو او نے LAFCO کے نام سے ایک اور ذیلی ادارہ تشکیل دیا جس میں نجی شعبے کے ٹھیکے دار بھی شامل ہیں۔

اسپیشل کمیونی کیشن آرگنائزیشن (SCO)

ایس سی او ابتداً 1976ء میں قائم کی گئی تا کہ یہ آزاد جموں و کشمیر اور شمالی علاقوں میں ٹیلی کمیونی کیشن کا جال بچھائے۔☆[4] یہ بھی ایک فوجی ادارہ ہے جو سگنلز ڈائی ریکٹوریٹ اور وزارتِ اطلاعات کے تحت آتا ہے۔ اس ادارے کو 1990ء کے عشرے کے اواخر میں دوبارہ متحرک کر کے مذکورہ علاقوں میں ٹیلی کمیونی کیشن کی بہتری کا کام سونپا گیا۔

کوآپریٹو ادارے

ان میں وہ تمام چھوٹے اور درمیانی حجم کے منافع بخش ادارے شامل ہیں جو فوج کے متعدد اعلیٰ افسران کی زیرِ نگرانی کام کرتے ہیں۔ ان اداروں کی کاروباری سرگرمیوں میں مختلف النوع کام بیکریوں سے لے کر سینما تک اور گیس اسٹیشن سے لے کر تجارتی پلازا اور مارکیٹیں بنانے تک شامل ہیں۔ ان اداروں کی سرگرمیوں میں شاہراہوں سے محصول کی وصولی، ساحلوں کی ریت کی فروخت اور ماہی گیری کے ٹھیکے حاصل کرنا بھی شامل ہیں۔

ان منافع بخش سرگرمیوں کے نظم و نسق کا انداز بہت حد تک مرکز گریز ہوتا ہے۔ انھیں آرمی یونٹ، ڈویژن یا کور ہیڈ کوارٹر چلاتے ہیں اور اپنے کاموں کے لیے ان میں نچلے درجے کے فوجیوں کو مفت افرادی قوت کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

ان کوآپریٹوز کے کاموں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے جیسے چھوٹی سرگرمیوں میں بیکریاں اور مرغیوں کے فارم چلانا اور بڑی سرگرمیوں میں گیس اسٹیشن اور شاہراہوں کے محصول کی وصولی شامل ہے۔ 2004ء میں وزارتِ دفاع نے ایسے اداروں کی جزوی فہرست پیش کی جو ایسے پچاس تجارتی منصوبوں پر مشتمل تھی۔ مبینہ طور پر ان اداروں نے 4-2003ء کے مالیاتی سال

میں کوئی ایک سو چونتیس ملین روپے کمائے۔[5]☆ تاہم ان منصوبوں کے انتظامی معاملات کی قانونی حیثیت یا ان کے طریقِ کار کی تفصیلات فراہم نہیں کی گئیں۔

دوسری سطح: ذیلی ادارے

فوجی کاروبار سے وابستہ افواج کے چار ذیلی ادارے فوجی فاؤنڈیشن، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ، شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن بے حد شفاف ہیں۔ اگرچہ سینئر جنرل ان اداروں کو فوج کی کاروباری سرگرمیاں تسلیم کرنے پر تیار نہیں مگر ان اداروں کی ساخت اور نظم و نسق سے ان کے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ سارے ذیلی ادارے سینئر جنرلوں یا وزارتِ دفاع کے ارکان کے ماتحت ہیں۔ علاوہ ازیں جیسا کہ نقشہ 4.3 میں دیکھا جاسکتا ہے، ان سب فاؤنڈیشنز کی حیثیت اپنے اپنے شعبوں کے ذیلی ادارے کی ہے۔ ایسی ایک مثال بہاولپور میں بحریہ کالج کی ہے جو پاکستان نیوی کا ذیلی ادارہ ہے۔

یہ چار ذیلی ادارے سو کے قریب آزاد منصوبے چلاتے ہیں جن میں بڑے بڑے صنعتی ادارے مثلاً سیمنٹ، کھاد اور دلیہ بنانے کے کارخانے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض فاؤنڈیشنز انشورنس، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور بینکاری اور تعلیم کے کاروبار سے بھی وابستہ ہیں۔ چونکہ مسلح افواج سمجھتی ہیں کہ ان کی ساکھ بہت سے سول اداروں سے بہتر ہے اس لیے اپنی کاروباری سرگرمیوں کے ساتھ ''عسکری'' یا ''فوجی'' جیسے نام جوڑ کر بہتر کاروباری مواقع حاصل کیے جاتے ہیں۔ ایسا خاص طور پر زمینوں کی خرید و فروخت میں کیا جاتا ہے کیوں کہ افواج یا ان کے ذیلی اداروں کے تحت چلنے والے منصوبوں میں قیمتوں میں اضافے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ فوجی کاروباری سلسلوں میں فوجی انتظامیہ کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے جیسا کہ جدول 4.4 سے ظاہر ہے۔ اس ضمن میں دفاعی انتظامیہ کا اثر ورسوخ پبلک سیکٹر کے کاروباری معاہدوں اور صنعتی یا معاشی فوائد کے تخفیفی قیمت پر حصول میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ مراعات فاؤنڈیشنز کو مدد دیتی ہیں کہ وہ نجی شعبے کو ترقی کی دوڑ میں پیچھے چھوڑ دے۔

تصویر: 4.3 بحریہ کالج بہاول پور کا یہ سائن بورڈ بتاتا ہے کہ یہ ادارہ پاکستان نیوی کے تحت ہے
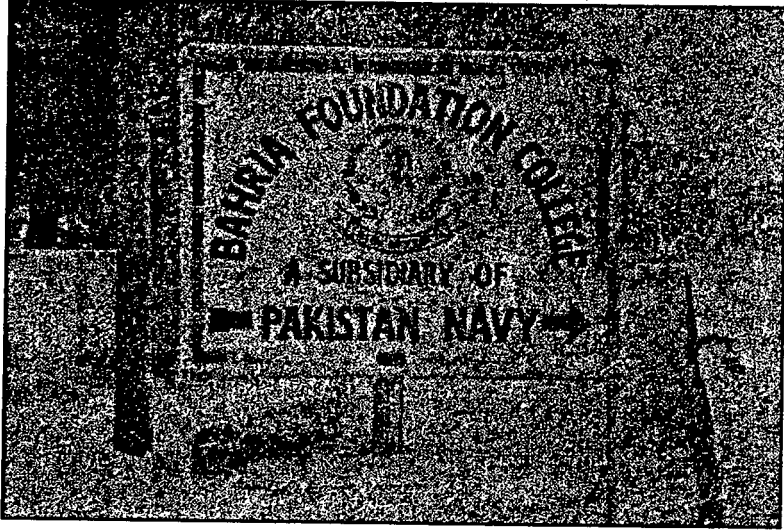
اس امر کا اعادہ بے جا نہ ہوگا کہ ویلفیئر فاؤنڈیشنز مسلح افواج سے اپنے روابط کو باعثِ افتخار گردانتی ہیں۔ اس امر کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ چاروں فاؤنڈیشنز اپنی اپنی سرپرست افواج کے امتیازی نشان استعمال کرتی ہیں۔ افواج کے ان امتیازی نشانات کے استعمال کو سپریم کورٹ میں ایک وکیل وہاب الخیری نے 1990ء میں چیلنج کیا۔☆[6] خیری کے خیال میں اس سے 1984ء کے کمپنیز آرڈی نینس اور 1940ء کے ٹریڈ مارک ایکٹ کی خلاف ورزی ہوتی تھی جن کی رو سے کوئی نجی ادارہ ریاست یا مسلح افواج یا بانیِ پاکستان کا نام استعمال نہیں کرسکتا۔ خیری نے عدالت سے استدعا کی کہ فوج کی تمام کاروباری سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے۔ کیوں کہ اس مصروفیت کے ساتھ مسلح افواج دفاع سے متعلق اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے اُس طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتی تھی جس طرح اُنھیں ہونا چاہیے۔ اس مقدمے کا تعلق بحریہ فاؤنڈیشن کے ایک کاروباری معاملے میں بدعنوانی سے تھا۔ بحریہ فاؤنڈیشن نے نہ صرف ان الزامات کی پرزور تردید کی بلکہ بحریہ سے مالیاتی امور کے حوالے سے اپنے تعلق کے ناجائز استعمال کو بھی رد کردیا۔ گوکہ یہ مقدمہ تیکنیکی بنیادوں پر خارج کردیا

گیا، پھر بھی اس سے یہ بات ضرور واضح ہوکر سامنے آئی کہ یہ فاؤنڈیشنز کس طرح مسلح افواج سے اپنے گہرے روابط کو استعمال کر کے منافع کماتی ہیں۔

ان فاؤنڈیشنز اور افواج کے تعلق پر مبنی کئی ایسی مثالیں ہیں کہ کاروباری سرگرمیوں کے لیے غیر قانونی طور پر فوجی وسائل استعمال کیے گئے۔ چونکہ تینوں افواج اور ان فاؤنڈیشنز کی اعلیٰ انتظامیہ ایک ہی ہے، اس لیے وسائل کی منتقلی آسان ہے۔

فوجی فاؤنڈیشن

فوجی فاؤنڈیشن کو 1954ء میں فلاحی اینڈاؤمنٹ ایکٹ 1890 کے تحت قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد سابقہ فوجیوں کی فلاح و بہبود تھا۔ پاکستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا اور اس کا مقصد تینوں افواج کے لیے فلاحی کام کرنا تھا۔ ترکی کے ماڈل کی طرح فوج نے اس ادارے کے قیام کے لیے ابتدائی سرمایہ حاصل کیا۔ اٹھارہ ملین روپے کی سرمایہ کاری اُس رقم سے کی گئی جو برطانوی شاہی فوج نے 1947ء میں پاکستانی فوج کی تعمیرِ نو کے لیے دی تھی۔ یہ رقم وہ تھی جو برطانیہ نے جنگ کے متاثرین کی بحالی کے لیے فنڈ میں رکھی تھی۔☆7

نقشہ 4.4 فوجی کاروبار سے فوج کی اداراتی سطح پر وابستگی کا نقشہ

Figure 4.4 The military's institutional linkage with Milbus
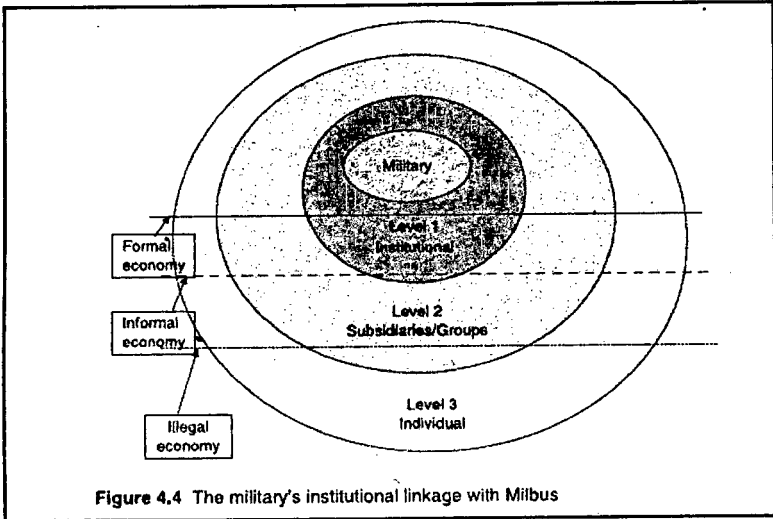
اس رقم سے مغربی پاکستان میں چند صنعتی ادارے قائم کیے گئے۔ آج فوجی فاؤنڈیشن ملک کا بہت بڑا کاروباری گروپ ہے۔☆[8] فوجی فاؤنڈیشن بڑے ٹیکس دہندگان میں شامل ہے۔☆[9] گوکہ 1970ء سے قبل اسے ٹیکس کی چھوٹ حاصل تھی۔☆[10]

فوجی فاؤنڈیشن نے ملک کے دونوں حصوں میں صنعتی ادارے قائم کیے جو زیادہ تر روزمرہ استعمال سے متعلق تھے، مثلاً چاول، آٹا، پٹ سن اور ٹیکسٹائل۔ 1982ء میں اس کے اثاثے دو ہزار ساٹھ ملین روپے کے تھے جو انتیس صنعتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔☆[11] اب اس کے ظاہر کردہ اثاثے 9.8 ارب روپے کے ہیں اور پچیّس خودمختار ادارے اس کی ملکیت ہیں جن میں سے 18 مکمل طور پر فوجی فاؤنڈیشن کی ملکیت ہیں۔ باقی سات اداروں کی ملکیت میں دوسرے حصہ دار بھی شامل ہیں۔☆[12] بھاری صنعتوں کے منصوبوں کو ذیلی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ فارم جیسے زرعی ادارے، موٹروے اور تعلیمی ادارے بھی فوجی فاؤنڈیشن کی ملکیت ہیں۔ کل پچیّس منصوبوں میں سے صرف کھاد اور سیمنٹ کے کارخانے اسٹاک ایکسچینج کی فہرست میں درج ہیں۔

فوجی فاؤنڈیشن میں چھ سے سات ہزار تک سابقہ فوجی کام کرتے ہیں اور اس کو چلانے والا انتظامی بورڈ بھی فوج کے ماتحت ہوتا ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ فوجی فاؤنڈیشن پر بری فوج کا غلبہ ہے جبکہ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ یہ تینوں افواج کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ فوجی فاؤنڈیشن میں اسّی سے نوے فی صد تک ملازمتیں بری فوجیوں کے پاس ہیں اور باقی دس فی صد ریٹائرڈ بحری اور فضائی افواج کے پاس ہیں۔ کمپنی کے تمام مینیجنگ ڈائریکٹر بری فوج کے ریٹائرڈ اعلیٰ افسران ہوتے ہیں۔ اس ادارے کے تنظیمی ڈھانچے پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکمل طور پر مرکزیت کا حامل ادارہ ہے (دیکھیے نقشہ 4.5)۔

فوجی فاؤنڈیشن کا کلیدی انتظام وزارتِ دفاع اور فوجی انتظامیہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایک انتظامی کمیٹی اس کا نظم ونسق چلاتی ہے اور تمام تر احکامات جاری کرتی ہے۔ اس کمیٹی کا سربراہ سیکریٹری دفاع ہوتا ہے۔ کمیٹی کے ارکان میں چیف آف جنرل اسٹاف، کوارٹر ماسٹر جنرل، ایجوٹنٹ جنرل، بری فوج کا چیف آف لاجسٹکس اسٹاف، ڈپٹی چیف آف نیول اسٹاف (ٹریننگ

اور پرسونیل) اور پاکستان ایئرفورس کا ڈپٹی چیف آف ایئر اسٹاف (انتظامی) شامل ہوتے ہیں۔

جدول:4.2 فوجی فاؤنڈیشن کے منصوبوں کی فہرست.

مکمل ملکیت کے منصوبے	شریک کمپنیاں	مشترک منصوبے	انویسٹمنٹ بورڈ
فاؤنڈیشن گیس	مری گیس کمپنی لمیٹڈ	فاؤنڈیشن یونیورسٹی	پاکستان ماروک فاس فیئر ایس اے
فوجی کارن فلیکس	فوجی سیمنٹ کمپنی لمیٹڈ		
فوجی سیکورٹی سروسز	فوجی فرٹیلائزر کمپنی لمیٹڈ		
فوجی شوگر ملز	فوجی فرٹیلائزر بن قاسم لمیٹڈ		
اورسیز ایمپلائمنٹ سروسز	فاؤنڈیشن سیکورٹیز (پرائیویٹ) لمیٹڈ		
فوجی فاؤنڈیشن	فوجی کبیر والا پاور کمپنی		
ایکس پیری مینٹل اینڈ سیڈ ملٹی پلی کیشن فارم	فوجی آئل ٹرمینل اینڈ ڈسٹری بیوشن کمپنی لمیٹڈ		

مرکزی بورڈ آف ڈائریکٹرز کا سیکریٹری کمیٹی کا بھی سیکریٹری ہوتا ہے۔ فاؤنڈیشن کی عملی منصوبہ بندی کرنا اور اسے چلانا مرکزی بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ذمہ داری ہے۔ بورڈ کا سربراہ سیکریٹری دفاع ہوتا ہے اور نائب سربراہ فوجی فاؤنڈیشن کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہوتا ہے جو برّی فوج کا ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل ہوتا ہے۔ بورڈ کے تمام ارکان فوجی فاؤنڈیشن سے ہوتے ہیں اور ڈائریکٹر فینانس، پلاننگ اور ڈویلپمنٹ، ہیومن ریسورس اور ایڈمن، ویلفیئر (تعلیم اور صحت) کارپوریٹ ایڈوائزر اور بورڈ کے سیکریٹری جیسے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز اُن سب منصوبوں پر عمل درآمد کراتا ہے جو انتظامی کمیٹی کو منظوری کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن کی کارکردگی کی رپورٹ بھی انتظامی کمیٹی کو پیش کی جاتی ہے۔

انتظامی تناظر میں دیکھا جائے تو فوجی فاؤنڈیشن بھی اپنی تین ساتھی تنظیموں کی طرح عدم مرکزیت کی حامل ہے۔ اس کے چار بڑے حصّے ہوتے ہیں: مکمل ملکیت کے منصوبے، شریک کمپنیاں، مشترک منصوبے اور انویسٹمنٹ بورڈ۔

پہلا حصّہ ان منصوبوں پر مشتمل ہے جو مکمل طور پر فوجی فاؤنڈیشن کی ملکیت ہیں۔ دوسرے اور تیسرے شعبے بھی یوں تو فوجی فاؤنڈیشن سے ہی سرمایہ لے کر کام کرتے ہیں لیکن انھیں انتظامی آزادی حاصل ہے۔

نقشہ: 4.5 فوجی فاؤنڈیشن کا انتظامیہ ڈھانچا
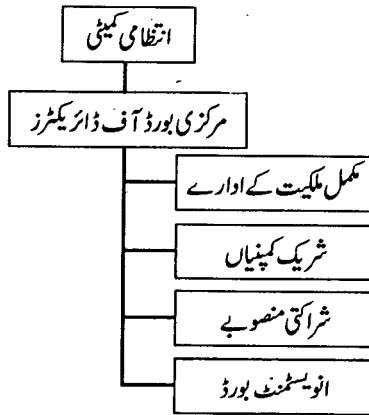
آخری حصّہ فوجی فاؤنڈیشن کی شراکت داری کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حصے میں وہ منصوبے شامل ہوتے ہیں جنھیں فوجی فاؤنڈیشن دوسرے اداروں جیسے فوجی فرٹیلائزر کارپوریشن، فوجی فاؤنڈیشن بن قاسم لمیٹڈ اور مراکش کے ادارے کے ساتھ آدھے آدھے کی شراکت پر سرانجام دیتی ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ فوجی گروپ اور مراکش کی کمپنی کا شراکتی منصوبہ سالانہ پونے چار لاکھ میٹرک ٹن فاسفورک ایسڈ پیدا کرے گا۔ یہ منصوبہ 2007ء کے وسط تک اپنے کام کا آغاز کرے گا۔☆[13]

غور کیا جائے تو دو وجوہات کی بنا پر اس ادارے کے لیے مرکز گریز ساخت ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ فوجی فاؤنڈیشن ایسے منصوبوں کا مکمل کنٹرول حاصل نہیں کرسکتی جو مکمل طور پر اس کی

ملکیت نہ ہوں۔ دوم یہ کہ بعض شریک کمپنیوں کے سربراہ فوجی فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر کے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں فوجی فاؤنڈیشن کے لیے مرکزی اختیار اپنے پاس رکھنا ممکن نہیں، مثلاً فوجی فرٹیلائزر کا سربراہ بھی ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل ہوتا ہے۔☆[14] مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں میں کوئی مشاورت نہیں ہوتی۔ تاہم حسبِ منشا اقدامات کے لیے مکمل اختیار اور پوری آزادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اعلیٰ جنرل اپنے اداروں کو آزادانہ طور پر چلانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان اعلیٰ افسران کا مشترک ماضی بھی کاروباری گفت وشنید میں ان کے لیے معاون ہوتا ہے۔ اس لائحۂ عمل کے پس منظر میں بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ پرانی شناسائی افراد سے پُراعتماد روابط قائم کرنے میں مفید ہوتی ہے اور کسی ادارے سے بہتر نتائج کے حصول کے لیے بھی یہ شے ضروری ہوتی ہے۔ اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بار فوجی فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل محمد امجد نے کہا تھا کہ اسی لیے جنرل مشرف نے سرکاری اداروں میں فوج کے افراد کو بحیثیت سربراہ تعینات کیا ہے۔☆[15]

فوجی فاؤنڈیشن کا دعویٰ ہے کہ وہ پچاسی لاکھ سابق فوجیوں اور اُن کے دست نگر افراد کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہے۔☆[16]

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ بری فوج کی ویلفیئر فاؤنڈیشن ہے جو 1971ء میں قائم کی گئی تاکہ بری فوجیوں کو ملازمتوں اور منافع بخش سرگرمیوں کے زیادہ مواقع فراہم کیے جاسکیں۔ بری فوج کا خیال تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن سے مطلوبہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ 1960ء کے عشرے میں لگنے والی امریکی پابندیاں اس نئے ادارے کے قیام کا باعث بنیں۔☆[17] ان پابندیوں کے باعث فوج کو 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے عرصے میں وسائل کی شدید کمی کا سامنا رہا تھا۔

جیسا کہ نقشہ 4.6 میں دکھا گیا ہے، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ فوجی ہیڈ کوارٹر کے ماتحت ہے۔ اس کی انتظامی کمیٹی کا مینجنگ ڈائریکٹر آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا بھی مینجنگ ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ ویسے تو یہ عہدہ بری فوج کے اے جی کے پاس ہوتا ہے لیکن اپنی مصروفیت کے باعث وہ ایک قائم مقام ایم ڈی تعینات کردیتا ہے۔ کمیٹی کے ارکان میں CLS, QMG, CGS اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا مینجنگ ڈائریکٹر شامل ہوتے ہیں۔ قائم مقام ایم ڈی کمیٹی کے اجلاس میں مکمل رکن کے طور پر شریک نہیں ہوتا۔ کمیٹی بورڈ آف ڈائریکٹرز کے کام کی نگرانی کرتی ہے جس کا سربراہ AG ہوتا ہے۔ نائب سربراہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوتا ہے جو سات ڈائریکٹروں کی معیّت میں فرائض سرانجام دیتا ہے۔

اس ٹرسٹ کو سات لاکھ روپے کے ابتدائی اثاثے کے ساتھ قائم کرکے 1860 کے سوسائیٹرز ایکٹ کے تحت رجسٹر کرایا گیا تھا تاکہ اس کے توسّط سے سابقہ فوجیوں کی بحالی کے علاوہ شہدا کی بیواؤں اور یتیموں کی مدد کی جائے۔ اب اس ٹرسٹ کے اکتالیس آزاد منصوبے کام کررہے ہیں جن میں سے تیرہ میں دوسرے ادارے شامل ہیں اور باقی سب اس کی مکمل ملکیت میں ہیں، (دیکھیے جدول 4.3)۔

ان منصوبوں میں سے صرف پانچ مالیاتی شعبے سے متعلق ہیں (جیسے بینک، لیزنگ اور انشورنس کمپنیاں) جو اسٹاک ایکسچینج میں درج ہیں۔ گروپ کے اثاثوں کی مالیت پچاس ارب روپے سے زیادہ ہے۔ اس میں پانچ ہزار سابق فوجیوں کو ملازمتیں حاصل ہیں۔

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو فلاح و بہبود کے کام کے لیے بالکل مختلف انداز سے قائم کیا گیا ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن نے تو ویلفیئر کے لیے منصوبے جاری کیے جب کہ ٹرسٹ نے حصہ داروں میں منافعے کی تقسیم کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے لیے ویلفیئر کا سرمایہ صنعتی اور دیگر منافع بخش سرگرمیوں میں لگایا گیا۔ اس کے لیے رقوم جی ایچ کیو کے رفاہی کاموں کے لیے مخصوص سرمایے سے ادھار لی گئیں۔ یہ سرمایہ فوجیوں کی تنخواہ سے فلاح و بہبود کے لیے لازمی کٹوتی سے اکٹھا ہوتا ہے۔

نقشہ 4.6: آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا تنظیمی سانچا
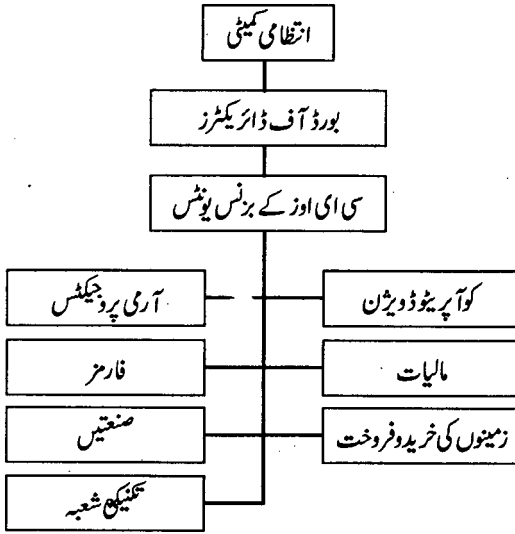
آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اس لیے بھی فوجی فاؤنڈیشن سے الگ نوعیت رکھتا ہے کہ رفاہی ادارے کی حیثیت سے 1993ء تک یہ ٹرسٹ ٹیکس بھی نہیں دیتا تھا۔ تاہم 3-1992ء میں اس پر رعایتی ٹیکس لگائے گئے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پر یکساں نوعیت کے ٹیکس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور فوجی فاؤنڈیشن اپنے منافع کی رقم پر کوئی لگ بھگ بیس فی صد ٹیکس ادا کرتی ہیں جب کہ شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن تیس فی صد ٹیکس دیتی ہیں۔ ذرائع ٹیکس کی ادائیگی میں اس فرق کا سبب بری فوج کے زیادہ سیاسی اثر ورسوخ کو بتاتے ہیں۔☆[18]

شاہین فاؤنڈیشن

پاک فضائیہ نے بری فوج کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے 1977ء میں اس ادارے کو پچاس لاکھ روپے کے ابتدائی سرمایے سے 1890 کے فلاحی قانون کے تحت قائم کیا۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی مانند شاہین فاؤنڈیشن کا انتظام بھی فضائیہ کے ماتحت رکھا گیا۔

جدول:4.3 آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے منصوبے

عسکری اسٹڈ فارمز (دو فارمز)*	آرمی ویلفیئر شاپس (چار دکانیں)
عسکری فارمز (دو فارمز)	آرمی ویلفیئر کمرشل منصوبے
عسکری ویلفیئر رائس مل	عسکری کمرشل بینک
عسکری ویلفیئر شوگر مل	عسکری لیزنگ لمیٹڈ
عسکری فِش	عسکری جنرل انشورنس کمپنی
عسکری سیمنٹ (دو پلانٹ)	عسکری ویلفیئر سیونگ اسکیم
عسکری ویلفیئر فارماسیوٹیکل پروجیکٹ	عسکری ایسوسی ایٹ لمیٹڈ
میگنی سائٹ ریفائنریز لمیٹڈ	عسکری انفارمیشن سروس
آرمی ویلفیئر شو پروجیکٹ	عسکری گارڈز لمیٹڈ
آرمی ویلفیئر وولن مل	عسکری پاور لمیٹڈ
آرمی ویلفیئر ہوزری یونٹ	عسکری کمرشل انٹرپرائز
ٹریول ایجنسیاں (تین مختلف ایجنسیاں)	عسکری ایوی ایشن
آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کمرشل پلازا (تین عمارات)	عسکری رہائشی منصوبے (چھ مختلف مقامات پر)

اس میں بھی انتظامی کمیٹی سب سے اوپر ہوتی ہے جس کا سربراہ چیف آف ایئر اسٹاف ہوتا ہے جبکہ نائب سربراہ ڈپٹی چیف آف ایئر اسٹاف (آپریشنز) ہوتا ہے۔ کمیٹی کے ارکان میں ڈپٹی چیف آف ایئر اسٹاف (انتظامی)، (پرسونل)، (تربیت)، اور (انجینئرنگ) کے علاوہ ایئر فورس اسٹریٹیجک کمانڈ کے ڈائریکٹر جنرل، پاک فضائیہ کے انسپکٹر جنرل اور شاہین فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر شامل ہیں۔ کمیٹی بورڈ آف ڈائریکٹرز کے کام کی نگرانی کرتی ہے۔ بورڈ کا سربراہ شاہین فاؤنڈیشن کا مینجنگ ڈائریکٹر اور ریٹائرڈ ایئر وائس مارشل ہوتا ہے۔ بورڈ کاروباری منصوبے بناتا ہے اور اُن پر عمل درآمد کرتا ہے۔ بورڈ میں ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر،

* عسکری فارمز سولہ ہزار ایکڑ سرکاری زمینوں پر ہیں جن سے حکومت کو کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔

ایڈمن، ہیومن ریسورس اور ویلفیئر کے ڈائریکٹر، ڈائریکٹر فینانس اور شاہین پروجیکٹس کے ایگزیکٹوڈائریکٹر شامل ہوتے ہیں۔ (جدول 4.4 میں فہرست دی گئی ہے) مینجنگ ڈائریکٹر اور ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر کے سوا اس ادارے کے دیگر ارکان سویلین ہوتے ہیں۔

اس ادارے کے قیام کی ضرورت اس وجہ سے محسوس کی گئی کہ فضائیہ کی اعلیٰ انتظامیہ فوجی فاؤنڈیشن سے ملنے والے حصّے سے ناخوش اور اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اس سے زیادہ کی خواہاں تھی۔ فوجی فاؤنڈیشن کی انتظامیہ اور اس کی رفاہی اور آبادکاری کی سرگرمیوں میں فضائیہ کا حصہ اب پانچ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ اس وقت شاہین فاؤنڈیشن کے پاس کوئی دوسو ریٹائرڈ کارکن ملازم ہیں جن میں زیادہ تر افسران کے بجائے ٹیکنیشن یا ایئرمین کی سطح کے افراد ہیں۔ فضائیہ کے حجم اور اہمیت سے موازنہ کیا جائے تو شاہین فاؤنڈیشن بڑا ادارہ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کوئی چودہ آزاد منصوبوں پر کام کرتا ہے جن میں سے کوئی بھی اسٹاک ایکسچینج کی فہرست میں درج نہیں ہے (دیکھیے جدول 4.4)

شاہین فاؤنڈیشن کا کہنا ہے کہ اس کی مالیت دو ارب روپے سے زیادہ ہے☆[19] جبکہ اس کی سالانہ آمدنی و اخراجات کا تخمینہ ساٹھ کروڑ روپے ہے۔☆[20] اس کے منصوبے نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں جن میں سب سے بڑا ایئر لائن کا کاروبار ہے اور اس کے علاوہ تین بڑے شہروں میں زمین کا کاروبار ہے۔

شاہین فاؤنڈیشن کے کاروبار میں 1990ء کے عشرے میں خاصی توسیع ہوئی ہے۔ ان منصوبوں کا انحصار ایئر فورس کے وسائل اور اس کاروبار پر ہوتا ہے جو فضائیہ شاہین فاؤنڈیشن کے لیے حاصل کرتی ہے۔ اس کے زیادہ تر منصوبے جیسا کہ جدول 4.4 سے واضح ہے، ایئر لائن کی صنعت سے وابستہ ہیں یا پھر کارگو اور پاک فضائیہ کو درکار اشیا پر ان کا انحصار ہوتا ہے۔ شاہین فاؤنڈیشن کا صحیح تجزیہ کرنا اس لیے بھی مشکل ہے کیوں کہ اس کے امور میں شفافیت نہیں ہے۔ اس کی کوئی کمپنی اسٹاک ایکسچینج کی فہرست میں بھی درج نہیں اس لیے کسی بھی دوسرے ذریعے سے اس کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

نقشہ: 4.7 شاہین فاؤنڈیشن کا انتظامی خاکہ
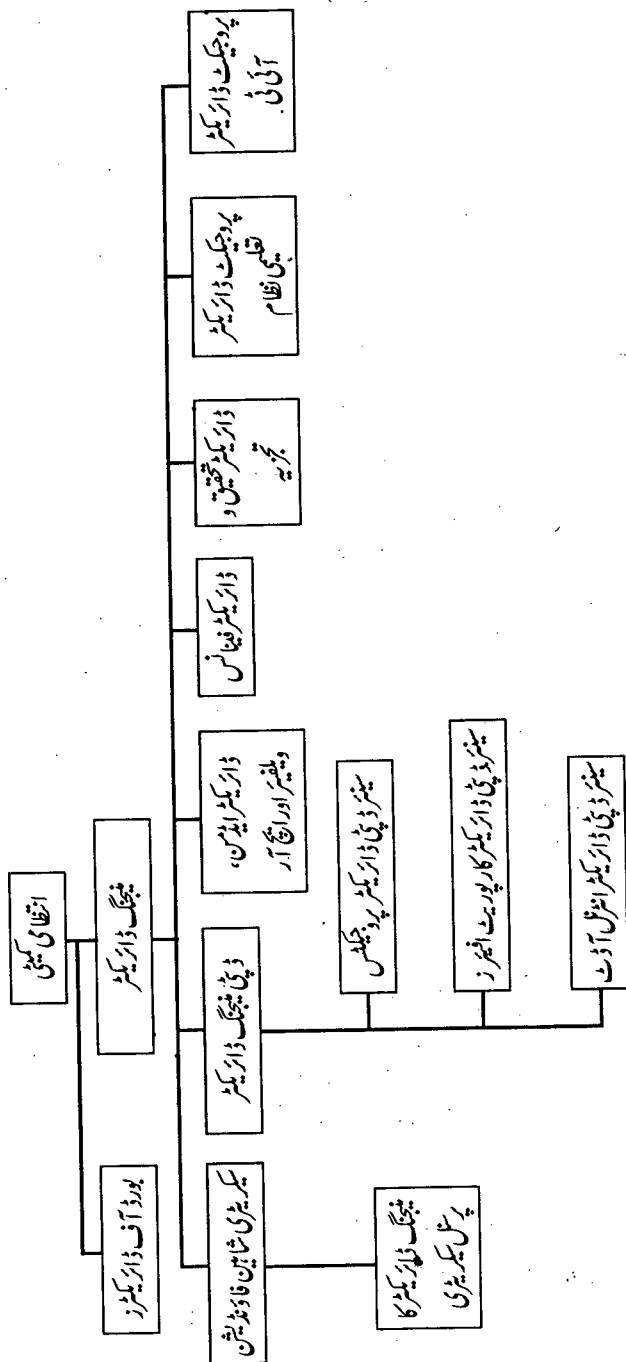
جدول: 4.4 شاہین فاؤنڈیشن کے منصوبے

شاہین ایئر انٹرنیشنل☆21	شاہین کمپلیکس (دو منصوبے)
شاہین ایئر کارگو	شاہین پے ٹی وی
شاہین ایئر پورٹ سروسز	ایف ایم 100 (ریڈیو چینل)
شاہین ایرو ٹریڈرز	شاہین سسٹمز (انفارمیشن ٹیکنالوجی)
شاہین انشورنس	شاہین نٹ ویئر
شاہین ٹریول (تین منصوبے)	

بحریہ فاؤنڈیشن

بحریہ کیوں اس دوڑ میں پیچھے رہے۔ اُس نے جنوری 1982ء میں اپنی فلاحی فاؤنڈیشن قائم کی۔ یہ فلاحی ایکٹ 1890 کے تحت رجسٹر کرائی گئی۔ ابتدا میں بحریہ کے اپنے فلاحی فنڈ کے تیس لاکھ روپے استعمال کیے گئے۔ بحریہ فاؤنڈیشن بھی مسلح افواج، یہاں مراد ہے نیوی (دیکھیے نقشہ 4.8) کے تحت کام کرتی ہے۔
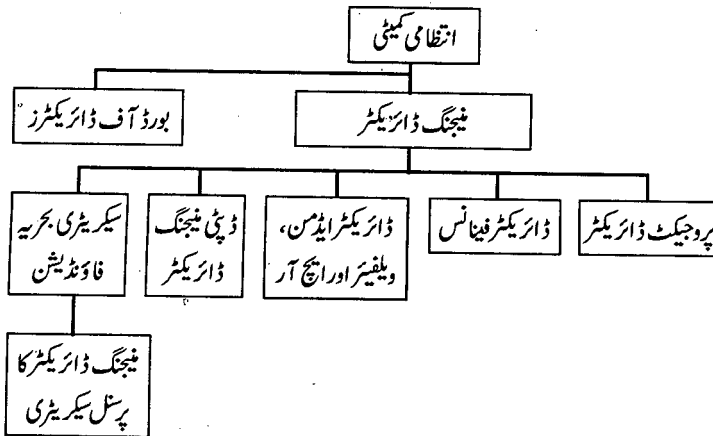
نقشہ: 4.8 بحریہ فاؤنڈیشن کا انتظامی خاکہ

گو کہ بحریہ فاؤنڈیشن کے انتظامی ڈھانچے کے بارے میں معلومات بہت کم فراہم ہیں تاہم ذرائع کہتے ہیں کہ اس کا انتظامی ڈھانچا شاہین فاؤنڈیشن سے ملتا جلتا ہے۔ بحریہ فاؤنڈیشن انیس منصوبوں پر کام کرتی ہے جن میں سے کوئی بھی اسٹاک ایکسچینج کی فہرست میں درج نہیں ہے۔

بحریہ فاؤنڈیشن کی مالیت کا اندازہ کوئی چار ارب روپے لگایا جاتا ہے۔ چوں کہ بحریہ کے افسران اور ملازمین اپنی کاروباری سرگرمیوں پر گفتگو سے گریز کرتے ہیں اس لیے اس کی مالیت کا باضابطہ تخمینہ بہت مشکل ہے۔ گفتگو سے گریز کی ایک وجہ بحریہ کے بعض منصوبے خاص طور سے رہائشی منصوبوں کی بابت پیدا ہونے والے تنازعے ہیں۔ بحریہ کے سرمایہ کارانہ منصوبے، مثلاً بحریہ پینٹس اور زمینوں کا کاروبار وغیرہ شراکت داری کے ضابطے کے تحت کام کرتے ہیں۔ ان منصوبوں میں متنازعہ افراد کی شمولیت اور مالیاتی بے قاعدگی کے حوالے سے بہت گفتگو ہوتی رہی ہے۔

جدول: 4.5 بحریہ فاؤنڈیشن کے منصوبے

فلاح ٹریڈنگ ایجنسی	بحریہ یونیورسٹی
بحریہ کنسٹرکشن	بحریہ شپنگ
بحریہ ٹریول اینڈ ریکروٹنگ ایجنسی	بحریہ کوسٹل سروسز
بحریہ پینٹس	بحریہ سیکورٹی اینڈ سسٹم سروسز
بحریہ ڈیپ سی فشنگ	بحریہ کیٹرنگ اینڈ ڈیکوریشن سروسز
بحریہ کمپلیکس	بحریہ فارمنگ
بحریہ ٹاؤن اور رہائشی منصوبے (تین منصوبے)	بحریہ ہولڈنگ
بحریہ ڈریجنگ	بحریہ ہاربر سروسز
بحریہ بیکری	بحریہ شپ بریکنگ
	بحریہ ڈائیونگ اینڈ سالویج انٹرنیشنل

تیسری سطح: ارکان

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے بارے میں کوئی بھی گفتگو اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک کہ اس ایک جزوِ لاینفک کا ذکر نہ ہوجائے حالانکہ اس کا مقداری تخمینہ لگانا بھی بہت دشوار ہے، وہ ہے اس کے انفرادی ارکان کو حاصل ہونے والا مالی فائدہ۔ فوج کی اندرونی معیشت کا نظام کچھ ایسا ہے کہ اس کے ذریعے ادارے کے افراد جن میں حاضر ملازمت اور سبک دوش ہونے والے افسران دونوں شامل ہیں، کو بیش بہا مالی فوائد پہنچانا اس کے سرپرستانہ نظام کا حصہ ہے۔ فوجی برادری کے ارکان اور خاص طور پر سبک دوش ہونے والے افسران اسامی اور سرپرست کے مضبوط باہمی تعلق کے زمرے میں، جس میں فوج کا کردار مرکزی ہوتا ہے، منافع جاتی سرگرمیوں سے خوب مستفید ہوتے ہیں۔ ان معاملات میں معاشی و سیاسی استحصال ضروری نہیں کہ ادارے کی سطح پر ہو بلکہ افراد خود انتظامیہ اور بااثر اداروں سے اپنے روابط استعمال کر کے ذاتی منفعت حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وسائل پر انفرادی تصرف کو بھی فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی گفتگو میں شامل کیا گیا ہے۔

غیر رسمی استحصال کی یہ صورت دوسرے ممالک جیسے کیوبا، چین اور شام میں بھی دکھائی دیتی ہے۔☆[22] سیاسی تجزیہ کار فرینک اومورا کا کہنا ہے کہ اعلیٰ فوجی افسران اپنے عہدوں کا اثر و رسوخ استعمال کر کے غیر جمہوری نظامِ حکومت میں ذاتی فائدے حاصل کرتے ہیں۔☆[23] پاکستان میں صورتِ حال کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ یہ معاملہ بے حد غیر معمولی سطح تک پہنچا ہوا ہے، اس لیے کہ یہاں اداروں کے باضابطہ تعاون سے ذاتی فوائد حاصل کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ فوجی معیشت کے اس شعبے کی مالیت کا تخمینہ لگانا بہت مشکل ہے۔

افراد کو حاصل ہونے والے فوائد کو دو حصوں واضح اور غیر واضح فوائد میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑا واضح فائدہ تو مسلح افواج کے ارکان کو ملنے والی شہری اور دیہی زمینیں ہیں (اس پر تفصیلی گفتگو باب 7 میں ملاحظہ کیجیے)۔ ان زمینوں کی مالیت کا اندازہ لگانا تو پھر بھی آسان ہے لیکن اُس زرِ تلافی کا تخمینہ لگانا بہت مشکل ہے جو ان افسران کو اپنی زمینوں کی

آبادکاری اور رہائشی منصوبے مکمل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ زمینیں ان قواعد وضوابط کے تحت بانٹی جاتی ہیں جو کہ مسلح افواج کے ادارے اپنے افراد کو بیش بہا مراعات دینے کے لیے خود بناتے ہیں۔

دیگر مراعات میں بالخصوص سبک دوش ہونے کے بعد ملنے والی ملازمتیں بھی شامل ہیں۔ مشرف کے دورِ حکومت میں مختلف وزارتوں اور محکموں میں چار سے پانچ ہزار تک فوجی افسر تعینات کیے گئے۔

حاضر ملازمت اور سبک دوش ہونے والے فوجی افسران کو یہ ملازمتیں کھلے معیار اور مقابلے میں سبقت کی بنیاد پر نہیں دی جاتیں بلکہ اس طرح کی ملازمتوں میں فوجی برادری کے ارکان کو ترجیحی بنیادوں پر کھپایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ اسامیاں واضح مقابلے کی بنیاد پر نہیں پُر کی جاتیں، نہ ہی عوامی سطح پر بہترین اہلیت کے افراد کی ان میں کوئی کشش ہوتی ہے۔ ان عہدوں کی تنخواہیں اور مراعات ریاست کے لیے بھاری مالی بوجھ ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ فوجی کاروبار کے اس پہلو پر بھی گفتگو کی جائے۔

غیر واضح فوائد میں کاروبار اور وہ دوسرے مواقع شامل ہیں جو سبک دوش ہونے والے افسران اپنے ادارے کے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے حاصل کرتے ہیں۔ یہ افسران دفاعی ٹھیکے داروں کی حیثیت سے اسلحے کی خریداری کے کاروبار میں شامل ہونے کے لیے مسلح افواج کے اداروں میں اپنے روابط کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ تو خیر ایسی کوئی بات نہیں۔ زیادہ کاروباری مزاج رکھنے والے بعض فوجی افسران تو دوسرے کاروباری شعبوں میں کودنے کے لیے فوج اور حکومت میں اپنے مراسم کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال پاکستان میں واران ٹرانسپورٹ کمپنی ہے جو سب سے بڑی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کی بیٹی کی ملکیت ہے۔ یہ کمپنی اس حقیقت کی ایک واضح مثال ہے کہ فوج کا سرپرستانہ نظام اپنے افراد کو کس طرح فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس کمپنی کو اسلام آباد اور راولپنڈی کے جڑواں شہروں کے درمیان گاڑیاں چلانے کی اجازت ترجیحی بنیادوں پر دی گئی ہے۔ باب 6 میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس کمپنی کی انتظامیہ اور

ڈرائیورز کو سزا سے کس طرح استثنا حاصل ہے۔

اس گفتگو کا آغاز پاکستان کی معیشت میں افواج کی شمولیت کے حوالے سے ہوا تھا جس میں یہ بیان دراز ہوگیا کہ فوجی کاروبار اصل میں کن حدوں تک وسیع ہے۔ اس میں زیادہ گفتگو چار فلاحی اداروں کے گرد گھومتی ہے جن کی کاروباری سرگرمیوں کا دائرہ بہت بڑا ہے۔ تاہم ان میں بہت سے کام ایسے ہیں جو عام آدمی کی نگاہ سے اوجھل تو نہ سہی لیکن کاغذات میں ان کا شمار فوجی کاروبار میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ اس معیشت کے ڈھانچے کو صاف طور سے شناخت کیا جائے اور اس کے سارے اہم اجزا پر روشنی ڈالی جائے۔

جیسا کہ اس باب میں بتایا گیا کہ فوج کی اندرونی معیشت تین مختلف حصوں پر مشتمل ہے۔ ان فلاحی اداروں کی ذیلی شاخوں کا مالیاتی تخمینہ تو کسی قدر آسان ہے، جب کہ دوسری دو سطحوں پر ان کی مالیاتی حیثیت کا تخمینہ سنجیدگی سے ان کے حجم کی جانچ اور باضابطہ اعداد و شمار کا متقاضی ہے۔ کتاب کے اس حصے کا مقصد اُس سانچے پر روشنی ڈالنا تھا جو بنیادی طور پر فوجی معیشت کے ایک ایک پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔

باب-5

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا تشکیلی دور

(1954ء سے 1977ء)

پاکستان میں فوج کی کاروباری سرگرمیاں 1954ء میں شروع ہوئیں، جب پہلی ویلفیئر فاؤنڈیشن قائم کی گئی۔ فوج کے اعلیٰ جنرل اس وقت اتنی سیاسی و انتظامی خودمختاری حاصل کر چکے تھے کہ وہ فلاحی رقوم کو تجارتی مقاصد میں لگانے کے فیصلے خود کرسکیں۔ ان سرگرمیوں کے آغاز سے ہی فوج کی اس نیت کا اظہار ہوا کہ وہ سرحدوں کی حفاظت سے زیادہ دیگر امور میں دخل دینا چاہتی ہے۔ ملک کے دونوں بازوؤں میں صنعتیں قائم کرنے سے فوج کی ساکھ میں بہتری آئی اور وہ ملک کی سماجی و معاشی ترقی میں حصہ لینے لگی۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے صنعتی منصوبے انتہائی علامتی نوعیت کے تھے، جن سے نہ صرف یہ کہ قومی ترقی میں فوج کی شمولیت نمایاں ہوئی بلکہ فوج کی طاقت کا اظہار بھی ہوا۔ ترقیاتی شعبے کے برعکس مسلح افواج کے پاس بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی منصوبے شروع کرنے کے وسائل بھی تھے اور فوج ان کے ذریعے اپنی کاروباری سلطنت قائم کرسکتی تھی۔ آنے والے برسوں میں یہ معاشی سلطنت آہستہ آہستہ لیکن بتدریج پھیلتی گئی۔

1954ء سے 1969ء کے درمیان فوج کی کاروباری سرگرمیاں حکومت میں اثر ورسوخ کے ساتھ پھیلتی گئیں۔ یہ وہ وقت تھا جب حکومت میں فوج کا اثر بڑھ رہا تھا یا جب اس نے حکومت پر براہِ راست کنٹرول حاصل کرلیا۔ تاہم 1969ء سے 1972ء کے درمیان شدید

سیاسی بحران کے باعث فوج کی اندرونی معیشت بھی جمود کا شکار ہوگئی اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے سویلین دور میں بھی دباؤ کا شکار رہی۔ کیوں کہ اس دوران سویلین حکومت نسبتاً مضبوط تھی۔ اس کے علاوہ ان برسوں میں فوج نے ابھی نگراں اور سرپرست بن کر ایک آزاد سماجی طبقے کا روپ نہیں دھارا تھا۔

اس باب میں ہم تشکیلی دنوں کے دوران میں فوج کی اندرونی معیشت کے ارتقا پر گفتگو کریں گے۔

معاشی سلطنت کا قیام (69-1954ء)

فوج نے اپنی پہلی ویلفیئر فاؤنڈیشن 1954ء میں قائم کی اور اس کے لیے جو رقم استعمال کی گئی، وہ برطانیہ نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد تعمیرِ نو کے فنڈ میں پاکستان کے لیے رکھی تھی۔ بھارت میں تو یہ رقم جنگ لڑنے والوں میں تقسیم کردی گئی مگر پاکستان کے جنرلوں نے ان رقوم سے بڑے صنعتی منصوبے شروع کردیے۔ ایسا شاید اس لیے ہوا کہ بھارتی فوج سیاسی حکومتوں کے قائم کردہ سخت احتسابی نظام کے تابع تھی مگر پاکستان میں ایسا نہیں تھا۔ پاکستانی فوج کے بارے میں لکھی جانے والی تحریروں میں ایسی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ فوج کاروباری سرگرمیوں میں کیوں ملوث ہوئی۔ صرف یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا گیا۔☆[1]

اسے فوج کی طرف سے ذاتی مفادات کا تحفظ بھی کہا جاسکتا ہے۔ فوجیوں کو دی جانے والی مراعات کا جواز پیش کیا جاتا رہا ہے کہ اس سے فوجیوں کی مالی مشکلات کم ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے لیے جن فوجی افسروں سے گفتگو کی گئی، انھوں نے فوجیوں کی مراعات کو حق بجانب قرار دیا کیوں کہ ان کے خیال میں سول افسروں کی مراعات فوجی افسروں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ چونکہ فوج خود کو ریاست کا بنیادی ادارہ سمجھتی ہے، اس لیے چاہتی ہے کہ اس کی مراعات بھی سول ملازمین کی طرح ہوں۔☆[2]

فوج کی اندرونی معیشت کے ارتقا کی دو اور ممکنہ وجوہ ہوسکتی ہیں جن کی طرف لکھنے والوں نے توجہ نہیں دی ہے۔ پہلی وجہ کا تعلق اس بات سے ہے کہ فوج قوم کی محافظ اور ترقی کی

ضامن ہے۔ چونکہ فوج اپنی سمت کا تعین خود کرتی ہے، اس لیے وہ اپنے تیئں ریاست کی معیشت کو جدید بنانے کا بیڑا بھی اٹھالیتی ہے۔☆3

فوج کی تجارتی سرگرمیاں ان معاشی ترقیوں کے نمونوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں جو ریاست کی اس بقا کے لیے اہمیت رکھتی ہیں جس کی حفاظت فوج کا مقصد ہے۔ یہاں اصل زور ترقی حاصل کرنے کے لیے دفاعی اسٹیبلشمنٹ کی اس اعلیٰ صلاحیت پر ہے جو دوسرے ادارے اس خوبی کے ساتھ نہیں حاصل کرسکتے۔ فوج کی اس اعلیٰ صلاحیت کے بارے میں یہ تاثر میں نے متعدد فوجیوں سے گفتگو کے بعد قائم کیا۔

افواج کے سروسز بورڈ کے سربراہ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) زاہد زمان کے مطابق "فوجی افسر سول افسروں سے زیادہ تجزیاتی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔"☆4 فوج کے ساتھ سول افسرِ شاہی کا موازنہ کرتے ہوئے بریگیڈیئر صاحب دیگر مضبوط اداروں پر فوج کی دانش ورانہ اور اخلاقی برتری ثابت کرنے لگے۔ دیگر اعلیٰ افسر تو خود کو داخلی موازنے تک محدود نہیں رکھتے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) امجد اور میجر جنرل (ریٹائرڈ) جمشید ایاز کے خیال میں مسلح افواج کاروبار یا سیاست میں اس لیے کامیاب ہوتی ہیں کہ انھیں ملازمت کے دوران افراد اور وسائل کا انتظام سنبھالنے میں مہارت حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ دونوں افسر تجارتی اور سیاسی ذمے داریوں میں فوج کو برتر سمجھتے ہوئے پاکستانی جنرلوں کو فوجی پس منظر رکھنے والے بڑے رہنماؤں مثلاً صدر آئزن ہاور، جنرل کولن پاوٗل اور صدر رونالڈ ریگن کے برابر کھڑا کرتے ہیں۔☆5

دوسری وجہ کا تعلق افسروں کی حرص و ہوس سے ہوسکتا ہے۔ طاقت ور جنرلز ملکی نظام کو بڑی آسانی سے ذاتی حرص پوری کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان میں فوجی کاروبار میں اکثر ادارتی خود مفادی اور انارکی کے مثالی نمونے ایک دوسرے پر منعکس ہوتے ہیں جن سے سینئر جنرلز نے ذاتی سفاکانہ غصب کے لیے اپنے ادارتی اختیار اور فوجی طریقِ عمل کو استعمال کرتے ہیں۔

پہلی فاؤنڈیشن قائم کرنے کا مقصد مسلح افواج کی فلاح و بہبود کے لیے ایک خودمختار نظام تشکیل دینا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فوج کی یہ ساکھ بھی بنائی گئی کہ وہ بڑی صنعتیں لگا کر قومی

ترقی میں بھی حصہ لے سکتی ہے۔

فوجی فاؤنڈیشن نے کئی ایسے صنعتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی جو صارفین کی ضرورت کی چیزیں بناتے تھے، مثلاً تمباکو، شکر اور کپڑے کی مصنوعات۔ ملک کے مغربی بازو میں جو سرمایہ کاری کی گئی، اس میں مردان کی خیبر ٹوبیکو کمپنی، راول پنڈی کے قریب ڈھمیال میں سیریئل کا کارخانہ، ٹنڈو محمد خان سندھ میں شوگر مل اور جہلم میں ٹیکسٹائل فیکٹری شامل ہیں۔

مشرقی پاکستان میں فوجی فاؤنڈیشن نے ایسٹ پاکستان لیمپس اور ایسٹ پاکستان الیکٹریکل انڈسٹریز (دونوں ڈھاکے میں)، رنگ پور میں چاول کے کارخانے، چٹاگانگ میں آٹے کے کارخانے اور ڈھاکے کے قریب جوٹ مل میں سرمایہ کاری کی۔ ان کے علاوہ فوجی سیرامکس اور ویسٹ پاکستان لیمپس لمیٹڈ میں بھی مالیاتی حصص لیے گئے جنھیں بعد میں تحلیل کر دیا گیا۔☆6

مشرقی پاکستان میں فوجی فاؤنڈیشن کو مغربی پاکستانی سرمایہ کار کے طور پر دیکھا جاتا تھا جس سے بنگالی آبادی خوش نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان کے لوگ حکومت پر مغربی پاکستانی سرمایے اور اسٹیبلشمنٹ کے مفادات کی نگرانی کا الزام لگاتے تھے۔ عام لوگوں کے غصے کا ہدف اسٹیبلشمنٹ اور بطورِ خاص فوج ہوتی تھی جو زیادہ تر پنجابی اور پٹھان فوجیوں پر مشتمل سمجھی جاتی تھی۔ فوجی فاؤنڈیشن اپنی کاروباری سرگرمیوں سے ہونے والے منافعے کو مغربی پاکستان لاکر ان علاقوں میں فلاحی منصوبے چلاتی تھی جہاں سے فوجیوں کی اکثریت کا تعلق تھا۔ اس طرح وسائل غیر منصفانہ طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔

اب ان کمپنیوں کی کارکردگی سے متعلق دستاویزات میسر نہیں ہیں اور نہ سرمایہ کاری پر منافعے کی تفصیل ہی ملتی ہے۔ صرف ریمنڈ مور (Raymond Moore) کی لکھی ہوئی ایک تحریر ہے جس میں ان کارخانوں کو منافع بخش قرار دیا گیا تھا۔ تاہم کچھ کارخانوں کی مالیاتی صحت مشکوک تھی، مثلاً ایک ٹیکسٹائل مل کو بند کرنا پڑا تھا حالانکہ اسے ٹیکس میں بھی چھوٹ دی جاتی رہی تھی اور اس کی توسیع اور بہتری کے لیے سرمایہ بھی لگایا جاتا رہا تھا۔☆7 فوج اپنے منصوبوں کے لیے حکومت سے مالی مدد لیتی رہی لیکن اس شہادت کے باوجود یہ دعوے بھی کرتی

رہی کہ فاؤنڈیشنز سرکاری شعبے کا حصہ نہیں ہیں۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ سول سوسائٹی یا سیاسی قیادت نے فوج کی معاشی سلطنت کے خلاف کوئی سنجیدہ اعتراض کیا ہو۔ سول سوسائٹی کی اس بظاہر خاموشی کی تین وجوہ ہوسکتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ بالادست اشرافیہ نے فوجی مفادات کی توسیع کو اپنے مفادات سے منسلک سمجھا۔ حمزہ علوی کے خیال میں آزادی کے بعد پاکستان کی ریاست:

> تین مال دار طبقوں کے درمیان مصالحتی کردار ادا کرتی تھی اور نجی ملکیت اور سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کا تحفظ کرتی تھی۔☆[8]

ریاستی افسرِ شاہی اور خاص طور پر فوجی بالادست طبقوں کی معاشی طاقت بڑھانے اور ملک میں بڑے سرمایہ دار پیدا کرنے کی ذمے دار رہی ہے۔ 1958ء میں صدر بن جانے والے فوج کے سربراہ جنرل ایوب خان نے ملک میں نجی شعبے کو فروغ دیا۔ حکومت کی مالیاتی اور ادارتی معاونت نے ملک میں بڑے صنعتی اور کاروباری ادارے قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (پی آئی ڈی سی) اور دیگر ادارے کاروبار کرنے کے لیے مالیاتی قرضے اور دیگر ترغیبات دینے کے لیے استعمال کی گئیں۔☆[9]

ایوب خان نے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد معاشی ترقی پر زور دیا اور درآمدات کی متبادل صنعتیں قائم کیں۔ مطلق العنان معاشی ترقی میں فوجی صنعتوں کا قیام بھی شامل تھا۔ ایوب خان کی فوجی آمریت نے مشہور بائیس خاندانوں کو پروان چڑھایا جو ملک کی صنعتوں کے 68 فی صد اور بینکاری اور بیمے کے 87 فی صد حصے پر قابض تھے۔ یہ بائیس خاندان فوج کو اپنی طاقت کا سرچشمہ سمجھ کر اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔☆[10] کاروباری اور دیگر بالادست طبقے جو خود فوج کے طفیلی تھے، فوجی فاؤنڈیشن کو ملنے والی ٹیکس میں چھوٹ پر کیا اعتراض کرتے، کیوں کہ خود نجی شعبہ بھی اس وقت بڑی مراعات حاصل کر رہا تھا۔

دوسری بات یہ کہ نجی کاروباری طبقے نے اس لیے بھی اعتراض نہیں کیا کہ فوج اپنے صنعتی اور کاروباری منصوبے قوم کی سماجی و معاشی ترقی کی آڑ میں پیش کرتی تھی۔ فوجی فاؤنڈیشن بھی نجی شعبے کی طرح ریاستی مطلق العنان معاشی ترقی کے ماڈل سے فائدے اٹھا رہی تھی۔ یاد رہے

کہ اس وقت سینئر جنرل حریصانہ سرگرمیوں میں اتنے زیادہ ملوث نہیں تھے۔ ترکی میں کمال اتاترک کی پیروکار فوج کی طرح پاکستانی فوج بھی خود کو ریاست کی تعمیر وترقی اور تحفظ کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ ملک کی معاشی سالمیت کو بھی فوج نے اپنے کردار کا حصہ سمجھنا شروع کردیا۔ پاکستانی فوج بھی ترکی کی مسلح افواج کی طرح وقتاً فوقتاً مداخلت کرکے معاشی ترقی کے دعوے کرتی رہی۔

ترک امور کے ایک ماہر ٹم جیکوبی (Tim Jacoby) کے خیال میں فوجی اشرافیہ معاشی ترقی کے واسطے اس لیے فکرمند ہوتی ہے، کیوں کہ اُسے ہتھیار کے حصول اور اپنی بقا کے لیے قومی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔☆[11] فوج کا بزنس انڈسٹریل کمپلیکس دراصل افواج میں پائے جانے والے معاشی ترقی کے رُجحان کا مظہر ہے۔ ملٹری بزنس کمپلیکس انھی اقدامات کا حصہ تھا جو برآمدات کا بدل ثابت ہونے والی صنعت کے قیام کے لیے کیے گئے تھے۔ پاکستان میں سیاسی ومعاشی تبدیلیاں ایوب خان کے 1958ء میں حصولِ اقتدار کے بعد لائے ہوئے ''انقلاب'' کا حصہ تھیں۔☆[12]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ 1960ء کے عشرے میں ترکی اور انڈونیشیا جیسے ملکوں میں بھی فوج نے اقتدار پر قبضہ کیا اور اپنے ملک کی نگراں اور سرپرست بن بیٹھیں۔ سوہارتو کی سربراہی میں انڈونیشیا کی فوج نے بھی کاروبار میں قدم جمائے۔ فوج نے یہ کام سوہارتو اور اس کے ٹولے کی مدد سے کیا اور فوج کے حاضر ملازمت افسروں کو استعمال کیا گیا۔ دوسری جانب ترکی نے پاکستان کا ماڈل اپنایا اور فوج کی پنشن کی رقوم سے صنعتیں اور کاروبار جمائے۔ انقرہ میں ہرفوجی کی بنیادی تنخواہ سے دس فی صد کٹوتی کرکے سرمایہ کاری کی جانے لگی۔☆[13] ان تینوں معاملات میں افواج نے قومی ومعاشی ترقی کی آڑ میں اپنے عہدے داروں کی خوش حالی ممکن بنائی۔ اس کے علاوہ فوج کے صنعتی اور کاروباری کمپلیکس کے ذریعے نجی شعبے کو فروغ دے کر فوج کو ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کے قریب کیا۔☆[14]

تیسری بات یہ کہ سول سوسائٹی اور خاص طور پر سیاسی قیادت نے مسلح افواج کی بڑھتی ہوئی خودمختاری کو روکنے کی کوئی بڑی کوشش نہیں کی۔ سول سوسائٹی اور سیاسی قیادت کے مقابلے

میں فوجی افسرِ شاہی نسبتاً زیادہ مضبوط تھی۔ فوج پاکستانی ریاست کے ایک بڑے افسرِ شاہی نظام کا حصہ رہی ہے جس نے آزادی کے بعد سیاسی اداروں سے زیادہ پختگی کا مظاہرہ کیا۔ اسے یہ پختگی برطانوی دور سے ورثے میں ملی تھی۔☆[15] دوسری طرف سیاست دان داخلی بحرانوں میں گھرے رہے جن کے باعث حکومتیں بار بار بدلتی رہیں۔ فوج نے سیاسی قیادت کی اس کمزوری کو اُجاگر کیا اور سویلین اداروں کو بدعنوان، نااہل اور غیرضروری قرار دیا۔☆[16] سیاسی قیادت میں اتنی استعداد نہیں تھی کہ وہ فوجی افسرِ شاہی کو مزید خود مختار ہونے سے روک سکے یا اس کے آزاد تجارتی منصوبوں پر قدغن لگا سکے۔☆[17] 1954ء سے 1969ء کے عرصے میں فوج نے اپنے سیاسی مقاصد کو پروان چڑھایا۔ فوج نے ریاست پر قبضہ کر کے خود کو قومی مفادات کا نگہبان باور کرایا اور یوں ریاست کی سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی کا بیڑہ اٹھایا۔ فوج کے اعلیٰ ترین جنرل اور ملک کے پہلے فوجی آمر نے آئینی ترامیم کے ذریعے فوجی حکمرانی کا آغاز کیا۔ نئے آئین نے جنرل ایوب کی قیادت میں صدارتی نظام متعارف کرایا۔ فوجی آمر نے قومی ترقی میں فوج کے کردار کو نمایاں کر کے اُس کے سیاسی جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔

فوج کو قوم کے نجات دہندہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے مختلف تعمیراتی کاموں کی ذمے داری سنبھال لی گئی، مثلاً آٹھ سو پانچ کلومیٹر لمبی شاہراہِ قراقرم تعمیر کر کے پاکستان کو سڑک کے ذریعے چین سے منسلک کر دیا گیا۔ 1966ء میں فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن قائم کر کے اس شاہراہ کی تعمیر شروع کی گئی۔ یہ ادارہ اپنی ابتدائی ذمے داری پوری کرنے کے بعد بھی قائم رکھا گیا اور اسے ملک میں سڑکیں بنانے کے کام دیے جانے لگے۔ لیفٹیننٹ (ریٹائرڈ) جنرل اسد درّانی جیسے اعلیٰ فوجی عہدے دار اس ادارے کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاہراہِ قراقرم جیسے منصوبے کو FWO کے بغیر مکمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اُن کا سوال تھا کہ ''FWO کی غیرموجودگی میں پاکستان کہاں ہوتا؟''☆[18] FWO کی ویب سائٹ پر بھی شاہراہِ قراقرم کی تعمیر کو فوج کی اعلیٰ صلاحیتوں سے منسوب کیا گیا ہے۔☆[19]

فوج کے احساسِ برتری کو دیکھتے ہوئے ایوب خان نے حاضر ملازمت اور سبک دوش ہونے والے فوجیوں کو حکومت میں شامل کیا اور سول سروس کے مختلف محکموں میں بھی فوجی

تعینات کیے۔ چونکہ مسلح افواج کے لوگوں کو زیادہ قابلِ اعتبار بنا کر پیش کیا جاتا تھا، اس لیے اُنھیں ملک کے مختلف شعبے چلانے کی ذمے داریاں بھی سونپی جاتی تھیں۔ اس طرح اعلیٰ فوجی عہدے داروں کو سرکاری اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔☆[20]

فوجیوں کی حکومت میں شمولیت صرف اس لیے نہیں تھی کہ انتظامیہ میں اچھے لوگ شامل کیے جائیں بلکہ مسلح افواج کی اعلیٰ انتظامیہ یہ بھی چاہتی تھی کہ فوج کے اجتماعی تعلقات بہتر ہوں۔ مسلح افواج 1950ء کے عشرے میں خود کو خطرے میں محسوس کرنے لگی تھیں۔ فوج کو مبینہ طور پر ایک ناکام بغاوت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا جسے راول پنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا تھا جس میں تین فوجی افسر اور متعدد سویلین بھی شامل تھے۔ مارچ 1951ء میں فوجی افسروں کے ایک گروہ اور بائیں بازو کے چند سویلین لوگوں مثلاً مشہور اردو شاعر فیض احمد فیض پر الزام لگایا گیا کہ وہ حکومت کا تختہ الٹ کر ایک فوجی کونسل قائم کرنا چاہتے تھے جو قانون ساز اداروں کے انتخابات کراتی اور کشمیر کا مسئلہ طاقت کے ذریعے حل کرتی۔☆[21]

گو کہ یہ کوشش ناکام ہوگئی اور مقدمہ چلانے کے بعد آخرکار افسروں کو معاف بھی کر دیا گیا، تاہم اس واقعے سے فوج کو اپنے ادارے کے اندر ایک نیا ''عمرانی معاہدہ'' کرنے کا خیال آیا۔ فوجی افسروں کو قومی وسائل پر تصرف کا حق دیا جانے لگا۔ جونیئر اور درمیانی درجے کے افسروں کو ملازمت کے دوران اور بعد میں دیکھ بھال کی ضمانتیں دی گئیں تاکہ وہ قومی فرائض ادا کریں، اعلیٰ افسروں کے وفادار رہیں۔ اس طرح فوج کے اندرونی تعلقات بہتر ہوئے۔ ایک ایسا فلاحی نظام جو افسروں اور سپاہیوں کی ذاتی ضروریات پوری کرے، وہ فوج کے سربراہوں سے وفاداری کا ضامن تھا اور اس طرح فوج ایک برادری میں تبدیل ہوتی گئی۔

فوج کا اصول رہا ہے کہ ''مہد سے لحد تک'' یعنی بچپن سے مرنے تک اپنی برادری کے ارکان کی دیکھ بھال کرو۔ اعلیٰ جنرلوں نے اپنے ادارے کی ضروریات پوری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خود ایوب خان کو فوجیوں کے حالاتِ زندگی پر بڑا قلق رہتا تھا۔☆[22] اسی لیے فوجی فاؤنڈیشن جیسے ادارے بنائے گئے تاکہ فوجیوں اور ان کے اہلِ خانہ کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جائے۔ اس ادارے کے تحت چلنے والے پانچ کاروباروں کے منافع سے شروع میں

اسپتال اور اسکول بنائے گئے اور فلاحی نظام مسلح افواج کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ فوجیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ اُن کا ادارہ اتنی اچھی طرح ان کا خیال رکھتا ہے۔

اسی نظام کے تحت دیگر فوائد بھی بہم پہنچائے جاتے ہیں، مثلاً فوجیوں کو زرعی زمینیں دی گئیں۔ گو کہ زرعی زمینیں پنجاب میں بھی دی گئی تھیں لیکن سندھ کی زمینیں ایوب خان کے دور میں بڑی بے دردی سے بانٹی گئیں۔ کیوں کہ 1947ء کے بعد نہروں اور آبی ذخائر کی مدد سے سندھ میں بڑی زمینیں کاشت کاری کے قابل بنائی گئی تھیں۔ کوٹری، گدو اور غلام محمد ڈیم بنا کر تقریباً نوے لاکھ ایکڑ زمین کاشت کاری کے دائرے میں لائی گئی اور اس کا تقریباً دس فی صد حصہ فوجیوں میں بانٹ دیا گیا۔ فوجی حکومت کے سینئر سویلین افسروں میں بھی زمینیں بانٹی گئیں۔

حسن عسکری رضوی کے مطابق ایوب کے دور میں کوئی تین لاکھ ایکڑ زمین سندھ میں فوجیوں کو دی گئی۔[23] ایک اور رپورٹ کے مطابق سندھ میں کل ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمینیں بانٹی گئیں جو زیادہ تر ایوب کے دور میں دی گئیں۔[24] اس کے علاوہ جن فوجیوں کی زمینیں سیم اور تھور کا شکار ہوئیں، ان کے لیے تلافی کی اسکیمیں بنائی گئیں۔ انھیں اندرونِ سندھ میں متبادل زمینیں دی گئیں۔[25] فوجیوں کو زمینیں دینے کا جواز یہ بتایا گیا کہ انگریزوں کے دور میں بھی فوجیوں کو زمینیں دی جاتی تھیں۔

یہ معاشی فائدے ادارے کی مضبوطی کا باعث بنے اور سینئر جنرلوں نے ریاست پر اختیارات بڑھاتے ہوئے اپنے خاندانوں کو مالی طور پر مستحکم کیا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ایوب خان نے اپنے بیٹے گوہر ایوب کو فوج سے استعفے کے بعد کاروبار اور صنعتیں قائم کرنے میں مدد دی۔[26] بیٹے کے مالیاتی کارناموں سے باپ کی بدنامی ہوئی کیوں کہ یہ ذاتی فائدے فوجی اور سیاسی اثر ورسوخ کے بغیر ممکن نہیں تھے۔

احتیاط کا دور (77-1969ء)

1969ء میں ایوب خان کے دور کے خاتمے کے بعد فوج کی اندرونی معیشت کا ارتقا سست ہوگیا۔ جنرل یحییٰ خان کے تین سالہ دور میں فوج کے کاروباری اور صنعتی کمپلیکس میں

کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ اس سست روی کی وجہ فوج کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایوب خان کی طرح یحییٰ خان نے بھی اپنے بہت سے وردی والے ساتھیوں کو ملک چلانے کا موقع دیا۔ تبدیلی صرف یہ تھی کہ اُس وقت ملک شدید سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔

دوسری ویلفیئر فاؤنڈیشن یعنی آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اکتوبر 1971ء میں قائم کی گئی جس کے صرف دو مہینے بعد پاک بھارت جنگ شروع ہوگئی۔ AWT بھی خالص فوجی ادارہ تھا جو جی ایچ کیو کے تحت کام کرتا تھا۔ اس کا مقصد ریٹائرڈ فوجیوں اور ان کے اہلِ خانہ کی فلاح و بہبود تھا (ملاحظہ ہو باب 4 میں تفصیلات)۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ چونکہ فوجی فاؤنڈیشن بری فوج کی ضروریات پوری نہیں کرسکتا، اس لیے ایک اور ادارے کا قیام ضروری تھا۔☆[27] یہ منطق عجیب تھی کیوں کہ فوجی فاؤنڈیشن پر پہلے ہی بری فوجیوں کا غلبہ تھا۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی ساخت فوجی فاؤنڈیشن سے مختلف تھی۔ فوجی فاؤنڈیشن تینوں افواج کی فلاح و بہبود کے لیے تھی جب کہ نو قائم شدہ AWT کا مالیاتی انحصار بری فوج پر زیادہ تھا۔ جی ایچ کیو نے AWT کو کاروباری منصوبوں کے لیے سرمایہ فراہم کیے جن کے منافعے ریٹائرڈ فوجیوں اور ان کے اہلِ خانہ کو دیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ فوج کی اعلیٰ قیادت ضرورت پڑنے پر AWT سے بھی فلاحی منصوبوں کے لیے مالیاتی مدد مانگ سکتی تھی (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو باب 8)۔

اس دور میں AWT کے سوا کوئی ادارہ قائم نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ فوج کی کاروباری سرگرمیوں میں کمی صرف اس لیے آئی تھی کہ اُس وقت ملک کی سیاسی صورتِ حال خاصی خراب تھی۔ یحییٰ نے ایوب کی نیم فوجی حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ اگر چہ اس دور کے بارے میں سیاسی تحریریں سیاسی تبدیلی کو بغاوت قرار دیتی ہیں لیکن درحقیقت یہ تبدیلی ایک جوابی بغاوت کی حیثیت رکھتی تھی۔ فوج کی اعلیٰ قیادت نے سب سے پرانے جنرل کو برطرف کردیا۔ فوج کا نیا سربراہ یحییٰ خان اپنے افسروں پر ایوب خان کی نسبت زیادہ اختیار رکھتا تھا۔ پھر ایوب خان خود کو فیلڈ مارشل کی آخری سیڑھی پر پہنچا کر افواج پر براہِ راست اختیار سے محروم ہوگیا تھا۔ مزید برآں ایوب کی معاشی پالیسیاں بھی کچھ عرصے چل کر سیاسی بحران کا شکار ہوگئی تھیں۔

ایوب خان کی پالیسیوں کے نتیجے میں دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہوگئی۔ اسی لیے ان پر تنقید کرنے والوں میں بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی ماہرِ معاشیات ڈاکٹر محبوب الحق بھی شامل تھے جنھوں نے ایوب کے دور میں بائیس مال دار خاندانوں کے معاشی غلبے کو نمایاں کیا۔ دولت کے اس ارتکاز سے عوام میں مایوسی بڑھی۔ اس کے علاوہ ایوب خان کے ''بنیادی جمہوریت'' پر مبنی سیاسی نظام نے چھوٹے زمیں داروں، کسانوں اور محنت کشوں کو بھی مایوس کیا۔☆[28] اس نظام سے عوام بااختیار تو کیا ہوتے، البتہ افسر شاہی مزید مضبوط ہوگئی۔ 1962ء میں متعارف کرائے جانے والے نئے آئین نے غیرسرکاری سیاسی جماعتوں اور گروہوں کو مرکزی دھارے سے نکال دیا جس سے حکومت پر لوگوں کا اعتماد مزید کم ہوگیا۔ قانونی داؤ پیچ کے ذریعے یونیورسٹی آرڈیننس اور پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس لائے گئے جن سے طلبہ اور صحافی بڑے متنفر ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے دونوں حصوں میں فوج کے سیاسی اور سماجی تسلط کے خلاف عوامی مظاہرے شروع ہوگئے۔ 1967ء میں مغربی پاکستان میں بھٹو نے عوامی احتجاج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی بنائی اور اپنے نیم سوشلسٹ ایجنڈے کا اعلان کیا۔

البتہ مشرقی پاکستان کے مسائل زیادہ گمبھیر تھے۔ وسائل کی غیرمنصفانہ تقسیم نے عوام کو اسٹیبلشمنٹ کے خلاف کردیا تھا جس میں پنجابی عنصر غالب تھا۔

مزید برآں ملک کے دونوں بازوؤں کے لسانی تضادات بھی ریاستی سیاست میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان تضادات کے باعث مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ نے چھ نکاتی ایجنڈا پیش کیا اور وفاقی اکائیوں کے لیے زیادہ خودمختاری کا مطالبہ کیا۔ ایوب خان نے نہ صرف ان مطالبوں کو رد کیا بلکہ بنگالی رہنما مجیب الرحمٰن کو دسمبر 1967ء میں اگرتلہ سازش کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ مجیب پر بھارتی حکومت کی مدد سے ایک آزاد ریاست کے قیام کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ گو کہ حکومت یہ الزام ثابت نہیں کرسکی، کیوں کہ مقدمے کے لیے ٹھوس ثبوت نہیں تھے،☆[29] پھر بھی اس سے حکومت اور بنگالی قیادت و عوام کے درمیان خلیج وسیع ہوئی۔

ان حالات میں یحییٰ خان نے 1969 میں اقتدار سنبھالا، پھر بھی مشرقی پاکستان کی

جانب اسلام آباد کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور دونوں بازوؤں کے درمیان بیگانگی بڑھتی رہی۔ پھر بھارت سے جنگ نے متحدہ پاکستان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

دسمبر 1971ء میں جنگ کے خاتمے سے پاکستان میں سیاسی تبدیلی آئی جس کے اثرات فوج کی کاروباری سرگرمیوں پر بھی پڑے۔ ملک کے پہلے منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے فوج کی سیاسی و مالیاتی خودمختاری کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ اسے کم کرنے کے لیے فوج کی مراعات پر نظر رکھی، مثلاً انھوں نے اصلاحات کے ذریعے کچھ زمینیں فوجیوں سے واپس لے لیں۔☆30 انھوں نے مزید فلاحی فاؤنڈیشنز کے قیام کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی اور تیسری فاؤنڈیشن صرف 1977ء میں بھٹو کو ہٹائے جانے کے بعد ہی بنائی جاسکی۔

بھٹو کے خیال میں مسلح افواج پالیسی پر عمل درآمد کے لیے تھیں اور انھوں نے ترقیاتی کام کے لیے بھی فوج کو استعمال کیا جن میں آزاد جموں کشمیر اور شمالی علاقوں میں کمیونی کیشن کا جال بچھا دیا۔ اسپیشل کمیونی کیشن آرگنائزیشن کا قیام 1976ء میں ہوا اور اس کا مقصد فوج کی ترقیاتی استطاعت کو استعمال کرنا تھا، نہ کہ اسے مزید اختیار دینا۔ بھٹو فوج کو خود مختار نہیں بنانا چاہتے تھے اور نہ اسے سویلین اداروں سے آزاد ہی کرنا چاہتے تھے۔ تاہم بھٹو مسلح افواج کی طاقت کم کرنے میں ناکام رہے۔

بھٹو کی ذات تضادات کا مجموعہ تھی یعنی وہ عوام اور جمہوری اداروں کو طاقت ور بھی بنانا چاہتے تھے اور پھر خود مطلق العنان اختیارات بھی رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بالآخر اپنے دوسرے جذبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جس کی وجہ سے وہ نادانستہ طور پر فوج کی سیاسی قوت بڑھانے کی طرف چل پڑے جس کے نتیجے میں فوج مضبوط ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فوج نے انھیں 1977ء میں اقتدار سے علیحدہ کر کے 1979ء میں پھانسی چڑھا دیا۔ بھٹو کی ناکام پالیسیاں اور جی ایچ کیو کے مفادات فوج کو پھر اقتدار میں واپس لے آئے۔

بھٹو کے خاتمے سے فوج پر رہی سہی رکاوٹیں بھی ختم ہوگئیں۔ اس باب میں جن برسوں کا ذکر کیا گیا ہے، یہ وہ دور تھا جب فوج کو براہِ راست اقتدار کا مزہ پہلی بار معلوم ہوا، لیکن ان کا کردار بہرحال اس سے سوا بھی تھا۔ لاطینی امریکا کی افواج کی طرح پاکستانی افواج بھی خود کو

ریاست کی سالمیت اور اس کی معاشی اور معاشرتی ترقی کا ضامن سمجھنے لگیں اور اس کا اظہار فوج کے معاشی عزائم سے بھی ہوتا ہے۔ اکثر صنعتی منصوبہ بے قومی ترقی اور فوجی اہل کاروں کی فلاح و بہبود کی خاطر بنائے گئے۔

تاہم اس کے ساتھ ساتھ بعض دوسری سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں جیسے ملکی اراضی پر فوج کا تصرف اُن کے اس خیال کا نتیجہ تھا کہ افواجِ پاکستان ملک کی سالمیت اور تحفظ کے اقدامات کرنے والا خودمختار ادارہ ہے، اس لیے یہ اُس کا حق ہے کہ اپنے افراد کی فلاح و بہبود کے لیے وہ ملک کی جتنی اراضی چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ پاکستان میں فوجی کاروبار کے فروغ کا سبب افواج کی اعلیٰ انتظامیہ کا اپنے تمام اقدامات کو ہر طرح درست سمجھنا ہے۔ اراضی اور دوسرے وسائل یا غیر ملکی امداد کو فوجیوں کی بہتری کے لیے استعمال کرنے کا جواز اُن کے نزدیک یہ ہے کہ وہ سیاسی یا سول سوسائٹی کے افراد کے مقابلے میں زیادہ ذمے دار ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو یہ وہی دور تھا جب افواج کے اعلیٰ افسران میں لوٹ کھسوٹ کا رویہ نمایاں ہوا اور آنے والے دور میں اس رُجحان میں مزید اضافہ ہوا۔

باب-6

فوج کی کاروباری سرگرمیوں میں توسیع

(1977ء سے 2005ء)

سویلین حکمرانی اور خاص طور پر بھٹو کے دورِ حکومت سے جرنیلوں نے یہ سیکھا کہ فوج قومی نظم ونسق کو پوری طرح سیاست دانوں پر نہیں چھوڑ سکتی۔ اگرچہ بھٹو نہ جمہوریت کو مضبوط کر سکے اور نہ سویلین اداروں کی بالادستی ہی کو قائم کر سکے۔ پھر بھی انھوں نے فوج کی خودمختاری کو للکارا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل ضیاء الحق کے ٹولے نے مسلح افواج کی خودمختاری اور بالادستی دونوں کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ ان برسوں میں سینئر جنرلوں نے سیاسی طاقت حاصل کی تاکہ اپنی خواہشِ مال و زر کو پورا کر سکیں۔ پھر معاشی طاقت کے حصول کے ساتھ مزید سیاسی قوت کی بھوک بھی بڑھتی گئی۔ اس دوران فوج کی سیاسی سرگرمیوں میں اضافے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف جی ایچ کیو نے فوج کی مالیاتی خودمختاری بحال کرنے کی کوشش کی بلکہ سینئر جنرلوں نے بھی وسائل کو ذاتی استعمال میں لانا شروع کیا۔ فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے باعث ایک متوازی معیشت نمودار ہوئی جس نے مسلح افواج کو ایک بالادست معاشی فریق میں تبدیل کر دیا۔

فوج کی مالیاتی خودمختاری میں اضافہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ فوج نے اس دوران ریاستی معاملات میں ایک مستقل مقام حاصل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کی تھیں۔ ایک عشرے پر محیط ضیا حکومت نے جو قانونی اور آئینی سقم پیدا کیے، مشرف نے انھیں مضبوط کیا اور فوج کو

پالیسی پر عمل کرنے والے ادارے کی بجائے پالیسی سازی میں حصے دار بنا دیا۔فوج کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت سے سیاسی حکومتوں نے بھی اپنی سربستہ اغراض کے باعث چشم پوشی کی۔ سیاسی خودمختاری اور معاشی آزادی نے مل کر فوجی برادری کو ایک طبقے کی شکل دے دی۔ہم اس باب میں فوج کی بڑھتی ہوئی کاروباری سرگرمیوں پر نظر ڈالیں گے۔

مالیاتی خودمختاری کی بحالی (1977-1988ء)

جنرل ضیاء الحق کا عشرہ اگست 1988ء میں ایک پُراسرار ہوائی حادثے میں ان کے انتقال پر ختم ہوا۔اس فوجی آمر نے فوج کو دوبارہ اقتدار کی راہ دکھائی۔معاشی حلقوں میں فوج کی توسیع پسندی دراصل سیاسی اقتدار ہی کا شاخسانہ تھی۔

یہی وہ دور تھا جب معیشت میں فوج کا حصہ بڑھانے کے لیے کئی شقیں متعارف کرائی گئیں۔اس طرح فوج کو تنظیمی طور پر اور افسروں کو انفرادی طور پر فائدے پہنچائے گئے۔اس عرصے میں فوج کی کاروباری سرگرمیاں تعمیر و توسیع کے ایک بڑے عمل سے گزریں۔فلاحی فاؤنڈیشن نئے نئے صنعتی منصوبے شروع کرتی رہیں اور نت نئی کاروباری سرگرمیوں میں داخل ہوتی رہیں۔فوج کی اقتدار میں واپسی اور اس کے معاشی مفادات میں اضافہ ساتھ ساتھ ہی ہوا۔ریاست پر جی ایچ کیو کی بالادستی سے فوج کو وسائل کے استحصال اور مالیاتی خودمختاری کے مواقع ملتے رہے۔

فوج کا سیاسی اقتدار اور معاشی استحصال ترکی اور وسطی امریکا کے ملکوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ وسطی امریکا میں فوج کے کاروباری امور کے ماہر کیون زمورا (Kevin Zamora) کے مطابق اس خطے میں سیاست پر فوجی غلبہ ہی فوج کی کاروباری سرگرمیوں میں اضافے کا باعث بنا۔[☆1] ترکی کی سیاست پر تبصرہ نگار ولیم ہیل (William Hale) کا کہنا ہے کہ 1960ء اور 1980ء میں اقتدار پر قبضہ کرتے ہی مسلح افواج نے اپنے افسروں کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافے کر لیے۔تاہم ہیل کے خیال میں فوج نے سیاسی مداخلت مالیاتی مفادات کے باعث نہیں کی تھی۔ان کا کہنا ہے کہ تاریخی شواہد کے مطابق کاروباری

مفادات سیاسی و سماجی مفادات سے کم اہمیت کے حامل رہے ہیں۔☆[2] تاہم ہیل کا تجزیہ ترک فوج کی مالیاتی خودمختاری اور سیاسی طاقت کے ربط کو نظرانداز کرتا ہے۔

مسلح افواج کی مالیاتی اور سیاسی خودمختاری ایک شیطانی چکر میں باہم مربوط ہیں جیسا کہ اس باب میں ظاہر کیا جائے گا۔ اگر ایک طرف قومی وسائل کے استحصال کے لیے فوج کو سیاسی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو دوسری طرف اُس کی مالیاتی خودمختاری ریاستی اقتدار پر منحصر ہے۔ یہی تجزیہ پاکستان پر بھی صادق آتا ہے جہاں سیاسی طاقت ہی افسروں کے معاشی مفادات کا تعین کرتی ہے جس کا اظہار اُن کی مالیاتی مراعات سے ہوتا ہے۔

پاکستان کی فوج اس تجزیے سے اتفاق نہیں کرتی۔ چالیس کے قریب اعلیٰ فوجی افسر جن کے اس کتاب کے لیے انٹرویو لیے گئے، یہ بات ماننے پر تیار نہیں کہ فوج معاشی مفادات کے باعث مداخلت کرتی ہے یا اس کا سیاسی طاقت سے کوئی تعلق ہے۔ ان افسروں میں سے کچھ مشرف حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ ان کے خیال میں فوج نے ریاست کو غیر ذمے دار سیاست دانوں سے بچانے کے لیے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیا اور معاشی سرگرمیوں کا فوج کی سیاسی طاقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے پیچھے کوئی سیاست کارفرما نہیں تھی اور یہ سرگرمیاں صرف فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور قوم کی معاشی بہتری کے لیے کی گئی تھیں۔

مثال کے طور پر پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) خالد مقبول نے ایک سوال کے جواب میں پوچھا، ''کیا ہم (یعنی فوج) نے کسی کو معاشی وسائل سے محروم کیا ہے؟ جب فوج یہ کاروباری سرگرمیاں ملک کے مجموعی فائدے کے لیے کر رہی ہے تو اس پر کیوں اعتراض کیا جائے؟''☆[3] ایڈمرل سعید محمد خان نے گفتگو میں مسلح افواج کی ''ادارتی یادداشت'' یا ''انسٹی ٹیوشنل میموری'' کا ذکر کیا۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس یادداشت میں مسلح افواج کی پیشہ ورانہ روایات اور داخلی یک جہتی کا ذکر تو ہے مگر فوج کی معاشی سرگرمیوں کا کوئی تذکرہ نہیں۔☆[4] ایڈمرل نے جس ادارتی یادداشت کا ذکر کیا ہے، وہ مسلح افواج کے پیشہ ورانہ معیار

اور مزاج اور اس کے اندرونی ربط کی جانب ایک اشارہ ہے۔

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی سلیم النفس نوعیت پر متضاد خیالات ملتے ہیں اور تمام فوجی افسر اس بات پر متفق ہیں کہ مسلح افواج کی کاروباری سرگرمیاں فلاح و بہبود کے لیے ہیں۔ کراچی میں ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے ایک کلب کے منتظم کرنل (ریٹائرڈ) بختیار خان نے اس تصور پر احتجاج کیا کہ کاروباری سرگرمیاں عام فوجیوں کی بہبود کے لیے ہیں۔ ان کے خیال میں فوج کی اندرونی معیشت اعلیٰ جنرلوں کے مفادات پورے کرتی ہے اور عام فوجیوں کو شاید ہی کچھ ملتا ہو۔ انھوں نے کہا کہ جی ایچ کیو کی تمام پالیسیاں ہر عہدے دار کے لیے مفید نہیں ہوتیں اور کاروباری سرگرمیاں بنیادی طور پر سینئر افسروں کی حرص پوری کرتی ہیں۔☆5

فوج کی کاروباری سرگرمیاں جو بھٹو کے دور میں وقتی طور پر ٹھنڈی پڑ گئی تھیں، جنرل ضیا کے دور میں دوبارہ نئی توانائی کے ساتھ متحرک ہوگئیں اور جس قوت کے ساتھ فوج واپس آئی تھی، اس سے ان کی معاشی سرگرمیاں بھی متناسب تھیں۔ ضیا نے اپنا قانونی جواز مذہبی اشرافیہ، جاگیردار اور کاروباری طبقے کے ساتھ اتحاد میں ڈھونڈا۔ بھٹو نے کاروبار، صنعت اور تعلیم کو ریاستی ملکیت میں لینے کی جو پالیسی شروع کی تھی، ضیا نے اُسے پلٹ دیا۔ نجکاری کا مقصد نجی کاروباری طبقے اور ملک کی معاشی حالت کو مضبوط کرنا تھا۔ سیاست اور سول سوسائٹی کی جانب فوجی حکومت کا رویہ وہی تھا جو کسی افسر شاہی اور مطلق العنان ٹولے کا ہوسکتا ہے۔ اس ٹولے نے جمہوری روایات سے انحراف کر کے مطلق العنان سیاسی نظام کو فروغ دیا۔☆6

معاشی بہتری کے لیے جنرل ضیا نے جو کوششیں کیں، اُن کا فائدہ فوج کو بھی پہنچا۔ ضیا نے فوج کی مالیاتی خود مختاری قائم کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے اور اعلیٰ کمانڈروں کو بااختیار بنا کر اپنے حلقۂ انتخاب یعنی مسلح افواج میں مقبول بن گیا۔ ضیا جنرلوں کو خوش اور مطمئن رکھنے کی اہمیت جانتا تھا۔ اس نے اپنے کور کمانڈروں کو ''خفیہ رجمینٹل'' فنڈ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ یہ خفیہ رقوم کمانڈروں کے تصرف میں تھیں اور اُنھیں وسائل کو خصوصی بجٹ میں ڈالنے اور نکالنے کا پورا اختیار تھا۔

یہ رجمینٹل فنڈ ایک طرح کے اندھے کنویں تھے جو وسائل کو نگل کر کسی کو جواب دہ نہیں تھے۔ یہ رقوم دو ذرائع سے آتی تھیں۔ ایک تو دفاعی بجٹ سے اور دوسرے کوآپریٹوز جیسے چھوٹے منصوبوں سے حاصل کردہ رقوم سے۔ ان رقوم کے لیے کوئی سوال جواب نہیں ہوتا اور نہ کسی نگرانی کا انتظام ہے جو یہ دیکھے کہ رقوم صحیح اور جائز مقاصد کے لیے استعمال کی جارہی ہیں یا کمانڈروں اور اعلیٰ افسروں کے ذاتی مفادات کے لیے۔ کئی ذرائع سے پتا چلا ہے کہ اعلیٰ کمانڈر ان رقوم کو اپنے اور اپنے خاندانوں کے آرام و آسائش کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں، نہ کہ عام فوجیوں کی بہتری کے لیے۔

اعلیٰ کمانڈروں کے انفرادی اختیارات ڈویژن اور یونٹ کی سطح پر بھی تقسیم تھے۔ یہ کمانڈر چھوٹے کاروباری منصوبے شروع کر کے بہبود کی مد میں رقوم رکھ سکتے تھے۔ کوآپریٹوز بھی مسلح افواج کی مالیاتی خودمختاری کی پالیسی کا حصہ تھے۔ 1988ء میں وزیراعظم محمد خان جونیجو کی برطرفی کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اعلیٰ افسروں کی مراعات کے متعلق سوال کرنے لگے تھے اور یہ بات جنرل ضیا کو پسند نہیں تھی۔ وزیراعظم بنائے جانے پر جونیجو نے ضیا کا احسان مند ہونے کے بجائے جنرلوں کو ان برآمدشدہ کاروں کی بجائے جو وہ عموماً استعمال کرتے تھے، چھوٹی اور مقامی سوزوکی کاروں میں بٹھانے کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ اوجڑی کیمپ کے سانحے کی تحقیقات بھی جنرل ضیا کے غصے کا باعث بنیں اور ضیا نے بدعنوانی کے الزامات لگا کر جونیجو اور اسمبلی کو برطرف کر دیا۔

جونیجو حکومت اور بعد کی دیگر حکومتوں کی برخاستگی سے بدعنوانی کی جانب فوج کے متضاد رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ انگریزی اخبار ''ڈیلی ٹائمز'' کے مدیر نجم سیٹھی کے مطابق ''فوج قوانین میں رد و بدل کرتی ہے اور خود اپنے قوانین بناتی ہے تاکہ کوئی اسے بدعنوان نہ کہہ سکے۔ اور جب سیاست دان یہی کچھ کرتے ہیں تو اسے بدعنوانی کہا جاتا ہے۔''[☆7] رجمینٹل فنڈز کا انتظام کرتے وقت سینئر جنرل یہ نہیں سوچتے کہ اسے غلط طریقے سے استعمال کیا گیا ہے۔

انفرادی کمانڈروں کے خصوصی مالیاتی اختیارات حکومت کے روایتی احتساب کی زد میں

نہیں آتے۔ فوج کی اعلیٰ قیادت نے ہمیشہ اپنے اس حق کا دفاع کیا ہے کہ اس سے پارلیمنٹ یا عوام پوچھ گچھ نہیں کرسکتے اور نہ ہی وہ رقوم کے استعمال پر کوئی سوال اٹھا سکتے ہیں، بلکہ درحقیقت اگر افسروں سے کہا جائے کہ مسلح افواج میں جواب دہی کی کمی ہے تو انھیں فوراً غصہ آجاتا ہے۔ وہ خود کو عوام یا نجی شعبے کی نسبت زیادہ ''پاک صاف'' سمجھتے ہیں۔ فوج خود کو نہ صرف احتساب سے بالاتر سمجھتی ہے بلکہ اپنے معیار کو بھی بہت اعلیٰ گردانتی ہے، مثلاً انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز کے سربراہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) جمشید ایاز خان کے خیال میں فوج کا احتسابی نظام بے خطا ہے۔[8☆] مگر ان کے دعوے کی تائید آڈیٹر جنرل آف پاکستان کے اعلیٰ ارکان نہیں کرتے۔ ایک آڈیٹر کے مطابق ''رجمینٹل فنڈ'' کا آڈٹ نہیں کیا جاسکتا اور ان پر شکوک وشبہات کی خاصی گنجائش ہے۔[9☆]

جیسا کہ اس سے پہلے کہا جاچکا ہے کہ جنرل ضیا کی حکومت کو اس بات سے یک گونہ دل چسپی تھی کہ فوجی اداروں کو بااختیار بنایا جائے۔ چنانچہ اس عمل کے نتیجے میں انھیں ایک ایسے آزاد طبقے کی حیثیت دے دی گئی جو منفرد سیاسی صلاحیتوں کا حامل تھا اور اس لیے مزید مراعات اور رعایتوں کا مستحق تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی نے کاروباری منصوبوں اور مراعات کو ''اقربا پروری'' قرار دیا۔[10☆] 1977ء کے بعد فوجی برادری کے لیے تعمیراتی منصوبے شروع کیے گئے، مثلاً فوجیوں کے بچوں کے لیے علیٰحدہ تعلیمی نظام قائم کیا گیا۔ 1977ء ہی میں جی ایچ کیو نے فوجی چھاؤنیوں کے اندر ہی اپنے اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا[11☆] تاکہ فوجیوں کے بچوں کو بہتر قسم کی تعلیم فراہم کی جاسکے۔

فوج کے اسکول ملک میں اشرافیہ کے تعلیمی نظام کا حصہ ہیں جو سویلین شعبے میں بھی ہیں۔ طارق رحمان کے مطابق ان تعلیمی اداروں میں تدریسی زبان انگریزی ہے جو عام سرکاری اسکولوں میں نہیں پائی جاتی۔[12☆] پاکستان کا نظامِ تعلیم ''اشرافیہ'' اور ''غیر اشرافیہ'' نظاموں پر مبنی ہے۔ اشرافیہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے فوج اپنے لیے اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کرسکتی ہے۔ اعلیٰ تعلیمی نظام سے فوج کی اپنی ضرورتیں بھی پوری ہوتی تھیں۔ افسروں کے بچوں کو ان

اسکولوں میں پڑھ کر فوج میں شامل ہونے کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

فوج کے زیرِ انتظام اسکولوں میں فوجی افسروں کے بچے ہی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ جونیئر اور نان کمیشنڈ افسروں کے بچوں پر کوئی پابندی نہیں ہے، پھر بھی اعلیٰ افسروں کے بچے ہی زیادہ تر ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ بعض صورتوں میں افسروں اور سپاہیوں کے درمیان طبقاتی فرق بڑا واضح ہوتا ہے، مثلاً بحریہ میں عملے کے بچوں کے لیے علیٰحدہ اسکول ہیں۔ یہ اندرونی سماجی فرق غیرارادی طور پر ان طبقہ بندیوں کی نقل کرتے ہیں جو دوسرے زمروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

بہرحال تعلیمی سہولیات کو فوجی افسران اس چیز کی ایک مثال کے طور پر اُجاگر کرتے ہیں جسے ان کے ترجمان میجر جنرل شوکت سلطان نے فوج کی اس صلاحیت کے طور پر پیش کیا کہ وہ اداروں اور نظام کو زیادہ بہتر طور پر چلاسکتے ہیں۔[☆13] فوج کی بہتر صلاحیت کی اس دلیل کو استعمال کرتے ہوئے دیگر ادارے بھی قائم کیے گئے، مثلاً نیشنل لاجسٹکس سیل (NLC)— یہ ادارہ 1978ء میں کراچی کی واحد بندرگاہ سے نقل وحمل کے مسائل حل کرنے کے لیے بنایا گیا۔ جنرل ضیا کے دفتر سے جاری کیے جانے والے ایک خط کے مطابق اگر بندرگاہ سے نقل و حمل کا بحران حل نہ کیا گیا تو جلد ملک میں گندم اور دیگر اشیا کی قلت پیدا ہو جائے گی۔ کراچی بندرگاہ نے گودی اور دوسرے جہازوں سے سامان اتارنے کے وقت میں اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ چودہ ارب روپے سے زائد غیرملکی جہازراں کمپنیوں کو ہرجانے کے طور پر ادا کرنے پڑے۔[☆14]

اس وقت کے کوارٹر ماسٹر جنرل سعید قادر نے فوج کے زیرِ انتظام ایک آزاد ادارہ تشکیل دیا جس میں سویلین نہ ہونے کے برابر تھے تاکہ مبینہ طور پر بدعنوانیوں اور نااہلیوں کا تدارک کیا جاسکے۔ این ایل سی اب نقل وحمل کے علاوہ سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کرنے لگی ہے۔ اس ادارے کا دعویٰ ہے کہ اس نے کراچی کی بندرگاہ پر صورتِ حال بہت بہتر کر دی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں جدول 6.1 کے اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں:

جدول: 6.1 1995ء سے 2000ء کے دوران نقل وحمل کا تقابلی جائزہ

سال	این ایل سی (ٹنوں میں)	مجموعی کارگو کا فی صد	نجی ٹرانسپورٹ (ٹنوں میں)	مجموعی کارگو کا فی صد	ریلوے (ٹنوں میں)	مجموعی کارگو کا فی صد
1995-96	711,770	52.86	407,53	30.23	227,688	16.91
1996-97	819,210	52.52	460,901	29.55	279,451	17.92
1997-98	666,559	64	472,387	34	72,289	2
1998-99	511,667	33	911,946	59	123,629	8
1999-2000	215,766	20	839,952	77	39,839	3

ماخذ: این ایل سی کی ہیڈکوارٹر رپورٹ

تاہم دوسرے ادارے این ایل سی کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے، مثلاً ریلوے کے افسران کے خیال میں این یل سی نے ان کے کاروبار کو زک پہنچائی۔[15☆] ان کی رائے یہ تھی کہ فوج کی اس ٹرانسپورٹ کمپنی نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے نقل وحمل کے کاروبار کا بڑا حصہ حاصل کرلیا ہے۔ دیے ہوئے جدول (6.1) سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ 1997-98ء کے بعد ریلوے کا حصہ بڑے ڈرامائی انداز میں کم ہوا۔ فوجی حکومت نے پاکستان ریلوے کو بہتر بنانے کی بجائے خود اپنا ادارہ قائم کرلیا جس سے پاکستان ریلوے کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی۔ این ایل سی کا قیام کسی ادارے کی نج کاری کے نتیجے میں نہیں ہوا تھا بلکہ یہ ایک سرکاری شعبے کا کام دوسرے کو منتقل کرنا اور اس طرح دُہری محنت پیدا کرنا تھا۔

این ایل سی نے گندم ذخیرہ کرنے کے مرکز بھی تعمیر کیے اور یہ وہ کام تھا جو اس کے اصل منشور میں شامل تھا۔ 1990ء سے 2000ء تک اس کا ظاہر کردہ منافع تقریباً ایک ارب روپے تھا۔[16☆] فوج کے ایک سابق سربراہ مرزا اسلم بیگ کے مطابق اس منافعے سے این ایل سی کی بہتر کارکردگی ثابت ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں این ایل سی اور ایف ڈبلیو او فوج کا

حصہ نہیں لیکن چونکہ ان میں سویلین کی بجائے فوجی کام کرتے ہیں، اس لیے ان اداروں کی پیداواری صلاحیت نجی شعبے کے اداروں سے زیادہ ہے۔[☆17] تاہم یاد رہے کہ این ایل سی کا بظاہر زیادہ منافع بخش ہونا ضروری نہیں کہ بہتر صلاحیتوں کے باعث ہی ہو۔ اس کی بڑی وجہ سرکاری ٹھیکوں کے لیے فوجی تعلقات کا استعمال اور نجی شعبے سے مقابلہ نہ ہونا ہے۔ این ایل سی کسی بھی نجی یا سرکاری کمپنی کے مقابلے میں ٹھیکے لینے کے لیے زیادہ اثر ورسوخ رکھتی ہے۔ فوج سے ملنے والی زمینیں کسی نجی شعبے کے پاس ہونا ناممکن ہے۔ اسی طرح این ایل سی کی گاڑیوں کو نجی گاڑیوں کے مقابلے میں کسٹم، پولیس اور دوسرے اداروں کے ہاتھوں چھان بین کا سامنا بہت کم کرنا پڑتا ہے۔ نجی شعبے کی گاڑیوں کو قدم قدم پر رشوتیں دینی پڑتی ہیں جب کہ این ایل سی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس کی لاگت بھی کم ہوتی ہے۔

جنرل ضیا کے دور میں فوج نے اپنی مالیاتی طاقت کو اپنے ارکان اور خصوصاً اعلیٰ افسروں کے فائدے کے لیے خوب استعمال کیا۔ اس عرصے میں فوج کی معاشی سلطنت افقی اور عمودی دونوں لحاظ سے خوب پھلی پھولی اور اس کا اظہار تین طرح سے ہوا۔ اوّل تو یہ کہ حکومت نے فوجی برادری کے ارکان کو بڑی دیہی اور شہری زمینیں عنایت کیں۔ دوسرے یہ کہ کئی کوآپریٹو منصوبے شروع کرکے فوج کی مالیاتی آزادی مستحکم کی گئی۔ تیسرے یہ کہ فوج کے ذیلی اداروں کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنی کاروباری سرگرمیاں سماج اور معیشت کے بیشتر شعبوں میں پھیلائیں۔ پاکستانی فضائیہ کی شاہین فاؤنڈیشن اور پاکستان بحریہ کی بحریہ فاؤنڈیشن کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

شاہین فاؤنڈیشن 1977ء میں قائم کی گئی[☆18] اور اس کا قیام بھی آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے اصولوں پر مبنی تھا یعنی پنشن کی رقوم سے کاروباری اور صنعتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی جائے۔ ظاہر ہے کہ پاک فضائیہ کی اعلیٰ قیادت بھی اپنے ارکان کے لیے فلاح و بہبود کے مواقع چاہتی تھی۔ فضائیہ کو فوجی فاؤنڈیشن کے وسائل اور ملازمتوں کا بمشکل پانچ فی صد حصہ ملتا تھا جو فضائیہ کے سابق ارکان کو کھپانے اور اُن کی بہبود کے لیے ناکافی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کی دفاعی بجٹ پر تینوں افواج کے مابین رسّا کشی سے ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو جدول 6.1)

فضائیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بحریہ نے بھی جنوری 1982ء میں بحریہ فاؤنڈیشن بنا ڈالی۔☆[19] بحریہ کے لیے علیحدہ فاؤنڈیشن کا کوئی معقول جواز نہیں تھا۔ 1971ء کی جنگ کے بعد بحریہ سے بہت زیادہ لوگ سبک دوش نہیں ہوئے تھے اور ویسے بھی بحریہ میں کام کرنے والے بہت تھوڑی تعداد میں تھے اور قومی دفاعی حکمتِ عملی میں بحریہ کو تینوں مسلح افواج میں سب سے کم اہمیت دی جاتی ہے۔ ملک کے دفاعی منصوبوں میں کراچی کی بندرگاہ کی ممکنہ ناکہ بندی کو ضرور ذہن میں رکھا جاتا تھا لیکن زیادہ تیاریاں برّی جنگ کی کی جاتی تھیں۔☆[20]

نقشہ: 6.1 دفاعی بجٹ کی تقسیم

ماخذ: صدیقہ۔ آغا (2001، صفحہ 83)
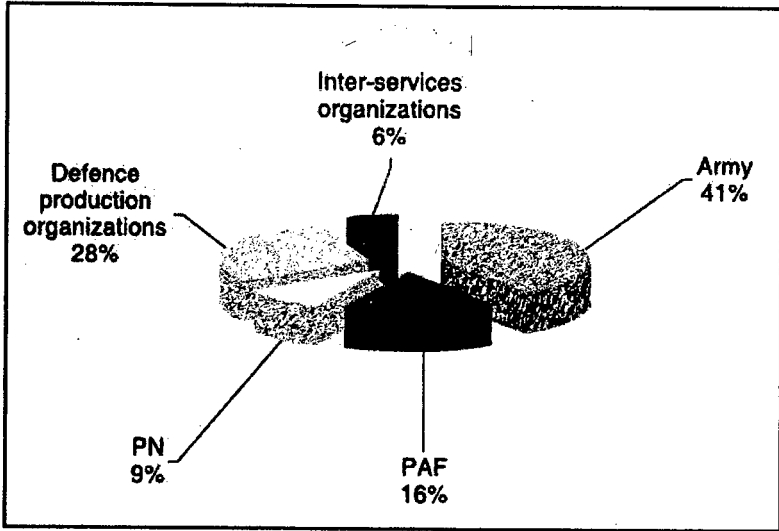
بحریہ کے سابق سربراہ ایڈمرل طارق کمال خان کا دعویٰ ہے کہ وہ بحریہ فاؤنڈیشن کے خلاف تھے اور اپنی مدتِ سربراہی (86-1983ء) میں اسے بند کر دینا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ بحریہ کے اعلیٰ افسر اپنے پرنسپل اسٹاف کی میٹنگوں میں چالیس فی صد وقت فاؤنڈیشن پر گفتگو میں لگا دیتے تھے لیکن وہ ناپسندیدگی کے باوجود اس فاؤنڈیشن کو بند نہ کر سکے۔☆[21] دراصل اعلیٰ کمانڈر معاشی فوائد حاصل کرنے کے مواقع ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

بحریہ فاؤنڈیشن نے بھی آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور شاہین فاؤنڈیشن سے ملتا جلتا تصور اپنایا اور فلاحی وسائل کو کاروباری اور صنعتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا اور ان سے اسپتال اور اسکول وغیرہ نہیں چلائے۔ دوسری فاؤنڈیشنوں کی طرح بحریہ فاؤنڈیشن کو بھی ریٹائرڈ فوجی افسر چلاتے رہے ہیں۔

اسی لیے ان اداروں کو نجی اداروں میں شمار نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ فوجی افسر دعویٰ کرتے ہیں۔ ان رفاہی فاؤنڈیشنوں میں تقرری اسی وقت کی جاتی ہے جب افسر اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے آخری مراحل میں ہوتے ہیں، اس طرح یہ نئی ملازمت ان کی فوجی ملازمت کا تسلسل ہوتی ہے اور کسی نجی شعبے کی ملازمت نہیں سمجھی جاسکتی۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) طلعت مسعود کے مطابق جنرل ضیا نے فاؤنڈیشنوں کے اعلیٰ عہدے افسروں کو یا تو وفاداری کے انعام میں دیے یا پھر اُنھیں خود اپنے یا اپنے وضع کردہ نظام کے لیے خطرہ سمجھ کر ایک طرف ہٹانے کے لیے ان اداروں میں تعینات کر دیا گیا۔☆22

فاؤنڈیشنوں اور دیگر سرکاری اداروں اور محکموں میں اعلیٰ تقرریوں کا نظام فوج کے سربراہوں کی خوشنودی پر منحصر تھا۔ یہ تقرریاں جزا و سزا کے اس نظام کے تحت کی جاتی تھیں جو مسلح افواج کی اعلیٰ قیادت کسی بادشاہ یا جاگیردار کی طرح وفاداریاں قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق عملیت پسند آدمی تھے اور اُنھیں اپنا اور اپنے لواحقین کا بہت خیال تھا اور اس کے لیے ان کا اپنے ادارے کو مضبوط کرنا ضروری تھا۔ جنرل ضیا کی شہرت مذہبی شخص کی ہے لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے بدعنوانیوں اور ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی نہیں کی جن سے افسروں کو مالی فائدے پہنچ رہے تھے۔ ان کے دور میں حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ اعلیٰ افسروں پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

فوجی معیشت کی عمودی توسیع کاروباری مواقع میں اضافے کا باعث بنی۔ فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ جیسے بڑے ادارے کھاد بنانے میں لگ گئے کیوں کہ کھاد کی مارکیٹ میں طلب زیادہ تھی۔ فوجی فرٹیلائزر کمپنی مئی 1978ء میں قائم کی گئی۔ اس کا پہلا پلانٹ 1982ء میں 814 ملین کے حصص کے ساتھ تین ہزار تین سو ملین روپے سے قائم کیا

گیا۔ یہ سابق مشرقی پاکستان میں قائم کیے جانے والے جوٹ پلانٹ کی طرح تھا۔ جس طرح مشرقی پاکستان کی معیشت جوٹ پر منحصر تھی، اسی طرح مغربی پاکستان کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔

عشرہ 1980ء کے وسط میں فوجی فاؤنڈیشن تیل اور گیس جیسے اہم شعبے میں بھی داخل ہوگئی اور اس نے ماڑی گیس کمپنی لمیٹڈ قائم کرلی۔ فوجی فاؤنڈیشن پاک اسٹانویک (Pak Stanvec) پیٹرولیم کے چالیس فی صد حصص خرید کر کمپنی کی سب سے بڑی مالک بن گئی۔ اس کے دیگر حصہ داروں میں حکومتِ پاکستان کے بیس فی صد، آئل اینڈ گیس کارپوریشن کے بیس فی صد اور عام لوگوں کے بیس فی صد حصص تھے۔☆[23] فوجی فاؤنڈیشن کے چالیس فی صد حصص کی بدولت اسے منافعے اور انتظامیہ پر بالادستی حاصل ہوگئی اور ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل کو ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ کمپنی کے دعوے کے مطابق اس کا منظور شدہ سرمایہ ڈھائی ہزار ملین روپے ہے اور یہ ڈھرکی، سندھ میں ملازمتیں بھی فراہم کرتی ہے۔ جہاں یہ ملک کا دوسرا سب سے بڑا تیل کا پیداواری نظام چلاتی ہے۔☆[24]

تاہم عام لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرنے کے حوالے سے ڈھرکی کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ملازمتیں مقامی لوگوں کو نہیں دی جاتیں۔ 1984ء میں مقامی آبادی نے احتجاج کیا اور ایک بڑا تنازع کھڑا ہوگیا جس کے نتیجے میں مظاہرین پر گولیاں چلائی گئیں اور ایک عورت فوت ہوگئی۔☆[25] لوگ اب بھی اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ کمپنی مقامی وسائل کا استحصال تو کرتی ہے مگر مقامی لوگوں کو ملازمتیں نہیں دیتی۔ اس طرح کی صورتِ حال 1890ء کے لگ بھگ کانگو کے شہر کنشاسا میں ہوئی تھی جہاں بادشاہ کے ایجنٹوں نے ایسا انتظامی نظام قائم کیا جو مقامی علاقے کے ہاتھی دانت کی دولت لوٹتا تھا۔☆[26]

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے شکر جیسی زرعی صنعتوں میں بھی سرمایہ کاری کی۔ 1984ء میں فاؤنڈیشن نے سندھ میں بدین کے قریب شوگر مل قائم کی۔ لاہور میں چاول اور تیل کے کارخانوں کے علاوہ ایک جننگ مل یعنی مشین سے روئی کے بنولے نکالنے کا کارخانہ بھی لگایا۔ لاہور ہی میں مچھلیوں کا ایک فارم اور سائیکلیں بنانے کا پلانٹ بھی لگایا۔ جب کہ راول پنڈی

میں ہوزری یعنی بنیانوں وغیرہ کا کارخانہ بھی لگایا گیا۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے پہلے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل رضوی کے مطابق ان منصوبوں میں سرمایہ کاری کے لیے سرکاری بینکوں سے قرض لیا گیا[☆27] تاکہ ایسی صنعتوں سے منافع کمایا جاسکے جن کی طلب زیادہ ہو۔[☆28] یہ تمام منصوبے بالآخر بند کرنے پڑے کیوں کہ یہ منافع نہ دے سکے۔ اس کی وجہ مصنوعات کی کم طلب نہیں تھی بلکہ نااہل انتظام تھا۔ (ملاحظہ ہو باب 9، بابت آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی اہلیت)

صنعتی منصوبوں کے علاوہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے زمینیں حاصل کرکے سندھ اور پنجاب میں پانچ فارم قائم کیے جن کا کل رقبہ کوئی اٹھارہ ہزار ایکڑ تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر کے مطابق آرمی کی ویلفیئر فاؤنڈیشن کو ''دشمن کی زمین'' بھی دی گئی جس پر 1965ء کی جنگ میں قبضہ کیا گیا تھا۔[☆29]

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگرچہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ 1971ء میں قائم کیا گیا مگر اس نے اصل کام 1977ء میں شروع کیا۔ 1980ء کے عشرے کے اوائل میں کئی حاضر ملازمت افسر اس میں تعینات کیے گئے۔[☆30] ویلفیئر فاؤنڈیشن دراصل افسروں کو ملازمتوں کے مزید مواقع فراہم کررہی تھیں مثلاً 1984ء میں میجر جنرل رضوی کو دیگر افسروں کے ساتھ دس سال کے لیے آرمی ویلفیئر ٹرسٹ میں تعینات کیا گیا۔[☆31] یہ وہ افسر تھے جو ترقی پانے کے اہل نہیں تھے، اس لیے یہ ملازمتیں انھیں نہ صرف آمدنی کے ذرائع فراہم کرتی تھیں بلکہ فوج سے ان کے رابطے بھی بحال رکھتی تھیں۔

رضوی جیسے دیگر افسر بھی کاروبار چلانے کی تربیت نہیں رکھتے تھے مگر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد امجد کا دعویٰ تھا کہ ''اگر فوج ملک چلاسکتی ہے تو کاروبار کیوں نہیں چلاسکتی؟ آخر ہمیں انتظامی امور کی تربیت تو ملتی ہی ہے۔''[☆32] دیگر اعلیٰ افسر بھی یہی سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں اعلیٰ افسر اپنی فوجی ملازمت کے دوران افراد اور ساز و سامان کے انتظام کا وسیع تجربہ حاصل کرلیتے ہیں اور اسی لیے وہ تجارتی منصوبے بھی چلا سکتے ہیں۔ پہلے ریلوے کے اور پھر تعلیم کے وفاقی وزیر بننے والے لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی کا کہنا تھا: ''مجھے ایک بھی ایسا کاروبار دکھا دو جو حاضر ملازمت یا ریٹائرڈ فوجی کے زیرِ انتظام ناکام ہوا ہو۔ یاد رکھیے کہ

ریلوے ایک جنرل کے دور میں ہی خسارے سے نکل سکی ہے۔''[33] جنرل کا اشارہ خود اپنی طرف تھا مگر وہ یہ بتانا بھول گئے کہ خسارے سے نکلنے کی اصل وجہ ریلوے کی زمینوں کی فروخت تھی جس سے سرمایہ حاصل کر کے خسارہ کم کیا گیا۔[34]

جنرل ضیا کے دور میں ریٹائرڈ فوجی افسروں کی تقرری نظام کا حصہ بنتی گئی۔ پہلے تو افسروں کو اپنی ملازمتوں کے آخری دور میں نئی ملازمتیں دی جاتی تھیں لیکن اب ان فاؤنڈیشنوں میں انھیں ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد لگایا جانے لگا۔

شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن نے بھی برّی فوج کی دو فاؤنڈیشنوں کا راستہ اپنایا۔ شاہین فاؤنڈیشن نے 1977ء میں ایک اشتہاری ادارہ بھی قائم کیا۔ 1981ء میں ایک نٹ ویئر فیکٹری لگائی اور 1982ء میں ایک ایئرپورٹ سروس کمپنی قائم کی۔ نٹ ویئر کا کاروبار اس لیے شروع کیا گیا کہ پاک فضائیہ کی ہوزری کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ فضائیہ کے بجٹ میں ہوزری کا ٹھیک ٹھاک حصہ تھا۔ اس طرح سبک دوش ہونے والے اعلیٰ افسروں کو کھپانے کے لیے شاہین فاؤنڈیشن نے یہ صنعتی یونٹ لگایا جو بنیادی طور پر فضائیہ کے وسائل ہی کو ''ری سائیکل'' کرتا تھا۔ اس کاروبار کے مستقبل کا کوئی جائزہ نہیں لیا گیا اور نہ ہی یہ سوچا گیا کہ جب فضائیہ کی ہوزری کا بجٹ ختم ہو جائے گا تو اس یونٹ کا کیا ہوگا۔ مقامی استعمال کے لیے نٹ ویئر کی پیداوار جلد ہی روک دی گئی اور برآمدات شروع کر دی گئیں مگر کہا جاتا ہے کہ اس کے بھی کوئی متاثر کن نتائج نہ نکل سکے۔

اسی طرح شاہین ایئر ٹریڈرز کو 1988ء میں قائم کیا گیا تا کہ فضائیہ کو مطلوب ہارڈ ویئر اور دیگر ساز و سامان فراہم کیا جائے۔[35] اگرچہ 1990ء کے عشرے کے دوران میں کمپنی کی مالیاتی تفصیل معلوم نہیں۔ تاہم شاہین فاؤنڈیشن کا دعویٰ ہے کہ سن دو ہزار میں کوئی چالیس سے پچاس ملین روپے کا کاروبار ہوا۔[36] اس کاروبار کا مقصد بھی فضائیہ کو فاضل پرزہ جات کی فراہمی تھا۔ 1990ء میں ہتھیاروں پر پابندی لگنے سے یہ کاروبار خوب چمکا کیوں کہ اب فضائیہ کو اپنے امریکی ساختہ ایف سولہ طیاروں کے لیے فاضل پرزوں اور ہتھیاروں کی کھلی منڈی سے خریداری کرنی پڑ رہی تھی۔ خود اپنی کمپنی بنا لینے سے اس کام میں نجی ٹھیکے داروں کی

شمولیت کم ہوگئی۔

شاہین ایئرپورٹ سروسز جیسے دیگر منصوبے بھی فضائیہ کے اثر و رسوخ سے فائدے اٹھاتے رہے۔ یہ کمپنی ملک کے اہم بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر گراؤنڈ ہینڈلنگ کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس ادارے نے فضائیہ کے افرادی وسائل بھی استعمال کیے اور چونکہ ملکی ایئر لائنوں سے متعلق کاروبار وزارتِ دفاع کے تحت آتے ہیں جو فوجی افسر چلاتے ہیں، اس لیے پی آئی اے کو بھی یہی کمپنی بڑی تعداد میں پائلٹ فراہم کرنے لگی۔

اسی اثنا میں بحریہ فاؤنڈیشن نے 1982ء میں فلاح ٹریڈنگ کمپنی قائم کی۔ یہ کمپنی سرکاری دفاتر اور خاص طور پر نیوی سے تعلق رکھنے والی ایجنسیوں مثلاً میری ٹائم سیکورٹی ایجنسی، کراچی پورٹ ٹرسٹ اور ڈائریکٹر جنرل ڈیفنس پروکیورمنٹ کو اسٹیشنری اور دیگر دفتری سامان فراہم کرتی ہے۔ ان سب کے پس منظر میں یہی خیال تھا کہ ایسی کمپنیاں قائم کی جائیں جو وزارتِ دفاع کے زیرِ اختیار آنے والے محکموں کی ضروریات پوری کرسکیں، مثلاً بحریہ فاؤنڈیشن کی ٹریڈنگ کمپنی نے کے پی ٹی کے ساتھ صرف سنہ دو ہزار دو اور تین کے مالی سال میں ساٹھ ملین روپے کا کاروبار کیا۔☆37

فوج کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور اداراتی طاقت سے نیم فوجی دستے بھی مضبوط ہوئے جو خودکو بھی مسلح افواج ہی کا حصہ سمجھنے لگے تھے۔ پاکستان رینجرز کو جو ایک سرحدی محافظ ادارہ ہے، تینوں مسلح افواج کی طرح وزارتِ دفاع ہی چلاتی ہے۔ 1977ء میں رینجرز نے سندھ کی چار جھیلوں میں ماہی گیری کے وسائل پر قبضہ کرلیا۔ اس سے علاقے کے قریب ماہی گیر بستیوں کے رہنے والوں کے مفادات متاثر ہوئے۔☆38 اس سلسلے میں سرحدوں کی حفاظت کو بہانہ بنا کر وسائل کا استحصال کیا گیا۔ رینجرز نے جس کی سربراہی ایک آرمی میجر جنرل کرتا ہے، ان جھیلوں میں ماہی گیری کے حقوق نجی ٹھیکے داروں کو لیز کردیے اور مقامی ماہی گیر بستیوں کے رہنے والے اپنے روزگار سے محروم کردیے گئے۔ چونکہ رینجرز کی ماہی گیری کے لائسنس پر اجارہ داری تھی، اس لیے ہاتھ آنے والی مچھلیاں پہلے کی نسبت سستی بیچی جانے لگیں اور مقامی بستیوں کے رہنے والوں کو اپنے حقوق سے محروم کردیا گیا۔ حالانکہ اس سے صوبائی حکومت کے

فشریز آرڈیننس مجریہ 1980ء کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔[39]

اس کے بعد رینجرز نے صوبے کی مزید بیس جھیلوں پر بھی قبضہ کرلیا اور اس سے بھی رینجرز اور ماہی گیر برادریوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ سندھ اور بلوچستان کے کوئی اٹھارہ ہزار کلومیٹر ساحلی علاقے میں آباد درجنوں دیہات اور ہزاروں چھوٹی بستیاں رینجرز کے اس قبضے سے متاثر ہوئیں اور ہزار ہا ماہی گیر اپنے روزگار سے محروم ہوئے۔[40] اس کے بعد 1990ء اور 2000ء کے عشروں میں سندھ میں رینجرز کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی کاروباری سرگرمیوں میں بھی توسیع ہوئی۔ 2005ء تک سندھ میں کوئی گیارہ ہزار رینجرز تعینات کیے جا چکے تھے۔[41] اس پر صوبائی حکومت بالکل خاموش رہی کیوں کہ وہ فوج کے سامنے بے بس تھی۔ حتیٰ کہ وفاقی حکومت بھی ماہی گیروں کی بجائے رینجرز کی حمایت کرتی رہی اور قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کو بھی اس مسئلے پر بولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔[42]

جنرل ضیاء الحق کا دور اس لیے بھی یاد رکھا جائے گا کہ اس میں افسروں کو انفرادی حیثیت میں بڑی بڑی رعایتیں اور مراعات دی گئیں۔ ایوب خان کی حکومت میں فوجیوں کو ادارے کی سطح پر فائدے ملتے تھے لیکن جنرل ضیا اپنے افسروں کو انفرادی طور پر فائدے پہنچانے میں مصروف رہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ایوب خان کی حکومت سے تو فوجی اقتدار کی ابتدا ہوئی تھی اور ابھی جنرلوں نے فوج کو ایک الگ طبقے کے طور پر مستحکم نہیں کیا تھا۔ سیاسی طور پر دیکھا جائے تو جنرل ضیا نے 1973ء کے آئین میں دفعہ 58 (2) (ب) جیسی ترمیمیں داخل کر کے فوجی طاقت کو مستحکم کرلیا تھا۔ اسی طرح جنرل ضیا نے اپنے حلقۂ انتخاب یعنی فوج کے درمیانی درجے کے افسروں کو بھی فائدے پہنچائے۔

فوجی افسروں کو دی جانے والی مراعات کے باضابطہ صورت اختیار کرنے سے فوج کی معاشی سلطنت عمودی طور پر بھی پھیلتی گئی۔ اس کی ایک مثال فوجی افسروں کے لیے گھروں کی فراہمی ہے۔ جنرل ضیا کے دور میں ایک منصوبے کے تحت تینوں افواج نے اپنے افسروں کو ریٹائرمنٹ کے بعد گھروں کی فراہمی اپنے ذمے لے لی۔ افسروں کی تنخواہوں سے معمولی کٹوتی کر کے انھیں ریٹائرمنٹ کے بعد گھر یا اپارٹمنٹ دینے کی ضمانت دی گئی۔ یہ کٹوتی محض

دوسو روپے سے ہزار روپے مہینہ تک تھی۔[43]

برّی فوج میں افسر دس سال کی ملازمت کے بعد اس اسکیم میں شامل ہو سکتے تھے۔ جب کہ کٹوتی ان کی ملازمت کے بقیہ عرصے میں ہوتی۔ بعد میں مشرف کے دور میں یہ سہولت تمام افسروں کے لیے لازمی کر دی گئی۔

یہ سہولت اسی امید پر فراہم کی گئی تھی کہ اب افسر اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دیں گے۔ یہ اعلیٰ انتظامیہ اور افسروں کے درمیان ایک طرح کا ''سماجی معاہدہ'' تھا۔ چونکہ فوجیوں اور خاص طور سے برّی فوج کے لوگوں کے اکثر تبادلے ہوتے رہتے تھے، اس لیے گھر کی فراہمی سے انھیں ذہنی سکون فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس سہولت سے افسروں کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں بہتر ہوئیں یا نہیں لیکن افسروں کو تحفظ فراہم کرنے کے عوض قوم پر جو ''کرایہ'' واجب تھا، یہ گویا اس کی نئی تعریف تھی۔

کرنل بختیار خان کے مطابق دل چسپ بات یہ ہے کہ اس ''سماجی معاہدے'' سے اعلیٰ افسروں کو زیادہ فائدہ ہوا نہ کہ جونیئر کمیشنڈ افسروں اور نچلے عہدوں کے لوگوں کو اور یہی کیفیت فضائیہ اور بحریہ میں ان کے مساوی عہدے داروں کے ہاں رہی۔[44] ریاستی زمینوں پر قائم کیے جانے والے ستائیس رہائشی منصوبوں میں سے سب کے سب افسروں کے لیے تھے اور عام فوجیوں کے لیے ایک بھی رہائشی منصوبہ نہیں تھا۔ بریگیڈیئر علی ترمذی کے مطابق یہ رہائشی منصوبے اور افسروں کو شہری زمینوں کی فراہمی کا سلسلہ شروع کر کے جنرل ضیا نے بے شمار افسروں کو فائدے پہنچائے جس سے افواج کی بدعنوانیوں میں اضافہ ہوا۔[45] اس کتاب کے تعارفی باب میں، میں نے یہ بتایا ہے کہ اعلیٰ افسروں کی طرف سے فائدے حاصل کرنا فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا طرۂ امتیاز ہے جو پاکستانی فوج کے افسروں کی اشرافیہ والی ذہنیت کو راس بھی آتا ہے۔ اس میں اور پاکستانی اشرافیہ کی پالیسیوں اور سماجی معاشی ذہنیت میں بہت کچھ مشترک ہے۔

پاکستان کے ایک انگریزی اخبار ''دی نیشن'' کے ایک اداریے میں دعویٰ کیا گیا کہ ضیا حکومت کے دوران اعلیٰ افسروں نے ایسے وسائل بھی حاصل کیے جن کی وضاحت ممکن نہیں

تھی، اور جن کے بارے میں افواہ یہ تھی کہ وہ افغان جنگ کے دوران ہیروئن اسمگل کرکے حاصل کیے گئے تھے۔[46☆] اگرچہ ''دی نیشن'' کے اداریے میں ''افواہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلح افواج کے افسران ضیا دور میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ خوش حال تھے۔

ریاستی زمین پر رہائشی منصوبے بنانے سے فوج کے ذیلی اداروں کی حوصلہ افزائی ہوئی کہ وہ بھی جائیدادوں کی خرید وفروخت میں ملوث ہو جائیں۔ یہ بحریہ فاؤنڈیشن کی جانب ایک اشارہ ہے جس نے 1986ء میں اپنا رہائشی منصوبہ شروع کیا جو اپنی نوعیت کا کوئی پہلا منصوبہ نہیں تھا۔ بری فوج پہلے ہی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی قائم کر چکی تھی۔ اب بحریہ فاؤنڈیشن کے منصوبے سے یہ واضح ہو گیا کہ فوج کے رفاہی ادارے بھی اسی کام میں لگ جائیں گے۔ بنیادی تصور تو بہت سادہ تھا اور صرف مسلح افواج تک محدود نہیں تھا بلکہ فوج کے علاوہ سول سروس اور عدلیہ بھی زمینوں کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ طریقہ یہی تھا کہ سستی زمینیں حاصل کرو اور پھر اُن پر منافع کماؤ۔ فوج سب سے زیادہ منافع حاصل کرنے والا ادارہ تھا جس کی وجہ اس اسکیم میں رقم لگانے والوں کا اعتماد تھا۔ فوجیوں کو جو فوائد دیے گئے، ان میں زرعی اراضی بھی شامل تھیں جو فوج کی تینوں شاخوں کے افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کی گئیں۔ بہر حال معمولی سپاہیوں کو کم زمینیں ملیں اور انھیں اعانتیں (سبسیڈیز) بھی نہیں ملیں جو سینئر افسروں کو دی گئیں (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو باب 7)۔

اعلیٰ افسروں کو دی جانے والی دیگر مراعات میں یہ سہولت بھی شامل تھی کہ وہ بیش قیمت گاڑیاں کسٹم ڈیوٹی کے بغیر درآمد کر سکتے تھے۔ 1977ء سے 1997ء کے درمیان کوئی تینتالیس اعلیٰ افسروں نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا۔ ان افسروں میں ستائیس برّی فوج کے، دس بحریہ کے اور چھ فضائیہ کے افسران شامل تھے جو سب کے سب بریگیڈیئر سے اوپر کے عہدوں پر فائز تھے۔[47☆] ان کے علاوہ ایک سو پندرہ فوجی افسروں کو سرکاری شعبوں میں کنٹریکٹ پر دوبارہ ملازم رکھا گیا۔ ان میں اٹھارہ سفیر تھے (یاد رہے کہ پاکستان کے بیرونِ ملک کُل سفیروں کی تعداد صرف بیالیس تھی)۔[48☆] مفادات کا یہ بٹوارا عموماً افسروں تک محدود تھا۔ فوج کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کے ساتھ مسلح افواج کے اعلیٰ افسروں کی معاشی ہوس گیری

میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ انھوں نے خود اپنے واسطے زیادہ منافع حاصل کرنے کی غرض سے سیاسی منظر کو استعمال کیا اور یہ رجحان وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ یہ تمام مراعات اور سہولتیں ایک طرح سے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا ہی حصہ ہیں اور فوج کی مالیاتی خودمختاری کو ظاہر کرتی ہیں۔

اس رجحان کا ایک پہلو یہ ہے کہ جنرل ضیا کی معیشت آزاد کرنے کی پالیسی کا فوجی برادری نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ جب نجکاری کے ذریعے نجی شعبے کو مہمیز ملی تو فوج کی کاروباری سرگرمیاں بھی بڑھنے لگیں۔ ایسی ہی صورتِ حال 1960ء کے عشرے میں ترکی میں تھی جب ترک مسلح افواج نے وزیراعظم سلیمان دیمیریل کی ان پالیسیوں سے فائدہ اٹھایا جو وہ سرکاری شعبے کا کردار کم کرنے اور نجی شعبے کا کردار بڑھانے کے لیے کر رہے تھے۔ 1961ء میں ترکی کی مسلح افواج نے آرمڈ فورسز میوچول اسسٹینس فنڈ (Mutual Assistance Fund) قائم کیا جسے عام طور سے ''اویاک'' (OYAK) کہتے ہیں۔ اس کے تحت فوجیوں اور وزارتِ دفاع کے سویلین ملازمین کی تنخواہوں سے دس فی صد کٹوتی کر کے منافع بخش سرگرمیوں میں سرمایہ کاری کی گئی۔ ☆[49] اگر ایک طرف ترکی میں سویلین حکومت نے اپنے اور فوج کے درمیان معاشی انضمام کی ابتدا کی تو دوسری طرف پاکستانی فوج نے یہ کام کیا کہ اس نے سویلین نجی حلقے کو مواقع فراہم کیے اور اس انضمام کے عمل میں خود اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔

سویلین اور فوجی سیاسی و معاشی انضمام (1988-1999ء)

اگست 1988ء میں ضیا کی موت کے بعد پاکستان میں جمہوریت بحال کردی گئی۔ تاہم بعد کے برسوں میں بھی فوج کے معاشی مفادات کم نہیں ہوئے بلکہ سویلین حکومتوں نے فوج سے تعلقات استوار رکھنے کے لیے جو کوششیں کیں، اُن سے فوج کا تجارتی جال مزید پھیلا۔ ضیا حکومت نے جب ایک منتخب وزیراعظم (بھٹو) کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو اس سے نہ صرف فوج کی زبردست طاقت کا مظاہرہ ہوا بلکہ سیاست دانوں کو یہ دھمکی بھی ملی کہ وہ فوج سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کریں۔ بے نظیر بھٹو کی دو حکومتوں (یعنی 1988ء سے 1990ء تک۔ اور 1993ء سے 1996ء تک) اور نواز شریف کی دو حکومتوں (یعنی 1990ء سے 1993ء

تک اور 1997ء سے 1999ء تک) نے فوجی جنرلوں کو معاشی فوائد پہنچا کر انھیں ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ نواز شریف کے وزیرِ خزانہ سرتاج عزیز کے مطابق ان کی حکومتوں کے لیے سب سے مشکل کام فوج کی سیاسی قوت کو کم کرنا تھا۔ ان کے بقول، اگر ہم نے ان کے مالی مفادات میں کوئی رکاوٹ ڈالی ہوتی تو مسلح افواج کی طرف سے اس کا فوری ردِعمل آجاتا۔☆50 فوج کو ملنے والی مراعات اور فوائد فوجی مفادات کا ایک اہم حصہ سمجھے جاتے تھے اور انھیں چیلنج کرنا دراصل جنرلوں کی غیرت کو للکارنے کے مترادف تھا۔☆51

اکثر حکومتوں نے فوج کو معاشی فائدے پہنچا کر اپنا عرصۂ اقتدار بڑھانے کی کوشش کی۔ قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر الٰہی بخش سومرو کے مطابق فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو کوئی بھی حکومت چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ سومرو نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے صدر اسحاق خان کی توجہ فوج کی پھیلتی ہوئی معاشی سلطنت کی طرف دلائی تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک شہد کا چھتا ہے جسے چھیڑنا نہیں چاہیے۔ فوج ایک بہت مضبوط ایجنسی ہے اور ہم (سیاست دانوں) نے اگر اس مسئلے پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو ہم اس میں پھنس کر رہ جائیں گے۔☆52 اگرچہ بے نظیر کہتی تھیں کہ انھوں نے کبھی اس مسئلے کو نظرانداز نہیں کیا۔☆53 پھر بھی اس موضوع پر دو گھنٹے کے انٹرویو میں انھوں نے اس سوال کا جواب گول کر دیا کہ آیا انھوں نے جنرلوں کو معاشی فائدے پہنچا کر خوش رکھنے کی کوشش کی تھی یا نہیں۔ بہرحال ان کی پارٹی کے ایک ممتاز رہنما اور 2002ء میں منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے ایک رکن شاہ محمود قریشی نے اعتراف کیا کہ ''تمام سویلین حکومتوں نے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو نظرانداز کیا یا فوج کو خوش رکھنے کے لیے معاشی مواقع فراہم کیے۔☆54

یہ ایک حقیقت ہے کہ 1988ء میں سویلین قیادت کو اقتدار منتقل ہونے کے باوجود فوج سیاست میں ایک بھاری بھرکم فریق کے طور پر موجود رہی اور کوئی حکومت فوج کو للکارنے کی جرأت نہ کر سکی۔ 1988ء میں آنے والی سیاسی تبدیلی بڑی سطحی سی تھی۔ نومبر 1988ء میں بے نظیر کو اقتدار اس لیے دیا گیا کہ فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ کے مطابق وہ خود جمہوریت کے بڑے حامی تھے۔ اسلم بیگ کا کہنا ہے کہ انھوں نے اقتدار پر قبضہ نہ کر کے اور سویلین حکومت کو

اقتدار میں لاکر ملک وقوم کی بڑی خدمت کی۔ اسلم بیگ خود کو جنرل ضیا سے خاصا مختلف سمجھتے ہیں کہ انھوں نے فوج کے اقتدار کو طول نہیں دیا۔☆55

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ 1988ء میں جنرل ضیا کی موت کے فوراً بعد جنرل اسلم بیگ اقتدار پر قبضہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کی تین وجوہ تھیں۔ پہلی تو یہ کہ 1988ء تک بین الاقوامی ماحول اتنا بدل چکا تھا کہ پاکستان میں فوجی حکومت قائم رکھنا بہت مشکل تھا۔ دوسری یہ کہ ملکی سیاسی حالات بھی فوج کے موافق نہیں تھے۔ اور تیسری وجہ بحریہ کے سابق سربراہ فصیح بخاری نے یوں بیان کی کہ ''جنرل بیگ فوج کے سربراہ ہونے کے باوجود فوج پر مکمل کنٹرول نہیں رکھتے تھے۔''☆56 اس بات سے فصیح بخاری کا مطلب یہ تھا کہ ایک فوجی سربراہ کو اتنا اعتماد ہو کہ اگر اسے بغاوت کرنی پڑ جائے تو پوری فوج اس کا ساتھ دے گی۔ جنرل بیگ کا جمہوریت پسندی کا دعویٰ اس لیے بھی قائل نہیں کرتا کہ وہ خود بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت کو گرانے میں ملوث تھے۔ بہرحال ایک غیر مستحکم جمہوریت فوج کو جنرل ضیا سے ورثے میں ملی تھی اور پھر آٹھویں ترمیم نے تو صدر کو پارلیمنٹ توڑنے کا اختیار بھی دے دیا تھا۔ اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے 1990ء کے عشرے میں بار بار حکومتیں برطرف کی گئیں۔ ان حکومتوں کی اوسط مدت صرف دو سال تھی جس میں وہ خود کو بچانے کے لیے فوج کو خوش کرنے میں لگی رہتی تھیں۔

اس کے علاوہ نجی شعبے نے بھی فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو نہیں للکارا۔ جس کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی تو یہ کہ کاروباری منتظم ملک کی سیاسی معیشت کے عادی تھے جو نیم استبدادی تھی اور جہاں فائدہ حاصل کرنے کے لیے مسلح افواج سمیت طاقت ور گروہوں کو ساتھ لے کر چلنا ضروری تھا۔ نجی شعبہ بھی فوج کے ساتھ مل کر فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ درحقیقت فوج نے سویلین رہنماؤں کے ساتھ مل کر سرمایہ داری کے ان مسائل کو انگیخت کیا جن میں نجی حلقہ ان لوگوں کے ساتھ اپنی وفاداری کے نتیجے میں فائدہ اٹھاتا ہے جو قومی وسائل پر اپنا کنٹرول رکھتے ہیں۔ معاشی ترقی ایک آزاد معیشت کی منڈی کے ذریعے نہیں بلکہ چند افراد کے ہاتھوں میں دولت اور مواقع کے ارتکاز کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادی اثاثوں کا اعلان نہیں کیا جاتا۔

سنہ دو ہزار میں چھپنے والی ایک رپورٹ میں روزنامہ ''دی نیشن'' نے لکھا کہ پاکستان کی غیرقانونی اور خفیہ معیشت کا حجم قانونی معیشت کے مقابلے میں تین گنا ہے۔ اگر غیرقانونی معیشت کے کالے دھن کو شامل کیا جائے تو فی کس آمدنی چار سو امریکی ڈالر سے بڑھ کر سترہ سو امریکی ڈالر ہو جائے گی (یعنی تقریباً اٹھائیس ہزار روپے سے بڑھ کر تقریباً ایک لاکھ روپے تک پہنچ جائے گی)۔☆[57] سابق وزیرِ داخلہ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر نے بھی یہ بات تسلیم کی اور کہا کہ اسمگلنگ کے نتیجے میں ہر سال ملک کو تقریباً سو ارب روپے کا نقصان ہوتا ہے۔☆[58] غیرقانونی معیشت بھی اسی معاشی نظام کا ایک حصہ ہے جو مخصوص لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ فوج بدعنوانی ختم کرنے کے دعوے تو کرتی ہے مگر خود سیاست دانوں اور سول سوسائٹی کے خاص گروہوں سے مل کر اس میں شامل ہو جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ نجی شعبہ منافع بخش مواقع کے لیے حکومت پر انحصار کرتا ہے جو ملک میں اقتدار کے کسی سرچشمے پر اعتراض نہیں کرنے دیتی۔ چونکہ فوج ملک کے سیاسی عناصر میں طاقت ورترین حیثیت رکھتی ہے، اس لیے نجی شعبہ بھی اس کے مفادات کو نہیں للکارتا۔ اس نیم مطلق العنان ماحول میں نجی شعبہ اپنی بقا کے لیے میکیاویلی کے طریقے استعمال کرتے ہوئے صاحبِ اقتدار طبقوں سے تعاون ضروری سمجھتا ہے اور قواعد وضوابط سے انحراف کرتا رہتا ہے۔

کریسنٹ گروپ آف انڈسٹریز کے ڈائریکٹر طارق شفیع کے مطابق فوج نجی شعبے کو بے ایمان سمجھتی ہے☆[59] مگر خود منصفانہ نظام کے قیام کے لیے کچھ نہیں کرتی۔ اسی طرح ایک اور مشہور کاروباری شخصیت ''رزّاق ٹبّا'' کا کہنا ہے کہ فوجی فرٹیلائزر کے کارخانوں کو قدرتی گیس رعایتی نرخوں پر ملتی ہے جب کہ یہ سہولت نجی شعبے کو میسر نہیں۔ انھوں نے مزید یہ کہا کہ فوجی فاؤنڈیشنوں کو حکومت سے زیادہ مدد ملتی ہے جس کی وجہ سے وہ نجی طبقوں سے زیادہ تیز کام کر سکتے ہیں۔☆[60] یہ بات کسی ستم زدہ بیوپاری نے نہیں کہی بلکہ اس حقیقت کے شواہد موجود ہیں، مثلاً حکومت نے سنہ دو ہزار چار، پانچ اور چھ میں ہر سال ایک سے ڈیڑھ ارب روپے تک کا زرِتلافی فوجی فاؤنڈیشن کو دیا۔☆[61] اس طرح کی مدد کسی نجی شعبے کے کاروبار کو نہیں دی گئی۔

ان سہولتوں کے نتیجے میں 1988ء سے 1999ء کے دوران فوج کی کاروباری

سرگرمیوں میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ عمودی سے زیادہ افقی طور پر ہوا کیوں کہ مجموعی طور پر پہلے ہی خاصی توسیع ہو چکی تھی۔ اب مسلح افواج کے ارکان کو نئے رہائشی منصوبوں میں جگہیں ملنے لگیں اور ان کا دائرہ درمیانی حجم کے شہروں، جیسے پنجاب میں جہلم وغیرہ تک پھیلا دیا گیا۔ سویلین حکومتوں نے بھی فوج کے سرکاری اداروں مثلاً این ایل سی اور ایف ڈبلیو او کو کاروباری مواقع فراہم کیے۔ نواز شریف کی حکومت نے بھی سڑکیں بنانے کے بڑے بڑے ٹھیکے ان فوجی کمپنیوں کو دیے۔ نواز شریف کے وزیرِ تجارت اسحاق ڈار کے مطابق یہ ٹھیکے اس لیے دیے گئے کہ فوجی کمپنیوں کی بے کار پڑی صلاحیتوں کو کام میں لایا جائے۔☆62 دوسرے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ شہباز شریف اُن اداروں کی بہتر صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے صوبے اور صوبائی دارالحکومت میں سڑکیں بہتر بنانا چاہتے تھے۔☆63 ہائی وے کا محکمہ بدعنوانی کے لیے بدنام تھا اور شہباز شریف اپنے ترقیاتی منصوبوں کے وسائل ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ شریف خاندان کی حکومت نے سویلین اداروں کو بہتر بنانے کے بجائے فوجی کمپنیوں کو مضبوط کیا، مثلاً 1999ء میں این ایل سی کو جی ٹی روڈ پر حقِ راہداری (ٹول ٹیکس) وصول کرنے کا ٹھیکا دیا گیا کیوں کہ بجٹ میں سرکاری تخفیف کے باعث اس کی آمدنی کم ہو رہی تھی۔ 1999ء سے 2000ء کے مالی سال میں اسے کوئی چار ارب روپے کا خسارہ ہو رہا تھا اور اسے اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے یہ ٹھیکا دیا گیا۔☆64 ایف ڈبلیو او کو بھی جو این ایل سی ہی جیسا ادارہ تھا، سکھر (صوبہ سندھ) سے لاہور (صوبہ پنجاب) تک کی شاہراہوں کا انتظام سونپ دیا گیا اور ایف ڈبلیو او کو اختیار دیا گیا کہ وہ ان شاہراہوں پر اشتہاری بورڈ لگانے والی نجی کمپنیوں سے پیسے وصول کریں۔☆65

ان تمام حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت خود ان دونوں کمپنیوں کو مواقع دے رہی تھی کہ وہ سڑکوں پر تعمیر اور نقل و حمل پر اجارہ داری قائم کرلیں۔ ایڈمرل فصیح بخاری کا کہنا تھا کہ اس نے بڑے بڑے تعمیراتی نجی ادارے جیسے مکڈونلڈ لیٹن کوسٹین اور گیمنز وغیرہ کو تباہ کر دیا۔☆66 اور پھر اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ سویلین حکومتوں نے بھی فوج کے زیرِ انتظام کمپنیوں کو نجی

شعبے کے مقابلے میں مضبوط کیا۔ شاید اسی لیے پاکستانی تجزیہ نگار حسن عسکری رضوی کا کہنا ہے کہ ''پاکستان میں فوج ہی ریاست ہے۔''☆67

این ایل سی اور ایف ڈبلیو او کی جانب شہباز شریف کا رویہ سویلین حکومتوں کی حالتِ پسپائی کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ فوج کو ایک ایسے متبادل ادارے کے طور پر دیکھ رہے تھے جو ترقیاتی پروگراموں کو چلانے میں زیادہ مستعد ہے۔ ترقیاتی کاموں کی ذمے داری سویلین سے فوجی اداروں کو اس امید پر منتقل کی گئی کہ وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے۔ اور زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ سویلین قیادت نے فوجی کاروبار پر فوجی کاروباریوں کے عمل کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جس کی وجہ پی پی کے ایک اعلیٰ رہنما نثار کھوڑو کے مطابق یہ ہے کہ فوجی کمپنیاں بھی شعبے سے کھلا مقابلہ کر کے ٹھیکے حاصل کرتی ہیں۔☆68 تاہم معلوم نہیں کہ نثار کھوڑو واقعی ایسا سمجھتے ہیں یا صرف بے نظیر بھٹو کے شاہین فاؤنڈیشن کے ساتھ ملوث ہونے کے باعث ایسا کہتے ہیں۔ بے نظیر پر الزام تھا کہ وہ شاہین فاؤنڈیشن کے ریڈیو اور ٹی وی چینلوں میں ملوث رہی ہیں۔☆69

فوج کی کاروباری سرگرمیوں میں سب سے زیادہ توسیع ذیلی اداروں کی سطح پر ہوئی جو نت نئے کاروبار شروع کرتے رہے مثلاً بینکاری، مالیات اور بیمہ، جائیداد کی خرید و فروخت، ٹریولنگ، آئی ٹی، توانائی اور تعلیم کے شعبے۔ ایسے منصوبے شروع کیے گئے جن سے افسروں کو بھی فائدے ہوں اور اداروں کو بھی۔ کاروباری سرگرمیوں میں توسیع کی ایک وجہ یہ تھی کہ سبک دوش ہونے والے افسر مزید ملازمتیں کرنے کے خواہاں تھے جن کے باعث ضیا حکومت نے نئی نئی مراعات اور سہولتیں فراہم کیں اور نت نئے کاروباری اور تجارتی منصوبے شروع کیے جانے لگے۔

اب فوجی کمانڈر تجارتی منصوبے منتخب کرنے میں زیادہ خودمختاری کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ اعلیٰ افسروں کو یہ مواقع دیے جانے لگے کہ وہ ایسے منصوبے شروع کریں جہاں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد تین سے پانچ سال تک کام کرسکیں۔ فلاحی اور ان سے متعلق کاروباری اداروں میں ان تقرریوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ افسروں کو سول زندگی شروع کرنے کے

لیے تیار کیا جائے۔ ان اداروں کی ملازمتیں افسروں کے لیے بڑی پُرکشش ہوتی ہیں کیوں کہ یہاں کا ماحول کسی بھی نجی شعبے کی نسبت زیادہ فوجی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جنرلوں کے لیے یہ ادارے بڑے آرام دہ ہوتے ہیں اور ان میں تین چار سال کام کرکے وہ خود کو نجی شعبے یا سویلین انتظامیہ میں کام کرنے کے لیے تیار کرلیتے ہیں۔☆[70] کاروباری منصوبے شروع کرنے سے پہلے ان امور کو ذہن میں رکھا جاتا ہے کہ فوج کے کاروباری ادارے قائم یا ان کی توسیع کی جائے یا نہیں، مثلاً ہیلی کاپٹر چلانے والے نجی شعبے میں کھپ نہیں سکتے تھے، اس لیے فوج نے 1990ء کے عشرے میں عسکری ایوی ایشن قائم کی۔☆[71] یہ کمپنی پانچ چھ ہیلی کاپٹر چلانے والوں کو ملازم رکھ لیتی ہے۔☆[72]

پارلیمنٹ کے ایک رکن ایم پی بھنڈارا کے مطابق فوج معیشت اور ریاست کے تمام شعبوں پر گہری نظر رکھتی ہے اور ان میں چپکے چپکے داخل ہوتی رہتی ہے۔☆[73] ان کے خیال میں اس طرح فوج بھی جاپان کی طرح ایک ''کارپوریٹ ریاست'' بن جاتی ہے۔☆[74] پاکستان میں مسلح افواج خود کو نگران اور سرپرست بنا کر سماج اور معیشت کے تمام شعبوں میں داخل ہوگئیں اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، اس پر سویلین حکومتوں نے نہ تو کوئی مزاحمت کی اور نہ ہی دفاعی اور ترقیاتی اخراجات میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ فوج نے دفاعی اخراجات اور دیگر معاشی مفادات کو ہمیشہ مقدم رکھا اور ان پر اس وقت بھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا، جب وہ براہِ راست اقتدار میں نہیں تھی۔

سویلین حکومت کو ہٹانے کے لیے انٹیلی جنس ایجنسیوں کا بے دریغ استعمال حکومت کو اتنا کمزور رکھتا تھا کہ وہ فوج کی کاروبار میں شمولیت پر کیا اعتراض کرتیں۔ تاہم فوج کی بڑھتی ہوئی مالیاتی خودمختاری کی ایک وجہ سول حکومتوں اور فوج کے درمیان ملی بھگت بھی تھی۔ حکمران جماعتوں کی سیاسی قیادت بھی اسی اشرافیہ میں سے رہی ہے جس نے معیشت آزاد ہونے کے عمل سے فائدہ اٹھایا تھا۔ خاص طور پر نواز شریف خود جنرل ضیا کے فوجی اقتدار کی پیداوار تھے۔ لہٰذا انھوں نے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی مخالفت نہیں کی اور نہ مسلح افواج کی مالیاتی خودمختاری ہی پر کوئی اعتراض کیا۔ ماسوائے اس کے کہ تینوں فاؤنڈیشنوں یعنی آرمی ویلفیئر

ٹرسٹ، شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن پر ٹیکس کی چھوٹ ختم کردی گئی۔

اگر چہ ہر فاؤنڈیشن پر ٹیکس کی شرح مختلف تھی۔☆[75] پھر بھی انھوں نے ٹیکس عائد کیے جانے پر احتجاج نہیں کیا۔ ٹیکس میں چھوٹ سے نواز شریف حکومت نے کامیابی سے گفت وشنید کرکے چھٹکارا پایا۔ تاہم ٹیکس کی یہ چھوٹ افسروں پر انفرادی طور پر لاگو نہیں ہوتی تھی، مثلاً فوجی افسروں کی شہری اور دیہی جائیدادوں پر ٹیکس کی چھوٹ برقرار رہی۔ اب بھی ڈیفنس کے رہائشی علاقوں یا چھاؤنیوں میں رہنے والے صرف سویلین شہریوں کو ہی ٹیکس دینے پڑتے ہیں۔

1999ء میں نواز شریف کی حکومت نے آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی تشکیلِ نو کی بات بھی شروع کی تھی جسے جی ایچ کیو نے نظرانداز کردیا تھا۔☆[76] فوج اتنی کمزور نہیں تھی کہ اپنی معاشی سلطنت کا حجم کم کرنے کے مشورے پر کان دھرتی۔ بہرحال اکتوبر 1999ء میں حکومت کی تبدیلی کے باوجود تشکیلِ نو پر گفت وشنید نہ ہوسکی۔

فوج کی کاروباری سرگرمیاں خصوصاً ذیلی اداروں کی سطح پر تین طرح سے پھیلیں:

- ایسے منصوبے جو مسلح افواج کے وسائل پر چل سکتے تھے۔
- ایسی مصنوعات کے کارخانے جن کی صارفین میں طلب زیادہ ہو اور جو درآمدی اشیا کا متبادل ملک میں تیار کرسکیں۔
- ایسے منصوبے جو افسروں کے لیے منافع بخش ہوں۔

اسی دور میں فوجی افسر فاؤنڈیشنوں میں بیوپاری بن کر نئے کاروبار شروع کرنے لگے جیسے بینکاری، سرمایہ کاری اور بیمہ۔ اس طرح کے اہم منصوبوں میں عسکری کمرشل بینک، عسکری لیزنگ، عسکری جنرل انشورنس، عسکری کمرشل انشورنس اور شاہین انشورنس شامل ہیں۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے بھی 1992ء میں اپنا بینک قائم کرلیا۔ نواز شریف کے وزیرِ خزانہ سرتاج عزیز کے مطابق یہ بینک جنرل مرزا اسلم بیگ کا منصوبہ تھا۔ اسلم بیگ نے وزیرِ خزانہ کے پاس جاکر کہا تھا کہ فوج کو ایک بینک کی ضرورت ہے جہاں فوجی اپنی فلاحی رقوم کی سرمایہ کاری کرسکیں۔ کسی اور جگہ ان رقوم کے ڈوبنے کے امکانات زیادہ ہیں۔☆[77] 1990ء کے

عشرے میں یہ بینک خوب پھلا پھولا اور نجی شعبے کا ایک اہم بینک بن گیا۔ نجی شعبے کے دیگر بینکوں کے مقابلے میں یہ بینک اچھا رہا جس کی ساکھ بھی اچھی تھی اور مجموعی اثاثے اور کھاتے داروں کی تعداد بھی ٹھیک تھی۔

دسمبر 2002ء میں عسکری بینک کے ظاہر کردہ اثاثے تقریباً ستّر ارب روپے تھے اور اس کے تقریباً ڈھائی لاکھ کھاتے دار تھے۔ 2004ء میں اس کے عدم تعمیلی قرضے نجی شعبے کے بینکوں کے مجموعی عدم تعمیلی قرضوں کا تقریباً چار فی صد تھے۔

یہ کارکردگی صرف اچھی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھی۔ عسکری بینک نے بھی اختراعی سرمایہ کاری کی بجائے دیگر تجارتی بینکوں کی طرح اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کی۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی ملکیت لیزنگ اور بیمہ کمپنیاں بھی عسکری بینک سے تعلق کی بدولت اچھے کاروبار کرتی ہیں جب کہ دیگر بینک اتنے اچھے منافع کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ عسکری بینک کی اچھی کارکردگی کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اس کا تعلق فوج سے ہے، اس لیے قرض لینے والے سویلین بھی نادہندگی سے ڈرتے ہیں جب کہ دیگر سرکاری اور نجی شعبے کے بینکوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عسکری بینک فوج کی مالیاتی چھتر چھایا میں ہے اور تیسری یہ کہ اس بینک کے سب سے زیادہ کھاتے دار مسلح افواج ہی سے ہیں۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ فوج نے بینکاری شروع کرنے کا کیوں سوچا؟ پیٹر لاک (Peter Lock) جیسے ماہرین کا خیال ہے کہ افواج بینکاری میں اس لیے آتی ہیں کہ مشتبہ کمائی کو اِدھر سے اُدھر آسانی سے منتقل کیا جا سکے۔ اسی طرح کی حرکتیں لاطینی امریکا میں بھی ہوتی رہی ہیں۔☆78 اگر عسکری بینک کے قیام کے وقت کو دیکھا جائے تو 1990ء کے عشرے میں افواہیں گرم تھیں کہ منشیات اور بدعنوانیوں سے حاصل کردہ بڑی رقوم مالیاتی منڈیوں میں گردش کر رہی ہیں۔ معیشت میں کالا دھن جنرل ضیا کے دور میں بہت پھیلا اور 1990ء کے عشرے میں یہ پھیلاؤ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ ''نیویارک ٹائمز'' کے ایک کالم نگار الیگزینڈر کوکبرن نے اپنی کتاب ''وائٹ آؤٹ'' (White Out) میں لکھا ہے کہ جنرل ضیا کے ایک ساتھی جنرل فضل حق جو صوبہ سرحد کے گورنر تھے، منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث تھے۔ کوکبرن

کے مطابق افغانستان سے آنے والی افیم فضل حق کو بیچی جاتی تھی تاکہ اسے ہیروئن میں تبدیل کیا جاسکے۔☆[79] 1997ء میں ایک اور خبر مشہور ہوئی جس کے مطابق پاک فضائیہ کے ایک افسر کو نیویارک میں ہیروئن اسمگل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ اس خبر کے مطابق اسمگلنگ کے لیے فضائیہ کے ایک ٹرانسپورٹ طیارے کو استعمال کیا گیا تھا۔☆[80] یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسی سرگرمیوں میں ملوث لوگ پاکستان میں کالا دھن لانے اور نکالنے کے لیے اپنے ادارے کے وسائل استعمال کرتے تھے یا نہیں۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ عسکری بینک فوج کی مالیاتی خودمختاری کا مظہر تھا۔ اسی طرح کی صورتِ حال تھائی لینڈ میں بھی نظر آتی ہے جہاں کی فوج بھی ایک بینک چلاتی ہے۔

عسکری بینک نے مالیاتی شعبے میں دیگر کاروباروں کو بھی مدد دی مثلاً شاہین فاؤنڈیشن کے بیمے کے کاروبار کو۔ اس کمپنی کو 1995ء میں جنوبی افریقا کی ایک بیمہ کمپنی ہولارڈ انشورنس لمیٹڈ کے ساتھ پارٹنرشپ میں قائم کیا گیا۔ 1997ء میں ایک معاہدے کے تحت ہولارڈ نے کمپنی کے تیس فی صد حصص حاصل کر لیے۔ تاہم جنوبی افریقا کی کمپنی نتائج سے مایوس ہوئی۔ اس کی انتظامیہ کے خیال میں بدعنوانیوں کے باعث کاروبار متاثر ہو رہا تھا اور مالیاتی بدانتظامی سے ملک میں بیمے کا شعبہ متاثر تھا۔☆[81] دل چسپ بات یہ ہے کہ اس معاہدے میں دلّالی کا کام ایئرفورس کے ایک افسر نے کیا تھا جسے ریٹائرمنٹ کے بعد اس کمپنی میں ملازمت دی گئی۔ جنوبی افریقیوں کے مطابق یہ معاہدہ متعلقہ افسر سے اکیلے میں طے کیا گیا تھا۔☆[82]

ایک اور کاروبار جس سے ریٹائرڈ فوجیوں اور خصوصاً نچلے درجے کے فوجیوں کو فائدہ پہنچا، وہ نجی سیکورٹی کا کاروبار تھا۔ فوجی فاؤنڈیشن، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور بحریہ فاؤنڈیشن، تینوں نے نجی سیکورٹی کمپنیاں قائم کر کے ہزاروں ریٹائرڈ فوجیوں کو ملازمت کے مواقع فراہم کیے۔ اس شعبے میں بڑا کاروباری مقابل ایک بین الاقوامی ادارہ برنکس (Brinks) تھا جس نے گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد پاکستان میں اپنا کاروبار فروخت کر کے اپنی دکان بڑھالی۔ اس کاروبار کی بڑھتی ہوئی مانگ دیکھتے ہوئے ریٹائر ہونے والے دیگر افسروں نے بھی اپنے فوجی اور بین الاقوامی تعلقات استعمال کرتے ہوئے اس کاروبار میں ہاتھ ڈالا، مثلاً ایک سابق

فوجی افسر کی کمپنی سیکیورٹیز اینڈ مینجمنٹ سروسز (SMS) اس شعبے میں خاصی پھلی پھولی۔ 1990ء کے عشرے میں داخلی طور پر عدم تحفظ کی فضا نے اس کاروبار کو خوب چمکایا۔ جنرل ضیاء الحق نے افغان مہاجرین کو پاکستان میں جو کھلی چھوٹ دی، اس سے پاکستان کی معیشت اور ماحول پر بڑے منفی اثرات پڑے۔☆[83] جرائم میں اضافہ اور چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ دراصل افغان جنگ کے براہِ راست اثرات کا نتیجہ تھے۔

افواج کی تینوں فاؤنڈیشنوں نے اپنے روابط اور وسائل کو استعمال کر کے خوب کاروبار چلائے اور پھر ان کو تربیت یافتہ افرادِ کار بھی وافر تعداد میں میسر تھے۔ لیکن ایس ایم ایس کے مالک اکرام سہگل کے مطابق یہی وافر تعداد اور بدانتظامی ان کمپنیوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔☆[84]

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے چھوٹے موٹے کاروبار بھی شروع کیے جیسے بلو لیگون ریسٹورینٹ اور شادی ہال وغیرہ جن میں سویلین بھی آسکتے تھے لیکن بنیادی طور پر ان کے کرم فرما فوجی ہی تھے۔ یہ دونوں منصوبے فوج کی زمین پر شروع کیے گئے جو ریاست کی ملکیت ہوتی ہے۔ تاہم آمدنی کو سرکاری خزانے میں جمع کرنے کے بجائے فاؤنڈیشن کے کھاتے میں جمع کیا جاتا رہا۔☆[85]

بحریہ اور شاہین جیسی چھوٹی فاؤنڈیشنیں کاروباری ٹھیکوں کے لیے اپنی اپنی افواج پر انحصار کرتی ہیں، مثلاً بحریہ فاؤنڈیشن کے زیادہ تر منصوبے 1995ء کے لگ بھگ شروع کیے گئے۔ اکثر منصوبے بندرگاہ کے آس پاس تھے جن میں جہاز توڑنے، ساحلی پانیوں سے ریت نکالنے اور دیگر خدمات کے منصوبے شامل تھے۔ یہ وہ کام تھے جو بحریہ کے لوگ بخوبی کر سکتے تھے اور اپنے روابط کی بدولت نجی شعبے کی نسبت زیادہ آسانی سے ٹھیکے حاصل کر سکتے تھے۔ اسی طرح بحریہ فاؤنڈیشن نے رنگ بنانے کا کارخانہ 1995ء میں قائم کیا تاکہ جہازوں کے لیے استعمال ہونے والا رنگ تیار کیا جاسکے۔ یاد رہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب بحریہ نے فرانس کے ساتھ آبدوزیں وغیرہ بنانے کے دو بڑے معاہدے کیے تھے۔ ان آبدوزوں اور سرنگیں ہٹانے والے جہازوں کے لیے رنگ بنانے کے ٹھیکے بحریہ فاؤنڈیشن کو دیے گئے۔ تاہم اس میں بڑی سرمایہ کاری نجی شعبے کے ایک بڑے تاجر ملک ریاض اور دوسرے نجی سرمایہ کاروں نے کی۔

ملک ریاض بحریہ کے کئی منصوبوں میں سرمایہ کاری کر چکے ہیں جن میں رہائشی منصوبے بھی شامل ہیں۔[☆86] چونکہ ایسے منصوبے احتساب اور جواب دہی کے عوامی عمل سے مبرا ہوتے ہیں، اس لیے ان منصوبوں کی کارکردگی کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ان سرگرمیوں کے لیے بحریہ فاؤنڈیشن کا امتیازی نشان بھی استعمال کیا گیا تا کہ بحریہ اور دیگر افواج سے ٹھیکے حاصل کیے جاسکیں۔

ملک ریاض نے بحریہ فاؤنڈیشن کے ساتھ مل کر لاہور اور راول پنڈی میں دو رہائشی منصوبے شروع کیے۔ معاہدے کی رُو سے بحریہ فاؤنڈیشن کو دس فی صد حصص اور پچیس فی صد پلاٹ دیے گئے جس کے لیے بحریہ فاؤنڈیشن نے کوئی سرمایہ کاری نہیں کی۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر بحریہ فاؤنڈیشن چاہے تو ریاض ملک فی پلاٹ ایک لاکھ روپے دے کر مکمل ملکیت حاصل کر سکتے تھے۔

دراصل بحریہ کا امتیازی نشان استعمال کر کے زمین کی قیمتیں چڑھائی گئیں۔ اس سارے چکر میں بحریہ کے ملوث ہونے اور اس کے امتیازی نشان کے استعمال کو 1998ء میں ایک وکیل حبیب وہاب الخیری نے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔ انھوں نے فوج کی تمام تجارتی سرگرمیوں پر پابندی لگانے کی استدعا کی کیوں کہ ان کے خیال میں اس طرح فوج اپنے بنیادی کام یعنی سرحدوں کی حفاظت سے کوتاہی برت سکتی تھی۔ ان کا موقف یہ بھی تھا کہ افواج کی فاؤنڈیشنوں کے قیام سے کمپنیز آرڈیننس مجریہ 1984ء اور ٹریڈ مارک ایکٹ مجریہ 1940ء کی خلاف ورزی ہوتی تھی جو کسی نجی کمپنی یا پارٹی کو ریاست کا یا مسلح افواج کا یا بانیِ پاکستان کا نام استعمال کرنے سے روکتی تھی۔[☆87] بحریہ فاؤنڈیشن نے ان الزامات کی تردید کی اور یہ مقدمہ تکنیکی بنیادوں پر خارج کر دیا گیا۔ اس طرح بدقسمتی سے ان کے اٹھائے ہوئے نکات پر قانونی فیصلہ نہ آسکا۔

پھر سنہ 2000ء میں بحریہ فاؤنڈیشن نے رہائشی منصوبے کے تمام حصص ملک ریاض کو منتقل کر دیے جسے بحریہ کی اعلیٰ انتظامیہ سے اختلافات کے بعد گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ بحریہ کے افسروں کو رشوت دے کر بحریہ فاؤنڈیشن کو دھوکا دیا۔[☆88] بحریہ

فاؤنڈیشن نے عدالت سے یہ بھی کہا کہ وہ ملک ریاض کو بحریہ کا نام استعمال کرنے سے روک دے مگر عدالت نے ملک ریاض کے حق میں فیصلہ دیا۔ ملک ریاض کا مؤقف یہ تھا کہ اب بحریہ کا نام استعمال نہ کرنے سے اس کا کاروبار متاثر ہوگا۔[☆89] دل چسپ بات یہ ہے کہ عدالت نے اس قانون پر کوئی توجہ نہ دی جس کے تحت سرکاری نشان کو نجی کمپنیاں استعمال نہیں کرسکتی تھیں۔

بہرحال ملک ریاض ایک انتہائی بااثر شخص ہے جس کے روابط نام ور سیاست دانوں اور ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے ساتھ ہیں۔ اس نے مفاہمت کی ایک یادداشت کے ذریعے اکتوبر 2006ء میں DHA اور بحریہ کے رہائشی منصوبوں کو یکجا کردیا۔[☆90]

گو کہ اس پارٹنرشپ کی توثیق عدالت نے کردی تھی پھر بھی اسے فوج اور نجی شعبے کی ہوس گیری کی مثال سمجھا جاسکتا ہے۔ افواج کے ذیلی ادارے فوج کے اثر و رسوخ کو استعمال کرکے براڈ کاسٹنگ اور ٹیلی کاسٹنگ جیسے بالکل نئے کاروبار میں بھی داخل ہوگئے۔ جیسے شاہین فاؤنڈیشن نے اپنا ریڈیو چینل ایف ایم 100 اور شاہین پے ٹی وی سسٹم شروع کرنے کے لیے فضائیہ کے اختیارات کے تحت ریڈیو اور ٹی وی فریکوئنسیاں حاصل کیں۔ ان دونوں کاروباروں کے شروع کرنے سے اس فوجی قوت کا اندازہ ہوتا ہے جس سے وہ اپنے فائدے کے لیے قانون میں رد و بدل کرسکتے تھے۔ 1990ء کے عشرے میں ابھی حکومت نے نجی سرمایہ کاروں کو ریڈیو اور ٹی وی چینل کھولنے کی اجازت نہیں دی تھی مگر شاہین فاؤنڈیشن فضائیہ کے اثر کو استعمال کرکے یہ اجازت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

یہ منصوبے شاہین فاؤنڈیشن اور نجی سرمایہ کاروں کی ملی بھگت کی واضح مثال تھے۔ مبینہ طور پر سویلین سرمایہ کار وزیراعظم بےنظیر بھٹو اور ان کے شوہر آصف علی زرداری سے قریبی روابط رکھتے تھے۔[☆91] اس مشتبہ معاہدے سے شاہین فاؤنڈیشن کو نقصان بھی ہوا۔ پھر شاہین فاؤنڈیشن نے سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن میں دفعہ 263 کے تحت ایک مقدمہ بھی دائر کیا۔ ایک بڑے حصے دار پر الزام تھا کہ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔[☆92] مقدمہ اب بھی قانونی نظرِ ثانی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ بےنظیر سے اس بارے میں سوال کیا گیا لیکن انھوں نے ان الزامات کو رد کیا۔ تاہم وہ کوئی تسلی بخش وضاحت نہ دے سکیں، بلکہ انٹرویو میں ان کا

سارا زور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے ہراساں کیے جانے پر تھا۔

فوج کے کاروبار اور حکومت کے درمیان تعاون کی یہ واحد مثال نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی دو مقدمے تھے جن میں فوجی کمپنیاں حکومت سے مل کر منافع بخش سرگرمیوں میں ملوث تھیں۔ ایک کا تعلق بھارت کو شکر کی فروخت سے تھا اور دوسرا پنجاب میں سڑکوں کی تعمیر سے متعلق تھا۔ فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے شوگر مل نے دیگر شوگر ملوں کے ساتھ مل کر بھارت کو ساڑھے تین ارب روپے میں کوئی سات لاکھ ٹن شکر فروخت کی۔ اور یہ 1997ء سے 1999ء کے درمیان صرف دو سال کے عرصے میں ہوا۔ اس فروخت میں فوجی فاؤنڈیشن کا حصہ تقریباً اُنتیس ہزار ٹن تھا اور باقی حصے دیگر شوگر ملوں کے تھے جن میں وزیراعظم نواز شریف کی شوگر مل بھی شامل تھی۔ اس کے نتیجے میں شوگر انڈسٹری کو سینٹرل بورڈ آف ریونیو کی طرف سے پانچ ارب روپے ڈائریکٹ ریبیٹ اور ایکسائز ڈیوٹی سے چھوٹ کی شکل میں ملے۔ اس فیصلے کو اکتوبر 1999ء کے بعد خوب اچھالا گیا مگر تفتیش صرف نجی شوگر ملوں سے ہوتی رہی اور فوجی اداروں سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔☆[93] اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ فوج کا اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا اور اسے یہ اصرار تھا کہ وہ کسی کو جواب دہ نہیں تھی۔

یاد رہے کہ 1999ء میں مشرف حکومت کی طرف سے لایا جانے والا احتساب آرڈیننس فوج اور عدلیہ کو اپنے دائرۂ کار سے باہر رکھتا ہے۔ قومی احتساب بیورو کی ویب سائٹ کے مطابق فوج میں احتساب کا اپنا طریقِ کار موجود ہے۔☆[94] بیورو کے ایک سابق افسر حسن عباس کے مطابق بیورو کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اعلیٰ فوجی افسروں جیسے جنرل اسلم بیگ، حمید گل، زاہد علی اکبر، طلعت مسعود، سعید قادر، فرخ خان اور ایئر مارشل انور شمیم اور عباس خٹک سے مبینہ بدعنوانیوں کی پوچھ گچھ کر سکے۔☆[95]

جائیدادوں کی خرید و فروخت کے معاملے میں فوج کا کردار بڑا مشتبہ تھا۔ 1990ء کے عشرے میں فوج نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے اپنے لوگوں کو زمینیں اور مکانات فراہم کیے۔ فوج کے ذیلی اداروں کو بھی رہائشی منصوبے شروع کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ 1988ء سے 1999ء تک فوج جائیداد کی خرید وفروخت میں چار طرح سے ملوث ہوئی:

- فوج نے ادارے کی سطح پر رہائشی منصوبے شروع کیے۔
- رفاہی اداروں کے ذریعے جائیدادیں تیار کیں۔
- شہری علاقوں میں تجارتی عمارتیں تعمیر کیں۔
- حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ فوجیوں کو زمینیں تقسیم کیں۔

ان کے علاوہ فاؤنڈیشنیں آمدورفت کی صنعت میں بھی داخل ہوگئیں اور ایک ایئر لائن، ایک ایوی ایشن کمپنی اور کئی ٹریول ایجنسیاں کھول لیں۔ شاہین ایئر انٹرنیشنل کو 1990ء کے عشرے کی ابتدا میں فضائیہ کی فاؤنڈیشن نے قائم کیا۔ اس ایئر لائن نے افرادی وسائل کے لیے پاک فضائیہ پر انحصار کیا۔ کیوں کہ انتظامیہ کا خیال تھا کہ فضائیہ کے افسر تجربے کار ہوا باز ہوتے ہیں، اس لیے وہ ایئر لائن بھی چلا لیں گے۔ تاہم اس شعبے کے ماہرین نے اس مؤقف سے اختلاف کیا۔ ایک ماہر کا کہنا تھا کہ ایئر لائن چلانا خاصا پیچیدہ عمل ہے جس کے لیے پیشہ ورانہ مہارت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔☆[96] لیکن فوجی اس مؤقف سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلح افواج کے اندر افرادی وسائل اور ساز وسامان کا انتظام کرتے کرتے وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ تجارتی منصوبے اور کمپنیاں بھی چلا سکیں۔☆[97] ان دعووں کے باوجود شاہین انٹرنیشنل نقصان میں چلتی رہی اور 1996ء میں اسے عارضی طور پر بند کرنا پڑا۔ 1997ء میں اسے دوبارہ چلایا گیا اور بالآخر 2004ء میں کینیڈا کے ایک نجی سرمایہ کار کو یہ فروخت کردی گئی۔ جب شاہین ایئر کو فروخت کیا گیا، اس وقت اس پر کوئی ڈیڑھ ارب روپے کے مالیاتی واجبات تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ شاہین فاؤنڈیشن کی انتظامیہ اسے چلا نہیں سکی، اسی لیے یہ خسارے میں چلتی رہی۔☆[98] صرف دسمبر 1999ء سے مئی 2000ء تک اس نے کوئی چھ کروڑ روپے کا نقصان اٹھایا۔ یہ اس سات کروڑ روپے کے علاوہ تھا جو سول ایوی ایشن اتھارٹی کو واجب الادا تھے۔☆[99] ایئر لائن کے ابتدائی برسوں میں تو صورتِ حال اور بھی خراب تھی۔ بعض لوگ اس کی بڑی وجہ حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کو ٹکٹوں میں دی جانے والی رعایتوں کو بتاتے ہیں۔☆[100] اس ایئر لائن کے پاس لیز پر بہت کم طیارے ہونے کے باعث لاگت کار بڑھ گئی تھی کیوں کہ تکنیکی خرابیوں کے باعث پروازوں میں تاخیر اور دیگر مسائل زیادہ ہو گئے تھے۔

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے بھی عسکری ایوی ایشن کے نام سے ایک کمپنی کھولی جو ہیلی کاپٹر سروس فراہم کرتی تھی۔ اس نے برّی فوج کی ہوائی شاخ سے سبک دوش ہونے والے لوگ بھرتی کیے۔ یہ کمپنی ملک میں سیاحت کے فروغ کے لیے ہیلی کاپٹر سروس فراہم کرنے کے علاوہ اہم اور حساس ساز و سامان کی نقل و حمل اور آزاد جموں اور کشمیر سمیت ملک کے شمالی علاقہ جات کے لوگوں کو مشکل حالات سے نکالنے کے لیے پروازیں چلاتی ہے۔ تاہم دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے آرمی ایوی ایشن کے ہیلی کاپٹر اور ہواباز استعمال کرتی ہے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) بشیر باز کو فخر ہے کہ وہ فوجی وسائل استعمال کر سکتے ہیں۔ ☆101 ظاہر ہے بریگیڈیئر صاحب کو اس کا احساس نہیں تھا کہ تجارتی مقاصد کے لیے سرکاری اور خاص طور پر مسلح افواج کے وسائل استعمال کرنا غیر قانونی ہے۔ تاہم ان کے کھلے اعتراف سے صاف ظاہر ہے کہ فوجیوں کو اپنے ادارے کی خودمختاری اور عوامی وسائل پر تصرف کا پورا اختیار ہے۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور عسکری ایوی ایشن کے ہاتھوں سرکاری وسائل کے تجارتی استعمال کو نہیں روکا گیا حالانکہ آڈیٹر جنرل کے محکمے نے دفاعی بجٹ پر سنہ دو ہزار ایک اور دو ہزار دو کی سالانہ رپورٹوں میں ان سرگرمیوں پر اعتراض کیا تھا۔ رپورٹ نے یہ نشان دہی بھی کی تھی کہ فوج اپنے ہیلی کاپٹر عسکری ایوی ایشن کو کرایے پر دیتی ہے اور آمدنی کو سرکاری منظوری کے بغیر نجی کھاتے میں منتقل کیا جاتا ہے۔ ☆102

مسلح افواج کی فاؤنڈیشنوں نے ٹریول ایجنسیاں بھی کھولیں جو افواج کے لوگوں میں ہی کاروبار کے مواقع ڈھونڈتی تھیں۔ تینوں فاؤنڈیشنوں نے کراچی، لاہور، اسلام آباد اور راولپنڈی میں الگ الگ ٹریول ایجنسیاں کھولیں۔ تاہم شاہین فاؤنڈیشن نے اپنی ایجنسیاں 2003ء کے لگ بھگ بند کر دیں کیوں کہ شاید انتظامیہ کا خیال تھا کہ یہ کمپنیاں منڈی کے سخت مقابلے میں باقی نہیں رہ سکتیں۔ فوجی افسروں کے لیے ایک اضافی فائدہ یہ بھی تھا کہ کسی ذاتی لاگت کے بغیر بہتر سفر کر سکتے تھے۔ عام طور پر افسر ٹکٹ کی قیمت کا کچھ حصہ اپنے ذاتی کھاتے میں جمع کرا لیتے تھے اور اسے بدعنوانی بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اعلیٰ افسر اکثر ایجنسیوں پر زور دے کر ٹکٹ اَپ گریڈ کرا لیتے تھے۔ اپنی ایجنسیاں ہونے کے باعث یہ اطلاعات باہر بھی نہیں نکلتی تھیں جو اس صورت میں ہوتا، اگر یہ لوگ کھلی مارکیٹ کے وسائل کو استعمال کرتے۔

اعلیٰ فوجی افسروں کے اس قسم کے دباؤ کے علاوہ ان ٹریول ایجنسیوں کو چلانے والے بھی نااہل افسر تھے۔ کیوں کہ انھیں کاروبار یا ٹریول ایجنسی چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ عام ملازم مایوسی کا شکار ہوتے تھے کیوں کہ ایجنسیاں چلتی نہیں تھیں۔☆103

1990ء کے عشرے کے وسط تک یہ فاؤنڈیشن انفارمیشن ٹیکنالوجی اور تعلیمی شعبوں میں بھی وارد ہوگئیں کیوں کہ ان کی طلب بڑھ رہی تھی۔ فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اپنی الگ کمپنیاں بنا ڈالیں۔ تاہم فوجی سافٹ اور عسکری انفارمیشن سروسز کو کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

فوج اور اس کی رفاہی فاؤنڈیشنوں کو اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں بنانے میں نسبتاً زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ 1988ء سے 1999ء کے دوران فوج کے زیرِ انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس طرح فوج نے پیسے کمانے کے لیے راستے ڈھونڈ لیے اور دعویٰ یہ تھا کہ اپنے لوگوں کے لیے اعلیٰ تعلیمی مواقع فراہم کیے جا رہے تھے۔☆104 یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ فوج کی تعلیمی اور صحت کی سہولتوں پر فی کس عوام کی نسبت کہیں زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ جدول 6.2 سے ظاہر ہوتا ہے۔

جدول 6.2 پاکستان میں دفاع اور تعلیم وصحت

مالی سال	صحت (فی صد)	تعلیم (فی صد)	دفاع (فی صد)
1981-82	0.6	1.4	5.7
1982-83	0.6	1.5	6.4
1983-84	0.6	1.6	6.4
1984-85	0.7	1.8	6.7
1985-86	0.7	2.3	6.9
1986-87	0.8	2.4	7.2
1987-88	1.0	2.4	7.0

مالی سال	صحت (فی صد)	تعلیم (فی صد)	دفاع (فی صد)
1988-89	1.0	2.1	6.6
1989-90	0.9	2.2	6.8
1990-91	0.8	2.1	6.3
1991-92	0.7	2.2	6.3
1992-93	0.7	2.4	6.0
1993-94	0.7	2.2	5.9
1994-95	0.7	2.4	5.6
1995-96	0.8	2.4	5.6
1996-97	0.8	2.5	5.2
1997-98	0.7	2.3	5.1
1998-99	0.7	2.2	4.9
1999-2000	0.7	2.1	4.0
2000-01	0.7	1.6	3.2
2001-02	0.7	1.9	3.4
2002-03	0.7	1.7	3.3
2003-04	0.6	2.1	3.2
2004-05	0.6	2.1	3.2

نکات:

- صحت اور تعلیم پر خرچ مجموعی قومی آمدنی کا فی صد ہے۔
- دفاع پر خرچ مجموعی قومی پیداوار کا فی صد ہے۔
- 2001ء کے بعد دفاع پر اخراجات میں فوجیوں کی پنشن شامل نہیں ہے۔

ماخذ: اکنامک سروے آف پاکستان

1990ء کے عشرے میں فوج نے اپنے تعلیمی نظام کو تجارتی بنیادوں پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ یہ نظام دفاعی بجٹ سے چل رہا تھا، اس لیے اس کا تجارتی استعمال قابلِ اعتراض تھا۔ پھر یہ کہ فاؤنڈیشنوں کی یونی ورسٹیاں چھاؤنیوں میں تعمیر کی گئی تھیں جہاں اراضی سرکاری ہے۔ اسلام آباد میں بحریہ اور ایئر یونی ورسٹیاں ممنوعہ فوجی علاقوں میں بنائی گئی تھیں، اس لیے یہاں سویلین کو بھی آنے کی اجازت لینی پڑتی جو عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سول اور فوجی آبادی کے درمیان کوئی انضمام تھا۔ چھاؤنی میں سویلینز کی نسبتاً زیادہ آزاد آمدورفت نے سول اور فوج کی تقسیم کو کمزور نہیں کیا بلکہ اس امتیاز کو زیادہ مضبوط کیا، کیوں کہ بہت سے سویلینز نے پہلی بار یہ دیکھا کہ دو مختلف نظام کیسے چلتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فوجی چھاؤنیاں، خصوصاً بڑے شہروں کی، سویلینز کے محدود استعمال کے لیے بھی کھول دی گئیں۔ مثال کے طور پر محدود علاقوں میں سویلینز کے استعمال کے لیے تجارتی منڈیاں کھول دی گئیں جہاں سویلینز کو بھی رسائی دے دی گئی۔ اسلام آباد میں بحری اور فضائی علاقوں میں تجارتی منڈیاں اس قسم کی مثالوں میں شامل ہیں۔

فوج کے زیرِ انتظام تعلیم کی تجارت اس وقت شروع ہوئی جب فوج نے ان اسکولوں کو سویلین بچوں کے لیے بھی کھول دیا۔ ان اسکولوں کا مجموعی ماحول خاصا ممتاز تھا، مثلاً بحریہ کے اسکولوں میں طبقاتی تفریق نمایاں تھی۔ مثال کے طور پر پاکستانی بحریہ کے اسکولوں کا اندرونی نظام خاصا طبقاتی تھا جس میں بحریہ کے نچلے درجے کے ملازمین بحریہ کے ماڈل اسکولوں میں جاتے تھے جب کہ افسروں کے بچے بڑے شہروں، مثلاً اسلام آباد اور کراچی، جن دونوں شہروں میں بحریہ موجود تھی، بحریہ فاؤنڈیشن کے اسکولوں میں جاتے تھے۔ چونکہ یہ اسکول مال دار طبقے کے لیے تھے، لہٰذا ان کا فائدہ بھی بنیادی طور پر امیر لوگوں کو ہوا اور درمیانے اور نچلے درمیانے طبقے کے بچے ان میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ فوجی اسکول سویلین بچوں سے اور بھی زیادہ فیس وصول کرتے تھے۔ فاؤنڈیشنوں کے کالج اور یونی ورسٹیاں بھی سویلین سے زیادہ فیس لیتی فوجیوں کے بچوں کو کم فیس پر تعلیم دیتی ہیں۔ فوج کے اسکول اور کالج نجی شعبے کے اعلیٰ ترین اسکولوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہاں نظم و ضبط اور صفائی ستھرائی پر بہت زیادہ

توجہ دی جاتی ہے جو لوگوں کے لیے باعثِ کشش ہے۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ وہاں پڑھائی کا معیار کیسا ہے۔

اسی دوران فوج کی کاروباری سرگرمیاں پھیلتے پھیلتے بڑی سرمایہ کاری اور منافعے والے کاروباروں میں آ گئیں۔ ان سرگرمیوں میں تیل اور گیس کے علاوہ بجلی اور سیمنٹ بنانے کے منصوبے بھی شامل تھے۔

فوجی فاؤنڈیشن کی ملکیتی فوجی آئل ٹرمینل اور ڈسٹری بیوشن کمپنی لمیٹڈ (FOTCO) ملک کی سب سے بڑی کمپنی بن کر ابھری جو سالانہ نوے لاکھ ٹن تیل کا انتظام کرتی تھی۔[☆105] اس کمپنی نے پاکستان اسٹیٹ آئل (PSO) کو خریدنے میں بھی دلچسپی ظاہر کی۔ پی ایس او کا سالانہ قبل از ٹیکس منافع کوئی چار ارب روپے تھا اور اس طرح یہ ملک کی تین بڑی تیل فروخت کرنے والی کمپنیوں میں سے ایک تھی اور حکومت کے لیے آمدنی کا بڑا ذریعہ تھی۔ PSO ملک میں فروخت ہونے والے تیل کا اکہتر فی صد حصہ رکھتی ہے اور اسی لیے بہت سے لوگ اس کی نجکاری کی مخالفت کر رہے تھے۔[☆106] ایک اطلاع یہ تھی کہ اس کمپنی کو بیرونی سرمایہ کاروں کے پاس فروخت کرنے کا خدشہ تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح ملک میں تیل کی فروخت کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔[☆107] اسی لیے FOTCO کو ترجیح دی جا رہی تھی کہ اس طرح وسائل کا اختیار ملک میں ہی رہتا۔ یوں بظاہر تو عالمی بینک اور بین الاقوامی مانیٹری فنڈ کی ہدایات پر عمل کر کے سرکاری صنعتوں کو نجی ملکیت میں دیا جاتا اور ساتھ ہی PSO کو FOTCO کے ہاتھوں فروخت کر کے اثاثے بھی حکومتی اختیار میں ہی رکھے جاتے۔

کچھ لوگوں کا نقطۂ نظر اس کے متضاد بھی ہے جس کے مطابق FOTCO مسلح افواج کا ادارہ ہے جس کے پاس PSO فروخت کرنے سے سرکاری شعبے کا بوجھ کم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔[☆108] تاہم PSO کی نجکاری کا تنازعہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلح افواج اور ان کے ذیلی ادارے کس طرح نجکاری کے عمل سے فائدے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک اور مؤقف یہ ہے کہ PSO کی فوجی فاؤنڈیشن کو فروخت سے یہ فاؤنڈیشن نہ صرف بڑے مالیاتی فوائد حاصل کرتی بلکہ فوجی اثر و رسوخ استعمال کر کے منافع کمانے کی

صلاحیتیں بھی بڑھالیتی۔☆109 یہ درست ہے کہ فوجی فاؤنڈیشن کے پاس اتنی سیاسی طاقت ہے کہ وہ فائدے مند ٹھیکے حاصل کر سکے جیسا کہ واپڈا اور PSO کے ساتھ فرنیس آئل فراہم کرنے کے معاہدوں میں ہوا۔ اس معاہدے کے مطابق FOTCO ہر سال چالیس لاکھ ٹن فرنیس آئل درآمد کرتی جو PSO دوسو اٹھتر روپے چالیس پیسے فی ٹن کے مقررہ نرخ پر خرید لیتی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اگر درآمد شدہ ایندھن کی مقدار کم بھی ہوتی تو بھی پی ایس او کو وہی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ پی ایس او یہ ایندھن خرید کر آگے واپڈا کو بیچ دیتی۔ تاہم واپڈا نے حال ہی میں پی ایس او کے ساتھ یہ معاہدہ منسوخ کر کے شیل (Shell) کے ساتھ بہتر نرخوں پر نیا معاہدہ کرلیا ہے۔ لیکن پھر بھی FOTCO اور پی ایس او کا معاہدہ برقرار ہے جس میں پی ایس او پھنسی ہوئی ہے۔☆110

FOTCO کی انتظامیہ اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اس نے واپڈا یا پی ایس او پر کوئی معاہدہ نہیں تھوپا بلکہ وہ صرف ایسے معاہدے پر عمل کر رہی ہے جس کا مالی انتظام ایشیائی ترقیاتی بینک (ADB) اور دیگر بین الاقوامی ڈونر ادارے فوجی فاؤنڈیشن کے ذریعے کرتے ہیں۔☆111

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی سیمنٹ کی صنعت میں سرمایہ کاری تو اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ AWT منیجنگ ڈائریکٹر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فرخ خان کے سرحد میں نظام پور کے قریب ایک سیمنٹ پلانٹ قائم کرنے کے لیے چین کی ایک کمپنی CBSM کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیے۔ چونکہ سیمنٹ کی طلب زیادہ تھی، اس لیے توقع کی گئی کہ یہ پلانٹ اچھے نتائج دے گا مگر اس سے AWT کا خزانہ خالی ہونے لگا۔ منصوبہ قابلِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے منافع توقع سے کم رہا اور واحد حل یہ سوچا گیا کہ سیمنٹ کی مارکیٹ کا بڑا حصہ حاصل کرنے کے لیے پلانٹ کا سائز بڑا کیا جائے۔☆112 اس توقع کے لیے جی ایچ کیو سے پہلے تو آٹھ ارب روپے ادھار لیے گئے اور پھر مارکیٹ میں حصص پیش کیے گئے۔ پھر بھی اس پروجیکٹ نے AWT کا مالیاتی توازن بگاڑ دیا اور اسے حکومت سے مدد کے لیے کہنا پڑا۔ چنانچہ حکومت نے تین مرتبہ AWT کو مالیاتی امداد دی۔ یعنی 1995-96ء میں، پھر 1999ء میں اور

تیسری بار 2001ء میں۔[113]

دل چسپ بات یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتوں نے اس قسم کی مشتبہ توسیع پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بعد میں صرف ایک مرتبہ اعتراض کیا گیا جب AWT اپنی اس ناقص سرمایہ کاری پر شدید مصیبت میں گرفتار تھی۔ نواز شریف کے وزیرِ تجارت اسحاق ڈار نے فوج سے کہا کہ وہ AWT اور فوجی فاؤنڈیشن کو ضم کر دے اور نااہل منتظمین کو ہٹا کر ان کی جگہ بہتر اور کارآمد لوگ تعینات کیے جائیں۔ اسحاق ڈار کے مطابق یہ بات فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف سے کہی گئی تھی کیوں کہ وہی اس معاملے میں مالیاتی امداد حاصل کرنے میں دل چسپی لے رہے تھے۔[114] اسحاق ڈار کا کہنا ہے کہ رقم اس لیے فراہم کی گئی کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں غریب سپاہیوں اور ان کے لواحقین کا سرمایہ ڈوب جاتا اور وہ بڑی بری طرح متاثر ہوتے۔[115]

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ AWT پنشنوں کی رقوم اپنے منصوبوں میں لگاتی ہے تاکہ سابق فوجیوں کے لیے کچھ منافع کمایا جاسکے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر عشرت حسین، اسحاق ڈار سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسی مالی معاونت عام سی بات ہے جو کسی بھی کمپنی کو دی جاسکتی تھی۔ مزید یہ کہ مقامی بینکوں کے کنسوریشم نے AWT کو رقوم اس وقت دیں جب AWT نے اپنے اثاثے رہن رکھوائے۔[116] جواب میں اسحاق ڈار کا کہنا ہے کہ بینکوں نے رقوم اس وقت دیں جب حکومت نے ایک طرح کا ''طمانیتی خط'' جاری کیا جس کا مطلب تھا کہ اگر کمپنی نے رقوم نہ دیں تو حکومت بھرے گی۔ ڈار کے مطابق اثاثے رکھے گئے مگر پھر بھی یہ ایک رسمی کارروائی تھی جو کنسوریشم کی منظوری کے بعد قرض حاصل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ آخر کار حکومت نے طمانیت نامہ جاری کر دیا۔[117] فوج کے پاس یہ مدد حاصل کرنے کے لیے کافی سیاسی دباؤ موجود تھا۔

چونکہ سیاسی قیادت پر خود بھی بدعنوانیوں کے الزامات تھے، اس لیے سویلین حکومتوں نے افواج کی فاؤنڈیشنوں کو مالیاتی ضمانتیں دینے پر کوئی اعتراض نہیں کیے۔ حکمران جماعتوں کے بہت سے ارکان اور ان کے ساتھی بھی حکومت سے قرضے لے کر کھا چکے تھے۔ سن دو ہزار تین

میں جاری کی جانے والی فہرست کے مطابق قرض واپس نہ کرنے والوں میں AWT، سابق وزیراعظم نواز شریف کا اتفاق گروپ اور بہت سے دیگر لوگ شامل تھے۔☆118

معاشی مفادات کا استحکام (1999-2005ء)

1999ء کا سال سیاسی فریقین کے ساتھ فوج کے تعلقات کی تشکیلِ نو میں اہم موڑ ثابت ہوا۔ وزیراعظم نواز شریف اور فوج کے سربراہ پرویز مشرف کے درمیان تصادم کا نتیجہ یہ نکلا کہ بارہ اکتوبر 1999ء کو مشرف نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ فوج نے محسوس کیا کہ اس کے مفادات کو نااہل سیاسی قیادت سے خطرہ ہے، اس لیے 'وہ' اپنے تحفظ کے لیے میدان میں نکل آئی۔ نواز شریف کو نہ تو بہت ذہین سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی وہ ریاستی معاملات اور اداروں کے رویوں کا ادراک رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسے پنجابی مرد کے طور پر مشہور تھے جس کی بنیادی دل چسپی اچھے کھانوں تک محدود تھی۔ ایسی باتیں پھیلانے والے لوگ یہ بات نظر انداز کردیتے ہیں کہ نواز شریف نے مسلح افواج کی طاقت کم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ تاہم انھوں نے فوج کی ثابت قدمی کا غلط اندازہ لگایا اور نہ ہی وہ یہ سمجھ سکے کہ فوج کے جنرل خود کو بچانے کے لیے کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔ شاید نواز شریف فوج کی سیاسی و معاشی طاقت کا ربط نہ سمجھ سکے، یعنی یہ کہ فوج معاشی مواقع لے کر خوش ہونے کے بجائے مزید کی خواہش رکھتی ہے۔ 1999ء تک مسلح افواج معیشت میں بھی بالادست فریق بن چکی تھیں اور فوج کے جنرل ہر قیمت پر ریاست کی معیشت اور سیاست دونوں پر اپنا اختیار قائم رکھنا چاہتے تھے۔

1999ء کے بعد فوج اپنی سیاسی طاقت بڑھاتی رہی اور اس نے ریاست اور سماج پر بھی اختیارات میں اضافہ کیا۔ مشرف نے فوج کے سیاسی کردار کو مستحکم کرنے کے لیے قومی سلامتی کونسل قائم کی اور پارلیمنٹ برطرف کرنے کے صدارتی اختیارات بحال کردیے۔ اس طرح فوج کو وہ طاقت مل گئی جو اس سے پہلے اس کے پاس کبھی نہیں تھی۔ قومی سلامتی کونسل کے ذریعے مشرف نے ان دیگر جنرلوں کو بھی اپنے ساتھ کرلیا جو قومی سلامتی کونسل کے ممبر تھے۔ ترکی کی قومی سلامتی کونسل کی طرح پاکستان میں یہ کونسل تمام اہم ریاستی مسائل پر فیصلے کرنے کا

اختیار رکھتی تھی۔ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اب ایسا ہوا کہ سینئر جنرلوں کو پالیسی سازی کے عمل میں برابری کی بنیاد پر شامل ہونے کا موقع مل گیا اور اس طرح قومی سلامتی کونسل کے قیام نے فوج کے اقتدار کو استحکام بخشا۔

قومی سلامتی کونسل فوجی طاقت کی ترقی میں برابر شامل تھی جس نے 2004ء تک صرف اس کی تنظیم کی نہیں بلکہ قوم کی سیاسی اور معاشی قسمت کی تشکیل اس کو شرکت کرنے کا موقع دیا۔ مشرف کا دور فوج کے صرف سیاسی نہیں بلکہ معاشی استحکام کا اور خاص طور سے افسروں کے طبقے کا دور بھی ہے۔ اب ریٹائرڈ افسر بھی پورے اعتماد کے ساتھ زیادہ مراعات کے طلب گار تھے، مثلاً بحریہ کے ریٹائرڈ ریئر ایڈمرل بھی ذاتی عملہ طلب کرنے لگے تھے۔ یہ سہولت اب تک صرف ایڈمرل اور وائس ایڈمرل کے عہدوں پر فائز افسروں کے لیے تھی۔ ریئر ایڈمرل اب یہ مطالبہ اس لیے کر رہے تھے کہ ان کے متوازی عہدوں پر بری فوج کے افسروں کو ذاتی عملہ دیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تینوں افواج خصوصاً بری افواج اور بحریہ آپس میں مراعات کا حریفانہ موازنہ کیسے کرتی ہیں۔

اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اب بحریہ نے بھی ملک بھر میں اور خاص طور پر پنجاب میں پیر پھیلانے شروع کردیے تھے۔ خاص طور سے پنجاب کے میدانوں میں جہاں کے لوگ سمندری ذہنیت کے مالک نہیں ہیں۔ بحریہ نے لاہور میں ایک کالج قائم کیا اور جنوبی پنجاب کے بھاول پور جیسے چھوٹے شہروں میں بھرتی کے مراکز کھولے۔ بحریہ کی اس توسیع پسندی کی ایک وجہ یہ تھی کہ اب بحریہ کے اعلیٰ افسروں کے پاس بھی اس ضلعے میں شہری اور زرعی اراضیاں تھیں۔ بحریہ نے اعلیٰ افسروں کے مفادات کی دیکھ بھال کے لیے ایک جونیئر افسر کو مستقل بہاول پور میں تعینات کردیا اور جواز یہ دیا گیا کہ وہاں بحریہ میں بھرتی کا مرکز موجود ہے۔ اسی طرح بحریہ فاؤنڈیشن نے بھی بہاول پور میں ایک نجی کالج کھول لیا۔

بحریہ کی تعلیمی سہولتوں میں وسعت دیگر فاؤنڈیشنوں سے مختلف نہیں تھی۔ اس عرصے میں تینوں فاؤنڈیشنوں کے تعلیمی اداروں میں اضافہ ہوا۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے تو حکومت سے کہا کہ اسے عسکری ایجوکیشن بورڈ قائم کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ خود اپنا نظامِ امتحان

متعارف کرا سکے۔ 9/11 کے بعد سے سرکاری اسکولوں کی خراب تعلیم پر بہت لے دے ہوتی رہی ہے اور اسے مدرسوں میں اضافے کا ذمے دار سمجھا جاتا رہا ہے۔ مگر نظامِ تعلیم بہتر کرنے کے بجائے نجی تعلیمی بورڈ جو بہت زیادہ اخراجات وصول کرتا ہے، محض حکومت کو تعلیمی ذمے داریوں سے مبرا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

عسکری تعلیمی بورڈ نے سرکاری تعلیمی اداروں کے مقابلے میں خود کو ایک بہتر ادارے کے طور پر پیش کیا۔ اس بورڈ کے قیام سے حکومت کی پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ والی پالیسی کو بھی تقویت ملی۔ عسکری تعلیمی بورڈ فوج کے زیرِ انتظام چلنے والے تمام اسکولوں میں امتحانات لینے کا ذمے دار تھا۔ ایک اور ادارہ جسے امتحان لینے کی اجازت ملی، آغا خان یونی ورسٹی کا امتحانی بورڈ تھا جو دولت مند تعلیمی برادری یعنی اسماعیلی برادری کی ملکیت ہے اور جس کا نجی میڈیکل کالج بھی ہے۔ یہ دونوں ادارے ابھرتے ہوئے درمیانے طبقے کو تعلیمی سہولتیں فراہم کرتے ہیں نہ کہ نچلے طبقے کو جس کے لیے معیاری تعلیم کا حصول بڑا مسئلہ ہے۔

برّی فوج کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بحریہ فاؤنڈیشن نے بھی حکومت سے یونی ورسٹی کے قیام کی منظوری حاصل کرلی۔ فروری 2000ء میں بحریہ یونی ورسٹی آرڈیننس منظور کیا گیا جس کی رُو سے بحریہ کو ایک یونی ورسٹی اور پورے ملک میں متعدد کالج کھولنے کی اجازت مل گئی۔☆[119] یونی ورسٹی کی انتظامیہ مکمل طور پر بحریہ کے حاضر ملازمت یا ریٹائرڈ افراد پر مشتمل تھی۔ یونی ورسٹی بورڈ کا سربراہ بحریہ کا سربراہ ہوتا ہے اور بورڈ کے ارکان میں ڈپٹی چیف نیول اسٹاف، پرنسپل اسٹاف افسر اور بحریہ کے دیگر افسر شامل ہوتے ہیں جن کی منظوری بحریہ کا سربراہ دیتا ہے۔ یونی ورسٹی کا ریکٹر بھی بحریہ کا ایک ریٹائرڈ اعلیٰ افسر ہوتا ہے۔

اس طرح کے اداروں کا قیام فوج کی اس سوچ کا حصہ تھا جس کے تحت نا اہل سویلین اداروں کے متبادل بہتر ادارے فوج ہی قائم کرسکتی تھی۔ یاد رہے کہ شریف برادران کی حکومت نے پنجاب میں ''بھوت اسکول'' پکڑنے کے لیے فوج کی خدمات حاصل کیں (یہ وہ اسکول تھے جو صرف کاغذ پر موجود تھے اور ان کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں تھا)۔ یہ اسکول سویلین افسر شاہی کی بدعنوانیوں کا نتیجہ تھے۔ اب فوج کے جنرل یہ سمجھنے لگے تھے کہ چونکہ سویلین اداروں

میں جان نہیں ہوتی، اس لیے صرف فوج ہی ایسا ادارہ ہے جو ریاست کو جدید خطوط پر چلا سکتا ہے۔[☆120] چنانچہ خیال کیا جاتا ہے کہ ملکی ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر فوج کی خدمات کا حصول مشرف کے لیے ناگزیر فطری اقدام تھا۔

حکومت میں فوج کے ریٹائرڈ یا حاضر ملازمت افسروں کی تعیناتی مشرف کے اسی منصوبے کا حصہ تھی۔ مسلح افواج میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد ان لوگوں پر جنرل مشرف کو سویلین کے مقابلے میں زیادہ اعتماد تھا۔ تاہم اس طریقے سے سویلین ادارے مزید کمزور ہوئے۔ درمیانے عہدے کے بعض افسر اس دعوے پر شک وشبے کا اظہار کرتے ہیں کہ فوج ملک میں اداروں کے زوال کو روک سکتی ہے۔ ایسے فوجی افسر بہت تھوڑی تعداد میں ہیں جو کہتے ہیں کہ ریاست کے معاملات میں فوج کی مسلسل شمولیت سویلین اداروں کے لیے نقصان دہ ہے۔[☆121]

فوج کا ریاست، سماج اور معیشت کے تمام اہم شعبوں میں سرایت کرنا صرف مسلح افواج کی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظہر نہیں تھا بلکہ اب فوج ایک طبقہ بن چکی تھی اور اس کے حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ ارکان دیگر ملکی فریقین کے مقابلے میں اب بہت زیادہ طاقت کے حامل تھے اور حکومت میں بڑی بااثر ملازمتیں حاصل کر رہے تھے۔[☆122] مشرف کے دور میں فوج کے ریٹائرڈ اعلیٰ افسروں کو اہم سرکاری یونی ورسٹیوں کا سربراہ بنایا گیا جس سے ان اداروں کی مجموعی صلاحیتیں متاثر ہوئیں کیوں کہ وہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کے علمی ماحول سے ناآشنا تھے۔ مثال کے طور پر کوئی درجن بھر ریٹائرڈ فوجی افسروں کو یونی ورسٹی آف پنجاب میں اہم عہدوں پر لگایا گیا تو ان پر اقربا پروری اور بدعنوانیوں کے الزامات سامنے آئے۔ یہ منفی تاثرات اس تعلیمی ادارے کی ترقی کے لیے نقصان دہ ہیں۔

یہ ریٹائرڈ افسر اپنی جان پہچان والوں یا رشتے داروں کا تقرر کرنے کے لیے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو باہر نکال دیتے ہیں جس سے معیارِ تعلیم متاثر ہوتا ہے۔ ایک پروفیسر کا کہنا ہے کہ اگر طویل عرصے تک پنجاب یونی ورسٹی اپنی آزادی سے محروم رہے گی تو کچھ عرصے بعد یہاں کے طلبہ کسی نجی یونی ورسٹی کے طلبہ کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔[☆123] یونی ورسٹی کے اساتذہ کے احتجاج کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پنجاب یونی ورسٹی اکیڈمک اسٹاف ایسوسی ایشن کی مجلسِ عاملہ

کے اجلاس میں کوئی دوسو اساتذہ نے ریٹائرڈ فوجی افسروں کے یونی ورسٹی پر تسلط پر تنقید کی۔ اساتذہ نے اس پر بھی احتجاج کیا کہ وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ارشد محمود نے ایڈوانسڈ اسٹڈیز ریسرچ بورڈ کے اجلاس میں شرکت کر کے امیدواروں سے غیر ضروری سوال پوچھے کیوں کہ وائس چانسلر کو تحقیق کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔☆124 یہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس سے فوج کی نجی اور سرکاری شعبوں میں دخل اندازی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ریٹائرڈ اور حاضر ملازمت افسر زرعی اراضی بھی حاصل کرتے ہیں اور جائیدادوں کی خرید و فروخت میں بھی ملوث ہوتے ہیں۔ ایسی اراضی زیادہ تر جنوبی پنجاب میں چولستان جیسے علاقوں میں دی جاتی ہیں جہاں سے فوجی بھرتی نہیں ہوتے۔ غیر مقامی لوگوں کو اراضی منتقل کرنے سے سماجی و سیاسی تناؤ پیدا ہوتا ہے اور مقام لوگ الزام لگاتے ہیں کہ فوج ان کی اراضی پر دھاوا بول رہی ہے۔ ان علاقوں میں اراضی بانٹنے سے ملک میں لسانی کشیدگی بھی بڑھتی ہے کیوں کہ مسلح افواج میں غالب اکثریت پنجابیوں کی ہے، اسی لیے چھوٹے صوبے پانی سے متعلق فیصلوں پر شک و شبہے کا اظہار کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زراعت والے پانی کو اُس اراضی کی طرف موڑا جا رہا ہے جہاں اعلیٰ جنرلوں کی جائیدادیں ہیں اور اس طرح سندھ اور بلوچستان کو کم پانی ملتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے زمیں دار بھی شکایت کرتے ہیں کہ مقامی کسانوں کو ملنے والا پانی اب فوجیوں کی اراضی کو دیا جا رہا ہے۔☆125

ان مسائل پر حکومت اس لیے توجہ نہیں دے رہی کہ ملک میں سویلین اور فوجی افراد پر مشتمل طاقت ور گروہ ایسے ہیں جنھوں نے اراضی کی غیر منصفانہ تقسیم سے فائدے اٹھائے ہیں۔ اس مفاد پرست گروہ کو عام طور سے ''لینڈ مافیا'' یا ''اراضی کے مجرم'' کہہ سکتے ہیں۔ اعلیٰ ریٹائرڈ اور فوجی افسر اب اپنی ذات کے لیے مزید مالی فوائد طلب کرنے لگے ہیں۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی جیسے شہری منصوبے سرمایہ کاروں کو فائدے پہنچانے کے لیے شروع کیے جاتے ہیں۔ متعدد معاملات میں حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ فوجی ملی بھگت سے اراضی حاصل کرتے ہیں۔ بعض اور صورتوں میں لاہور جیسے بڑے شہروں میں بااثر سیاست داں بھی ان فوجیوں کے ساتھ مل کر ایک مثلث بنا لیتے ہیں۔

متعدد حاضر ملازمت جنرلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جائیدادوں سے کروڑوں کمائے ہیں۔ مقامی فوجی حکّام کی مدد سے کم قیمت اراضی حاصل کر کے مہنگے داموں بیچی جاتی ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد جائیدادوں کی قیمتیں اور چڑھیں۔☆[126] اس صورتِ حال میں مشرف کے بدعنوانی کو ختم کرنے کے دعوے ہوا ہو گئے۔

ایک زیادہ اہم الزام یہ بھی ہے کہ جنرل مشرف نے بدعنوانی ختم کرنے کے بجائے مخصوص مفادات کا براہِ راست تحفظ کیا ہے۔ مشرف کا دعویٰ ہے کہ فوجیوں کے زیرِ اختیار اراضی بہتر انتظام کی بدولت مہنگی ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی بلکہ فوج پر لوگوں کا اعتماد ہی مالیاتی فائدے کا باعث بنتا ہے۔ 1998ء میں ملتان، لاہور اور سرگودھا میں ایک سروے کیا گیا تو پتا چلا کہ فوج کی موجودگی سے اراضی کی قیمتیں بڑھتی ہیں اور اگر چھاؤنیاں بند کر دی گئیں تو اراضی کی قیمتیں گر جائیں گی کیوں کہ چھاؤنیوں میں بہتر سہولتیں اور حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔

فوجی برادری کے انفرادی ارکان کو دی جانے والی مراعات ہمیشہ ادارے کی سطح پر نہیں ہوتیں، مثلاً نجی شعبے کی ٹرانسپورٹ کمپنی واران کو لیجیے۔ یہ کمپنی آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حمید گل کی بیٹی کی ملکیت ہے۔ واران کو راول پنڈی سے اسلام آباد کے درمیان گاڑیاں چلانے کی اجازت دی گئی جس نے نجی حلقوں کے چھوٹے گاڑی چلانے والوں کو باہر کر دیا۔ اس کمپنی کی انتظامیہ اور عملہ تمام قواعد و ضوابط سے بالاتر ہو کر کام کرتا رہا ہے۔☆[127] چونکہ یہ اجازت ترجیحی بنیادوں پر دی گئی تھی، اس لیے سپریم کورٹ نے موٹر وہیکل آرڈیننس 1965ء کی دفعہ 69A کی رو سے یہ اجازت منسوخ کر دی۔ اس قانون کے مطابق صوبائی حکومتیں نجی کمپنیوں کو ترجیحی معاہدے جاری کر سکتی تھیں جن سے چھوٹی کمپنیوں کا نقصان ہو سکتا تھا۔☆[128] عدالت کا یہ فیصلہ اس وقت آیا جب جنرل حمید گل حکومت کی مخالفت کر کے حکومت کے لیے ناپسندیدہ شخصیت بن چکے تھے۔ پھر بھی کمپنی نے اپنی بسیں فوجی فاؤنڈیشن کو فروخت کر دیں اور ویسے بھی واران نے یہ گاڑیاں عسکری بینک سے حاصل کردہ قرضے سے لی تھیں۔

حاضر ملازمت افسروں کی طاقت بلاشبہ ریٹائرڈ افسروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح حاضر ملازمت سینئر جنرلز ریاستی وسائل کے استحصال کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ اس لیے معاشی ہوس گیری کو ادارے کی سطح پر بھی دیکھا جاسکتا ہے اور کمانڈروں کی انفرادی سطح پر بھی۔ پہلی سطح پر فوجی ادارے سڑکوں کی تعمیر اور شاہراہوں پر ٹول کی وصولی کے سرکاری ٹھیکے لیتے ہیں۔ FWO اور NLC جیسے ادارے نیشنل ہائی وے اتھارٹی پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں اور ویسے بھی NHA کی سربراہی ایک ریٹائرڈ میجر جنرل کے پاس ہوتی ہے جو خود بھی کسی سویلین ادارے کے مقابلے میں فوج سے ملحقہ اداروں کو ترجیح دیتا ہے۔[☆129] این ایل سی اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے بین الاقوامی پارٹنرشپ بھی حاصل کرتا ہے اور کراچی جیسے شہروں میں ریاستی اثاثے اور جائیدادیں حاصل کرتا ہے، مثلاً این ایل سی نے قطر کے ایک نجی سرمایہ کار سے مل کر ریلوے کی اراضی خریدی تاکہ اس پر ایک بڑا تجارتی پلازا تعمیر کرے۔

ایف ڈبلیو او اور این ایل سی کی تجارتی سرگرمیوں میں ملکی اور غیر ملکی پارٹنرشپ کا حصول بھی شامل ہے، مثلاً ایف ڈبلیو او نے 2004ء میں LAFCO کے نام سے ایک ذیلی ادارہ قائم کیا جس کا مقصد نجی شعبے کی پارٹنرشپ میں ایک سو پندرہ کلومیٹر لمبی لاہور۔ شیخوپورہ۔ فیصل آباد سڑک تعمیر کرنا تھا (یہ تینوں شہر وسطی پنجاب میں ہیں)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ٹھیکا حاصل کرنے کے لیے نجی شعبے سے پارٹنرشپ ضروری تھی کیوں کہ ایف ڈبلیو او کے پاس مطلوبہ آلات اور مشینیں نہیں تھیں کہ وہ تنِ تنہا ٹھیکا حاصل کر سکے۔ اس نے ملک کی بڑی تعمیراتی کمپنیوں حبیب رفیق گروپ اور سچل کنسٹرکشن کے ساتھ مل کر پارٹنرشپ قائم کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 2004ء تک فوجی کمپنیوں کو معیشت میں اپنے کردار پر پورا بھروسا ہوگیا اور دیگر کاروباری فریق بھی اُسے تسلیم کرنے لگے تھے۔ دوسری طرف نجی کمپنیاں ایف ڈبلیو او کے حکومت میں روابط سے فائدے اٹھا کر ثمرات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔

فوج اور سول پارٹنرشپ بیرونِ ملک بھی تھی، مثلاً این ایل سی کی پارٹنرشپ قطر کی کمپنی کے ساتھ بنی یا ڈی ایچ اے نے مشرقِ وسطیٰ کی مختلف تعمیراتی کمپنیوں کے ساتھ مل کر پارٹنرشپ بنائی۔ اب فوج ایک علیحدہ طبقہ بن چکی تھی جو معاشی مفادات کے لیے بین الاقوامی

روابط بھی استعمال کر سکتی تھی اور ترک فوج کی طرح سرمایہ دار اشرافیہ سے مشترکہ مفادات رکھتی تھی۔[☆130] پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ فوج نیم مطلق العنان سیاسی نظام کو اپنے مفاد میں استعمال کر کے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اپنے پارٹنروں کے لیے مراعات حاصل کرتی تھی۔

جب یہ فاؤنڈیشنیں مالی مشکلوں کا شکار ہوتی ہیں تو اس وقت بھی دفاعی انتظامیہ اپنا اثر استعمال کرتی ہے، مثلاً آرمی ویلفیئر ٹرسٹ ہمیشہ مالی مسائل کا شکار رہا ہے حالانکہ اسے جی ایچ کیو کی طرف سے رقوم ملتی رہی ہیں۔ 2001ء میں AWT نے کوئی پندرہ ارب کے خسارے میں کمی کے لیے حکومت سے تقریباً ساڑھے پانچ ارب روپے کا مالیاتی پیکیج طلب کیا۔[☆131] جب یہ معاملہ معاشی رابطہ کونسل (اکنامک کوآرڈی نیشن کونسل) کے سامنے آیا تو اس نے AWT سے کہا کہ وہ اپنی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے کراچی اور راول پنڈی میں اپنے دو تجارتی مراکز فروخت کر دے۔[☆132] یہ اعانت کی ان دوسری قسموں کے علاوہ تھی جو ٹرسٹ کو اسلام آباد سے ملتی ہے۔ 1995ء کے بعد یہ تیسرا موقع تھا کہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ 1999ء میں نواز شریف حکومت نے AWT کو اپنے کمرشل پلازا بیچنے کی ہدایت کی تھی تاکہ حکومت نے بینکوں کو جو ڈھائی ارب روپے مالیت کی ضمانت دی تھی، وہ پوری کی جا سکے لیکن ان ہدایات پر عمل نہیں کیا گیا۔[☆133] فاؤنڈیشن اور اس کو مدد دینے والی فوجی انتظامیہ اپنے مفادات سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں تھی۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ سیاسی انتظامیہ بہت کمزور تھی۔ اکتوبر 1999ء میں جب حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تو پھر فوج پر کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ اپنی پیدا کردہ مالیاتی گندگی کو صاف کرے۔

اسی طرح اعلیٰ کمانڈروں کی طاقت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ملک کے 9 کور کمانڈر فوج کی سیاسی طاقت کے بل پر بڑے خود مختار اور پُراعتماد طور پر عمل کرتے ہیں۔ عمل کی اس آزادی میں انفرادی افسروں اور اجتماعی طور پر فوجی تنظیم میں معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے زیادہ مواقع کو استعمال کرنا شامل ہے۔ اس کے لیے متعدد طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بعض یونٹوں کو گیس اسٹیشن کھولنے اور ایسی دکانیں قائم کرنے کی اجازت دی گئی جنھیں کرایے پر دیا جا سکے تو دوسری طرف بیکری یا ایسے ہی کاروبار قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔

بہاول پور میں چھاؤنی کے قریب کی قومی شاہراہ کے پاس اراضی پر عمل داری قائم کر کے ہر آنے جانے والے سے ٹول وصول کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس طرح حاصل کی جانے والی رقم کو مقامی چھاؤنی کی دیکھ بھال پر خرچ کیا جانے لگا۔ جہاں سویلین آزادی سے نہیں آ جا سکتے تھے۔ ماہرینِ قانون کے مطابق یہ عمل غیر قانونی تھا۔ ایک سینئر جج کے مطابق کنٹونمنٹ بورڈ کسی شاہراہ پر محصول عائد نہیں کرسکتا اور یہ بات قانون کی کتابوں میں واضح طور پر موجود ہے۔ اس شاہراہ پر محصول برسوں تک وصول کیا جاتا رہا اور پھر بالآخر ہائی کورٹ نے 2006ء میں فوج کے خلاف فیصلہ دے کر یہ سلسلہ ختم کرایا۔ اس مقدمے میں لاہور ہائی کورٹ کی بہاول پور بنچ کے چند اہم جج محصول کو غیر قانونی قرار دینے پر تیار تھے مگر جی ایچ کیو نے اختیارات کے اس غلط استعمال کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔

ملک کا سیاسی ماحول چونکہ ایسا ہے کہ فوج پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا، اسی لیے فوج بھی اپنے عمل درست کرنے پر توجہ نہیں دیتی۔ حالانکہ حزبِ اختلاف کی جماعتوں خصوصاً نواز شریف کی پی ایم ایل (این) اور بے نظیر بھٹو کی پی پی پی نے فوج کی اندرونی معیشت کو محدود کرنے کی بات میثاقِ جمہوریت میں کی تھی جس پر مئی 2006ء میں دستخط ہوئے تھے، لیکن فوج کی کاروباری سرگرمیوں کو روکنا آسان کام نہیں جب تک کہ جمہوری ادارے مضبوط نہ ہوں۔ سیاسی فریقین کا اپنی غلطیوں کو درست کرنے کی جانب میثاقِ جمہوریت ایک چھوٹا سا قدم ہے۔ صرف ایک دستاویز سے جمہوریت مضبوط نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس قسم کا اعلان فوج سے پوشیدہ گفت وشنید سے بچنے کے لیے کسی سنجیدہ کوشش سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ 1990ء کے عشرے میں سویلین حکومتیں بھی مسلح افواج کی معاشی طاقت بڑھانے میں برابر کی ذمے دار ہیں۔

اس باب میں زیرِ گفتگو عرصے میں فوج کی بڑھتی ہوئی معاشی سلطنت فوج کے بڑھتے ہوئے سیاسی کردار سے منسلک تھی اور ان دونوں عناصر پر اختیار سے ہی ملک میں جمہوریت کا مستقبل بہتر ہوسکتا ہے۔ اگرچہ فوج کی اندروی معیشت لازماً اس کی سیاسی امنگ کی وجہ نہیں ہے لیکن بہت سے مالی فوائد جن کی سینئر افسروں کو تلاش رہتی ہے، ان کے اقتدار پر قائم رہنے اور مفاد کو بڑھانے پر مجموعی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس عرصے کے دوران میں فوجی

کاروبار کی ترقی اس کے ثالث سے آگے بڑھ کر والدین/ سرپرستوں کی قسم کے کردار میں تبدیلی کی ہے جو معاشرے اور معیشت پر کنٹرول کرنے کے لیے بہت خواہش مند ہیں۔ فوجی تنظیم خود کو ایک ایسے متبادل ادارے کے طور پر دیکھتی ہے جسے ہر قسم کی قومی سرگرمیوں پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ بہرحال فوجی کاروبار کی ترقی کی وجوہ ایثار پسندانہ نہیں ہیں۔ فوج کی اندرونی معیشت کی ترقی ادارے کے اپنے مفاد اور سینئر افسروں کا سفاکانہ حصول ہے۔

اس باب میں فوج کی جس معاشی سلطنت کی ترقی پر بحث کی گئی ہے، وہ تنظیم کی سیاسی قوت اور قومی فیصلے کرنے میں اثرات کے متوازی ہے۔ فوج نے جوں جوں خود کو ایک طبقے میں مجتمع کرلیا، اسی لحاظ سے قومی وسائل کو استعمال کرنے اور زیادہ مواقع حاصل کرنے میں زیادہ پُراعتماد ہوتی گئی جس نے اسے بطورِ ادارہ فائدہ پہنچایا اور سینئر جنرلوں کے جیب بھی بھر دی۔ فوجی کاروبار کی ترقی فوجی افسران کی ان معاشی کارگزاریوں کو نمایاں کرتی ہے جو سیاسی نظام کو نیم مطلق العنان رکھتی ہے اور اس طرح جنرلوں کو اپنے اور اپنے شرکا کو فوائد حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ان معاشی مفادات کی شفافیت ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

باب-7

نئے زمیں دار

پاکستانی جنرلوں کے قانونی اثاثوں کا تخمینہ کوئی پندرہ کروڑ سے چالیس کروڑ روپے تک فی جنرل لگایا جاتا ہے۔ ان اثاثوں میں اعلیٰ کمانڈروں کی دیہی اور شہری جائیدادیں شامل ہیں۔ قومی وسائل اور خصوصاً شہری اور دیہی اراضی کے منظّم استحصال نے فوجی افسروں کو خاصا مال دار بنا دیا ہے۔ فوج کے نزدیک زرعی اراضی کا حصول دراصل نوآبادیاتی روایات کا تسلسل ہے جس میں حکمرانوں کی طرف سے فوجیوں کو اراضی عطا کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ شہروں میں املاک کے حصول کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ فوجیوں کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کام سے اُن کی لگن برقرار رکھنے کے لیے اُنھیں گھروں کی سہولتیں فراہم کرنا ضروری ہے۔

شہری اراضی ہتھیانے کی منطق یہ دی جاتی ہے کہ قوم کو اپنے تحفظ کے لیے فوجیوں کو سماجی تحفظ دینا چاہیے۔ تاہم زیرِ نظر باب میں ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ارضی کا حصول روایات یا پیشہ واریت کے باعث نہیں بلکہ افسروں کی مالیاتی ہوس کا نتیجہ ہے۔ اراضی کے حصول کی پالیسی دراصل حریفانہ رویوں کا ہی اظہار ہے۔

مسلح افواج کے زمینی مفادات میں توسیع زیادہ تر فوجی حکومتوں کے دوران ہی ہوئی۔ اراضی کا حصول صرف سرمایے کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا مقصد زمیں داروں اور عوام کے مقابل فوج کی طاقت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اراضی کے حصول سے فوج اب خود فیوڈل یا

جاگیردار شکل اختیار کر چکی ہے۔ بے زمین مزارعوں یا عام سپاہیوں کی طرف اعلیٰ فوجی افسروں کا رویہ بھی کسی بڑے فیوڈل جیسا ہی ہوتا ہے۔ زرعی زمینوں کے مالک فوجی افسر اپنی طاقت اور اختیارات استعمال کرتے ہوئے ان سپاہیوں کی خدمات سے فائدے اٹھاتے ہیں جن کی تنخواہیں سرکاری خزانے سے دی جاتی ہیں۔

فوج اور اراضی

اس وقت پاکستان کی فوج کا شمار ملک کے بڑے زمیں داروں میں ہوتا ہے کیوں کہ اس کے پاس کسی بھی دوسرے ادارے یا گروہ سے زیادہ اراضی ہے۔ فوج کے پاس تقریباً ایک کروڑ سولہ لاکھ ایکڑ اراضی ہے جو مجموعی ریاستی اراضی کا کوئی بارہ فی صد ہے۔ ویسے تو پاکستان ریلوے جیسے سرکاری محکموں کے پاس بھی زمینیں ہیں مگر فوج اور دیگر سرکاری محکموں میں خاصا فرق ہے۔ دیگر سرکاری اداروں کے برعکس مسلح افواج سرکاری اراضی کو نجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ فوج واحد سرکاری ادارہ ہے جو اپنی برادری میں اراضی کی تقسیم بڑے منظم طریقے سے کرتا ہے۔ اس تقسیم کو جنرل ضیاء الحق کے دور میں باقاعدہ شکل دی گئی اور فوج کو پیشہ ورانہ ضروریات کے لیے دی جانے والی اراضی کو افسروں میں تقسیم کیا جانے لگا۔

اراضی اور دیگر متعلقہ وسائل پر اجارہ داری قائم کر کے نہ صرف انفرادی اور گروہی دولت میں اضافہ کیا گیا بلکہ ان کے سیاسی و سماجی رُتبے کو بہتر بنایا گیا۔ فوج اپنے سیاسی اثر و رسوخ کی بدولت اراضی کے استعمال کا مقصد آسانی سے تبدیل کر لیتی ہے۔ اراضی کی تقسیمِ نو کے باعث ملک کی طاقت ور اشرافیہ اور عوام کے تعلقات پر بھی اثر پڑتا ہے جس میں فوج کو اشرافیہ کا ہی حصہ سمجھا جاتا ہے۔

فوج اور دیہی اراضی

فوج زرعی اراضی میں بھی اپنے مفادات رکھتی ہے۔ ایک کروڑ اٹھاون لاکھ ایکڑ میں

سے جسے مسلح افواج کنٹرول کرتی ہیں، کوئی ساٹھ فی صد حصہ دیہی علاقوں میں ہے جس کی تقسیم کچھ اس طرح ہے:

- تقریباً ستّر ہزار ایکڑ اراضی فوج کے براہِ راست اختیار میں ہے جسے کیمپنگ گراؤنڈ اور فارموں وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
- تقریباً پینتیس ہزار ایکڑ اراضی آرمی ویلفیئر ٹرسٹ، فوجی فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن جیسے ذیلی اداروں کے پاس ہے۔
- کوئی اڑسٹھ لاکھ ایکڑ اراضی مسلح افواج کے انفرادی ارکان کے پاس ہے۔

یاد رہے کہ کسی اور سرکاری ادارے کے پاس یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنے افسروں کے فائدے کے لیے سرکاری اراضی بانٹ دے جب کہ فوج تقریباً اڑسٹھ لاکھ ایکڑ اراضی اپنے افسروں اور غیر افسر ملازمین میں ذاتی استعمال کے لیے بانٹ چکی ہے۔

پیشہ ورانہ ضرورتوں کے لیے دی جانے والی اراضی

فوج کوئی ستّر ہزار ایکڑ اراضی کو پیشہ ورانہ ضرورتوں کے لیے استعمال کرتی ہے جن میں فارمنگ اور کیمپنگ گراؤنڈ بھی شامل ہیں۔ اس اراضی میں کوئی ساٹھ ہزار ایکڑ پنجاب میں ہے جس پر جئی اور گھاس کے فارم ہیں تاکہ گھوڑے پالے جاسکیں۔ ان کے علاوہ ڈیری فارم بھی ہیں۔ یہ اراضی 1947ء میں آزادی سے پہلے ہی حاصل کرلی گئی تھیں۔ آج بھی پنجاب حکومت کی سرکاری اراضی میں فوج کا بڑا حصہ ہے کیوں کہ اس کے پاس کوئی اڑتیس فی صد یعنی اڑسٹھ ہزار ایکڑ سرکاری زمین ہے۔☆[1]

فوج کے زیرِ استعمال تمام فارم اے ون کلاس اراضی میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تفصیل فوج کے لینڈ مینول سے ملتی ہے۔ ڈپارٹمنٹ آف ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ (MLC) دیہی اور شہری علاقوں میں زمینوں کا انتظام کرتا ہے۔ MLC کے پاس سات مختلف قسم کی اراضی ہیں۔ جن کی بنیاد 1937ء کے برٹش کنٹونمنٹ لینڈ ایڈمنسٹریشن رولز پر ہے۔ اے ون قسم کی اراضی صرف فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہونا تھی جن میں قلعہ بندیاں، فوجیوں کی اقامت گاہیں

یعنی بیرکیس، اسٹور، اسلحہ خانہ، ہوائی اڈا، ہینگر، فوج کے لیے مکانات، پریڈ گراؤنڈ، فوج کے تفریحی میدان، رائفل رینجز، فارم، بھٹے، شفاخانے اور باغات شامل ہیں۔ جب کہ اے ٹو قسم کی اراضی تفریحی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اے ٹو قسم کی زمینیں درحقیقت فوج کے استعمال یا قبضے میں نہیں ہوتی بلکہ اسے غیر لازمی سرگرمیوں یعنی تفریح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

بی ٹائپ کی اراضی کو مزید چار ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے جو بی ون، بی ٹو، بی تھری اور بی فور کہلاتی ہیں۔ بی ون ٹائپ کی اراضی وفاقی حکومت کی ملکیت اور زیرِ انتظام ہوتی ہے اور اس اراضی کو عبادت گاہوں، قبرستانوں اور دیگر مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بی ٹو ٹائپ کی اراضی صوبائی حکومت کی ملکیت ہوتی ہے جس سے آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ بی تھری ٹائپ کی اراضی نجی نوعیت کی ہوتی ہے جہاں بازار، مذہبی عمارتیں، مقدس تالاب یا عوامی قبرستان وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ملٹری لینڈ مینول کے مطابق ایسی اراضی حاصل کرنے پر حکومت اراضی کے مالک کو معقول معاوضہ ادا کرتی ہے۔ بی فور ٹائپ کی اراضی درجِ بالا تینوں اقسام میں سے کسی میں شامل نہیں ہوتی۔

ان کے بعد سی کلاس اراضی ہوتی ہے جن میں نالے اور لبِ سڑک پلاٹ شامل ہوتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ برصغیر میں چھاؤنیاں مکمل طور پر برطانوی ملکیت نہیں تھیں بلکہ یہ نجی املاک ہوتی تھیں جنھیں دفاعی ضرورتوں کے لیے حاصل کیا جاتا تھا۔ دفاعی انتظامیہ کی ملکیت صرف وہ اراضی ہوتی تھی جہاں فوجی اقامت گاہیں یا بیرکیس ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ ایک حملہ آور ملک تھا جو یہاں پر طویل المیعاد مفادات قائم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

برطانوی حکومت اور بعد میں حکومتِ پاکستان نے فوج کے لیے اراضی لینڈ ایکویزیشن ایکٹ مجریہ 1894ء کے تحت حاصل کی، جس کے مطابق زیرِ تصرف جائیداد کا مالک اس وقت تک مالک رہے گا جب تک کہ مجاز ادارہ قبضہ حاصل نہ کرلے۔ اس کے بعد مالک جائیداد کے تمام حقوق و مفادات سے محروم ہوجائے گا جو حکومت کو منتقل ہوجائیں گے۔[☆2] اسی قانون کے مطابق ریاست عوامی مقاصد کے لیے لوگوں کی اراضی پر قبضہ کرسکتی ہے۔[☆3] تاہم اس قانون سے اراضی کے حصول، تقسیمِ نو اور استعمال کی وضاحت نہیں ہوتی۔

یہ قانون فوج کو اس امر سے نہ روک سکا کہ وہ اراضی کی قسموں کو تبدیل کر کے ان پر گولف کے میدان بنا لے یا رہائشی منصوبے شروع کر دے اور سویلین حکومت یا افسروں سے اجازت بھی نہ لے۔ 2003ء میں پارلیمنٹ کی ایک بحث سے پتا چلا کہ فوج نے کیمپنگ کے چند میدانوں کو گولف کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جن کا مقصد مفادِ عامہ نہیں بلکہ مخصوص لوگوں کو تفریح فراہم کرنا تھا۔ پارلیمنٹ میں پوچھے جانے والے سوالات سے واضح تھا کہ ارکان اسے ریاستی اراضی کا غلط استعمال سمجھتے تھے۔ وزارتِ دفاع نے جواب دیا کہ فوج کے زیرِ انتظام اراضی پر اس کا مکمل اختیار ہے۔☆4 بہت سے دوسرے معاملات میں بھی یہی کیا گیا، مثلاً نوشہرہ میں ایک فائرنگ رینج پر کینو کے باغ لگا دیے گئے۔☆5

فوج اراضی پر اپنے قبضے کا نہ صرف دفاع کرتی ہے بلکہ اس سے متعلق معلومات پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے۔ بی بی سی کے ایک صحافی کے مطابق بہت کوشش کے باوجود محکمۂ شماریات اور MLC جیسے سرکاری اداروں سے فوجی اراضی کی تفصیلات حاصل نہیں کی جاسکیں، بلکہ صحافی کو دھمکی آمیز لہجے میں کہا گیا کہ اُسے کوئی معلومات فراہم نہیں کی جائیں گی۔☆6

فوج کی سیاسی طاقت کے ڈر سے وفاقی اور صوبائی حکومتیں اس امر پر خاموش رہتی ہیں کہ مسلح افواج اراضی کے استعمال کی نوعیت بدل کر اسے مخصوص لوگوں کے فائدے میں استعمال کرتی ہیں، مثلاً آڈیٹر جنرل کے محکمے نے 2006ء میں نشان دہی کی کہ پنجاب حکومت نے لینڈ ایکویزیشن ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فوج کو جہلم میں گولف کا میدان بنانے کے لیے تیس ایکڑ اراضی دی جس کی کم از کم مالیت بھی سات کروڑ روپے سے زائد تھی۔ رپورٹ کے مطابق بازار میں اس اراضی کی قیمت کہیں زیادہ تھی اور گولف کورس اے ون ٹائپ اراضی پر بنایا گیا تھا جو صرف دفاعی مقاصد کے لیے استعمال کی جاسکتی تھی۔☆7

زراعت میں فوج کی براہِ راست شمولیت اور دیہی اراضی پر قبضوں کی بات اس وقت سامنے آئی جب 2001ء میں وسطی پنجاب کے ضلع اوکاڑہ میں بے زمین کسانوں اور فوجیوں کے درمیان تصادم ہوا۔ یہ فارم اوکاڑہ اور رینالہ کے فوجی فارم گروپ کا حصہ ہیں جو ساڑھے سولہ ہزار ایکڑ سے زائد اراضی پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں دو ڈیری فارم، سات فوجی فارم

(جئی اور گھاس کے) اور بارہ گاؤں شامل ہیں۔

اس مجموعی اراضی پر اوکاڑہ اور رینالہ کے کوئی ڈیڑھ ہزار کسان کاشت کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ دیہات اور اراضی کیتھولک چرچ کے کنٹرول میں تھے اور یہاں رہنے والے چرچ کے کرایے دار (مزارع) تھے۔☆[8] تاہم حکومتِ پنجاب ہی اس اراضی کی مالک تھی جو دیگر لوگوں یا اداروں کو یہ اراضی لیز پر دیتی تھی اور تقسیم سے قبل ہی یہ اراضی فوج کو لیز پر دی جا چکی تھی۔

مزارعین کے لیے مالکانہ حقوق مسئلہ نہیں تھے کیوں کہ وہ بٹائی پر کاشت کاری کرتے تھے اور اراضی کے مالک یا مختار کے ساتھ اخراجات و پیداوار میں شریک تھے۔ معاہدے کی نوعیت ایسی تھی کہ قانون بھی اراضی پر مزارعین کے دعوے کو تسلیم کرتا تھا اور یہ دعویٰ ملکیت کی طرح ہی پختہ تھا۔ اگر اراضی بیچی جاتی تو کرایے داروں کا دعویٰ اوّلین ہوتا۔ اس طرح کرایے کے سادہ معاہدے کی نسبت مزارعین بہتر صورتِ حال میں ہوتے کیوں کہ کرایے کے معاہدے میں تو کاشت کاری کے بدلے مختص رقم یا مصدقہ کرایہ ملتا تھا۔

فوج نے یک طرفہ دھاندلی سے معاہدے کو بٹائی کے بجائے نقد کرایے داری میں بدل دیا۔☆[9] اس فیصلے سے کرایے داروں میں بے چینی پھیلی جو اوکاڑہ اور اس کے قریب رینالہ میں عرصے سے رہ رہے تھے۔ کرایے داروں کو خدشہ تھا کہ نئے معاہدوں کے تحت فوج (جو اراضی کی اصل مالک نہیں تھی) اُنھیں گھروں سے باہر پھینک سکتی تھی۔ جب کاشت کاروں نے احتجاج کیا تو فوج نے اپنا من مانا فیصلہ بزورِ طاقت مسلط کرنے کی کوشش کی۔ فوج اور نیم فوجی دستوں نے مقامی دیہی آبادی کا محاصرہ کرلیا جس سے خانہ جنگی جیسی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔

دستاویزی بیانات کے مطابق فوج غریب مزارعوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آئی اور تشدد کے نتیجے میں آٹھ معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔ نیم فوجی رینجرز نے دو مرتبہ گاؤں کا محاصرہ کیا، کرفیو لگایا اور لوگوں کی نقل و حرکت کو محدود کردیا۔ دواؤں اور دیگر اجناس کی ترسیل روکنے کے علاوہ دوسرے طریقے سے بھی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔ ہیومن رائٹس واچ کی ایک رپورٹ میں اُن دیہاتیوں کے بیان شامل ہیں جنھیں فوجی حکام نے نشانہ بنایا۔

فوجی حکام کا دعویٰ تھا کہ یہ کوئی انسانی حقوق کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ یہ مقامی نقصِ امن کا

مسئلہ تھا جو چند غیر سرکاری تنظیموں نے کھڑا کیا تھا۔[10] فوجی ذرائع کے مطابق مزارعین لالچ اور بدنیتی کے باعث "ملکیت یا موت" کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ایک پاکستانی محقق عائشہ سلمیٰ کری آپر کے مطابق فوج مالکانہ حقوق پر کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کیوں کہ اسے اے ون ٹائپ کی اراضی کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ تھا۔[11]

عائشہ سلمیٰ کری آپر کا کہنا ہے کہ طاقت کا استعمال فوج کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مظہر تو ہے۔[12] لیکن بے رحمی جاگیردارانہ رویے کی عکاس ہے۔ سلمیٰ نے فوج کی منافع بخش سرگرمیوں کے باعث اسے ایک سرمایہ دار قوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ تاہم یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستانی فوج کا مؤقف سرمایہ دارانہ ہوتا تو وہ ہر قیمت پر اوکاڑہ فارم پر قبضہ کرنے پر مصر نہ ہوتی۔ فارموں پر شہریوں اور فوج کے تصادم سے اخراجات بڑھ رہے تھے جو سرمایہ داری کے لیے اچھا نہیں تھا۔[13] اس معاملے میں فوج کی خودسری اس کی مطلق العنانیت کا مظہر تھی جو فوج کی دیرینہ روایت رہی ہے۔ اوکاڑہ کے کاشت کاروں کے ساتھ رویے سے کسی جاگیردارانہ یا وڈیرے کا گمان ہوتا ہے جو اپنے ہاریوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آتا ہے اور انھیں نجی زندانوں میں بند رکھتا ہے۔

سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے یہ تصادم فوجی طاقت اور اس فیصلہ کن رویے کا ایک مظہر ہے کہ وہ اس طاقت کو قائم رکھے گی۔ فوج کی اعلیٰ قیادت کو خطرہ تھا کہ مزارعوں کو کوئی رعایت دینے سے معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔[14] اور فوج کو دیگر سیاسی و سماجی قوتوں کے مقابل سبکی اٹھانی پڑے گی۔ اس طرح یہ بات صرف مالکانہ حقوق تک محدود نہیں تھی بلکہ اسے فوج کے عزت و وقار کا مسئلہ سمجھا گیا۔ اس رویے سے یورپ کی فیوڈل افواج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو غاصبانہ قبضے کو اپنی طاقت کا مظہر سمجھتی تھی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اوکاڑہ میں فوج ایسی اراضی کا معاہدہ تبدیل کر رہی تھی جو فوج کی ملکیت تھی ہی نہیں۔ اس طرح فوج پنجاب حکومت کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ یہ معاہدہ 1913ء میں برطانوی فوج کے ساتھ کیا گیا تھا جس کی رُو سے ساڑھے پینتیس ہزار ایکڑ اراضی پنجاب حکومت نے فوج کے حوالے کی تھی۔ 1913ء میں بیس

سالہ لیز کا معاہدہ کیا گیا جسے 1933ء میں مزید پانچ سال کے لیے بڑھا دیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت اراضی کو فوج کے گھوڑوں کے لیے جئی اور گھاس اُگانے کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔ محکمۂ محصولات کے اعلیٰ افسروں کے مطابق پاکستانی فوج کو یہ لیز برطانوی دور سے ورثے میں ملی اور اسی لیز کی مدت بھی ان واقعات سے 15 سال قبل ختم ہوچکی تھی۔ اور اس کی توسیع کی کوئی فکر نہیں کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ لیز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اراضی پر جئی اور گھاس کے فارم کے بجائے ڈیری فارم بنائے گئے۔☆[15] جب کہ لیز کے مطابق وہاں صرف چارہ اُگایا جاسکتا تھا۔☆[16]

اوکاڑہ فارم کے مسئلے پر واحد تحقیقی رپورٹ اس فارم کے انتظام کے بارے میں دل چسپ حقائق بیان کرتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ فوجی حکام کے دعووں کے برعکس کہ فارموں سے ہونے والی آمدنی حکومت کو دی جاتی ہے، دراصل فارم کی فوجی انتظامیہ ساری آمدنی خود رکھ لیتی تھی۔☆[17] دوسری بات یہ کہ فارم سے حاصل ہونے والے دودھ اور گوشت کی بڑی مقدار اعلیٰ افسروں کو رشوت کے طور پر دی جاتی تھی۔ عائشہ سلمیٰ کا دعویٰ ہے کہ آڈیٹر جنرل کے محکمے نے فارم کے فوجی حکام پر بدانتظامی کے الزام لگائے تھے نہ کہ مزارعین کو آمدنی کے نقصان کا ذمے دار قرار دیا گیا ہو۔☆[18]

فوج کے ترجمان یعنی انٹرسروسز ریلیشنز (ISPR) کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل شوکت سلطان نے فوج کا دفاع کرتے ہوئے کہا:

> فوج کی ضروریات کا تعین خود فوج کرے گی یا حکومت کرے گی۔ کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ فوج کو بتائے کہ پانچ ہزار یا سترہ ہزار ایکڑ پر کیا کرنا چاہیے۔ فوج اپنی ضروریات کا تعین خود کرے گی۔☆[19]

اراضی کے استعمال میں من مانی تبدیلی سے ہیوگوگروشیئس (Hugo Grotius) کے بیان کردہ حقِ فائق (eminent domain) کی خلاف ورزی ہوتی تھی جس کے مطابق کسی مملکت کے اندر تمام املاک پر حکومت کا حقِ تصرف ہے جس کی بدولت وہ مالک کو معاوضہ دے کر اس کی نجی جائیداد سرکاری استعمال میں لاسکتی تھی۔ گروشیئس (Grotius) کے مطابق:

حقِ فائق کے تحت لوگوں کی زمین بھی ریاست کی ملکیت ہے اور ریاست یا اس کا کوئی نمائندہ اس جائیداد کو استعمال کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ مفادِ عامہ کے لیے لوگوں کی املاک کو تباہ بھی کیا جاسکتا ہے۔[☆20]

اس قانون کے اطلاق کا انحصار ریاست کی سیاسی نوعیت پر ہوتا ہے۔ امریکا میں حقِ فائق کی تشریح جان لاک کے لبرل فلسفے کے مطابق کی جاتی ہے۔ امریکی آئین کی پانچویں ترمیم نجی املاک کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ لاک نے اس حق کی تو حمایت کی کہ حکومت چلانے کے اخراجات لوگوں سے وصول کیے جائیں مگر اس کے لیے لوگوں کی نجی املاک کو نہ چھیڑا جائے۔[☆21] اس حق کا تحفظ انقلابِ فرانس نے انسانی حقوق کے اعلامیے کے ذریعے 1789ء میں کیا۔ اس اعلامیے کے مطابق ''نجی ملکیت کا حق مقدس ہے جسے چھیڑا نہیں جاسکتا تاوقتے کہ عوامی مفاد میں ایسا کرنا نہایت ضروری ہو مگر اس کے لیے بھی معاوضہ ادا کرنا ضروری ہے۔''[☆22] یاد رہے کہ ان حقوق کے لیے فرانس اور امریکا کے لوگوں نے طویل جدوجہد کی۔ اگرچہ پاکستان میں رائج لینڈ ایکویزیشن ایکٹ مجریہ 1894ء بھی املاک پر قبضے کی شرائط بیان کرتا ہے مگر سیاست میں مطلق العنانیت کے باعث ان پر عمل نہیں ہوتا۔

لاک کے فلسفے کے برعکس ہابس ریاست کے معاشرے پر بے رحمانہ اور مطلق العنان کنٹرول کا حامی ہے۔ یہ کنٹرول کسی فرد کا بھی ہوسکتا ہے اور گروہ کا بھی جو باقی آبادی کے لیے اچھے یا برے کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اوکاڑہ فارم کے معاملے میں یہی طریقہ آزمایا گیا۔ پاکستانی ریاست بنیادی طور پر فیوڈل ہے اور ہابس کے نظریے سے بہت قریب ہے جس کے مطابق حکمران ٹولہ ہی ''مفادِ عامہ'' کا تعین کرتا ہے۔ چونکہ فوج بھی بالادست اشرافیہ کا حصہ ہے، اس لیے وہ بھی فیوڈل رویے کی نقالی کرکے وسائل پر اجارہ داری قائم کرتی ہے اور سرمایے کے بہاؤ کا تعین کرتی ہے۔ پاکستانی فوج نے جس طرح اراضیوں پر قبضہ کیا اور منافع کمایا اس کی مثال امریکا، فرانس، اسرائیل، بھارت اور کسی بھی ایسے ملک میں نہیں ملی کہ جنھوں نے شعوری طور پر سرمایہ داری کا راستہ اپنایا ہو۔

زراعت میں فوج کے ذیلی ادارے

فوجی فاؤنڈیشن، آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور بحریہ فاؤنڈیشن جیسے فوج کے ذیلی اداروں نے بھی دفاعی انتظامیہ کی اراضی بخشنے کی پالیسی سے فائدے اٹھائے۔ سندھ میں نوکرجی کے قریب فوجی فاؤنڈیشن کا فارم کوئی ڈھائی ہزار ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔[☆23] قریب ہی فاؤنڈیشن کی شوگرمل بھی ہے، اس لیے فارم پر گنے کے نت نئے تجربات کیے جاتے ہیں۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی ملکیتی زرعی اراضی فوج کی شراکت کے ساتھ اوکاڑہ فارم میں بھی ہے۔ بحریہ فاؤنڈیشن کے ڈیری فارم بحریہ کے افسروں کو سستے داموں دودھ اور ڈیری کی دیگر مصنوعات فراہم کرتے ہیں۔

فوجی زمیں دار

اراضی کے استحصال کی سب سے نمایاں مثال فوجیوں کو زرعی املاک کی منتقلی ہے۔ فوج نے افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے لیے کوئی ستر لاکھ ایکڑ اراضی حاصل کی ہے۔ فوج کو اراضی دیے جانے کی روایت نوآبادیاتی دور کی روایت کا تسلسل ہے۔ جب اراضی کے بدلے وفاداریاں خریدی جاتی تھیں۔ 1857ء کے بعد برطانوی حکومت نے اپنے وفاداروں کو اراضی اور آبی وسائل سے نوازا۔[☆24] علاقائی سیاست کے ایک ماہر تجزیہ نگار مصطفیٰ کمال پاشا کے مطابق فوج کو اراضی اس کی پیشہ ورانہ ضرورتوں کے لیے یا اس مہارت کے عوض دی گئی تھی جو مادی قوتوں، نظریات اور اداروں کی نمائندگی کرتی تھی جو نوآبادیاتی سرمایہ داری سے مربوط تھیں۔[☆25]

پنجاب ایلین نیشن آف لینڈ ایکٹ مجریہ 1900ء کے تحت برطانوی مفادات کی خدمات کرنے والوں کو کینال کالونیوں میں اراضی دی گئی۔ (یہ وہ زمینیں تھیں جو پنجاب اور دیگر صوبوں میں نئی نہروں کی تعمیر سے قابلِ کاشت بن گئی تھیں)۔ عمران علی نے پنجاب میں زراعت کے ارتقا پر تحقیق کر کے لکھا ہے کہ مختلف اسکیموں کے تحت مقامی لوگوں کی اراضی

ہتھیائی جاتی تھی، مثلاً ایسے گھوڑے پالنے کے لیے جنھیں بعد میں برطانوی گھڑسوار دستے خرید سکیں۔ وفاداروں کونوازنے کے اصول کے تحت بازیاب کی جانے والی اراضی کا دس فی صد حصہ مسلح افواج کے لیے رکھا جاتا تھا۔ اراضی تقسیم کرنے کے اس عمل کو بعد میں کلونائزیشن آف لینڈ ایکٹ مجریہ 1912ء میں شامل کیا گیا جس کی 1965ء میں حکومتِ پاکستان نے تجدید کی۔

یہ قانون ایک جاگیردارانہ استحکام تھا جو مقامی سماجی طبقات کی اس تخلیق سے فائدہ اٹھاتا تھا جو نوآبادیاتی آقاؤں کے مفادات کی خدمت کرتا تھا۔ یہ نظام معاشرے کے اندر رشتوں پر اثرانداز ہوتا تھا کیوں کہ افراد، گروہوں، قبیلوں یا خاندانوں کو وہ ریاستی سرپرستی درکار ہوتی تھی جو ان کی طاقت اور دولت میں اضافہ کرسکے۔ نسبتی طاقت باہمی رشتوں اور اداراتی رشتوں کا تعین کرتی ہے۔

اس طرح کے قوانین سے چودھویں صدی کے ایشیا کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جہاں سلطنتِ عثمانیہ اور منگول حملہ آور اپنے سپاہیوں کو نقد یا اراضی کی شکل میں انعامات دے کر وفاداریاں خریدتے تھے۔[26☆] یورپ میں بھی چارلس مارٹیل (741-681) جیسے حکمرانوں نے فیوڈل نظام کو مہمیز دی اور کلیسا کی ایک تہائی اراضی کی تقسیمِ نو کرکے مسلح گھڑسوار دستے تیار کیے۔[27☆] اراضی ملنے سے سپاہیوں کو بھی وفاداری کی ترغیب ملتی اور بادشاہ کے زیرِ نگیں لوگ بھی رعب میں رہتے کیوں کہ اراضی ہی دولت اور اثرورسوخ کی ضامن سمجھی جاتی تھی۔

اگرچہ پاکستان کی مسلح افواج جدید ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، پھر بھی جنرلوں نے کبھی بھی پرانی جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی روایات کا دامن نہیں چھوڑا۔ کلونائزیشن آف لینڈ ایکٹ 1912ء کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ ملک کے چاروں صوبوں میں فوجیوں کو صرف بیس سے ساٹھ روپے فی ایکڑ کے حساب سے اراضی دی گئی۔ پنجاب اور سرحد کے چند اضلاع سے ملنے والے اعداد وشمار کے مطابق ہر ضلعے میں اوسطاً کوئی ایک لاکھ نوے ہزار ایکڑ اراضی 1965ء سے 2003ء کے دوران فوجی افسروں کے درمیان بانٹی گئیں۔ ان زمینوں کی قیمت کا نامکمل اندازہ جدول 7.1 میں دیا گیا ہے۔

زمین کی تخمینی مجموعی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے جو جدول 7.1 میں دی گئی ہے۔ انگریزی کے روزنامے ''ڈان'' کی ایک رپورٹ کے مطابق 1981ء میں کچھ اراضی پچاس روپے فی ایکڑ کے حساب سے دی گئی۔ 1994ء میں یہ قیمت بڑھا کر ساٹھ روپے فی ایکڑ کر دی گئی۔☆[28]

جدول 7.1 1965ء سے 2003ء کے درمیان فوجیوں کو الاٹ کردہ زمینیں

ضلع	صوبہ	رقبہ (ایکڑ میں)
ڈیرہ اسماعیل خان	سرحد	185,000
مظفر گڑھ	پنجاب	173,000.7
ڈیرہ غازی خان	پنجاب	153,000.5
راجن پور	پنجاب	133,000.3
وہاڑی	پنجاب	170,987
پاک پتن	پنجاب	193,676
ملتان	پنجاب	123,793
خانیوال	پنجاب	143,283
ساہیوال	پنجاب	173,407
لاہور	پنجاب	273,413
قصور	پنجاب	387,283
شیخوپورہ	پنجاب	193,863
کل رقبہ	ایکڑ میں	2,303,706.5

فوجی اراضی کا تخمینہ (7.1)

اگر پچاس روپے فی ایکڑ کو حاصل کردہ اراضی کے رقبے سے ضرب دیا جائے تو کل رقم کوئی ساڑھے تیرہ کروڑ روپے بنتی ہے جو ریاست نے 1965ء سے 2004ء کے دوران وصول کی۔ تاہم بازار کے نرخ یعنی کوئی ایک لاکھ روپے فی ایکڑ کے حساب سے تخمینہ لگایا جائے تو رقم اندازاً 270 ارب روپے ہونی چاہیے۔

اور اگر بازار کے موجودہ نرخ کے حساب سے جوڑا جائے تو فی ایکڑ ڈھائی لاکھ روپے ملنے چاہییں یعنی کل پونے سات سو ارب روپے ریاست کو ملنے چاہییں۔ یہ ایک تخمینی حساب ہے، بالکل صحیح تخمینہ لگانے کے لیے رقبے کو اس وقت کی مروّجہ قیمت سے ضرب دینا چاہیے چونکہ درست اعداد وشمار موجود نہیں، اس لیے اوسطاً ایک لاکھ روپے فی ایکڑ سے حساب لگایا جاسکتا ہے۔ 1965ء سے 2004ء تک چار عشروں میں زمین کی قیمتیں تیس ہزار روپے فی ایکڑ سے بڑھ کر تین لاکھ روپے فی ایکڑ تک پہنچ گئی ہیں۔

یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جدول 7.1 میں دیے گئے اعداد وشمار ملک کے چاروں صوبوں کے شہری اور دیہی علاقوں میں فوجی زمین کی مجموعی صورتِ حال نہیں بتاتے۔ اس زمین کا زیادہ مختصر حساب جدول 7.2 میں دیا گیا ہے۔

فوج کے زیرِ اختیار اراضی صوبائی یا وفاقی حکومتوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خود فوج اراضی کے حصول کو قبضے میں شمار نہیں کرتی بلکہ اسے معمول کی بات باور کراتی ہے۔[29] یہ رویہ اس بات کو یاد دلاتا ہے کہ فوج زمین حاصل کرنے کے لیے اداراتی طریقے استعمال کرتی ہے۔ زرعی اراضی بڑی باقاعدگی کے ساتھ صوبائی حکومتوں سے وزارتِ دفاع کو منتقل کی جاتی ہیں جو تینوں افواج میں اراضی تقسیم کرتی ہے۔ پھر فوج یہ اراضی اپنے انفرادی عملے میں بانٹتی ہیں۔ زمینیں دینے کا یہ نظام جو برطانوی راج سے ورثے میں ملا تھا، اسے ایوب حکومت نے مزید موزوں بنایا۔ فوجی آمر نے فوج کو ''قبضہ شدہ'' اراضی سے حصے دے کر

فوج کو ایک طرح کا ''قبضہ گروپ'' بنا دیا۔ 1955ء سے 1965ء کے دوران گڈو، کوٹری اور غلام محمد ڈیموں کی تعمیر سے جو اراضی زیرِ کاشت آئی اس کا دس فی صد حصہ فوجیوں کو دیا گیا۔

جدول: 7.2 فوج کے زیرِ انتظام ایک کروڑ سولہ لاکھ ایکڑ اراضی کی تفصیل

	پنجاب	سندھ	سرحد/ بلوچستان
کل اراضی	62%	27%	11%
شہری	48%	19%	4%
زرعی	14%	8%	7%

1947ء کے بعد تعمیر کیے جانے والے چار ڈیموں میں سے تین ڈیم نوے لاکھ ایکڑ اراضی قابلِ کاشت بنا سکے جس میں سے دس لاکھ ایکڑ اراضی فوجیوں کو دے دی گئی۔ جن بڑے بڑے جنرلوں کو فائدے پہنچے اُن میں جنرل ایوب خان نے دوسو سینتالیس ایکڑ، جنرل موسیٰ خان نے دوسو پچاس ایکڑ اور جنرل امراؤ خان نے دوسو چھیالیس ایکڑ اراضی حاصل کی۔☆[30] فوجیوں کو ملنے والی اراضی (جس کی تلخیص جدول 7.3 میں دی گئی ہے) کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام سپاہیوں کے بجائے اعلیٰ افسر بہت فائدے میں رہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افسروں کو ملنے والی اراضی میں کمی ہوتی گئی کیوں کہ افسروں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اب میجر جنرل اور اُن سے اوپر کے عہدے دار پچاس ایکڑ اراضی لیتے ہیں اور اگر بہادری کا تمغا یا انعام مل جائے تو مزید اراضی بھی دی جاتی ہے۔☆[31]

اتنی بڑی اراضی فوجیوں کو دینے سے فوجی زمیں داروں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا ہے۔ اس کی تین وجوہ تھیں۔ پہلی تو یہ کہ سرحدی علاقوں میں ایسے لوگ آباد کیے جائیں جو دفاعی طریقوں سے واقف ہوں اور جنگی کارروائیوں کے موقعے پر کام آسکیں۔ اگر سرحدی علاقے فوجیوں کے پاس ہوں گے تو وہ سرحدوں کے تحفظ میں ذاتی دل چسپی لیں گے۔ لیکن ایسا

ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کیوں کہ زیادہ فوجیوں نے اراضی لینے کے بعد بیچ دی، خاص طور پر نچلے درجے کے فوجی جن کے پاس زمین بہتر بنانے کے وسائل نہیں ہوتے یا تو زمین چھوڑ دیتے ہیں یا مقامی زمیں داروں کو فروخت کر دیتے ہیں۔

جدول 7.3 فوجیوں کے عہدے اور رقبے کا استحقاق

عہدہ	رقبے
میجر جنرل اور ان سے اوپر	240 ایکڑ
بریگیڈیئر اور کرنل	150 ایکڑ
لیفٹیننٹ کرنل	124 ایکڑ
لیفٹیننٹ سے میجر تک	100 ایکڑ
جی سی او	64 ایکڑ
این سی او	32 ایکڑ

ماخذ: صدیقی (1997ء)

دوسری بات یہ کہ فوجی زمیں دار وجود میں آنے کا مطلب یہ لیا گیا تھا کہ دیہی درمیانے طبقے کی جو کمی تھی، وہ پوری ہو جائے گی۔ دیہی علاقوں میں مضبوط درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے باعث بڑے زمیں دار یا فیوڈل طبقہ راج کرتا تھا۔ یاد رہے کہ ایوب خان کی حکومت نے 59-1958ء میں زرعی اصلاحات متعارف کرائیں۔ ان اصلاحات کا بنیادی مقصد زمیں دار اور فیوڈل طبقے کی طاقت کو للکارنا تھا۔ ایوب خان کی مخالفت کرنے والے سیاست داں زیادہ تر اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور جنرل ایوب خان اُن پر ریاست اور فوج کی جانب سے زمینیں چھیننے کی طاقت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح زرعی اصلاحات نے دیگر تمام طبقات اور اداروں پر فوج کی بالادستی کو واضح کر دیا۔

تاہم ان اصلاحات سے فیوڈل طبقے کی کمر نہیں ٹوٹی۔ 1959ء کی زرعی اصلاحات کمیشن کی رپورٹ سے یہ بات واضح ہے۔ بڑے زمیں دار صرف آٹھ لاکھ اکہتر ہزار ایکڑ

سے دست بردار ہوئے۔ یہ مغربی پاکستان کی کل قابلِ کاشت اراضی کا جو تین کروڑ ایکڑ سے زیادہ تھی، صرف دو اعشاریہ چار فی صد حصہ تھا۔☆[32] اصلاحات نے صرف انفرادی ملکیت کی حد مقرر کی تھی اور بڑے زمیں داروں نے دیگر افرادِ خانہ کے نام پر اراضی منتقل کر کے اس قانون کا توڑ نکال لیا۔ تجزیہ نگار رونالڈ ہیرنگ کے مطابق اصلاحات نے صرف یہ کیا کہ بعض زمیں داروں نے مجبوراً کچھ اراضی اپنے مزارعوں کے نام منتقل کرا دی جس سے زراعت کی ساخت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔☆[33] اصلاحات کا اثر اس لیے بھی اور کم ہوگیا کہ بڑے زمیں داروں کو بدلے میں چار فی صد سرکاری بانڈ دیے گئے۔ اس طرح کوئی نو کروڑ روپے کا زرِاصل اور کوئی تینتیس لاکھ روپے کا سالانہ سود نو سو دو افراد کو دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو باب 5)☆[34]

تیسری بات یہ کہ فوج کو اراضی اس توقع پر دی گئی تھی کہ مسلح افواج کے لوگ سخت محنتی ہونے کی وجہ سے اس زرعی اراضی کی ترقی کو یقیناً بنائیں گے جو انھیں موسوم کی جائے گی جس سے سماجی، معاشی و سیاسی عمل آگے بڑھے گا۔ تاہم اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ فوجی زمیں داروں نے ملک کے دیہی علاقوں میں سماجی پس ماندگی دور کرنے کی کوشش کی ہو یا تکنیکی، سماجی و سیاسی عمل کو جدید خطوط پر استوار کیا ہو۔ دراصل 1990ء کے عشرے کے وسط تک فوجی زمیں دار مقامی لوگوں کو اراضی بیچ کر نقد وصول کرتے رہے۔

اس عمل نے نہ صرف مقامی زمیں داروں کو مضبوط کیا بلکہ فوج اور فیوڈل طبقے کے مشترکہ مفادات بھی پروان چڑھے۔☆[35] اس طرح فوج خود بھی فیوڈل طبقے کا حصہ بھی بنی اور آلۂ کار بھی۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ اراضی تقسیم کرنے کی پالیسی سے سب سے زیادہ فائدے اعلیٰ جنرلوں کو ہوئے جو صرف بڑی اراضی ملنے تک محدود نہیں تھے بلکہ انھیں اراضی پر ترقیاتی کام کرنے کے لیے زرِتلافی اور تکنیکی امداد کے علاوہ پانی اور سڑکوں کی فراہمی بھی شامل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ 1950ء اور 1960ء کے عشروں میں ملنے والی فوجی اور معاشی بیرونی امداد کا کچھ حصہ جنرلوں کی اراضی پر ترقیاتی کاموں میں لگایا گیا۔ جب پنجاب کے صوبائی وزیرِ خزانہ افتخار حسین ممدوٹ سے امداد کی اس منتقلی کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا، ''غیر ملکی

امداد فوج ہی کے لیے تو آئی تھی۔"☆36

تاہم بات صرف اسی زرِ تلافی پر ختم نہیں ہوتی۔ فوج کے اعلیٰ عہدے دار نہ صرف اپنی اراضی کے دورے کرتے ہیں بلکہ جنرلوں مثلاً جنرل مشرف، جنرل زیدی اور بحریہ کے سابق سربراہ عبدالعزیز مرزا کی اراضی پر حاضر سروس فوجیوں سے حفاظتی اور ترقیاتی کام بھی کرائے جاتے ہیں۔ بہاول پور میں جنرل مشرف اور جنرل زیدی کے فارموں پر ہر وقت رینجرز کے نو دس افسر موجود ہوتے ہیں اور ایڈمرل مرزا کے فارم پر نیوی کے حاضر سروس افسر ہوتے ہیں۔ اعلیٰ جنرلوں کے فارموں پر کام کرنے والے فوجیوں کو دیکھ کر سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے یورپ میں جنگجو سرداروں کی نجی افواج یا روس کے غلام یاد آتے ہیں۔ فوجی سپاہی ان گھریلو ادنیٰ کاموں کے لیے بھرتی نہیں کیے جاتے جو کرنے کے لیے انھیں آخرکار مجبور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ افسر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے پانی اور سڑکوں کی سہولت بھی حاصل کرتے ہیں جو دیگر چھوٹے زمیں داروں یا مزارعوں کو میسر نہیں ہوتیں جنھیں حکومت کی مہربانی کے طور پر زمین دی جاتی ہے۔ ان سہولیات کے سلسلے میں جاگیرداروں اور سینئر فوجی افسروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی ان آسانیوں کو حاصل کرنے کے لیے وہ سیاسی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں جو عام سپاہیوں کو دستیاب نہیں ہوتا۔ اعلیٰ افسر اپنی زمینوں کے لیے بیج، کھاد اور دیگر زرعی اشیا بھی رعایتی داموں پر حاصل کرلیتے ہیں اور پھر یہ چیزیں فوجی گاڑیوں میں اُن کی اراضی پر پہنچائی جاتی ہیں۔ فوجی افسر جب اپنی زمینوں کو بیچتے ہیں تو انھیں شان دار منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عام کسانوں یا سپاہیوں کو نہ تو زرِ تلافی ملتا ہے اور نہ زمین قابلِ کاشت بنانے کے لیے دیگر سہولتیں۔ جب کہ اعلیٰ افسروں کو بغیر کسی ذاتی محنت کے بے شمار فائدے ملتے رہتے ہیں۔

شہری اراضی کا حصول

فوج کی ابھرتی ہوئی معاشی سلطنت کو سب سے زیادہ شہرت اس کی شہری اراضی کے حصول سے ملی۔ آج فوج شہری اراضی کے حصول اور خرید و فروخت میں ایک اہم اور نمایاں

فریق ہے۔ اکثر بڑے شہروں میں فوج کے رہائشی منصوبے خاصے قیمتی ہوتے ہیں اور عام طور پر بازار کے داموں سے بہت زیادہ قیاسی (Speculative) سرمایے کو کھینچتے ہیں۔ شہری اراضی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث اس میں فوج کا تخمینہ اربوں ڈالر تک کا ہے اور یہ دستاویزوں میں نہیں ہے۔

دفاعی انتظامیہ یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ کسی بھی سرکاری اراضی کو لینڈ ایکویزیشن ایکٹ مجریہ 1894ء کے تحت ''عوامی مقاصد'' کے لیے اپنے اختیار میں لے لے۔ قانونی مبصرین شوکت محمود اور ندیم شوکت کے مطابق یہاں ''عوامی مقصد'' کی کوئی تعریف معین نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی صوابدید پر منحصر ہے۔☆[37] فوج کا سیاسی اثر ورسوخ اس تعریف کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور عوامی مقصد کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اراضی کو افسروں میں بانٹا جاسکے۔ فوج کی یہ طاقت بے مثال ہے اور اس کتاب کی ایک بنیادی دلیل کو واضح کرتی ہے۔ اس کو استعمال کرتے ہوئے مسلح افواج کی سیاسی و معاشی شکار خوری کا باہمی تعلق شہری اراضی کے کاروبار میں بہت واضح ہے کیوں کہ اس کے مالی فوائد بہت زیادہ ہیں۔

1999ء کے بعد سے مسلح افواج کی ملکیت میں شہری اراضی کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ فوج کی توسیع دو مرحلوں میں ہوئی۔ پہلا مرحلہ 1980ء کے عشرے میں شروع ہوا اور 1990ء کے عشرے کے اواخر تک چلا۔ دوسرا اور غیر معمولی اضافے کا دور 1999ء میں شروع ہوا۔ دونوں مرحلوں میں نہ صرف فوج کی طاقت مستحکم ہوئی بلکہ پاکستان میں خاصا سرمایہ بھی آیا۔ 1980ء کے عشرے میں فوج شہری اراضی کی خرید وفروخت میں باقاعدہ طور پر داخل ہوئی اور افغان جنگ کے ساتھ ہیروئن اسمگلنگ سے کالا دھن آیا جس سے اراضی کی قیمتیں بڑھتی گئیں۔ دوسرے مرحلے میں بیرونِ ملک رہنے والے پاکستانی یا دوسرے اسلامی ملکوں میں رہنے والے شہری اپنی قانونی اور غیر قانونی رقوم پاکستان بھیجنے لگے کیوں کہ اب امریکا اور دیگر مغربی ممالک میں ان کی رقوم پر سوالات اٹھائے جارہے تھے۔

2005ء تک اسلام آباد میں یہ کوششیں ہونے لگیں کہ مالیاتی نظام میں شفافیت لائی جائے اور رقوم کی غیر قانونی نقل وحمل روک کر تمام معیشت کو دستاویزی شکل دی جائے۔ تاہم

کالا دھن اراضی کی خرید و فروخت میں لگتا رہا کیوں کہ اس میں فوج اور دیگر مفاد بردار گروہ ملوث تھے۔ اگر چہ غیر منقولہ جائیدادیں بڑی منفعت بخش حیثیت رکھتی تھیں۔ تاہم 2005ء اور 2006ء کے مالیاتی سال میں بھی اراضی سے ہونے والے منافعے پر ٹیکس نہیں لگایا گیا۔☆38 کہا جاتا ہے کہ اراضی میں سرمایہ کاری سے فائدے اٹھانے والے بااثر گروہ نے ان تجاویز کو دبا دیا جو اس شعبے پر ٹیکس لگانے یا اسے دستاویزی شکل میں لانے سے متعلق تھیں۔☆39

فوج کی شہری املاک میں تجارتی اور رہائشی منصوبے شامل ہیں جنھیں درجِ ذیل ڈایاگرام (7.1) سے سمجھا جاسکتا ہے۔

نقشہ: 7.1 فوج کی شہری املاک
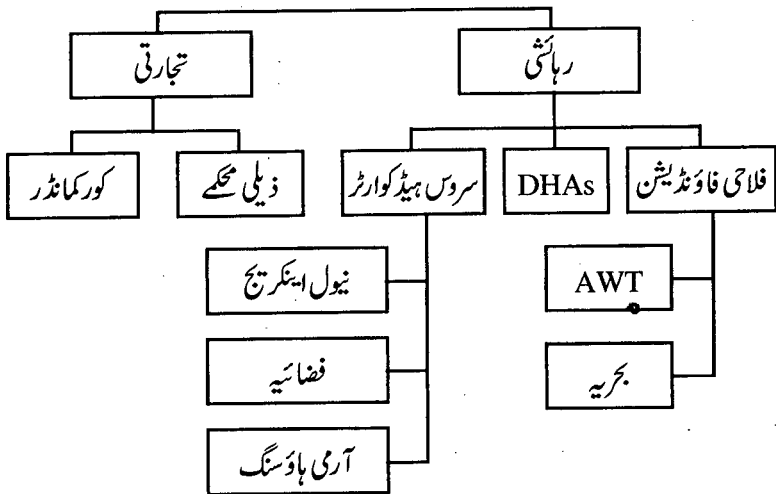
فوج کی شہری املاک میں مارکیٹیں اور کمرشل پلازہ شامل ہیں جن میں 1990ء کے عشرے میں اور 1999ء کے بعد تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اکثر بڑی چھاؤنیوں میں خصوصاً وہ جو بڑے شہروں اور قصبوں کے قریب ہیں، میں تجارتی پلازا بنا کر کرایے پر دیے گئے۔ تاہم رہائشی منصوبوں اور نجی گھروں کی تعمیر کے لیے دی جانے والی اراضی پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے کیوں کہ فوج اپنے لوگوں کے فائدے کے لیے اداراتی اثر استعمال کرکے شہری اراضی

حاصل کرتی ہے۔

رہائشی منصوبے شروع کرنے کے تین طریقے ہوتے ہیں:

- سرکاری یا اے ون ٹائپ اراضی پر گھروں کی تعمیر
- نجی اراضی جن پر مناسب زرِتلافی دے کر یا اس کے بغیر ہی قبضہ کرلیا جائے جن پر فوج کے ذیلی ادارے رہائشی منصوبے بنائیں۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) رضوی کے مطابق آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی عسکری ہاؤسنگ اسکیم براہِ راست جی ایچ کیو کے ماتحت ہے۔☆40
- وہ نجی اراضی جو ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹیز (DH \s) حاصل کرلیتی ہیں اور جو آرمی جی ایچ کیو کے زیرِ انتظام ہیں۔

پہلی قسم اور بعد کی دو اقسام میں فرق یہ ہے کہ فوج ریاستی زمین لے کر مکان بناتی ہے جو افسروں کو بیچے جاتے ہیں یا افسروں کو اس مقصد کے لیے اراضی دی جاتی ہے۔ جب کہ دیگر دو اقسام تکنیکی طور پر نجی اسکیمیں ہوتی ہیں۔ کنٹرولنگ اتھارٹی تعمیرِ مکانات کے لیے زمین کی خریداری میں کسی بھی نجی خریدار کی طرح گفت وشنید کرتے ہیں۔ بہرحال کنٹرولنگ اتھارٹی فوج ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تمام بڑے شہروں میں کور کمانڈر ڈیفنس کے رہائشی منصوبوں کے سربراہ بھی ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ منصوبے بنیادی طور پر فوج کے اعلیٰ افسروں کے لیے ہوتے ہیں۔ مسلح افواج نے کل چھیالیس رہائشی منصوبے تعمیر کیے جن میں سے کوئی بھی عام سپاہیوں کے لیے نہیں ہے۔ فوج کے ایک ترجمان نے جولائی 2006ء میں ''نیوز لائن'' رسالے کے ایک رپورٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا۔ میجر جنرل سلطان کے مطابق سپاہیوں کے لیے بھی اصولی طور پر ایک منصوبہ بنایا گیا تھا مگر اسے تعمیر نہیں کیا گیا۔☆41 افسروں اور سپاہیوں کے درمیان فرق کوئی حیرت انگیز نہیں کیوں کہ ملک کے بڑے سویلین سرمایہ داروں کے تعمیر کردہ منصوبے بھی ملک میں کم آمدنی والوں کے لیے گھروں کی کمی کو پورا نہیں کرتے۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ساٹھ لاکھ سے زائد گھروں کی ی ہے جس کے نتیجے میں کوئی بیس فی صد شہری آبادی کچے مکانوں میں رہتی ہے جہاں بنیادی سہولتیں میسر نہیں۔☆42

ریاستی اراضی میں تبدیلی

ریاستی اراضی پر مکان بنانے میں فوج ضیاء الحق کے دور میں ملوث ہوئی۔ جب یہ پالیسی شروع ہوئی۔ اس پالیسی پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شہری اراضی فوجیوں کو منتقل کرنے کی روایت کا پس منظر جان لیا جائے جس کے بارے میں ایک اعلیٰ فوجی افسر کا دعویٰ تھا کہ یہ روایت 1947ء کے بعد کے دنوں سے چلی آ رہی ہے۔

فوجی اراضی اور چھاؤنیوں کے محکمے (MLC) میں طویل ملازمت کا تجربہ رکھنے والے ریاض ہاشمی کے مطابق کئی افسروں نے 1947ء کے بعد چھاؤنیوں میں اراضی لیز پر حاصل کی۔[☆43] چھاؤنیوں کے علاقوں میں متروکہ املاک اُن فوجی افسروں کو دی گئیں جو بھارت کے مسلم اقلیتی صوبوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔[☆44]

بعد میں ہجرت نہ کرنے والے افسروں نے بھی اپنے تجربے اور اہمیت کی بنا پر اراضی حاصل کرنا شروع کر دیں، مثلاً جنرل اعظم خان اور دیگر افسروں نے لاہور چھاؤنی میں بڑی بڑی اراضیاں حاصل کیں۔ اعظم خان پٹھان افسر تھے اور ان کا خاندان بھارت کے مسلم اقلیتی صوبوں سے ہجرت کر کے پاکستان نہیں آیا تھا۔ ان افسروں کو اراضی ننانوے سال کی قابلِ انتقال لیز پر دی گئی۔ ننانوے سالہ لیز قابلِ توسیع ہوتی ہے، خصوصاً جہاں املاک کے مالک فوجی افسر ہوں اور لیز کی فروخت پر کوئی پابندی نہ ہو اور نہ ہی فروخت سے حاصل ہونے والے منافعے پر کوئی ٹیکس ہو۔[☆45]

فوج نے اس پالیسی پر عمل جاری رکھا ہے۔ 2000ء میں فوج نے اپنے دو اعلیٰ جنرلوں خالد مقبول اور محمد امجد کو لاہور چھاؤنی میں بارہ بارہ سو گز کے پلاٹ دیے۔ خالد مقبول بعد میں پنجاب کے گورنر اور جنرل امجد قومی احتساب بیورو کے سربراہ اور پھر فوجی فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر رہے۔ 2003ء میں وزارتِ دفاع نے سینیٹ میں ایک رپورٹ دی جس کے مطابق اکتوبر 1999ء سے 2003ء تک مختلف شہروں میں ایک سو تیس افسروں کو 130 رہائشی پلاٹ دیے گئے جن کا کل رقبہ اٹھتّر ہزار مربع گز سے کچھ زائد تھا۔[☆46] یہ رقبے کراچی، لاہور اور راول پنڈی کے علاوہ کھاریاں اور جہلم جیسے چھوٹے شہروں میں تھے اور ان افسروں کے

عہدے کیپٹن سے لے کر جنرل تک تھے۔

اعلیٰ، درمیانے اور جونیئر افسروں میں بالترتیب چھیالیس، چھتیس اور اڑتالیس پلاٹ دیے گئے۔ [47☆] تاہم اعلیٰ افسروں کو دیے جانے والے پلاٹ جونیئر افسروں کے پلاٹوں سے بہت بڑے تھے۔ ہر قسم کے جنرلوں کو آٹھ آٹھ سو مربع گز کے پلاٹ بانٹے گئے۔ جب کہ کیپٹن کے عہدے والے افسروں کو چار سو چھیانوے مربع گز کے پلاٹ دیے گئے۔ [48☆] پھر بھی ان اعداد و شمار سے لاہور میں اراضی کی چھینا جھپٹی تک پوری صورتِ حال واضح نہیں ہوتی۔ چھاؤنی جو 1980ء تک فوج کے تربیتی میدانوں اور گولیاں چلانے کی مشق کے لیے استعمال ہوتی تھی، اب تقریباً مکمل طور پر رہائشی علاقے میں بدل چکی ہے یعنی انھیں حکومت کی اجازت یا عوام کی اطلاع کے بغیر نجی استعمال میں لایا جا رہا ہے، جن کی حفاظت کے لیے شروع میں یہ زمینیں دی گئی تھیں۔

یہ نشان دہی لاہور میں آڈیٹر جنرل کے محکمے نے ایک آڈٹ رپورٹ میں کی۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ صرف لاہور میں فوجی افسروں کو کوئی چار سو ایکڑ اراضی منتقل کی جا چکی ہے۔ چونکہ رہائشی منصوبے آرمی ہاؤسنگ ڈائریکٹوریٹ (قائم شدہ 1968ء) نے بنائے تھے جسے کوئی آئینی یا قانونی حیثیت حاصل نہیں تھی، اس لیے آڈیٹروں کے مطابق یہ تعمیرات موجودہ قوانین کی خلاف ورزی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی حکومت کو خاصا نقصان ہوا تھا کیوں کہ اراضی صرف ایک کروڑ ستر لاکھ روپے میں بیچی گئی تھیں جب کہ بازار میں اس اراضی کے دام بہت زیادہ تھے۔ آڈیٹروں نے یہ بھی کہا کہ جو اراضی فوج کو پیشہ ورانہ مقاصد کے لیے دی گئی تھیں، انھیں تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ بہت اچھے محلِ وقوع کی اراضی کے 24 ٹکڑے تجارتی استعمال میں تھے اور ان کی رقم بھی سرکاری خزانے میں جمع نہیں کی جا رہی تھی۔ [49☆] بعض جگہ مارکیٹیں بی ٹو ٹائپ کی اراضی پر تعمیر کی گئی تھیں جو تکنیکی طور پر فوج کی زیرِ ملکیت نہیں آتیں۔ اس طرح کی صرف ایک بڑی مارکیٹ یعنی فورٹریس اسٹیڈیم لاہور ہی کو لیا جائے تو اسی کے کرایے کو کور ہیڈکوارٹر رکھ لیتا ہے جو کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔

ریاستی اراضی کے اس استحصالی استعمال سے متعلق فیصلے فوج اندرونی طور پر کر لیتی ہے

اور حکومت سے مشورے نہیں کیے جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ فوج کے رہائشی منصوبوں کے بارے میں فیصلے اُس وقت کیے جاتے ہیں جب پارلیمنٹ کا اجلاس نہیں ہو رہا ہوتا۔[☆50] اس طرح کی من مانی بندر بانٹ سے ریاستی اراضی اور خصوصاً چھاؤنیوں کی اراضی کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ بڑی چھاؤنیوں میں لاہور (بارہ ہزار ایکڑ)، کراچی (بارہ ہزار ایکڑ)، راول پنڈی (آٹھ ہزار ایکڑ)، کامرہ (ساڑھے تین ہزار ایکڑ)، ٹیکسلا (ڈھائی ہزار ایکڑ)، پشاور (چار ہزار ایکڑ) اور کوئٹہ (ڈھائی ہزار ایکڑ) شامل ہیں۔ ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ (MLC) کے ایک ریٹائرڈ اعلیٰ افسر نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ چونکہ فوج زمین کے استعمال میں آزاد ہے، اس لیے چھاؤنیوں کی تمام اراضی کا بالآخر تجارتی استعمال کیا جانے لگے گا۔[☆51] حقیقت یہ ہے کہ لاہور، کراچی، راول پنڈی اور پشاور چھاؤنیاں اب کوئی ممنوعہ فوجی علاقے نہیں رہے۔ جیسا کہ لاہور کے معاملے میں دیکھا جا چکا ہے کہ اعلیٰ افسروں کو دوسری پرانی چھاؤنیوں میں بھی بڑی بڑی رہائشی املاک کے مالکانہ حقوق دیے گئے ہیں۔

کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹے کی چھاؤنیوں کی اراضی کا کم سے کم تخمینہ بھی کوئی پانچ سو ارب روپے لگایا جاتا ہے۔ گو کہ جنرل ایوب خان پر الزام ہے کہ اُس نے اعلیٰ افسروں کو شہری اراضی کی لت لگائی مگر اصل میں یہ عمل بڑے پیمانے پر جنرل ضیاء الحق نے شروع کیا جو اس طرح اپنے اعلیٰ افسروں کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔[☆52] تاکہ اس کا اقتدار مستحکم رہے۔ اس کے بعد تینوں مسلح افواج نے اپنے افسروں اور خصوصاً اعلیٰ افسروں کو شہری زمینیں الاٹ کرنے کے اس طریقے پر عمل کیا۔ شہروں املاک کے حصول سے افسروں کی ذاتی مالیاتی دولت بڑھنے لگی۔ ایک سابق فوجی افسر اکرام سہگل جو بعد میں ملک کی ایک بڑی کاروباری شخصیت بن گئے، کہتے ہیں کہ شہری اور دیہی دونوں طرح کی اراضی ملنے سے اعلیٰ جنرل بہت مال دار ہو گئے۔ یعنی ایک عام میجر جنرل کے پاس کم از کم ایک کروڑ اور ایک لیفٹیننٹ جنرل کے پاس کوئی پانچ کروڑ تک کی املاک ہوتی ہیں۔ مگر کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ضرار عظیم جو شرف کے دورِ حکومت میں لاہور کے کور کمانڈر تھے، جیسے سینئر جنرلوں کے اراضی میں ث ہونے کے بعد جنرلوں کی انفرادی املاک دس کروڑ سے بھی تجاوز کر گئیں۔ جنرل ضرار عظیم نے ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

کی اراضی کی خرد برد میں خوب نام اور پیسا کمایا۔[53] اکرام سہگل نے کچھ کم اندازے لگائے ہیں کیوں کہ اگر بازار کے بھاؤ جنرلوں کی املاک پر لگائے جائیں تو ایک ایک جنرل کی انفرادی دولت پندرہ کروڑ سے چالیس کروڑ تک ہوگی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کئی سینئر جنرلوں نے فوج سے ملنے والی اراضی سے خوب ندہ اٹھایا۔ ان میں جنرل (ریٹائرڈ) شمیم عالم خان، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کو اسلام آباد کے ایف سیون سیکٹر میں گیارہ جون 1994ء کو ایک ہزار چھیاسٹھ مربع گز کا پلاٹ ملا۔ فوج کے سابق سربراہ جنرل عبدالوحید کاکڑ کو G-6/4 میں سات ستمبر 1996ء کو بارہ سو گز کا پلاٹ ملا۔ ایئر چیف مارشل فاروق فیروز خان کو F-7/2 میں ایک ہزار تینتیس مربع گز کا پلاٹ اُنتیس جنوری 1995ء کو دیا گیا۔ بحریہ کے سابق سربراہ ایڈمرل سعید محمد خان کو ایف سیون سیکٹر میں گیارہ جون 1994ء کو ایک ہزار چھیاسٹھ مربع گز کا پلاٹ دیا گیا۔ بحریہ کے ایک اور سابق سربراہ ایڈمرل محمد سعید کو F-8/1 سیکٹر اسلام آباد میں آٹھ سو گز کا پلاٹ تیس اگست 1987ء کو دیا گیا۔ بحریہ کے ہی ایک سابق سربراہ ایڈمرل یسطور الحق ملک کو F-10/2 سیکٹر اسلام آباد میں چار نومبر 1991ء کو آٹھ سو مربع گز کا پلاٹ نمبر پانچ سو اکاون دیا گیا۔ ان علاقوں میں صرف ایک پلاٹ کی قیمت سات سے دس کروڑ روپے ہوگی۔[54]

یہ ضروری نہیں کہ ایک افسر کو صرف ایک ہی پلاٹ ملے۔ بعض افسروں کو شہری اراضی کے ایک سے زائد پلاٹ بھی دیے گئے، مثلاً ایک فہرست کے مطابق آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے نام 1994ء میں آٹھ پلاٹ کیے گئے۔ سینٹ میں پیش کی جانے والی فہرست کے مطابق اسلام آباد کے سیکٹر F-11/2 میں پندرہ اپریل 1994ء کو ڈی جی آئی ایس آئی کے نام پانچ پلاٹ الاٹ کیے گئے جن کے نمبر ایک سو ترانوے، ایک سو چورانوے، دو سو اکسٹھ، دو سو باسٹھ اور دو سو تریسٹھ تھے اور مجموعی رقبہ چھ سو چھیاسٹھ مربع گز تھا۔ بعد میں سولہ نومبر اُنیس چورانوے کو سیکٹر F-7/4 اور F-7/2 میں انھیں مزید دو پلاٹ دیے گئے جن میں ہر ایک کا رقبہ سولہ سو مربع گز تھا۔ اسی نام پر 26 اکتوبر 1994ء کو بارہ سو چوالیس مربع گز کا ایک پلاٹ اور منتقل کیا گیا۔[55]

تینوں افواج جس طرح اراضی بانٹتی ہیں، اس سے خود فوج اور چھاؤنی کے قوانین کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ مینوول کے مطابق اے ون ٹائپ اراضی کے غیر فوجی استعمال کی اجازت نہیں ہے کیوں کہ یہ صرف پیشہ ورانہ استعمال کے لیے ہوتی ہے۔ ریاض ہاشمی کے مطابق رہائشی منصوبے خود ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس کے مطابق اس قسم کی اراضی کسی ایسے استعمال میں نہیں لائی جاسکتی جس کی قانون میں اجازت نہیں۔ ہاشمی کے خیال میں فوجی چھاؤنی کی اراضی منتقل کرنے کی مثال ایوب خان نے 1950ء کے عشرے میں قائم کی جب انھوں نے راول پنڈی کنٹونمنٹ میں بی ٹو ٹائپ اراضی پر تعمیر کردہ خود اپنا مکان کرایے پر دیا۔☆[56] اس طرح اعلیٰ افسروں نے ریاستی املاک کو کرایے پر دینا اور بعد میں بیچنا بھی شروع کر دیا۔ پھر بتدریج فوج کو پیشہ ورانہ مقاصد کے لیے دی جانے والی اراضی کو بھی نجی استعمال میں لایا جانے لگا اور تینوں افواج کے افسروں میں اس کی تقسیم ہونے لگی۔

اراضی کی قابلِ اعتراض منتقلی پر سینٹ میں ایک سوال کے جواب میں جی ایچ کیو نے بتایا کہ فوج اپنے زیرِ اختیار اراضی کو اگر فاضل سمجھے تو اسے جس طرح چاہے استعمال یا منتقل کر سکتی ہے۔☆[57] میجر جنرل شوکت سلطان کے الفاظ میں ''ہم مکان ریاست کی اراضی پر نہیں بلکہ فوج کی اراضی پر بناتے ہیں۔'' اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلح افواج خود کو قانون اور جواب دہی سے بالاتر سمجھتی ہیں۔☆[58] فوج کی زمین کو ریاست سے الگ سمجھنا ظاہر کرتا ہے کہ فوج خود کو ریاست اور قانون کی پابندیوں سے آزاد سمجھتی ہے۔ تنظیم (فوج) کی قوت نے زمین کی دوبارہ تقسیم کو طے کیا ہے جس کے نتیجے میں اُسے بیش بہا فائدہ ہوا ہے۔

منگلا کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل توقیر ضیا نے جو پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کے سربراہ بھی تھے، اپنی سربراہی کے دور میں کراچی نیشنل اسٹیڈیم کی اراضی کراچی کنٹونمنٹ کے حکام کے حوالے کر دی تاکہ اعلیٰ افسروں کو تقسیم کی جاسکے۔ افسروں کے خوب وارے نیارے ہوئے اور انھوں نے صرف چھ لاکھ روپے دے کر دو سے تین مہینوں میں ڈیڑھ کروڑ روپے تک کمائے۔ اتنی کم رقم بھی چھ سو گز کے رہائشی پلاٹ پر ترقیاتی اخراجات کے لیے دی گئی۔

دوسری قیمت بازار کے بھاؤ کے مطابق ہے۔ لہٰذا یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں۔ جب ہم سینئر جنرلوں کو اپنی دولت کو دگنی تگنی کرنے کے مواقع حاصل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، مثال کے طور پر جنرل پرویز مشرف نے اسلام آباد میں جو فارم لیا، اس کی قیمت کوئی چار کروڑ روپے تھی۔ آئی ایس آئی کے ایک سابق ڈائریکٹر جنرل نے اپنے فارم کی زمین کے تقریباً دس کروڑ روپے بنائے۔☆59 مشرف کی ظاہر کردہ اراضی کی مجموعی مالیت تقریباً ساٹھ کروڑ روپے ہے۔ تفصیلات اس باب کے آخر میں دی گئی ہیں۔

جس طرح بری فوج قانون یا حکومت کو اہمیت نہیں دیتی، اسی طرح بحریہ اور فضائیہ بھی کرنے لگی ہیں، مثلاً بحریہ نے اے ون ٹائپ کی تین ہزار مربع گز اراضی پر بحریہ کمپلیکس بنایا جو تجارتی بنیادوں پر منافع کمانے لگا جسے قومی خزانے میں جمع نہیں کیا جاتا۔☆60 اسی طرح فضائیہ نے اپنے رسالپور کے اڈّے میں سات سو پینتیس ایکڑ اراضی کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔☆61 دونوں صورتوں میں یہ فوجی اراضی کا غیر پیشہ ورانہ استعمال تھا جس کی قانونی منظوری نہیں تھی۔☆62

اعلیٰ افسر اراضی کے تجارتی استعمال کو ''جوانوں'' کی بہبود کے نام پر جائز قرار دیتے ہیں اور چین اور انڈونیشیا کی مسلح افواج کی مثالیں دیتے ہیں۔ تاہم چین اور انڈونیشیا کے برعکس پاکستان میں فوج کی تمام ضرورتیں حکومت پوری کرتی ہے جو فوجی اخراجات کو ہمیشہ فوقیت دیتی ہے، اس لیے یہاں فوجی اراضی کا تجارتی استعمال کسی صحیح ضرورت کے لیے نہیں بلکہ ہوس پوری کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

فوج کی معاشی ہوس کی داستانیں بے شمار ہیں۔ سب سے بڑے بین الاقوامی نوعیت کے شہر، کراچی میں فوج نے سرکاری اراضی پر آٹھ پیٹرول اسٹیشن قائم کیے۔ اکتوبر 1999ء میں فوجی حکومت کے قیام کے بعد مختلف آرمی کور نے اے ون ٹائپ اراضی پر تجارتی پلازا اور دکانوں کے لیے نجی پارٹیوں کے لیے اظہارِ دل چسپی کے اشتہار شائع کرائے۔ اس کے علاوہ فوج اور ذیلی ادارے اراضی کی چھینا جھپٹی میں بھی ملوث رہے ہیں، مثلاً نیشنل لاجسٹکس سیل (این ایل سی) نے جو فوج کا ایک ذیلی ادارہ ہے، ملیر کراچی میں اراضی پر تجارتی استعمال کے

لیے زبردستی قبضہ کرلیا۔ ایک ذریعے کے مطابق این ایل سی نے اپنی املاک کی حدود بڑھاتے ہوئے متصل اراضی پر بھی قبضہ کرلیا۔☆63 یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں نے نہ صرف ان سرگرمیوں کو نظرانداز کیا بلکہ اس رویے کی درپردہ حوصلہ افزائی بھی کی۔ اسی طرح کے ایک معاملے میں حکومت نے چار ارب روپے مالیت کی اراضی کراچی میں آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو دی۔

فوج نے اکثر صوبائی حکومتوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ زراعت یا دیگر مقاصد کے لیے اراضی دیتی رہیں۔ اکثر صورتوں میں اس عمل کو قومی سلامتی کے نام پر حق بجانب قرار دیا جاتا رہا ہے یا کوئی وجہ بتانے کی زحمت ہی نہیں کی جاتی، مثلاً 2000ء میں فوج نے کراچی میں سپر ہائی وے کے ساتھ ابھرتے ہوئے صنعتی علاقے میں بیس ہزار ایکڑ کا مطالبہ کیا۔☆64 فوج نے بارہ ہزار ایکڑ زرعی اراضی بھی اُن فوجیوں کو منتقل کرنے کا مطالبہ کیا جو 1960ء کے عشرے میں دارالحکومت اسلام آباد منتقل ہونے سے متاثر ہوئے تھے۔☆65 اس رویے سے چھوٹے صوبوں میں برہمی پیدا ہوتی ہے جو فوج کو ایک قومی قوت سمجھنے کے بجائے حملہ آور فوج گردانتے ہیں۔

فوج کے اراضی پر قبضے اور اپنے افسروں میں تقسیم کا معاملہ صرف دولت کی بات نہیں ہے بلکہ اس سے ادارے کی طاقت اور اثر کا پتا چلتا ہے۔ عوام کی ناراضی میں اور اضافہ ہوجاتا ہے جب لوگ دیکھتے ہیں کہ فوج اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے نجی یا سرکاری اراضی پر زبردستی قبضے کررہی ہے، مثلاً پٹارو سندھ میں بحریہ کے کیڈٹ کالج کے کمانڈنٹ کمانڈر عابد سلیم پر الزام ہے کہ انھوں نے جامشورو کے دیہی علاقے ملاح میں دیہاتیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے دیہات خالی کردیں تاکہ اس پر کالج کے حکام قبضہ کرسکیں۔ یہ دیہاتی پچھلی نصف صدی سے اس اراضی پر رہ رہے تھے اور اُنھیں وزیراعظم محمد خان جونیجو (88-1985ء) نے مالکانہ حقوق بھی دے دیے تھے۔ 2005ء میں کیڈٹ کالج کے حکام نے دیہاتیوں کو اراضی سے نکالنے کی کوشش کی جس پر دیہاتیوں نے سندھ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کردی۔ مقدمہ زیرِ سماعت ہونے کے باوجود کیڈٹ کالج کے کمانڈنٹ نے دیہاتیوں کو ہراساں کرنے کے لیے گاؤں کے گرد دیوار تعمیر کرکے آنے جانے والے راستوں پر نیوی کے سپاہی کھڑے کردیے۔ عابد سلیم نے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ مقدمہ ہائی کورٹ میں

زیرِ سماعت تھا۔ کمانڈنٹ نے دعویٰ کیا کہ دیہات کے لوگ توجہ حاصل کرنے کے لیے اس معاملے کو ذرائع ابلاغ میں اچھال رہے ہیں۔ ☆66

فوجی حکام نے اس قسم کے الزامات اوکاڑہ کے کسانوں پر بھی لگائے اور کہا کہ وہ غیر ملکی امداد سے چلنے والی غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ سازش کر کے قیمتی اراضی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح صوبۂ سرحد میں پٹن کے رہنے والوں نے بتایا کہ فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن (FWO) نے ان کی اراضی پر بلا معاوضہ قبضہ کرلیا۔ 63-1962ء کے دوران میں شاہراہِ قراقرم تعمیر کرتے ہوئے فوج کی تعمیراتی کمپنی (FWO) نے عارضی کیمپ لگا کر مالکان کو تاثر دیا کہ یہ کیمپ صرف سڑک کی تعمیر تک رہے گا مگر بعد میں اس عارضی کیمپ کو مستقل بنا کر اس میں توسیع کی گئی اور مالکان کو کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا گیا۔ ☆67

اسی طرح کی کہانیاں بلوچستان میں بھی سنی جاسکتی ہیں جہاں مثال کے طور پر چمن کے علاقے میں فوج نے نجی اراضی پر قبضے کیے۔ کہا یہ گیا کہ مارملنگ گاؤں کے لوگ ایک سو انتیس ایکڑ اراضی پر مالکانہ حقوق کے لیے فوج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ چمن میں فوج 64-1963ء میں آئی جب یہ ضلع بن رہا تھا اور بعد میں کوئی دو سو ایکڑ اراضی پر قبضہ کرلیا۔ جون 2005ء میں فوجی حکام نے دیہاتیوں کو علاقہ خالی کرنے کا نوٹس اس بنیاد پر دیا کہ یہ زمین فوج کی ہے۔ دیہاتیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ اراضی عاشیزئی قبیلے کی ہے جس کے لوگ 1947ء سے قبل بھی یہاں کاشت کاری کرتے تھے۔ انھیں یقین ہے کہ فوج اس جگہ میں اب اس لیے دل چسپی لے رہی ہے کیوں کہ اب اس کی قیمت بڑھ چکی ہے۔ اب یہ جگہ صرف ایک کھیت کی نہیں ہے بلکہ اب یہ ایک چھوٹا قصبہ بن چکی ہے جہاں بازار، مکان اور سنیما ہیں۔ ☆68 ہوسکتا ہے یہاں بھی تجارتی پلازا بنانے کے منصوبے ہوں۔

1970ء کے عشرے کے اختتام سے فوج منافع کمانے میں زیادہ تن دہی سے مشغول ہے۔ یہ منافع نہ تو شفاف ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر سرکاری جواب دہی کا عمل لاگو ہوتا ہے۔ اگر سندھ اور بلوچستان میں اراضی پر قبضے کو چھاؤنیوں کی ضرورت مان لیا جائے تو بھی مقامی لوگ اس سے محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ پاکستانی مبصر قیصر بنگالی کے خیال میں چھاؤنیاں نئے

شہروں کی طرح ہیں جہاں مقامی لوگوں سے ریڈ انڈینز کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔[☆69] قیصر بنگالی کی صداقت مجھے کوئٹہ میں 1996ء میں نظر آئی جب کوئٹہ چھاؤنی کی ایک طعام گاہ پر لکھا تھا، ''سویلین کا داخلہ ممنوع ہے۔'' یہ نوآبادیاتی حکومت کا وہ دور یاد دلاتی ہے جب ان پسندیدہ جگہوں پر مقامی لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں انگریز اکثر جایا کرتے تھے۔

فوج کو زمینوں اور دیگر وسائل پر قبضے کرتے دیکھ کر رینجرز کے نیم فوجی دستوں نے بھی سندھ اور بلوچستان کے ساحل پر سو کلومیٹر کا علاقے قبضے میں لے لیا۔ 1977ء کے بعد رینجرز نے دو درجن سے زائد جھیلوں پر قبضہ جمایا اور جواز یہ دیا کہ ساحلی علاقے کو بھارتی خطرے سے بچانا ہے۔ جلد ہی رینجرز نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے مقامی مچھیروں کو ماہی گیری سے روک دیا اور بڑے ٹھیکے داروں کو ماہی گیری کے اجازت نامے فروخت کر دیے۔ اس سے مقامی ماہی گیر تباہ ہو گئے اور اُن کی تعداد سات ہزار سے گھٹ کر دو سو رہ گئی۔[☆70] یہ دراصل زمینی استحصال کے اس تحفظ کا معاملہ ہے جو مقامی لوگوں کی زندگی اور روزی کو خطرے میں ڈالتی ہے۔

1980ء کے بعد تینوں افواج نے اپنے افسروں کو دینے کے لیے رعایتی داموں پر مکان بنانے کے منصوبے شروع کر دیے۔[☆71] ہر افسر کی تنخواہ سے دو سو سے ہزار روپے تک کی ایک معمولی رقم کاٹ کر ریٹائرمنٹ پر اسے ایک مکان یا اپارٹمنٹ دیا جاتا تھا[☆72] اور تعمیر کی حتمی رقم ریٹائرمنٹ کے وقت افسر کی فروخت شدہ (کمیوٹڈ) پنشن سے کٹتی تھی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے ریاستی اراضی کو بہت سستی قیمت پر دیا گیا۔ یہ نجی رہائشی منصوبے بہت سستے داموں شروع کیے گئے۔ اور اس سلسلے میں حکومتیں بھی مدد کرتی رہیں۔[☆73] اس تصور کے مطابق فوجیوں یا حکمراں اشرافیہ کے لوگوں کو اس بات کے زیادہ مواقع ملتے ہیں کہ وہ اپنا سرمایہ لگا سکیں، خاص طور پر جہاں معتد بہ منافع ملتا ہو۔ متعدد سینئر فوجی افسروں نے پہلے سے ان جائیدادوں کے بارے میں اطلاعات مل جانے سے بہت فائدہ اٹھایا ہے جن کی قیمت بعد میں بڑھ جاتی ہے۔ پیشگی اطلاعات تک رسائی نے سینئر جنرلوں کو صاحبِ جائیداد بنا دیا ہے، مثلاً جنرل مشرف کی آٹھ املاک میں DHA کراچی میں دو ہزار مربع گز،

بہاول پور میں پچاس ایکڑ زرعی اراضی، ایسٹریج راول پنڈی کے علاقے میں چھ سو مربع گز، گوادر بلوچستان میں بارہ سو مربع گز اور اسلام آباد میں ایک فارم ہاؤس شامل ہیں۔ ☆74

فوج کے ذیلی اداروں کے رہائشی منصوبے

فوج کی املاک میں نجی شعبے کے رہائشی منصوبوں کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ مسلح افواج کے مختلف ادارے نجی اراضی خرید کر اسے دوبارہ فروخت کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور بحریہ فاؤنڈیشن بھی جائیدادوں کی دلالی کرتے ہیں۔ فضائیہ نسبتاً کم حصے پر گزارا کرتی ہے۔ تینوں بڑے شہروں یعنی کراچی، لاہور اور اسلام آباد/ راول پنڈی میں آرمی ویلفیئر ٹرسٹ اور بحریہ کے کم از کم دو رہائشی منصوبے ہیں۔ دراصل بحریہ اس طرح کے کاموں میں بہت آگے ہے۔ شروع میں تو بحریہ نے ایک نجی سرمایہ کار کے ساتھ مل کر بحریہ ہاؤسنگ اسکیم کے نام سے رہائشی منصوبے شروع کیے۔ بعد میں ''اینکریج'' (لنگراندازی) کے نام سے بھی بحریہ نے ایک علیحدہ اسکیم شروع کی۔ یہ اسکیم اس وقت شروع کی گئی جب نجی سرمایہ کار سے تعلقات بگڑ گئے تھے۔ تاہم نجی سرمایہ کار اب بھی بحریہ کا نیلا امتیازی نشان استعمال کر رہا ہے۔

مسلح افواج کا دعویٰ ہے کہ یہ نجی شعبے کے منصوبے ہیں جو سویلین تجارتی قوانین کے تحت رجسٹرڈ ہیں۔ ان کی اعلیٰ انتظامیہ ریٹائرڈ فوجی افسروں پر مشتمل ہے۔ ان کے گورننگ بورڈ میں حاضر ملازمت اعلیٰ افسران کے ذریعے فوج کی نمائندگی ہوتی ہے، مثلاً تمام DHA کے سربراہ کور کمانڈر ہوتے ہیں اور انتظامیہ میں حاضر ملازمت بریگیڈیئر اور کرنل کی سطح کے افسر ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ اراضی دوبارہ فروخت کے لیے صرف حاضر ملازمت یا ریٹائرڈ افسروں یا ان کے اہلِ خانہ کو پیش کی جاتی ہے۔ پھر یہ لوگ حاصل کردہ اراضی سویلین سمیت کسی کو بھی مہنگے داموں بیچ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھاؤنیوں اور ڈی ایچ ایز میں سویلینز زیادہ رہائش پذیر ہیں۔ بہرحال مسلح افواج کا دعویٰ اب بھی یہی ہے کہ اس کی وجہ سے غیر منقولہ جائیدادوں کی تجارت میں فوج کی وابستگی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ڈیفنس ہاؤسنگ

اتھارٹیز کی مدافعت کرتے ہوئے مشرف نے کہا کہ یہ دلیل کہ فوج کی غیر منقولہ جائیداد اس کے تجارتی مفادات کا مظہر ہیں، دراصل بعض جعلی دانشوروں کے حسد کا مظہر ہیں۔ 2004ء میں کراچی میں ایک ڈی ایچ اے کے ازالۂ نمک (Desalination) کے منصوبے کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> پاکستان بھر میں ڈیفنس سوسائٹیاں سب سے بہتر سوسائٹیاں ہیں تو ہم اس سے حسد کیوں کرتے ہیں؟ اگر کوئی شخص ایک کنال شروع میں سستی خریدتا ہے اور پھر سوسائٹی کے اچھے کاموں کی بدولت وہ سو گنا مہنگی ہو جاتی ہے تو اس میں جلنے کی کون سی بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ میرے خیال میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔☆[75]

مشرف سے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) مقبول نے دعویٰ کیا کہ رہائشی منصوبوں سے فوج کی اراضی میں دل چسپی تو ظاہر ہوتی ہے مگر وہ کاروبار میں ملوث نہیں ہے۔☆[76] ایسے بیانات حقیقت کے برعکس ہیں کہ فوج کی سیاسی طاقت ہی استعمال کر کے اراضی حاصل کی جاتی ہے جس سے بالخصوص اس کے اعلیٰ افسروں کا فائدہ ہوتا ہے۔ یہ بات اہم نہیں کہ کتنے افسر براہِ راست کاروبار کرتے ہیں، اہم بات یہ ہے کہ فوج اپنے اثر ورسوخ سے اراضی حاصل کرتی ہے جس سے فوجیوں کو فائدے پہنچتے ہیں۔

ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹیز (DHAs)

فوج کے رہائشی منصوبوں میں ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹیز کو خاص اہمیت حاصل ہے جنھیں مختصراً DHA کہا جاتا ہے۔ کراچی، لاہور اور راول پنڈی جیسے بڑے شہروں میں فوج نے براہِ راست اپنا سیاسی اثر استعمال کرتے ہوئے DHA بنائیں۔ لاہور میں DHA 2002ء میں بنائی گئی اور اس کے لیے پہلے لاہور کینٹ کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ کا انتظام سنبھالا گیا جسے دراصل پنجاب کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ مجریہ 1925ء کے تحت قائم کیا گیا تھا۔☆[77] یہ پہلا

رہائشی منصوبہ تھا جسے ایک اتھارٹی میں تبدیل کر کے براہِ راست فوج کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔ اس تبدیلی کے لیے ایک صدارتی فرمان جاری کیا گیا جو بعد میں آئین کی سترھویں ترمیم کا حصہ بن گیا۔[☆78] اس کے بعد چھاؤنی یا اس سے متصل فوجی علاقوں میں واقع تمام رہائشی منصوبے آزاد ادارے بن گئے جن کے اپنے قواعد وضوابط تھے۔

منافعے کی بڑی شرحیں جو سرمایہ کار حاصل کرتے ہیں، ان کا انحصار سرمایہ کاروں یا کاروباریوں پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سستی قیمتوں پر زمین کے حصول میں فوج کا اثر بڑی اہمیت رکھتا ہے جو بعد میں مہنگے داموں بیچ دی جاتی ہیں۔ قیمتوں کا یہی وہ اونچا فرق ہے جس کا حوالہ مشرف نے اوپر دیا ہے۔ زیادہ منافعے کا راز اس امر کو یقینی بنانے میں ہے کہ قیمتِ خرید اور فروخت میں بڑا فرق ہے۔ منافعے کا فرق اطلاع کی ترجیحی رسائی پر بھی ہے جس کا براہِ راست تعلق سرمایہ کاری سے ہوتا ہے۔ کسی شہر کے توسیعی منصوبوں کے بارے میں اطلاعات پر کنٹرول اور فیصلہ سازی کو مؤثر بنانے میں اس شہر کے ترقیاتی منصوبوں کی خالص قیمت کا تعین کرنے میں اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے ذاتی فائدے کے لیے اس قسم کی اطلاعات کو توڑنے مروڑنے میں سینئر سول اور فوجی اعلیٰ حکام کو بڑا مقام حاصل ہے۔

پھیلتے ہوئے شہر اردگرد کی دیہی اراضی کو بھی ہڑپ کر جاتے ہیں جن کی قیمت شروع میں کم ہوتی ہے۔ اس اراضی کے اصل مالکان بھی سرمایہ کاری کر سکتے ہیں مگر ان کے پاس شہر کی توسیع کے سلسلے میں معلومات کم ہوتی ہیں، اسی لیے ان کا استحصال کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اراضی سستے داموں خریدی جاتی ہے اور خریدار کو بہت منافع ہوتا ہے، مثلاً DHA لاہور اصل مالکان کو نقد رقم ادا نہیں کرتی بلکہ انھیں بدلے میں پانچ سو مربع گز کے دو رہائشی پلاٹ فی ایکڑ پیش کیے جاتے ہیں۔ توقع یہ کی جاتی ہے کہ پورے رہائشی منصوبے کی ترقی سے ان پلاٹوں کی قیمت بھی بڑھ جائے گی۔

گو کہ کئی دیگر فریق بھی اراضی کی خرید وفروخت سے منافع بناتے ہیں لیکن فوج ان میں بہت آگے ہے۔ DHA کے منصوبوں میں زیادہ تر فائدے فوجی افسروں کو ہوتے ہیں جو صرف ترقیاتی اخراجات دینے کے پابند ہوتے ہیں۔ زمین کے حصول کی کوئی قیمت نہیں

ہوتی۔ ریٹائرڈ اور حاضر ملازمت فوجی افسران جائیداد ٹیکس اور چند دیگر سرکاری واجبات بھی ادا نہیں کرتے۔ DHA کی آمدنی کا اصل ذریعہ وہ ٹیکس اور فیس ہیں جو سویلین ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ شروع میں یہ اراضی صرف فوجیوں کو دی جاتی ہے لیکن بعد میں انھیں کسی سویلین کو فروخت کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ دوبارہ فروخت پر مدت کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی جس سے منافع بہت بڑھ جاتا ہے۔ خاص طور پر گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد اس میں بہت اضافہ ہوا۔

پاکستان میں آنے والی رقوم صنعتوں یا روزگار کے مواقع میں لگنے کے بجائے اراضی میں لگنے لگیں۔ 1980ء کے عشرے میں افغان جنگ کے دوران میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ امریکا کے ساتھ مل کر جنگ لڑنے سے پاکستان میں ڈالروں کی بھرمار ہوگئی جنھیں زیادہ تر املاک میں لگایا گیا۔ ضیاء الحق کے دور میں تعمیر ہونے والے اسلام آباد کے خالی تجارتی پلازا اسی قیاسی اور غیر پیداواری سرمایہ کاری کی مثال ہیں۔

کراچی، لاہور اور اسلام آباد جیسے بڑے شہروں میں DHA عام طور پر فوجی چھاؤنیوں سے متصل ہوتی ہیں۔ جغرافیائی طور پر یہ فوج کے زیرِ انتظام علاقوں کی توسیع کی حیثیت رکھتی ہیں اور چھاؤنیوں کے قواعد وضوابط کے تحت آتی ہیں، مثلاً جائیداد کی منتقلی اور ٹیکس کے قوانین یکساں ہوتے ہیں۔ ان قوانین کی یکسانیت کا مطلب یہ ہے کہ سویلینز کے برعکس فوجیوں کو جائیداد ٹیکس ادا نہیں کرنے ہوتے۔ مزید برآں DHA کے علاقوں کی تکنیکی اور انتظامی تفصیلات بھی چھاؤنیوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتیں۔ سویلین علاقوں کی نسبت یہاں دھوکا دہی بھی کم ہوتی ہے، اس لیے لوگ یہاں سرمایہ کاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ فوج اس اعتماد کی وجہ اپنے نظم وضبط اور بہتر انتظام کو قرار دیتی ہے۔

فوج میں اراضی کی تقسیم سے اعلیٰ افسروں کو سب سے زیادہ فائدے پہنچتے ہیں۔ درمیانے اور نچلے درجے کے افسروں کو بھی کچھ فائدے ہوتے ہیں لیکن ان کی شرح اعلیٰ افسروں سے کم ہوتی ہے تاکہ جونیئر افسروں میں نظم وضبط قائم رکھا جائے۔ اس نظم وضبط سے جونیئر افسروں کے اندر تابع داری کے جذبے کو یقینی بنایا جاتا ہے جو ہمیشہ سینئر افسروں کی جانب سے محتاط رہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے انھیں بھی سینئر پوزیشن پر ترقی ملے گی جس کی وجہ

سے انھیں زیادہ تنخواہ اور مراعات ملیں گی۔

اعلیٰ افسروں کو ملنے والی مراعات اور فوائد کے ساتھ فوج کی بدعنوانیوں میں بھی اضافہ ہوا ہے جو اراضی تک محدود نہیں۔ ہتھیاروں کی خریداری سے متعلق خرد برد کی کئی رپورٹیں بھی سامنے آ رہی ہیں۔[☆79] ان رپورٹوں کی ایک وجہ میڈیا کا جارحانہ رویہ بھی ہوسکتا ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ واقعی افسروں میں بدعنوانیاں بہت بڑھ گئی ہوں۔ لاہور کے DHA میں اراضی کے اسکینڈل میں اعلیٰ افسروں کا ملوث ہونا خاصا اہم موضوع رہا ہے۔

اسکینڈل یہ تھا کہ DHA نے پلاٹوں کی تعداد سے کہیں زیادہ درخواستیں وصول کیں، کیوں کہ ہر درخواست کے ساتھ مخصوص بیعانہ جمع ہوتا تھا جس سے DHA منافع حاصل کرتی تھی۔ اطلاعات کے مطابق اعلیٰ جنرلوں کو اس اسکینڈل کا پتا تھا۔[☆80] بہرحال پھر بھی فوج کے رہائشی منصوبے سویلین منصوبوں سے زیادہ قابلِ اعتبار سمجھے جاتے ہیں۔ بااثر اور مال دار لوگوں کے کئی نجی رہائشی منصوبے لوٹ مار کرتے ہیں اور عدلیہ میں بدعنوانی کی وجہ سے کہیں داد رسی نہیں ہوتی بلکہ سیاسی جبر کی وجہ سے یہ معاملات اور کمزور ہوجاتے ہیں۔ فوجیوں کی جانب سے چلائی جانے والی ترقیاتی اسکیموں میں لوگوں کو نسبتاً زیادہ اعتماد اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

DHA کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ ہے کہ فوج کے رہائشی منصوبے زیادہ محفوظ ہوتے ہیں اور وہاں چوری ڈاکے اور دیگر جرائم نہیں ہوتے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مجموعی صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سویلین اسکیموں کے مقابلے میں یہاں ڈاکے اور چھوٹے موٹے جرائم کم ہوتے ہیں، دراصل فوج کی موجودگی سے ہی تحفظ بہتر ہو جاتا ہے۔ چونکہ ریٹائرڈ اور حاضر ملازمت اعلیٰ افسر خود ان علاقوں میں رہتے ہیں، اس لیے چھوٹے موٹے مجرم یہاں واردات کی جرأت نہیں کرتے۔ اس طرح ان علاقوں کی ساکھ بہتر ہوجاتی ہے۔ صفائی ستھرائی کا بھی بہتر انتظام ہوتا ہے جس سے قیمتیں بڑھتی ہیں۔ فوج کے زیرِ انتظام اسکیموں سے بہاول پور جیسے چھوٹے شہروں میں بھی اراضی کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ بہاول پور میں اراضی کے اصل مالکوں کو اچھی قیمتیں نہیں ملتی تھیں لیکن بحریہ ٹاؤن کے قیام کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔[☆81]

گو کہ فوج کی اراضی کا صحیح تخمینہ لگانا ممکن نہیں، پھر بھی کچھ اندازے لگائے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب میں سنجیانی کے قریب آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے 1750 ایکڑ اراضی کو بہتّر کروڑ روپے لگا کر بہتر بنایا اور اس پر چوبیس ارب روپے کا منافع کمایا۔ راول پنڈی میں مورگاہ اور لاہور میں پارک ٹاؤن کے رہائشی منصوبوں پر کمایا جانے والا منافع بھی ایسا ہی قابلِ ذکر ہے۔ مورگاہ میں تین ہزار تین سو پچھتّر ایکڑ اراضی گیارہ ارب میں حاصل کی گئی جسے بعد میں ایک سو پینتیس ارب میں فروخت کیا گیا۔[☆82] پھر اس میں تعجب کیا کہ جب ایسے منافعے ملنے لگے تو DHA اپنی فوجی انتظامیہ کی وجہ سے توسیع پسندی پر اتر آئی اور زبردستی نجی اراضی پر قبضے کرنے لگی۔ مقصد یہ تھا کہ مقامی انتظامیہ اور نچلی عدلیہ سے مل کر مزید چار ہزار ایکڑ اراضی ہتھیالی جائے۔

لینڈ ریونیو ڈیپارٹمنٹ کو مجبور کیا گیا کہ اس چار ہزار ایکڑ اراضی سے متعلق کوئی دستاویز مہیا نہ کی جائے تاکہ مالکان اراضی بیچنے پر مجبور ہو جائیں۔[☆83] گاؤں والوں نے DHA حکام کی چیرہ دستیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ فوجی حکام نے صرف ستاون ہزار روپے فی کنال ادا کر کے انھیں علاقہ خالی کرنے پر مجبور کیا۔[☆84]

دوسرا معاملہ ایک اور نئے رہائشی منصوبے کا ہے جو DHA لاہور کے مضافات میں شروع کیا گیا۔ مبینہ طور پر DHA حکام نے اس کا قبضہ حاصل کرنے کے لیے قوانین کو بڑی چالاکی سے استعمال کیا۔[☆85] اس سلسلے میں مختلف طاقت ور حلقوں نے وسائل کے استحصال کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔

چونکہ شہری اراضی مہنگی ہوتی ہے، اس لیے عدلیہ جیسے اعلیٰ اداروں کو خریدنے کے لیے شہری اراضی استعمال کی جاتی ہے۔ عدلیہ کے ارکان کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ رہائشی پلاٹ حاصل کریں یا وہ بطورِ انعام انھیں دیے جاتے ہیں۔[☆86] عدلیہ کے علاوہ دیگر گروہوں کو بھی اسی طرح کے لالچ دیے جاتے ہیں، مثلاً 2004ء اور 2005ء میں حکومت نے صحافیوں کو رہائشی پلاٹ پیش کیے۔ اس طرح کی ترغیبات سے میڈیا جیسے سول سوسائٹی کے اداروں کو تنقید سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ممتاز کالم نگار ایاز امیر کے مطابق اراضی کی تقسیم سے دیگر

سماجی گروہوں کے حقوق مجروح ہوتے ہیں۔☆[87]

کراچی میں بہترین محلِ وقوع پر واقع DHA کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ DHA کا رقبہ آٹھ ہزار چھ سو ایکڑ سے بھی زیادہ ہے جو کراچی چھاؤنی کے ساڑھے پینتیس ہزار ایکڑ کی توسیع ہے۔☆[88] 1999ء کے بعد مزید چار ہزار پلاٹوں پر مشتمل کریک سٹی کا منصوبہ شروع کیا گیا جو DHA سے متصل کوئی نوے ایکڑ اراضی پر مشتمل تھا۔ صرف کریک سٹی کی مالیت کا اندازہ چار سو ارب روپے لگایا جاتا ہے۔ جہاں اتنے منافعے کی بات ہو، وہاں فوجی حکام خود اپنے لوگوں کی بات بھی نہیں سنتے، جو اس ''بدعنوانی'' کے خلاف بولتے ہیں۔ ایک سابق فوجی افسر اکرام سہگل کا، جو کہ اب کالم نگار اور کاروباری شخصیت ہیں، کہنا ہے کہ فوج کی ان حرکتوں سے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر اثر پڑتا ہے۔ ان کے مطابق یہ منصوبے کراچی کے ماحول کے لیے بھی نقصان دہ ہیں۔☆[89]

دوسرے شہروں مثلاً لاہور میں بھی ڈیفنس کے رہائشی منصوبے اسی توسیع پسندی کا مظہر ہیں جہاں اب DHA کا کل رقبہ ترانوے مربع کلومیٹر تک پھیل چکا ہے۔ ملٹری لینڈ اینڈ کنٹونمنٹ کے ایک اعلیٰ افسر کا کہنا تھا کہ جلد ہی لاہور پھیلتے پھیلتے بھارت کی سرحد سے جا ملے گا۔ اس کے مطابق یہ توسیع صرف فوجی حکام کی مرضی سے ہوتی ہے جو صرف مالیاتی فوائد سے دل چسپی رکھتے ہیں۔☆[90]

ان مہنگے رہائشی منصوبوں سے منفی اثرات صرف ارتکازِ دولت تک محدود نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ایسے رہائشی منصوبے ملک میں مکانوں کی قلت کے مسئلے کو حل نہیں کرتے بلکہ قیاسی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ شہری اراضی کی فروخت سے ملنے والے منافعے ایک خاص طبقے کی سماجی حیثیت کو بہتر بناتے ہیں اور ان سے شہری منصوبہ بندی بھی متاثر ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مہنگے منصوبے دیہی زمینوں پر قبضہ کر کے بنائے جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ بعض علاقوں کو دوسروں سے بہتر سہولتیں ملتی ہیں۔ اس طرح غریب اور امیر آبادیوں کا فرق بڑھتا رہتا ہے۔☆[91]

اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کی شہری منصوبہ بندی کے درمیان تفریق ایسے میں اور اُجاگر ہو جاتی ہے جب ان اعلیٰ اسکیموں کا بقیہ شہری ڈھانچے سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس

قسم کے فرق ساری دنیا میں ہوتے ہیں مگر یہ فرق اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتے ہیں جب اعلیٰ تعمیراتی سیاسی طاقت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

اراضی ہتھیانے کے لیے زبردستی

شہری اراضی کے حصول پر اس لیے بھی انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں کہ زمین حاصل کرنے کے لیے فوج طاقت کے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ فوج نے اکثر نجی اراضی بلا معاوضہ اور سویلین حکام کے بازو مروڑ کر حاصل کی ہیں۔ اسی طرح کی ایک مثال اسلام آباد کے انتظامی ضلع میں نیازیاں، ٹمک، سہالہ اور ڈھوک کینال کے گاؤں ہیں۔ دیہاتیوں نے لاہور ہائی کورٹ کی راول پنڈی بینچ میں آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے خلاف درخواست دی کہ AWT نے اُن کی چار ہزار ایکڑ اراضی ''قومی مفاد'' اور دفاعی ضروریات کا نام دے کر ہتھیالی ہیں جس کے لیے انھیں مناسب معاوضہ بھی نہیں دیا گیا۔

یہ دیہات اسلام آباد کی توسیع کے ماسٹر پلان کا حصہ ہیں۔ کیپٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی (CDA) نے جی ایچ کیو کو جو نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ (NOC) دیا تھا، وہ صرف ہماک کے گاؤں تک محدود تھا مگر فوج نے دیگر دیہات بھی مقامی لوگوں کو معاضہ دیے بغیر زبردستی ہتھیا لیے۔ AWT کے وکیل نے اس قبضے کو قومی مفاد میں قرار دیتے ہوئے حق بجانب کہا کیوں کہ یہاں فوجی افسروں کے مکان بنیں گے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ہائی کورٹ نے آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے اسے ملک کے ''قومی اور دفاعی مفاد'' میں قرار دیا۔☆[92] یہ ایک عجیب فیصلہ تھا کیوں کہ AWT ایک فلاحی ادارے کے طور پر رجسٹرڈ ہے اور خود نجی شعبے میں ہونے کا دعوے دار ہے۔ اس معاملے میں فوج نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایک نجی منصوبے اور خاص افسروں کو فائدے پہنچا کر عوام کے مفاد کو نقصان پہنچایا۔ تاہم سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے AWT کو حکم دیا کہ وہ دیہاتیوں کو معاوضہ ادا کرے۔ جب کہ اس معاملے میں دیہاتیوں نے عقل کا استعمال کرتے ہوئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن ایسے کئی معاملات میں فوج نے کوئی معاوضہ نہیں

دیا، مثلاً بلوچستان میں کوئٹہ کی وادی میں فوج نے سیکڑوں ایکڑ نجی اراضی زبردستی ہتھیا لی۔ مبینہ طور پر 1993ء کے بعد سے مقامی لوگوں اور اراضی کے مالکان کو ایک اینٹ بھی لگانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہاں فوج اپنے قلعے میں توسیع کرنا چاہتی تھی مگر جی ایچ کیو مارکیٹ ریٹ تو ایک طرف معمولی سرکاری قیمت بھی ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے وہاں لوگوں کی آمدورفت کو محدود کردیا گیا تاکہ جب حکومت اجازت دے تو فوراً قبضہ کیا جاسکے۔☆[93] اسی طرح سندھ میں وزارتِ دفاع نے 1980ء اور 1990ء کے عشروں میں دو لاکھ دس ہزار سات سو بائیس ایکڑ زمین لے کر صوبائی حکومت کو معاوضہ ادا نہیں کیا۔☆[94] فوج وفاقی حکومت کے ان دس محکموں میں سے ایک ہے جنھوں نے حکومتِ سندھ کو اراضی کے معاوضے نہیں دیے۔

اختیارات کا غیرقانونی استعمال کر کے نجی سویلین مالکان یا حکومتوں کی زمین ہتھیانے کی مثالیں اور بھی ہیں، مثلاً اسلام آباد میں نئے جی ایچ کیو کی تعمیر کے لیے وزارتِ دفاع نے 2005ء میں گیارہ سو پینسٹھ ایکڑ اراضی صرف چالیس روپے فی مربع گز کے حساب سے حاصل کی جو وزارتِ دفاع کے مطابق اراضی کے سرکاری مقاصد کے لیے حصول کا معقول معاوضہ تھا۔☆[95] بعد میں اسی علاقے میں وفاقی حکومت نے مزید ایک ہزار پچاس ایکڑ اراضی ایک سو پچاس روپے فی مربع گز پر الاٹ کردی۔ اس اراضی پر صرف فوجی ہیڈکوارٹر نہیں بنے گا بلکہ افسروں کے لیے مکان، اسکول، بازار اور دیگر سہولتیں بھی بنیں گی۔ فوجی حکام حکومت کو مجبور کررہے ہیں کہ ساڑھے تین ہزار دیہاتیوں کو سرکاری خرچ پر کہیں اور منتقل کیا جائے جن میں چونترہ کا گاؤں بھی شامل ہے۔☆[96]

فوجی اراضی کی سماجیات

فوج کے زمین ہتھیانے سے صرف اوپر بیان کیے گئے مسائل ہی پیدا نہیں ہوتے۔ خصوصاً پاکستان کے دیہی علاقوں میں یہ مسائل فیوڈلزم اور غیرمساوی سماجی رشتوں میں مزید خرابی پیدا کرتے ہیں۔ زرعی زمینیں حاصل کرنے والے فوجی ''غیرحاضر کسان'' ہوتے ہیں جو خود کاشت کاری نہیں کرتے، مثلاً جنرل پرویز مشرف اور دیگر اعلیٰ جنرلوں کے بہاول پور میں

فارموں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بے زمین کسان کام کر رہے ہیں جنھیں اپنی محنت کے بدلے کوئی قانونی یا سماجی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ 1990ء سے پہلے زرعی زمینوں کے مالک بہت سے فوجیوں نے اپنی اراضی مقامی زمیں داروں یا نئے دیہی سرمایہ داروں کو فروخت کر دیں جو اراضی خرید کر زراعت کا پیشہ نہیں اپناتے تھے بلکہ اسے اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے اظہار کے لیے استعمال کرتے تھے۔

سماجی سیاسی طور پر دیکھا جائے تو اس طرح مطلق العنانیت کو فروغ ملتا ہے۔☆[97] اراضی کی ''غائب ملکیت'' اور مطلق العنانیت کا باہمی تعلق اس لیے ہے کہ بڑے زمیں دار اور با اختیار لوگ ہی اُس اراضی سے فائدے اٹھاتے ہیں جس پر وہ خود کاشت نہیں کرتے۔ زرعی اراضی کے بڑے اور بااثر مالکان کی وجہ سے زمینی وسائل کی غیر مساوی تقسیم کا مسئلہ شدید ہو جاتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق ملک میں کوئی دو کروڑ بے زمین کسان ہیں۔ ایسے چھوٹے زمیں دار بھی بڑی تعداد میں ہیں جو سیاسی اثر و رسوخ میں بڑے زمیں داروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حمزہ علوی کے مطابق 1970ء کے عشرے میں صرف پانچ فی صد زمیں دار ملک میں ستّر فی صد سے زیادہ اراضی کے مالک تھے۔☆[98] یہ صورتِ حال ا تک کوئی زیادہ تبدیل نہیں ہوئی ہے جس کی نشان دہی اکبر زیدی نے بھی اپنے تجزیے (Issues in Pakistan's Economy) میں کی ہے۔☆[99] اکبر زیدی لکھتے ہیں کہ 1980ء کے عشرے میں حکومت نے جو مردم شماری کرائی اس کے مطابق پاکستان میں کاشت کاری کی چونتیس فی صد اراضی پانچ ایکڑ سے بھی کم کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے جو کہ مجموعی اراضی کا صرف سات فی صد ہے۔ دوسری جانب ملک کے اعشاریہ چونتیس فی صد فارم مجموعی زرعی کا ساڑھے آٹھ فی صد ہیں۔ یہ صورتِ حال سندھ اور جنوبی پنجاب میں بہت واضح ہے جہاں بڑی بڑی زمیں داریاں ہیں۔☆[100] سرمایے کے ارتکاز اور بہاؤ میں رکاوٹیں ہونے سے دیہی علاقوں میں مضبوط درمیانہ طبقہ نہیں ابھر پاتا۔

زرعی زمینوں کے فوجی مالکان خصوصاً اعلیٰ افسر جن علاقوں میں اراضی حاصل کرتے ہیں، خود بھی وہاں کے بڑے مقامی زمیں داروں جیسے ہی فیوڈل طور طریقے اپنا لیتے ہیں، مثلاً جنوبی

پنجاب میں کئی اعلیٰ فوجی افسر زرعی اراضی حاصل کر کے وہاں کے نمبردار بھی بن گئے ہیں۔ یاد رہے کہ نمبردار ریاست کے مقرر کردہ لوگ ہوتے ہیں جو علاقے کی اراضی اور پانی پر ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

اگرچہ حکومت نمبردار کو کوئی معاوضہ نہیں دیتی، پھر بھی ریاستی مفادات کا نگہبان ہونے کی بدولت اسے علاقے میں خاصا اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے جس میں مقامی پولیس اور حکام بھی شامل ہوتے ہیں اور یہی پنجاب کی فیوڈل روایت ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق لیفٹیننٹ جنرل شاہد پرویز (جو کبھی بہاول پور کے کور کمانڈر تھے) اور سابق وزیرِ داخلہ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر بالترتیب چک نمبر 104 اور چک نمبر 44 کے نمبردار بھی ہیں۔ سابق جوائنٹ چیفس آف اسٹافس کمیٹی کے سربراہ جنرل عزیز خان اور سیکریٹری اسٹیبلشمنٹ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعجاز شاہ بھی اپنے گاؤں چک نمبر 47 اور چک نمبر 143 کے نمبردار ہوئے۔ نمبردار بننے سے ان افسروں کو مزید ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی مل جاتی ہے۔

جنرل پرویز مشرف بھی چک نمبر 13 کے نمبردار ہیں۔☆[101] اس طرح کی تقرریوں سے نمبرداری کی روایت مجروح ہوتی ہے کیوں کہ اسے مقامی باشندہ ہونا چاہیے جو محصول بھی جمع کر سکے اور اس عمل میں مقامی آبادی کے ساتھ تعلقات بھی مضبوط بنائے۔ چونکہ یہ جنرل نمبردار بن کر بھی ان علاقوں میں نہیں رہتے، اس لیے محصول ان کے نمائندے وصول کرتے ہیں جو خود بھی مقامی نہیں ہوتے۔ حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ جنرل نمبردار بن کر دیہی علاقوں میں سیاسی اثر بڑھاتے ہیں اور مزید اراضی حاصل کرتے ہیں۔

اراضی اور اختیارات کا باہمی تعلق درمیانے طبقے کو اُکساتا ہے کہ وہ مزید طاقت کی علامت حاصل کریں۔ اراضی اور خصوصاً زرعی اراضی کی علامتی اہمیت کی نشان دہی ماہرِ معاشیات حارث گزدر نے پاکستان میں دیہی زمین کے بارے میں اپنی تحقیق میں کی ہے۔ ان کے خیال میں سول اور ملٹری افسر شاہی نے ایک خاص سیاسی علامت کے طور پر ہی اراضی حاصل کی۔☆[102] ایسی علامات فیوڈل سماجی اخلاقیات کا لازمی جز ہوتی ہیں جہاں لوگ ان علامات کے ذریعے بالادست طبقے کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔ کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے فارموں کو

بھی ایسی ہی علامات سمجھا جاسکتا ہے جن کے مالکان کا پُرتعیش طرزِ زندگی اسی زوال پذیر فیوڈل کلچر کی عکاسی کرتا ہے۔ دولت کا دکھاوا اور جاگیرداروں کی نقالی ایک ایسا اُلٹا رجحان ہے جو شہری نودولتیوں کو دیہاتی رویوں سے قریب کرتا ہے۔ یہ فارم اُن لوگوں کے پاس ہیں جو پڑھے لکھے، مغربی تربیت یافتہ ہیں اور زیادہ تر سول یا فوجی افسر شاہی یا صنعت کار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہی فارم فیوڈل اور مطلق العنان رویوں کی آماجگاہ ہیں۔

ایسے کلچر کو ''دیہی شہر'' کا کلچر کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ یہ دیہی علاقے شہروں سے جدا نہیں ہوتے۔☆[103] ''دیہی شہر'' کی اصطلاح شہری اور علاقائی منصوبہ بندی کے ماہر محمد اے قدیر نے وضع کی ہے، انھوں نے یہ اصطلاح شہری سہولتوں کے لیے استعمال ہے لیکن کلچر پر بھی اسے لاگو کیا جاسکتا ہے۔ ''دیہی شہر'' میں فیوڈل کلچر نمایاں ہوتا ہے جس کا اظہار نئے زمیں دار کرتے ہیں۔ مثلاً ان فارموں پر ہونے والے مجرے اسی غلیظ فیوڈل ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔☆[104] ان کا ذکر تہمینہ درّانی نے اپنی آپ بیتی ''مائی فیوڈل لارڈ'' میں کیا ہے۔☆[105]

ملک کے بالادست طبقے اراضی ہتھیاتے رہتے ہیں اور بے زمین کسان اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہتے ہیں، مثلاً بہاول پور میں نواز آباد کے گاؤں میں سیکڑوں بے زمین کسان جس ریاستی اراضی پر عرصے سے رہ رہے تھے، اسے فوجیوں کو دے دیا گیا۔ ایک ویڈیو انٹرویو میں ان کسانوں نے نکالے جانے پر احتجاج کیا کہ جس اراضی کو انھوں نے صحرا سے قابلِ کاشت زمین میں بدل دیا تھا، وہاں سے اُنھیں سماعت کا حق دیے بغیر نکال دیا گیا اور انھیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئیں۔ کسان سمجھ گئے کہ عدالت ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ فوج کے جونیئر افسروں نے بھی قانون کا مذاق اڑایا اور کسانوں سے کہا کہ یہ عدالتیں بھی فوج کا کچھ نہیں کرسکتیں۔ نواز آباد کے متاثرہ لوگوں کے مطابق جاگیرداروں اور فوجیوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔

چونکہ یہ لوگ طاقت ور زمیں داروں کی زمین پر مکان نہیں بنا سکتے تھے، لہٰذا بعض لوگوں نے سرکاری زمین پر قبضہ کرلیا۔ نواز آباد کے متاثرہ لوگوں میں سے ایک عورت نے کہا، ''اگر ہمارے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں تو حکام کو چاہیے کہ ہمیں ٹرک میں ڈال کر بھارت میں پھینک

دیں۔''[106] یہ ان بااختیار لوگوں کے سامنے احتجاج کا آخری طریقہ تھا جنھوں نے ان لوگوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا تھا، ایسے میں مقامی سویلین انتظامیہ بھی غریب اور بے زمین کسانوں کے بجائے فوج کی ہی مدد کرتی رہی۔ کسانوں نے بتایا کہ مقامی افسر ایک طرف کھڑے تماشا دیکھتے رہے اور فوجی افسر غریب کسانوں کو نہ نکلنے پر سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے رہے۔[107]

اسی طرح کی پریشان کن داستان سندھ میں ماہی گیروں کے چھوٹے سے گاؤں مبارک کی ہے۔ سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر واقع یہ ساحلی گاؤں کبھی ان ماہی گیروں کا اپنا تھا لیکن پچھلے پانچ سال سے یہ دیہاتی اپنے پیروں تلے سے گاؤں کو کھسکتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

صدیوں سے یہ ماہی گیر یہاں آباد تھے، پھر اچانک انھیں پتا چلا کہ خود اپنے گاؤں میں آزادی سے آجا نہیں سکتے۔ بحریہ نے مبارک والوں کو حکم دیا کہ وہ ایک چھوٹے سے علاقے میں خود کو محدود کرلیں، یہی نہیں بلکہ وہ کوئی مکان بھی تعمیر نہ کریں کیوں کہ متصل اراضی بحریہ کی مشقوں کے لیے ہے۔ دیہاتیوں کا دعویٰ ہے کہ بحریہ نے پہلے مخصوص حدود میں رہنے کا وعدہ کیا تھا لیکن پھر وعدہ توڑ کر حدود میں توسیع کرتے گئے جب کہ موجودہ قوانین میں بحریہ چھاؤنی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پھر دیہاتیوں کے پاس نہ تعلیم ہے اور نہ پیسا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے لڑسکیں یا مقدمے بازی کرسکیں۔

بہرحال اگر ان میں سے کوئی قانونی کارروائی کر بھی دے تو بھی فوری انصاف ملنا مشکل ہے۔ کراچی میں یونس آباد کے قریب بحریہ نے تیرتی گودی (Floating Jetty) اور اس کے قریب کی اراضی پر قبضہ کرلیا جو گاؤں کے لوگوں اور خصوصاً بیماروں کو لے جانے کے کام آتی تھی۔ قریبی گاؤں شمس پیر کے دیہاتیوں کے لیے یہ گودی واحد راستہ تھی۔ سندھ ہائی کورٹ میں ''بحریہ کے اس غیر قانونی'' عمل کے خلاف درخواست دائر کی گئی اور ضلعی انتظامیہ کو کئی خط لکھ کر بحریہ کے ہاتھوں انسانی حقوق کی اس پامالی سے آگاہ کیا گیا مگر دیہاتیوں کو ہراساں کیا جاتا رہا اور گاہے بگاہے انھیں مارا پیٹا بھی گیا۔ بحریہ نے اس عدالتی حکم پر بھی عمل نہیں کیا جس کے تحت لوگوں کی آمدورفت نہ روکنے کا کہا گیا تھا۔[108] بحریہ اس علاقے کو اس

لیے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ وہ یہاں بجری بیچتی تھی۔

بجری بیچ کر غریبوں کے استحصال کے علاوہ تجارتی سرگرمیوں کے ماحول کا استحصال بھی کیا جاتا رہا ہے۔ بجری ہٹنے سے نمکین سمندری پانی زمین کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ کراچی میں کلفٹن کا ساحل بھی خطرے میں ہے کیوں کہ DHA نے ڈیڑھ ارب روپے کا ایک توسیعی منصوبہ شروع کیا ہے۔ DHA کو سرکاری یا ریاستی اراضی دی گئی تاکہ وہاں نجی رہائشی منصوبہ شروع کیا جائے لیکن اس کے لیے مقامی لوگوں کے ماحولیاتی خطرات کی بابت مشورہ نہیں کیا گیا۔☆[109]

بحریہ کے حکام ماحولیاتی تباہی سے بے پروا ہیں اور ان کا سارا زور صرف اپنے اختیارات اور منافعے پر ہے۔ ان کا رویہ بھی کسی بڑے جاگیردار سے مختلف نہیں، کیوں کہ انھیں بھی اپنے مفادات کے علاوہ کسی چیز سے کوئی غرض نہیں۔ جاگیردار اور بڑے زمیں دار زمین اور دوسرے وسائل کے حصول میں فوج کے مددگار ہیں۔ مثال کے طور پر جنوبی پنجاب کے بڑے جاگیرداروں نے بھی فوجیوں کے زمین ہتھیانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جنوبی پنجاب کے معروف زمیں دار خورشید زمان قریشی نے (جو مشرف کی فوجی حکومت میں 2000ء سے 2002ء تک زراعت کے صوبائی وزیر بھی رہے) جنوبی پنجاب میں فوجیوں کے زمین ہتھیانے پر اعتراض نہیں کیا گو کہ عام لوگ فوجیوں سے کیے جانے والے ترجیحی سلوک سے نالاں تھے، پھر بھی بڑے لوگ اس پر کچھ نہیں کہتے۔ سابق وزیر کے خیال میں جنوبی پنجاب کے فوجیوں اور زمیں داروں کے تعاون سے علاقے میں اتنی ترقی ہو رہی ہے جتنی وسطی پنجاب کے ان دونوں گروہوں کے تعاون سے جو سیاسی طور پر بڑے اہم ہیں، نہیں ہو سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ فوجی زمیں دار کافی مقدار میں پانی چولستان میں لائے جو جنوبی پنجاب کا وہ ریگستانی علاقہ ہے جہاں انھیں زمین الاٹ ہوئی تھی۔☆[110] بڑی تعداد میں سینئر فوجی جنرل متنازعہ گریٹر تھل کے نہری منصوبے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جس کا مقصد جنوبی پنجاب میں زرعی زمین کو ترقی دینا ہے۔

پاکستان میں پانی کی تقسیم پر تحقیق کرنے والے مشتاق گدی کے مطابق تھل نہر اعلیٰ فوجی

افسروں کی اراضی کو سیراب کرے گی اور اس سے چولستانی عوام کو کم فائدہ ہوگا۔[☆111] یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مقامی حکام نے بھی علاقے کے بے زمین کسانوں کی بجائے فوجیوں کو زمین بانٹنے میں بڑی چستی دکھائی۔ اس مستعدی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اراضی کی تقسیم و ترقی کی ذمے دار چولستان ڈیویلپمنٹ اتھارٹی (CDA) کے کئی اعلیٰ عہدوں پر ریٹائرڈ فوجی افسر بیٹھے ہیں۔

زمین اور پانی کی تقسیم کے مسائل سے مرکز اور چھوٹے صوبوں میں تعلقات پر منفی اثر پڑتا ہے، مثلاً سندھ میں پانی کی شدید کمی کے باعث بعض کسان مثلاً بشیر شاہ اپنے آموں کے باغات تک کاٹنے پر مجبور ہوگئے ہیں، کیوں کہ نہروں اور جھیلوں میں پانی نہیں ہے اور ٹیوب ویل سے نمکین پانی آتا ہے۔[☆112]

بلوچستان میں گوادر کے ساحل پر وفاقی حکومت کے ترقیاتی کام بھی ریاستی مطلق العنانیت اور چھوٹے صوبوں میں مداخلت کی مثال ہیں جس سے فوج اور دیگر بالادست طبقوں کا فائدہ ہوتا ہے مگر وفاق کمزور ہوتا ہے۔ بلوچ رہنما اور عوام گوادر میں ہونے والی ترقی سے ناخوش ہیں، جہاں سے بااثر گروہ اور فوجی تو اراضی حاصل کرلیتے ہیں مگر علاقے کا سماجی و سیاسی ماحول خراب ہو رہا ہے۔

اور عوام اس بات سے ناخوش ہیں کہ گوادر کی رواں ترقی جس نے بہت سے بااثر گروہوں اور فوجیوں کو زمین خریدنے کا موقع فراہم کیا ہے، وہی ترقی اس علاقے بلکہ پورے صوبے کے سماجی سیاسی ماحول کے لیے نقصان دہ ہے۔ بلوچ رہنما عطاء اللہ مینگل کا خیال یہ تھا کہ:

> گوادر میں تعمیرات اور اراضی پنجابی سول اور فوجی افسر شاہی کو بانٹنے سے صوبے میں بڑی تعداد میں باہر سے لوگ آنے لگے ہیں جس سے مقامی کلچر متاثر ہو رہا ہے۔ یہ صورتِ حال سیاست کو بھی بدل دے گی کیوں کہ اکثریت باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی ہوگی۔[☆113]

ریاست کی طرف سے ایسی مداخلت اور اراضی بانٹنے کی مقامی لوگوں کی مخالفت سے وفاق کمزور ہوتا ہے مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے دور دراز کے فاصلے پر راول پنڈی

میں بیٹھے ہوئے فوجی جنرل بے خبر ہیں۔ اراضی پر قبضے میں فوج کا سیاسی اثر ورسوخ کام آتا ہے، مثلاً بہاول پور میں صوبائی حکومت نے بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد بشیر کو عبدالکریم نامی کسان کی زمین الاٹ کر دی۔ 1993ء میں صوبائی حکومت نے جانچ پڑتال کیے، بغیر کوئی چونتیس ہزار ایکڑ اراضی جی ایچ کیو کو منتقل کر دی جو اس سے قبل بے زمین کسانوں کو لیز کی جا چکی تھیں۔ تین سو چھیانوے کنال میں سے بریگیڈیئر بشیر کو دی جانے والے تین کنال اراضی عبدالکریم کی تھی۔ فوجی حکام کو خوش کرنے کی لگن میں ضلعی حکومت کے نمائندوں نے کریم کے دعوے کو رد کرنے کی کوشش کی۔ جب کریم نے اراضی رکھنے کی کوشش کی تو بریگیڈیئر بشیر عدالت میں چلا گیا اور لاہور ہائی کورٹ نے بہاول پور کی مقامی انتظامیہ کے فیصلے کو بدلتے ہوئے کریم کی ملکیت برقرار رکھی۔

پھر بھی بریگیڈیئر کو چین نہ آیا اور وہ سپریم کورٹ گیا جہاں عدالتِ عالیہ نے کریم کے مالکانہ حقوق برقرار رکھتے ہوئے ڈسٹرکٹ کلکٹر کو ڈانٹا اور پوچھا کہ جب زمین کو الاٹ نہیں کیا جا سکتا تھا تو پھر ایک فوجی کو یہ زمین کیسے ملی۔ عدالت نے بریگیڈیئر بشیر کو بھی تنبیہ کی کہ وہ ایک غریب کسان کے حقوق غصب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ تاریخی فیصلہ سپریم کورٹ نے ستمبر 2003ء میں سنایا اور فیصلے میں جان اسٹین بیک کے ناول The Grapes of Wrath کی یہ تحریر نقل کی۔

> مال دار افراد کو شورشوں میں اپنی املاک سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ مال دار لوگ تاریخ سے یہ حقیقت سمجھ سکتے ہیں کہ جب دولت بہت کم ہاتھوں میں جمع ہو جائے تو اسے چھین لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب لوگوں کی اکثریت بھوکی ننگی ہو تو وہ بزورِ طاقت اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ ایک اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ جبر و استبداد سے مظلوم مستحکم ہو جاتے ہیں۔ مال دار لوگ انھی حقیقتوں کو جھٹلاتے رہے ہیں۔ اراضی کم سے کم ہاتھوں میں جمع ہوتی رہی اور محروموں کی تعداد بڑھتی رہی مگر مال دار لوگ مزید ظلم و ستم کرتے رہے۔ رقم سے ہتھیار

> خریدے گئے، بارود خریدے گئے تاکہ بڑی املاک بچائی جاسکیں۔ انقلابیوں کی بو سونگھنے کے لیے جاسوس چھوڑے گئے، تاکہ بے چینی کو کچلا جاسکے۔ بدلتی معیشت کو نظر انداز کیا گیا، تبدیلی کے منصوبوں کو نظر انداز کیا گیا اور صرف بغاوت کچلنے کے طریقوں پر غور کیا جاتا رہا جب کہ بغاوت کی وجوہ اپنی جگہ موجود رہیں۔☆114

گو کہ عبدالکریم کو انصاف مل گیا مگر عدالت کے اس فیصلے کو دیگر مقدمات میں استعمال نہیں کیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کریم کو انصاف خود قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے سے نہیں ملا کیوں کہ اس کے پاس اتنے ذرائع تھے ہی نہیں، بلکہ بریگیڈیئر بشیر نے اس کی اراضی حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا تھا۔

اس بات کا امکان کم ہے کہ یہ تاریخی فیصلہ دیگر غریبوں کے کام آئے گا کیوں کہ وہ عدالتی چارہ جوئی کے لیے مالی وسائل سے محروم ہیں اور نہ اعلیٰ فوجی افسر ہی اس فیصلے سے کچھ سبق لیں گے کیوں کہ وہ اب بھی بے زمین کسانوں کو شک وشبہے اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، مثلاً بحریہ کے ایک افسر کا کہنا تھا:

> بے زمین کسانوں کا اراضی پر ترجیحی حق کیسے ہوگیا؟ اگر وہ غریب ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں اراضی پر ملکیت کا حق ہے۔☆115

اسی طرح کے جذبات کا اظہار میجر جنرل (ریٹائرڈ) سلیم نے کیا جن کے خیال میں:

> اراضی غریبوں کو دینے یا فوجیوں کو دینے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مسلح افواج کے لوگوں کو بھی اراضی کا اتنا ہی حق ہے جتنا بے زمین کسانوں کو۔☆116

رفتہ رفتہ پاکستان کی فوجی اشرافیہ بھی ملکی وسائل کے استحصال میں دیگر بالا دست طبقوں کے ساتھ کھڑی ہوگئی ہے۔ فوج کے زیرِ اختیار لاکھوں ایکڑ اراضی کے استعمال بدلے جانے کا خدشہ موجود ہے جس سے فوجی برادری کو ہی فائدے پہنچیں گے۔ اس طرح فوج اور ملک کے جاگیردار طبقے میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہے گا۔

باب–8

فوجیوں کی فلاح و بہبود

پاکستان میں فوج کی ملازمت انتہائی پُرکشش ذریعۂ معاش ہے۔ خاص طور پر فوجی گھرانے کے نوجوان اور نچلے درمیانے طبقے کے لوگوں فوج میں شمولیت کو روزگار کے علاوہ سماجی اثر اور رتبے میں بہتری کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ فوجی ملازمت کا پُرکشش ہونا دوسری وجوہ کے علاوہ اس کے سیاسی اثر و رسوخ اور فلاحی نظام کا مرہونِ منّت ہے۔ فوج اپنے حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ ملازمین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ انھیں معقول پنشن کے علاوہ شہری اور دیہی اراضی اور دیگر سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں جن سے فوج کے اندر یک جہتی اور یگانگت بڑھتی ہے۔ اس باب میں ہم فوج کے فلاحی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے ریاست اور سماج پر اس کے سیاسی مضمرات کا تجزیہ کریں گے۔

فوجی بہبود

فوج اپنے ملازمین کو ریٹائرمنٹ کے بعد جو مراعات دیتی ہے، اس کے بارے میں میجر جنرل (ریٹائرڈ) آغا مسعود حسن کہتے ہیں، ''فوج ایک سماجی ادارے کے طور پر کام کرتی ہے جو اپنے لوگوں کا خیال رکھتا ہے... سویلین اور سیاست دان اپنے لوگوں کا خیال نہیں رکھتے۔''☆[1] جنرل مسعود کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج نسبتاً بہتر لوگوں کو راغب

کرنے کے لیے اچھی سہولتیں بھی دیتی ہے اور اس بات پر فخر کرتی ہے کہ فوجیوں کی ضرورتیں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پوری ہوتی رہتی ہیں۔ دراصل ایسے متعدد طریقے ہیں جن کے ذریعے فوجی ملازمین کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

فوجیوں کو ملنے والی مراعات کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کی کوئی ٹھوس شکل نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کا غیر مرئی سماجی اثر و رسوخ ہے جو مسلح افواج میں کام کرنے سے خود بخود مل جاتا ہے۔ گزشتہ عشروں میں فوج بتدریج اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کا شعوری استعمال کرنے لگی ہے۔ چونکہ فوج اپنی برتر ساکھ کی تشہیر کرتی ہے، اس لیے لوگ بھی فوجیوں کو خود سے برتر سمجھنے لگے ہیں۔ خصوصاً پنجاب اور سرحد کے جن علاقوں سے فوج میں زیادہ بھرتی ہوتی ہے، وہاں پر لوگ فوجیوں کا عزت و احترام کرتے ہیں۔ چھوٹے شہروں اور دیہات میں فوج سے وابستہ لوگوں کے مسائل ضلعی انتظامیہ میں بھی آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ فوجیوں کے لیے بہترین کلب اور گیسٹ ہاؤس میسر ہوتے ہیں اور صحت اور تعلیم کی ایسی سہولتیں جو سویلین کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں، فوجیوں کو با آسانی دستیاب ہوتی ہیں۔

دوسری قسم ٹھوس مادی فوائد کی ہے جن میں فوجی پنشن اور شہری اور دیہی املاک اور ریٹائر ہونے کے بعد ملازمت کے مواقع شامل ہیں۔ فوج کوئی نوے لاکھ سے زیادہ افراد کو فلاحی خدمات فراہم کرتی ہے جن میں ریٹائرڈ فوجی اور اُن کے اہل و عیال شامل ہیں۔ ہر سال مرکزی حکومت فوجیوں کی پنشنوں پر ٹھیک ٹھاک رقم خرچ کرتی ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے مالیاتی ادارے وسائل میں کفایت کا درس دیتے ہیں، اس لیے مشرف حکومت نے فوجی پنشنوں کو فوجی اخراجات سے الگ کر کے حکومت کے مجموعی تنخواہوں کے کھاتے میں ڈال دیا اور اس طرح دفاعی بجٹ کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کی گئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حکومت سویلین پنشنوں سے زیادہ فوجی پنشنیں ادا کرتی ہے۔☆[2]

فوجی اور سویلین پنشنوں میں یہ فرق اس لیے ہے کہ فوجیوں کی تنخواہیں، الاؤنس اور پنشنیں سویلین ملازمین سے بہتر ہیں (ان میں مسلح افواج کو ملنے والی دیگر مراعات شامل نہیں ہیں)۔ سول ملازمین کو تنخواہیں بھی کم ملتی ہیں اور دیگر مراعات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں جب

کہ پنشن کا دارومدار ملازمین کی انفرادی تنخواہوں پر ہوتا ہے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس (PIDE) نے سرکاری شعبے کی تنخواہوں پر ایک تحقیق کی جس میں 1970ء کے بعد سول اور فوجی تنخواہوں کا موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ 1970ء کے عشرے میں سرکاری شعبے کی تنخواہیں کم ہوئیں۔☆[3] PIDE کے ایک محقق ظفر ناصر کے مطابق ہنرمند سرکاری ملازمین کی تنخواہیں اُن بے ہنر اور کم پڑھے لکھے ملازمین سے بہتر ہیں جو غیر منظّم (Informal) نجی شعبے میں کام کرتے ہیں۔ سویلین سرکاری ملازم باقاعدہ یا منظّم (Formal) نجی شعبے کے ملازمین سے کم تنخواہیں لیتے ہیں۔☆[4]

سرکاری شعبے (خصوصاً فوج) کی تنخواہوں اور نجی شعبے کی تنخواہوں کا فرق دنیا بھر میں مشترک ہے۔ اگرچہ امریکی فوجی پاکستانیوں سے بہتر تنخواہیں لیتے ہیں پھر بھی یہ امریکی نجی شعبے کی تنخواہوں سے کم ہوتی ہیں۔ مسلح افواج کی کم تنخواہوں کی ایک وجہ فوج کی فلاح و بہبود کا نظام بھی ہے جو دنیا بھر کی تقریباً تمام افواج کے لیے موجود ہے۔ ہر جگہ مسلح افواج اپنے ملازموں کو اضافی مراعات دیتی ہیں تاکہ بہتر لوگ اس میں آئیں اور اس کی ملازمتیں چھوڑ کر نہ جائیں۔

جدول: 8.1 فوجی اور سویلین پنشنوں کا موازنہ

سال	فوجی پنشن (اربوں میں)	سول پنشن (اربوں میں)
2000-01	28.247	N/A
2001-02	26.415	5.393
2002-03	33.494	6.130
2003-04	30.826	6.372
2004-05	30.181	6.156

ماخذ: اکاؤنٹینٹ جنرل آف پاکستان (AGPR) اسلام آباد۔

فوج کی پنشن یا ریٹائرمنٹ کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس سے لوگ فوجی ملازمت کی طرف راغب ہوں اور ان کا پیشہ ورانہ مستقبل بھی باقاعدہ شکل اختیار کر لے اور "مسلح

افواج'' مضبوط رہیں۔☆[5]

فوج کے فلاحی نظام میں ریٹائرمنٹ کے بعد کے تمام فوائد شامل ہیں مثلاً صحت، رہائش اور دوبارہ ملازمت کے مواقع۔ امریکا اور برطانیہ جیسی دیگر مسلح افواج بھی اسی طرح کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں، مثلاً اکتوبر 1996ء میں امریکی کانگریس نے پبلک N نمبر262-104 منظور کیا جس کے تحت تمام پرانے فوجیوں کو صحت کی بہتر سہولتیں فراہم کرنے کی ضمانت دی گئی۔ برطانیہ میں بھی جنگ میں حصہ لینے والے اور سبک دوش ہونے والے فوجیوں کے لیے خاص سہولتیں رکھی گئی ہیں۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اکثر مسلح افواج اپنے فوجیوں اور اُن کے اہل وعیال کی فلاح و بہبود کو اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ مگر یہ صورتِ حال ہمیں صرف سترھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد ہی نظر آتی ہے۔ جنگِ کریمیا (56-1854ء) تک سپاہیوں کی ذاتی ضرورتوں کا خیال بہت کم رکھا جاتا تھا اور ان کے اہلِ خانہ کا تو کوئی بھی پرسانِ حال نہیں تھا۔☆[6] تاہم جدید افواج میں اُن کی ضروریات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ رینڈ (Rand) کارپوریشن کے محققین کے مطابق اعلیٰ مراعات دے کر فوجیوں کو ملازمت پر برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔☆[7] مالیاتی مراعات کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کم صلاحیتوں والے فوجی اپنی ملازمت کے دوران میں جلد ہی ریٹائرمنٹ لے کر چلے جاتے ہیں۔☆[8] افسروں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ بیس سال کی ملازمت کے بعد فوجی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لیں تاکہ نئے نوجوان آگے آسکیں۔ اس طرح کی ترغیبات سے بہت سے فوجی افسر جلد ریٹائر ہوکر متبادل ملازمتیں ڈھونڈنے لگتے ہیں اور انھیں مکمل مراعاتی پیکیج فوج سے ملتا رہتا ہے۔

پاکستانی فوج کا عمدہ صلاحیتوں کے لوگوں کے لیے اپنی فوج میں کشش پیدا کرنے اور انھیں اپنے یہاں ملازمت میں رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انھیں متعدد ترقی یافتہ ملکوں سے زیادہ بہبود کا پیکیج پیش کرتے ہیں۔ بہبود کا نظام مستقبل میں مالی اور معاشرتی تحفظ پیش کرنے پر منحصر ہے جن کی افسروں اور جوانوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد ضرورت ہوگی۔ مثال کے طور پر

رہائشی مکانوں اور زرعی اور شہری زمینوں کی فراہمی کا مقصد اس دباؤ سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے جو ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد مکانات یا زندگی گزارنے کے متبادل ذریعوں کی تلاش کرنے میں انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس بات کو یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی مراعات پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں اضافہ کرتی ہیں اور بہتر صلاحیتوں کے افسروں کو بھرتی کرنے اور انھیں ملازمت میں رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ بہرحال اس مفروضے کو ثابت کرنے کے کوئی شواہد موجود نہیں ہیں۔

پاکستانی فوج کا فلاحی نظام دو طرح کے ماڈلوں پر مشتمل ہے جن پر تفصیل کے ساتھ گفتگو اگلے دو ذیلی حصوں میں کی گئی ہے۔

فوجی فاؤنڈیشن کا ماڈل

یہ ایک پرانا ماڈل ہے جس کے تحت ریٹائرڈ فوجیوں اور اُن کے اہلِ خانہ کو صحت، تعلیم اور ملازمت کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کے لیے مسلح افواج وسائل حاصل کر کے سبک دوش ہونے والے فوجیوں کے لیے سہولتیں مہیا کرتی ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن کی بنیاد بھی اسی طرح رکھی گئی کہ یہ تجارتی منصوبوں سے منافع کما کر صحت، تعلیم اور تکنیکی تربیت کی سہولتیں فراہم کرے۔ فوجی فاؤنڈیشن دو سو چوہتّر رفاہی منصوبے چلاتی ہے جن میں گیارہ اسپتال، تئیس طبّی مراکز، اکتیس دوا خانے اور اکتالیس گشتی شفا خانے شامل ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن کا موجودہ رفاہی بجٹ تقریباً ڈیڑھ ارب روپے کا ہے جس میں تقریباً ایک ارب روپے صحت پر اور نصف ارب روپے تعلیم پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد امجد کے دیے گئے اعداد شمار کے مطابق کوئی اسّی کروڑ روپے 2002ء اور 2003ء کے مالی سال میں صحت پر خرچ کیے گئے۔ طبّی سہولتوں سے فوجی اُن علاقوں میں بھی فائدے اٹھاتے ہیں جہاں کمبائنڈ ملٹری اسپتال یا فضائیہ اور بحریہ کے اسپتال نہیں ہیں۔ ☆9

تعلیم کے لیے بھی فوجی فاؤنڈیشن کا متوازی نظام موجود ہے۔ اس کے نوے اسکول اور

کالج ہیں جن میں کوئی چالیس ہزار طلبہ پڑھتے ہیں۔ ان کے علاوہ نو ٹیکنیکل ٹریننگ سینٹر مردوں کے لیے اور چھیاسٹھ ووکیشنل سینٹر عورتوں کے لیے ہیں جو سلائی وغیرہ سکھاتے ہیں۔ جنرل امجد کے مطابق اب تک ساڑھے ساٹھ ہزار خواتین کو تربیت دی جا چکی ہے جنھیں دورانِ تربیت دوسو روپے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے اور اگر ان وظیفوں کو ملایا جائے تو فوجی فاؤنڈیشن کے تعلیم پر اخراجات 3-2002ء کے مالی سال میں کوئی پون ارب سے زائد تھے۔

54-1953ء میں قائم ہونے والی فوجی فاؤنڈیشن نے کوئی تیس لاکھ زیرِ تربیت افراد کو دو ارب روپے سے زائد رقوم وظیفوں کی مد میں ادا کیں۔ فوجی فاؤنڈیشن تینوں سروس ہیڈ کوارٹروں کی رفاہی اخراجات کے لیے نقد رقم بھی ادا کرتی ہیں، مثلاً 3-2002ء کے مالی سال میں جی ایچ کیو کو تقریباً دو کروڑ روپے، بحریہ کو چودہ لاکھ روپے اور فضائیہ کو اٹھارہ لاکھ روپے ادا کیے گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی سہولتوں کے اس نظام کو سماجی فلاح و بہبود کا شراکتی نظام کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس سے مستفید ہونے والے لوگ ہی اسے چلاتے ہیں۔ فلاح و بہبود پر دستیاب لٹریچر خصوصی مفادات کے گروہوں کی موجودگی کو اپنے ممبروں کی بہبود کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے تسلیم کرتا ہے۔☆10

بہرحال یہ لٹریچر نسبتاً چھوٹے گروپ کے ان افراد کی غیر متناسب نمائندگی کی بھی بات کرتا ہے جنھیں نمائندوں کے طور پر منتخب کیا جاتا ہے یا جو مقامی اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

فوج کی فاؤنڈیشنوں کی فیصلہ سازی صرف اعلیٰ فوجی افسر ہی کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی مراعات کا فیصلہ بھی فوجی فاؤنڈیشنوں کے اعلیٰ حکام کرتے ہیں اور اس عمل میں سپاہیوں کی رائے شامل نہیں ہوتی کیوں کہ فوج میں عام سپاہیوں سے رائے لینے کا کوئی نظام موجود نہیں ہے۔ کرنل (ریٹائرڈ) بختیار خان کے مطابق فوج کے فلاحی نظام سے اصل فائدے سپاہیوں کے بجائے اعلیٰ افسر ہی اٹھاتے ہیں۔☆11

فوجی فاؤنڈیشن فوجیوں کو دوبارہ ملازمت کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ اس میں کوئی

ساڑھے بارہ ہزار ملازم ہیں جن میں سے ساڑھے چار ہزار سابق فوجی ہیں۔ انھیں عام طور پر تین سالہ معاہدے پر ملازم رکھا جاتا ہے۔ امریکا کی طرح یہاں بھی سابق فوجیوں کو ملنے والی مراعات اُنھیں کاہل بنا دیتی ہیں۔☆12 فوجی فاؤنڈیشن اور فوج کے قائم کردہ دوسرے اداروں میں فوج سے سبک دوش ہونے والے ملازمین کو کم محنت کے عوض زیادہ آسائشیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے ایسی فاؤنڈیشنوں کو چلانے کے لیے نسبتاً زیادہ سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ تاہم ایسی فاؤنڈیشنز کا قیام دراصل حصولِ منفعت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد فوج سے ریٹائر ہونے والے افراد کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔

فوجی فاؤنڈیشن کا دعویٰ ہے کہ اس سے کوئی نوے لاکھ لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے جن میں ہر پانچ سال بعد کوئی دس لاکھ لوگوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سابق گورنر ڈاکٹر عشرت حسین کے مطابق اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی فلاح و بہبود بذاتِ خود فوج کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے موزوں جواز ہے۔☆13

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا ماڈل

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا ماڈل فوجی فاؤنڈیشن سے مختلف ہے۔ بحریہ اور شاہین فاؤنڈیشن کی طرح AWT کو بھی اسی اصول کے تحت قائم کیا گیا کہ فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لیے منافع جاتی سرگرمیاں کی جائیں۔ ان کے اپنے گورننگ بورڈ کے تحت یہ متعلقہ سروس ہیڈ کوارٹروں کو وسائل فراہم کرتی ہے تاکہ انھیں آگے تقسیم کیا جائے یا فلاحی منصوبوں میں لگایا جائے۔ شفافیت نہ ہونے کی وجہ سے ان تینوں فاؤنڈیشنوں کے فلاح و بہبود میں حصے کا تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ سروس ہیڈکوارٹر سے فلاحی سرگرمیوں کی مالیات کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کی جاتیں۔ کیوں کہ چیریٹیبل انڈاؤمنٹ ایکٹ مجریہ 1890ء کے تحت قائم فاؤنڈیشن سرکاری شعبے کی جواب دہی سے آزاد ہوتی ہے۔ ذیل میں دیے گئے جدول (8.2) سے AWT کے 1992-2001ء کے فلاحی فنڈ کی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی مراعات میں سے ایک عسکری بینک کے زیرِ انتظام چلنے والی آرمی ویلفیئر اسکیم ہے۔ اس اسکیم کے تحت حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ افسر اپنی رقوم رضاکارانہ طور پر بینک میں لگاتے ہیں جو منافع کے ساتھ مقررہ مدت کے بعد واپس کی جاتی ہے۔ اس میں کم از کم پچاس ہزار روپے اور زیادہ سے زیادہ پندرہ لاکھ روپے لگائے جاسکتے ہیں۔ AWT کے پہلے سربراہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) فہیم حیدر رضوی کے مطابق زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کی حد اس اسکیم کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے لگائی گئی ہے۔ عسکری بینک کا منافع اچھا ہے۔ 2003ء میں کوئی نو فی صد منافع یا گیا جو اکثر قومی بینکوں اور سیونگ اسکیموں سے زیادہ تھا۔☆[14] ماضی میں یہ منافع سولہ فی صد تک تھا اور سرمایہ کاری کی بھی کوئی حد نہیں تھی، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوجی افسروں نے سرکاری بینکوں سے کم سود پر قرضہ لیا اور زیادہ منافعے پر عسکری بینک میں جمع کرا دیا۔☆[15] اب بھی یہ اسکیمیں عام سپاہیوں سے زیادہ اعلیٰ افسروں کے کام آتی ہیں۔

جدول 8.2:AWT کی فلاحی رقوم

سال	حصہ
1993ء	242,853
1994ء	407,973
1995ء	478,201
1996ء	499,454
1997ء	2,632,295
1998ء	707,132
1999ء	(715,214)
2000ء	(1,129,988)
2001ء	971,074

(نوٹ: بریکٹ میں منفی حصہ ہے)

فوجی فاؤنڈیشن اور AWT کے مقابلے میں بحریہ اور شاہین فاؤنڈیشنوں کے بارے میں دستیاب معلومات اور بھی کم ہیں۔ 2000ء میں شاہین فاؤنڈیشن نے دعویٰ کیا کہ اس کے سالانہ منافعے کا بیس فی صد فلاحی سرگرمیوں پر خرچ کیا گیا تھا۔ اُس برس شاہین فاؤنڈیشن نے کوئی ساٹھ کروڑ روپے کا کاروبار کیا تھا مگر منافعے کی شرح نہیں بتائی گئی۔ شاہین فاؤنڈیشن فضائیہ کے کوئی دو سو لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرتی ہے۔ ہر سال فضائیہ کے کوئی چالیس افراد شاہین فاؤنڈیشن میں ملازمت حاصل کرتے ہیں جن میں سے چار پانچ ریٹائرڈ افسر اور پینتیس چالیس ریٹائرڈ ٹیکنیشن اور ایئر مین ہوتے ہیں۔☆[16] اسی طرح AWT کوئی پانچ ہزار ریٹائرڈ فوجیوں کو ملازم رکھتا ہے اور بحریہ فاؤنڈیشن سو کے قریب بحریہ کے ملازمین کو ملازمت فراہم کرتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے فاؤنڈیشنوں کے اس کردار کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

> ریٹائرڈ فوجی افسر (ان فاؤنڈیشنوں میں کام کرکے) دیگر ریٹائرڈ افسروں کے لیے ملازمت کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ ایسا بہت ضروری ہے کیوں کہ فوجی افسر بڑی کم عمری میں سبک دوش ہوجاتے ہیں...ایک میجر چالیس پینتالیس سال کی عمر میں ریٹائرڈ ہوجاتا ہے۔ کیا انھیں ملازمت کی ضرورت نہیں؟ اور پھر فوجیوں سے زیادہ سویلین بھی تو ملازمتیں کرتے ہیں۔☆[17]

ان باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان فاؤنڈیشنوں کو ایسے اداروں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو صرف مسلح افواج کے لیے نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لیے صنعتوں اور کاروبار کے ذریعے ملازمت کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔

افراد کی فلاح و بہبود

فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لیے صرف فاؤنڈیشنیں ہی کام نہیں کر رہی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے چھٹے اور ساتویں باب میں تفصیل سے بتایا تھا کہ فوجی برادری کو فائدے پہنچانے کے لیے کئی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جن میں شہری اور دیہی اراضی دینے کے

علاوہ سابق فوجیوں کو ملازمتوں میں کھپانا بھی شامل ہے۔

ساتویں باب میں ہم نے بتایا تھا کہ مسلح افواج نے لاکھوں ایکڑ زرعی اور شہری اراضی لے کر اپنے ارکان میں تقسیم کی ہے جب کہ شہری اراضی کی تقسیم افسروں تک محدود ہے۔ دیہی اراضی افسروں کے علاوہ سپاہیوں کو بھی انتہائی کم قیمت پر مہیا کی جاتی ہے۔ زرعی اراضی تو صرف بیس سے ساٹھ روپے فی ایکڑ کے حساب سے دی جاتی رہی ہے۔ زمینوں کی تقسیم برطانوی راج کی روایت رہی ہے جس میں فوجیوں کی وفاداریاں برقرار رکھنے کے لیے اراضی بانٹی جاتی تھی۔ برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ فوج ان کے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے تن دہی سے کام کرتی رہے۔ یونگ (Yong) کے مطابق فوجیوں کی وفاداریاں رجمنٹ کے بجائے اکثر ان کے گھروں اور دیہات میں خریدی جاتی تھیں۔[18☆] جس کا طریقہ یہ تھا کہ فوجیوں اور اُن کے اہلِ خانہ کو خوش اور مطمئن رکھا جائے تا کہ وہ بیرونی سیاسی دباؤ سے متاثر نہ ہوں۔[19☆] اس طرح فوج کا فلاحی نظام اس کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کا لازمی جُز تھا۔ برطانوی حکام کو احساس تھا کہ لوگ ''تنخواہوں اور پنشن کے لیے ہی کام کرتے ہیں۔''[20☆] پاکستانی فوج نے بھی اپنے لوگوں کی وفاداریاں برقرار رکھنے کے لیے اس روایت کو جاری رکھا تا کہ لوگ فوج میں شامل ہو کر خدمات انجام دیتے رہیں۔ اعلیٰ عہدے دار اعلیٰ مراعات لیتے ہیں مگر عہدے میں ترقی کا انحصار اسٹاف کورس اور دیگر کارکردگی پر ہوتا ہے۔

دفاعی انتظامیہ بھی اپنے ارکان میں سے بعض کو ان کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ملازمت فراہم کر کے ان کی نگہداشت کا اہتمام کرتی ہے۔ ایک کے بعد دوسری آنے والی فوجی حکومت نے ریٹائر ہونے والے اپنے لوگوں کو سول سروس میں نوکریاں دی ہیں۔ ہر ہیڈ کوارٹر میں قائم شدہ فلاح اور آبادکاری کے محکمے اپنے ریٹائر ہونے والے افراد کی ملازمتوں کا بندوبست کرتے ہیں۔ ان محکموں کو سول سروس میں مواقع دریافت کرنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

سویلین سرکاری ملازمتوں میں بھی فوج کا حصہ ہوتا ہے جسے اسٹیب لشمنٹ کوڈ کے تحت رکھا گیا ہے۔ کوڈ کے باب دوم نمبر 125، 126، 127، 130 اور 131 کے مطابق گریڈ ایک سے چار میں چپراسیوں، قاصد اور ڈرائیوروں کی پچاس فی صد ملازمتیں ریٹائرڈ فوجیوں کو دی جاتی ہیں جب کہ گریڈ 17 اور اس کے اوپر کی سول ملازمتوں میں دس فی صد کوٹا فوج کا

ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں حکومت نے تمام سرکاری ملازمتوں میں سابق فوجیوں کا دس فی صد حصہ مختص کر دیا تھا۔

اکتوبر 2003ء میں آرمڈ فورسز بورڈ کے سربراہ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) زاہد زمان نے اس اعتراض کو سختی سے مسترد کیا کہ فوج سول افسروں کی ملازمتیں چھین رہی ہے۔ بریگیڈیئر کا کہنا تھا کہ سابق فوجی سرکاری ملازمتوں کا بمشکل دو فی صد حصہ لیتے ہیں جو کہ ان کے کوٹے سے کم ہے۔☆[21] بہرحال فوجیوں کے لیے ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمت ڈھونڈنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ملک کی سیاست میں مسلح افواج کے اثر و رسوخ کے باعث پاکستان میں نچلے درمیانے طبقے کے لوگ بھی فوج میں ملازمت کو پسند کرتے ہیں اور نجی کاروباری طبقہ بھی سابق فوجیوں کو ملازم رکھ کر اپنے کاروباری مواقع بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ قیصر بنگالی کے مطابق نجی کاروباری لوگ حکومت میں فوجیوں کے تعلقات سے فائدے اٹھاتے ہیں۔☆[22] حتیٰ کہ سیاسی جماعتیں بھی فوجیوں کی مدد سے فوج میں اثرات پھیلاتی ہیں۔ اگر فوج کی براہِ راست حکومت ہو تو فوجیوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے، مثلاً جنرل مشرف کی حکومت پر الزام رہا ہے کہ اس نے حکومت اور سرکاری شعبوں میں ہر جگہ حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ فوجی بھر دیے ہیں۔ مسلح افواج کے کوئی بارہ سو لوگوں کو اعلیٰ اور درمیانی عہدوں پر کھپایا گیا اور کوئی دو ہزار نچلے درجے کے فوجی بھی سرکاری محکموں میں تعینات کیے گئے۔ اس کے علاوہ تینوں افواج کے ہیڈکوارٹروں میں ویلفیئر ڈائریکٹوریٹ بھی ریٹائرڈ فوجیوں کو نجی شعبے میں ملازمتوں کے حصول میں مدد کر دیتی ہے اور آرمڈ فورسز بورڈ بھی ریٹائرڈ فوجیوں کو ملازمتیں دلاتا ہے۔

فوجی فلاح و بہبود کا سیاسی جغرافیہ

بہرحال فوج کا فلاحی نظام اپنے لیے مسائل خود پیدا کرتا ہے جس میں سب سے اہم مسئلہ اس فلاحی نظام سے فائدے اٹھانے کی سیاست ہے۔ فوج کے فلاحی وسائل صوبوں کے درمیان وسائل کے عدم توازن میں اضافہ کرتے ہیں چونکہ پچھتّر فی صد فوجیوں کا تعلق پنجاب سے ہے، اس لیے چھوٹے صوبے پنجابی بالادستی کی شکایت کرتے ہیں۔ چونکہ سول سروس میں سب سے بڑا یعنی پچاس فی صد حصہ پنجاب کا ہے، اس لیے چھوٹے صوبوں کی مایوسی اور بڑھ

جاتی ہے۔ گو کہ بائیس کابیناؤں میں سے تین کے وزرائے اعظم سندھ یا بلوچستان سے رہے ہیں، پھر بھی سول اور فوجی افسر شاہی میں غالب عنصر پنجاب کا ہونے کے باعث عام تاثر یہی ہے کہ چھوٹے صوبوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے اور اُنھیں ملک کے وسائل یا فیصلہ سازی میں مناسب حصہ نہیں ملتا۔

فلاحی رقوم بھی سب سے بڑے صوبے میں ہی لگائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ جدول 8.1 سے ظاہر ہے۔ جونیئر کمیشنڈ افسروں اور دیگر نچلے فوجیوں کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے جس کے بعد صوبۂ سرحد، آزاد جموں و کشمیر، سندھ اور شمالی علاقوں کا نمبر آتا ہے۔ بلوچستان جو شدید سیاسی بے چینی کا شکار رہا ہے، اس کا فوج میں سب سے کم حصہ ہے۔
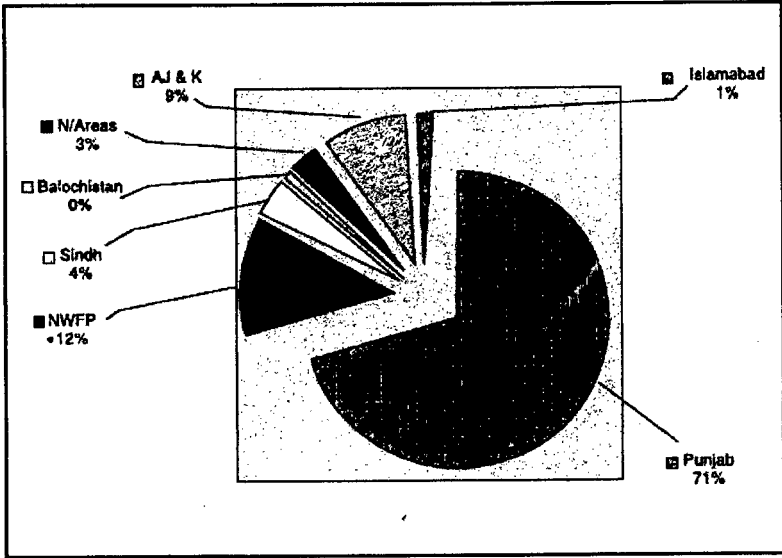
نقشہ 8.1: فوجی پنشن یافتہ جونیر کمیشنڈ افسر اور نچلے فوجیوں کی نسلی تقسیم

سندھ سے تعلق رکھنے والے فوجی افسروں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ بات مدِنظر رہنی چاہیے کہ یہ سب نسلاً سندھی نہیں ہیں بلکہ ان میں نئے سندھی یا بھارت کے مسلم اقلیتی علاقوں سے آنے والے مہاجر بھی شامل ہیں جو سندھ میں آباد ہوئے۔ جنرل پرویز مشرف اور ان سے پہلے سابق جنرل مرزا اسلم بیگ بھی اسی مہاجر آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔

نقشہ 8.2: فوجی پنشن یافتہ اعلیٰ افسر
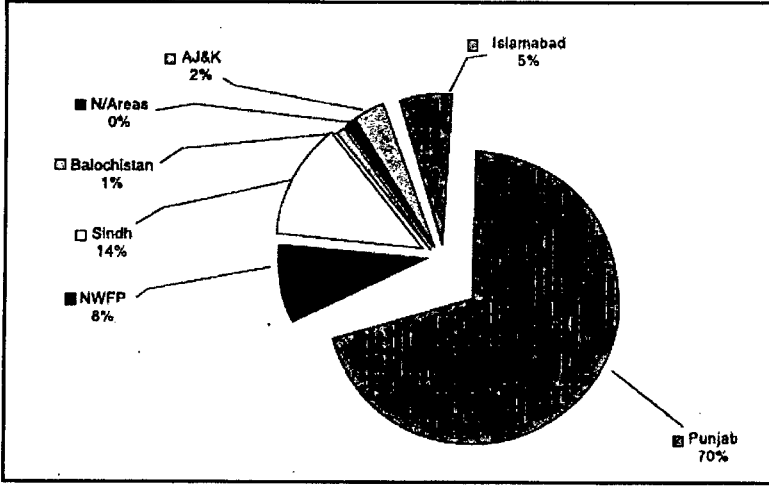
نقشہ 8.3: پنجاب میں فوجی پنشنوں کی تفصیل
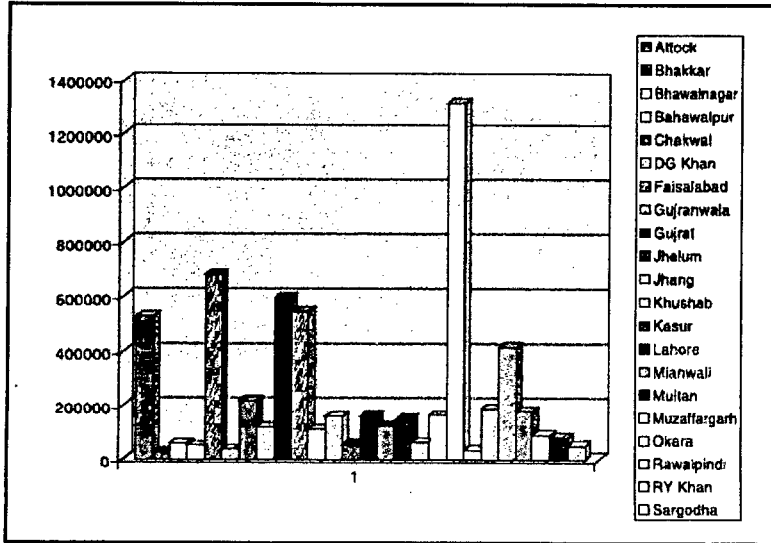
پھر فوجی ملازمتوں میں پنجاب کے زیادہ حصے کا بھی مطلب یہ نہیں کہ ملازمتیں صوبے کے تمام علاقوں کو دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس فوجی ملازمتوں میں بڑا حصہ پنجاب اور سرحد کے مخصوص علاقوں کو ملتا ہے۔

نقشہ 8.4:   سرحد میں فوجی پنشنوں کی تفصیل
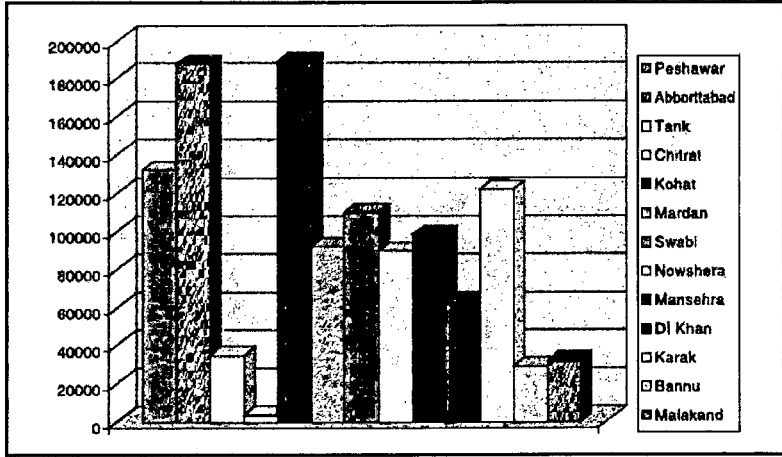
اب مسلح افواج کا بڑا حصہ ''سالٹ رینج'' سے آتا ہے۔ اسٹیفن کوہن کی تحقیق کے مطابق تقریباً پچھتّر فی صد فوج کا تعلق پنجاب کے تین ضلعوں اور سرحد کے دو ضلعوں سے ہے۔☆[23] اب تک برطانوی روایات پر عمل کیا جارہا ہے جس میں صرف مخصوص علاقوں سے فوجی بھرتی کیے جاتے تھے۔

نقشہ 8.5:   سندھ میں فوجی پنشنوں کی تفصیل
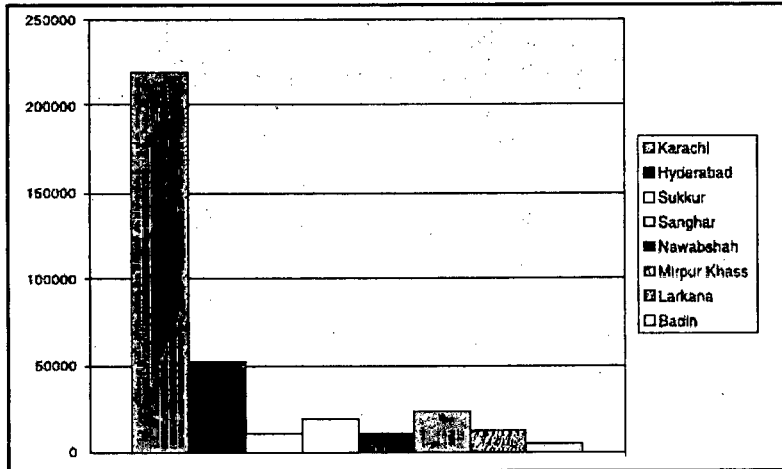
سندھ میں سابق فوجیوں کی بڑی تعداد کراچی اور حیدرآباد میں ہے۔ (دیکھیے نقشہ: 8.5)

نقشہ نمبر 1: فلاحی انجمن کے کاروبار کے مقامات

فوج میں صوبوں کی نمائندگی سے ریاست اور سماج کی سماجی و سیاسی ساخت کی عکاسی ہوتی ہے۔ چونکہ پاکستانی سماج روایات پر مبنی ہے، جہاں سماجی ترقی کے مواقع کم اور خاندانی رشتے زیادہ مضبوط ہیں، اس لیے زیادہ تر فوجی مخصوص علاقوں سے آتے ہیں اور فلاحی رقوم بھی ان ہی علاقوں میں خرچ کی جاتی ہیں۔ کوئی بہتّر فی صد فلاحی بجٹ پنجاب میں خرچ کیا جاتا ہے، تیرہ فی صد سرحد میں، تین فی صد سندھ میں، اٹھارہ فی صد بلوچستان میں۔ نو فی صد آزاد کشمیر میں اور تین فی صد شمالی علاقوں میں (یہ اعداد و شمار فوجی فاؤنڈیشن کے فلاحی بجٹ کے ہیں)۔☆[24] ذیل میں دیے گئے نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ چاروں ویلفیئر فاؤنڈیشنیں زیادہ تر کاروبار پنجاب میں کرتی ہیں جس کی ایک وجہ پنجاب میں بہتر ذیلی ڈھانچے کی موجودگی ہے۔ سندھ میں بحریہ فاؤنڈیشن کی سرگرمیاں زیادہ ہیں کیوں کہ ساحلی علاقے یہیں پر ہیں۔ اس کے علاوہ فوجی فاؤنڈیشن اور AWT کی بھی کچھ زرعی صنعتیں سندھ میں ہیں۔ ویسے صنعتی اور کاروباری منصوبوں میں سے زیادہ تر ملک کے سب سے بڑے صوبے میں قائم کیے گئے ہیں۔

اس صورتِ حال سے چھوٹے صوبوں کی تلخی میں اضافہ ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے مسلح افواج میں فلاحی وسائل کی تقسیم میں پائے جانے والے عدم توازن کو کم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ فوجیوں اور ان کے اہل و عیال کے لیے فوج کا منظّم فلاحی نظام اکثر سویلین لوگوں کے لیے رشک کا باعث ہوتا ہے جنھیں یہ سہولتیں نہیں ملتیں۔ خصوصاً ریٹائرڈ فوجیوں کو ملنے والی ملازمتوں سے ملک کی عمومی بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔

پاکستان میں فوج کا فلاحی نظام نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی خصوصاً ترقی پذیر ممالک کے لیے قابلِ رشک ہے جہاں مسلح افواج یا دیگر شہریوں کو یہ سہولتیں میسر نہیں۔ ''مہد سے لحد تک'' یا پیدائش سے موت تک سرپرستی کے اصول کے تحت پاکستانی فوج اپنے ملازمین اور ان کے اہل و عیال کو شہری اور دیہی املاک سے لے کر سرکاری اور نجی شعبے میں ملازمتوں تک اور صحت سے لے کر تعلیم تک شان دار سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یہ سہولتیں پنشن کے علاوہ ہوتی ہیں مگر ان کا زیادہ فائدہ اعلیٰ افسروں کو ہوتا ہے اور یہ ان کے مفادِ پیوستہ کا نتیجہ ہے جس پر ہم نے گزشتہ تین ابواب میں گفتگو کی ہے۔

یہ نظام مسلح افواج کے مفادات کی تکمیل تو کرتا ہے مگر اس سے صوبائی کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے کیوں کہ زیادہ تر فلاحی رقوم بڑے صوبے میں لگتی ہیں۔ تاہم یہ تفاوت معاشرے کے مجموعی عدم توازن کی عکاسی کرتا ہے جس میں پنجاب سول اور فوجی افسر شاہی پر قابض ہے۔ چونکہ ریاستی افسر شاہی فیصلہ سازی میں غالب کردار ادا کرتی ہے، اس لیے چھوٹے صوبوں کے لسانی گروہ مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی لیے جو لوگ فوج کے فلاحی نظام کو قومی مفاد میں قرار دیتے ہیں کہ وہ آبادی کے کچھ طبقات کی نگہداشت کرتا ہے اور یہ کہ وہ مؤثر انداز میں چل رہا ہے، انھیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ اس کی کتنی بڑی قیمت بھی ادا کر رہا ہے۔ فلاحی نظام یا مسلح افواج کو دی جانے والی سہولتیں اور مراعات دراصل تقسیم کی اس ہولناک ناانصافی کا حصہ ہیں جن کا خمیازہ پورا ملک بھگتتا ہے۔

باب-9

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا خمیازہ

یہ سوال خاصا اہم ہے کہ آیا فوج کو تجارتی سرگرمیوں میں ملوث ہونے اور اپنے معاشی مفادات مستحکم کرنے کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں۔ مال بنانے کی سرگرمیوں میں فوج کی براہِ راست شمولیت کا مالیاتی، سماجی اور سیاسی خمیازہ معاشرے کو بھگتنا پڑتا ہے، کیوں کہ مسلح افواج کو ترجیحی مراعات ملتی ہیں جن سے کھلی منڈی کی معیشت کو نقصان پہنچتا ہے۔ پچھلے پانچ ابواب میں پاکستانی فوج کی معاشی سلطنت کی ساخت، ارتقا اور سیاسی قوت پر بات کی گئی تھی۔ 1954ء میں فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے آغاز سے اب تک یہ سرگرمیاں تیزی سے پھیلتی گئی ہیں۔ یہ فوجی معیشت کا حصہ ہے جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور اس پر سرکاری احتساب کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔ پھر یہ صرف مخصوص لوگوں کے مفادات کو پورا کرتی ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فوج کی کاروباری سرگرمیوں سے حاصل ہونے والا سرمایہ بڑی حد تک غیر قانونی ہے۔ پاکستان میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فوج کی معاشی سرگرمیوں کا براہِ راست تعلق فوج کی سیاسی طاقت سے ہے۔

فوجی جنرل تو بدستور اسی بات پر اصرار کرتے ہیں کہ فوج کی کاروباری سرگرمیاں قوم کی سماجی و معاشی ترقی میں معاون ہیں۔ تاہم اس باب میں ہم دیکھیں گے کہ فوج کے زیرِ انتظام فاؤنڈیشنوں کی معاشی منفعت قابلِ اعتبار نہیں ہے اور درحقیقت زیادہ تر معاشی منصوبے دفاعی

بجٹ اور ملک کے مجموعی بجٹ پر بوجھ ہیں۔ مزید برآں فوج کی اندرونی معیشت کو اصل فائدہ مواقع سے ملتا ہے مثلاً سرمایہ داری کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور یہ ایک آزاد منڈی کی معیشت کی ترقی کے لیے رکاوٹ بنتی ہے۔

معاشی نااہلی کا خمیازہ

فوج کے تجارتی منصوبے خصوصاً آرمی ویلفیئر ٹرسٹ (AWT) اور شاہین فاؤنڈیشن، فوجی فاؤنڈیشن فرنٹیر ورکس آرگنائزیشن کے کچھ منصوبے منافع بخش نہیں ہیں۔ 1998ء سے 2001ء کے مالیاتی اعداد و شمار کے مطابق سرکاری خزانے سے ان کمپنیوں کو مسلسل وسائل فراہم کیے جاتے رہے جب کہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ کمپنیاں نجی شعبے کی ہیں۔

فوجی کمپنیوں کی شفافیت نہ ہونے کے باعث حالیہ مالیاتی اعداد وشمار تو میسر نہیں مگر تکنیکی اور قانونی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فلاحی فاؤنڈیشنیں عوام کو معلومات دینے کی پابند نہیں ہیں چونکہ چاروں فاؤنڈیشنیں چیریٹیبل انڈاؤمنٹ ایکٹ مجریہ 1890ء یا سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ مجریہ 1860ء کے تحت نجی کمپنیوں کے طور پر قائم کی گئی ہیں، اس لیے خاص سرکاری احتسابی ادارے کے ذریعے ان کا آڈٹ نہیں ہوتا۔ پھر بھی دفاعی بجٹ کا آڈٹ کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ سرکاری وسائل کو ان تجارتی منصوبوں میں استعمال کیا جارہا ہے جو قابلِ اعتراض بات ہے۔ ہیڈ کوارٹروں میں قائم آرمی ویلفیئر ٹرسٹ (AWT) سے ملنے والا ڈیٹا اس حوالے سے کوئی خوش کن نقشہ پیش نہیں کرتا۔

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا مالیاتی جائزہ

آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو 1969ء میں سات لاکھ روپے کے ابتدائی سرمایے سے قائم کیا گیا۔ شروع میں تو زراعت وغیرہ میں کچھ کام شروع کیا گیا مگر جلد ہی معیشت کے تقریباً تمام اہم شعبوں میں منصوبے بنائے گئے اور 2001ء کے مالی سال کے اختتام تک AWT کی بیلنس شیٹ ساڑھے سترہ ارب روپے ہوگئی۔ AWT کے اکتیس منصوبے زراعت، مصنوعات

سازی اور خدمات کے شعبوں میں پھیلی ہوئی رجسٹرڈ کمپنیاں ہیں۔ AWT کے مالیاتی اور غیر مالیاتی شعبوں میں بھی مفادات ہیں۔

1996ء میں AWT نے سیمنٹ اور دواؤں کے شعبوں میں دو منصوبے شروع کیے۔ ایک راول پنڈی کے نزدیک نظام پور سیمنٹ پروجیکٹ اور دوسرا لاہور کے قریب دواؤں کا کارخانہ۔ بعد میں 1997ء میں راول پنڈی کے قریب عسکری سیمنٹ لمیٹڈ کے نام سے سیمنٹ کا ایک اور کارخانہ لگایا گیا جسے حکومت نے نجکاری کی پالیسی کے تحت فروخت کیا تھا۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے ان صنعتی اداروں کو خریدنے اور قائم کرنے کے لیے قرضے حاصل کیے تھے۔ 1997ء ہی میں نظام پور میں مزید سرمایہ کاری کی گئی تاکہ خسارے میں جانے والے یونٹ کی پیداواری صلاحیت بڑھائی جاسکے۔ یہ ساری سرمایہ کاری کوئی آٹھ ارب روپے کے بین الاقوامی قرضوں سے کی گئی تھی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ 1996ء میں ٹرسٹ کو شدید ترین مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ سرمایہ کاری کے بعد سالانہ کوئی چالیس فی صد اخراجات تو صرف قرضوں کی ادائی میں چلے جاتے تھے۔

دراصل AWT نے قرضوں کا بندوبست دو طرح سے کرنے کی کوشش کی۔ پہلے تو کوئی دس کروڑ امریکی ڈالر کے میعادی مالیاتی سرٹیفکیٹ (TFC) لے کر نیشنل بینک آف پاکستان سے روپے کے قرضے میں بدلوائے گئے۔ اس طرح امریکی ڈالروں کا قرضہ تو بین الاقوامی منڈی سے لیا گیا اور مالیاتی ضمانت ایک قومی بینک سے لی گئی۔ پھر ان میں سرمایہ کاریوں کے لیے مزید قرضے مالیاتی اداروں سے حاصل کیے گئے۔ نتیجہ یہ کہ AWT کے طویل مدت کے قرضے جو 1997ء میں تین ارب روپے سے کچھ زائد تھے، بڑھ کر 1998ء میں تیرہ ارب کو چھونے لگے۔

باوجود اس کے کہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ جی ایچ کیو اور حکومت سے مالی امداد لیتا رہا ہے، آڈٹ کے ادارے KPMG کے مطابق اس کی کارکردگی متاثر کن نہیں رہی۔ 2001ء کے اواخر تک AWT کا خسارہ پندرہ ارب روپے تک پہنچ چکا تھا۔ ایک اخبار کے مطابق ایسا

بدانتظامی کی وجہ سے ہوا تھا۔☆[1] 2001ء تک AWT کے معاملات اتنے خراب ہوچکے تھے کہ اسے اپنی بقا کے لیے حکومت سے ساڑھے پانچ ارب روپے مانگنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ AWT نے حکومت سے مدد مانگی ہو۔ 1997ء میں بھی پانچ ارب روپے مانگے گئے تھے جس پر نواز شریف کی حکومت نے دو ارب روپے اس شرط پر دے بھی دیے تھے کہ فوج کی اعلیٰ قیادت AWT کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے اس کی انتظامیہ میں تبدیلی کرے گی۔ 1997ء میں بھی AWT ایک سفید ہاتھی تھا جو اس وقت کے وزیرِ تجارت اسحاق ڈار کے مطابق ''اپنے پرانے واجبات بھی ادا نہیں کرسکتا تھا۔''☆[2]

نواز شریف ہی کی حکومت سے فروری 1999ء میں مزید مدد مانگی گئی جس پر وزارتِ خزانہ نے یہ معاملہ معاشی امور کی کابینہ کمیٹی کے سپرد کردیا تاکہ وہ ڈھائی ارب روپے کی ضمانت منظور کرے جس سے پہلی والی چار ارب کی ضمانت کی تلافی کی جائے۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ نے پہلے کے واجبات ادا کرنے کے لیے نیا قرضہ مانگا اور حکومت سے نئی مالی ضمانت کا مطالبہ کیا حالانکہ اگر دعوے کے مطابق AWT ایک نجی ادارہ تھا تو اسے حکومت سے مالی مدد ملنے کا کوئی جواز نہ تھا اور نہ ہی حکومت اس کے قرضوں کی ذمے دار تھی۔

اکثر نجی کمپنیوں یا قرضوں کے انفرادی نادہندگان کی طرح AWT نے مقامی قومی اور نجی بینکوں اور بین الاقوامی مالیاتی منڈی سے قرضے لیے تھے۔ پندرہ ارب روپے کے خسارے میں سے تقریباً ساڑھے چھ ارب روپے نیشنل بینک، الائیڈ بینک اور اے بی این ایمرو بینک سے سرکاری ضمانت کے عوض لیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ AWT ایک غیر ملکی مالیاتی ادارے لیتھ (Laith) لمیٹڈ کی بھی ڈیڑھ ارب روپے کی مقروض تھی جس نے قرضے کی وصولی کے لیے اس کے خلاف برطانیہ میں ایک مقدمہ بھی دائر کیا ہوا تھا۔☆[3]

سویلین حکومتوں کا مالی امداد دینے کی دو بظاہر معقول وجوہ ہوسکتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ مالی ضمانتوں سے نواز شریف کی حکومت اور فوج کے تعلقات بہتر ہوسکتے تھے۔ چونکہ 1990ء کے عشرے میں سویلین حکومتیں اوسطاً دو سال ہی اقتدار میں رہ سکی تھیں، اس لیے نواز شریف فوج

کو راضی رکھنا چاہتے تھے جو کہ ملک کا اہم سیاسی ستون تھی۔ 1977ء کے بعد فوج ایک سیاسی قوت کے طور پر ابھری۔ نواز شریف کے وزیرِ تجارت اسحاق ڈار کے مطابق فوج کے سربراہ جنرل مشرف نے 1998ء میں اُنھیں بلا کر AWT کی مدد کرنے کے لیے کہا۔☆[4] اور حکومت نے فوج کو بہت زیادہ ناراض کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ AWT کے ڈوبنے کی صورت میں فوج کے ہزاروں سابق ملازمین کا سرمایہ ڈوب جاتا اور اس کا شکار بیوائیں اور یتیم ہی ہوتے۔ اس طرح سے حکومت کو بلیک میل کر کے اس سے AWT کی نااہلی کی قیمت ادا کرائی گئی۔

AWT کی واضح نااہلیوں کے باوجود وزارتِ خزانہ نے AWT کی مشروط مدد کا وعدہ کیا۔ شرائط یہ تھیں:

- سابق فوجیوں کے بجائے پیشہ ور منیجر مقرر کیے جائیں۔
- 1999ء کے آخر اور جون 2002ء تک تجارتی پلازے فروخت کیے جائیں۔
- وزارتِ خزانہ کی نگرانی کو قبول کیا جائے۔
- اگلے منصوبوں کے لیے وزارتِ خزانہ سے منظوری لی جائے۔

اطلاعات کے مطابق AWT کی اعلیٰ انتظامیہ نے وزارت کے افسروں سے 1999ء میں ملاقات کر کے درجِ ذیل اقدامات پر رضامندی ظاہر کی:

- راول پنڈی اور کراچی میں اس کے دو تجارتی پلازے فروخت کیے جائیں گے۔
- سیمنٹ کے کارخانوں میں اس کے پچاس فی صد حصص فروخت کیے جائیں گے۔
- دواؤں کے کارخانوں میں بھی اس کے پچاس فی صد حصص فروخت کیے جائیں گے۔
- جی ایچ کیو سے منتقل کی جانے والی تجارتی اراضی کو کچھ ترقیاتی کاموں کے بعد لیز کیا جائے گا۔
- جی ایچ کیو کے چار ارب روپے کے موجودہ سرمایے کو پچاس کروڑ روپے لگا کر بڑھایا جائے گا۔☆[5]

KPMG نامی مالیاتی مشاورت کی کمپنی نے بھی آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی انتظامیہ کو مشورہ دیا کہ کراچی میں واقع کچھ تجارتی اراضی فروخت کر دی جائے جو اسے فوج نے دی تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ نہ تو KPMG اور نہ ہی وزارتِ خزانہ نے یہ پوچھا کہ سرکاری اراضی کو اس طرح لیز یا فروخت کرنے کا قانونی جواز کیا ہے۔ یاد رہے کہ فوج کے زیرِ اختیار اراضی اس کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ وفاقی یا صوبائی حکومت کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس طرح زمین کی فروخت غیر قانونی اور مفادِ عامہ کے خلاف ہو جاتی ہے۔ مزید برآں کوئی بھی نجی کمپنی سرکاری اراضی کو فروخت یا لیز نہیں کر سکتی مگر AWT کا تعلق فوج سے ہونے کی بدولت یہ سب ممکن تھا۔ اسے غلط طریقے سے ایک خصوصی اختیار سمجھ لیا گیا۔

1999ء کے بعد بھی AWT کی مالی حالت ویسی ہی رہی۔ KPMG کے جس واحد مشورے پر عمل کیا گیا، وہ یہ تھا کہ تجارتی پلازے بیچ دیے جائیں۔ جون 2001ء میں بند ہونے والے AWT کے کھاتوں کے مطابق مجموعی خساروں کے باعث منفی واجبات تقریباً ساڑھے پانچ ارب تک پہنچ گئے تھے اور کوئی نو ارب روپے کے قرضے نیشنل بینک اور الائیڈ بینک کو واجب الادا تھے۔

2001ء میں AWT کے مجموعی نقصانات آٹھ ارب روپے تک پہنچ گئے تھے جس کی بڑی وجہ اوپر بیان کی گئی ہے، اور اتنی سرمایہ کاری کے باوجود منافع مجموعی کاروباری مالیت کا بمشکل چار فی صد تھا۔ اسی طرح کی بدانتظامی دیگر منصوبوں میں بھی کی گئی تھی۔ مزید برآں آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی انتظامیہ نے اتنی ہی رقم فوجی فلاحی اسکیموں سے بھی سیمنٹ کے منصوبوں میں لگانے کے لیے حاصل کی۔☆[6] مثلاً سیمنٹ کے کارخانے بھی خسارے میں چلتے رہے، جس کا مجموعی سبب سیمنٹ کے کاروبار میں خراب کارکردگی سے تھا۔ یہ صورتِ حال اُس وقت بدلی جب گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد افغانستان کی تعمیرِ نو شروع ہوئی اور سیمنٹ کی طلب بین الاقوامی طور پر بڑھ گئی۔

AWT کی بیلنس شیٹ کے مطابق اس نے مختلف منصوبوں میں کوئی چودہ ارب روپے

کی سرمایہ کی جس میں سے ترانوے فی صد سرمایہ پھنسا ہوا تھا جس سے کوئی منافع حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی تفصیل آگے جدول 9.1 میں درج ہے۔

اتنے قرضوں میں ڈوبے ہونے کے باعث AWT کو 2002ء میں پینسٹھ کروڑ کے عوض راول پنڈی میں اپنے تجارتی پلازہ بیچنے پڑے۔ سیمنٹ کے کارخانوں اور دیگر منصوبوں نے صرف چار کروڑ روپے کمائے جو اخراجات کو پورا کرنے اور قرضوں کی ادائی کے لیے ناکافی تھے۔ پلازا بیچنے سے ادارے کو وہ نقد آمدنی رُک گئی جو پچھلے آٹھ سال سے مل رہی تھی۔

اثاثوں سے آمدنی

اوپر بیان کیے گئے تینوں منصوبوں نے AWT کے منافعے ضائع کرادیے کیوں کہ یہ منصوبے چلانے کے لیے مختلف طرح کی مہارت درکار تھی جو AWT کے پاس نہیں تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنوعات سازی میں زراعت یا خدمات کی نسبت زیادہ نقصان اٹھایا گیا۔ جدول 9.2 میں تینوں شعبوں میں اثاثوں پر فی صد منافع دکھایا گیا ہے جن میں فاؤنڈیشن نے سرمایہ کاری کی تھی۔☆[7]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کے شعبے میں کارکردگی قدرے بہتر رہی، اس کے بعد خدمات کے شعبے میں۔ ان دونوں شعبوں میں ترقی کا تناسب امید افزا رہا۔ صنعت کے میدان میں کارکردگی غیر تسلی بخش تھی جس میں خسارہ جاری رہا اور یوں AWT کی مجموعی مالی حالت متاثر ہوئی۔ یہ نقصانات سرمایہ کاری کے ناقص فیصلوں اور بدانتظامیہ کی وجہ سے ہوئے۔ فکسڈ اثاثوں پر حاصل ہونے والے منافعے کا نقشہ بھی جدول 9.3 میں ایسا ہی نظر آتا ہے۔☆[8]

ادارے کی سرگرمی کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں زراعت کے شعبے میں ایک بار پھر بہتری کی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ 1996ء میں صنعت کے شعبے میں آمدنی کا تناسب 54 فی صد تھا جو 2001ء میں بہت زیادہ گر کے 25 فی صد رہ گیا۔ جب کہ فکسڈ اثاثوں میں بھی مندی کا رُجحان بتایا جاتا ہے۔

جدول 9.1: آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی جامد سرمایہ کاریاں 2001ء

	ارب روپے	ملین امریکی ڈالر
آرمی ویلفیئر نظام پور سیمنٹ ویلفیئر پروجیکٹ	5.8	100
آرمی ویلفیئر فارماسیوٹیکل	3.4	58.62
عسکری سیمنٹ لمیٹڈ (نان پروجیکٹ سرمایہ کاری)	3.9	67.24
کُل	13.1	225.86

جدول 9.2: AWT کے مختلف شعبوں میں مجموعی اثاثوں پر منافعے کی فی صد شرح

سال	1992	1993	1994	1995	1996	1997	1998	1999	2000	2001
زراعت	31	29	30	26	22	47	33	37	56	57
صنعت	11	24	12	16	29	-2	-15	-9	-8	-21
خدمات	1	-5	1	-1	2	12	7	9	5	5

جدول 9.3: AWT کے فکسڈ اثاثوں پر منافعے کی فی صد شرح

سال	1992	1993	1994	1995	1996	1997	1998	1999	2000	2001
زراعت	139	114	115	118	100	194	133	152	292	376
صنعت	21	53	34	52	54	-6	-18	-10	-9	-25
خدمات	4	-7	1	-2	4	18	11	14	8	7

سرمایہ کاری پر منافع

صنعتی شعبے کی خراب کارکردگی کا اندازہ لگائے گئے سرمایے پر منافع کے موازنے سے بھی ہوتا ہے۔[9☆] ایسی کارکردگی سے ادائے قرض کی صلاحیت (Solvency) متاثر ہوتی ہے جو زراعت اور خدمات کے شعبوں میں نسبتاً بہتر کارکردگی سے بھی اچھی نہیں ہوتی۔ (ملاحظہ ہو جدول 9.4)

ایکویٹی پر منافع

زرعی شعبے میں ایکویٹی پر منافع دیگر دو شعبوں سے بہتر تھا۔[10☆] خدمات کا شعبہ ذرا پیچھے تھا مگر صنعت سے بہرحال بہتر تھا۔ صنعتی شعبے کے کل نقصان سے سرمایہ کاروں کا بھی نقصان ہوتا رہا۔

صنعتی اور مالیاتی شعبوں کے موازنے سے بھی کچھ اسی طرح کی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ عسکری کمرشل بینک، عسکری جنرل انشورنس اور عسکری لیزنگ جیسے منصوبے نسبتاً بہتر رہے جب کہ سیمنٹ اور موبل عسکری لبریکینٹس میں سرمایہ کاری کے فیصلے غلط ثابت ہوئے۔ عسکری لیزنگ کی ایکویٹی پر بھی منافع متاثر کن نہیں تھا۔

جدول 9.4: تین شعبوں پر لگائے گئے سرمایے پر AWT کے منافع کی شرح (فی صد میں)

سال	1992	1993	1994	1995	1996	1997	1998	1999	2000	2001
زراعت	34	34	32	28	24	53	35	46	61	60
صنعت	20	42	19	22	34	-2	-18	-10	-9	-23
خدمات	1	-6	1	-1	2	15	9	11	8	7

جدول 9.5: شعبوں کی ایکویٹی پر AWT کا منافع (فی صد میں)

سال	1992	1993	1994	1995	1996	1997	1998	1999	2000	2001
زراعت	36	36	33	29	24	55	57	94	185	174
صنعت	20	44	90	23	48	-3	-27	-13	-10	-23
خدمات	2	-6	1	-2	6	39	30	41	20	16

صنعتی شعبے کی مایوس کن کارکردگی کو دیکھتے ہوئے KPMG نے AWT کو مشورہ دیا کہ اس شعبے کا مکمل جائزہ لے کر اس کی ساخت، انتظام اور مالیات میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ مگر ہمیں 2001ء میں کسی بڑی تبدیلی کا سراغ نہیں ملتا۔ (ملاحظہ جدول 9.7) جس کا مطلب ہے کہ AWT نے اپنے مالیاتی مشیروں کے مشوروں پر کان نہیں دھرے۔

جدول AWT 9.7 کی مکمل ملکیت کے منصوبوں کی تقابلی کارکردگی ظاہر کرتی ہے۔ صنعتی شعبوں کے علاوہ جو یقیناً فاؤنڈیشن کی پوری قوت نہیں ہے، اس نے ٹریول ایجنسی، کمرشل مارکیٹوں اور دیگر تجارتی منصوبوں میں بھی نقصان اٹھایا۔ جب کہ سب سے زیادہ منافع زراعت اور املاک کی خرید وفروخت میں ہوا۔ اراضی اور املاک کی خرید وفروخت میں گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد خاصا منافع کمایا گیا کیوں کہ بیرونِ ملک پاکستانیوں اور دوسری مسلم ریاستوں سے زیادہ سرمایہ پاکستان آنے لگا۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب نہیں کہ چھوٹے چھوٹے کاروبار بھی خوب روپیا کمانے لگے، مثلاً راول پنڈی میں بلولیگون ریسٹورنٹ میں کاروبار خوب چمکا۔ جی ایچ کیو کے قریب ہونے کی وجہ سے اس ریسٹورنٹ نے فوج سے خوب پیسے کمائے۔ اسی طرح ہوزری اور اونی مصنوعات کے کارخانے مسلح افواج سے ملنے والے کاروبار پر انحصار کرنے لگے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ AWT جی ایچ کیو اور فوج سے قریبی روابط اور مالیاتی مدد کے باوجود خسارے میں رہا۔ گو کہ AWT کی انتظامیہ اور فوجی برادری کے لوگ یہ اعتراف نہیں کرتے کہ یہ کمپنیاں فوجی روابط سے فائدے اٹھاتی ہیں، پھر بھی حقیقت یہی ہے۔ یہ اور دوسری فوجی فاؤنڈیشنیں سرکاری خزانے پر بڑا مالی بوجھ ڈالتی ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جو عموماً پوشیدہ رہتی ہے۔

شفافیت اور جواب دہی نہ ہونے سے گزشتہ عرصے میں سرکاری اور نجی شعبے کے درمیان حدِ فاصل معدوم ہوتی جارہی ہے۔ پریشان کن اطلاعات یہ ہیں کہ فوج کے تجارتی ذیلی ادارے ریاستی وسائل استعمال کرتے ہیں، مثلاً AWT کی عسکری ایوی ایشن اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے آرمی ایوی ایشن کے ہیلی کاپٹر اور پائلٹ استعمال کرتی ہے۔☆[11] اس کی تصدیق عسکری ایوی ایشن کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) بشیر باز نے بھی کی اور بڑے فخر سے بتایا کہ گاہکوں کی جانب سے طلب بڑھنے پر یہ فوج کے ہیلی کاپٹر استعمال کرتے ہیں۔☆[12] 2001ء اور 2002ء کے مالی سال پر آڈیٹر جنرل کی خصوصی رپورٹ میں کہا گیا کہ عسکری ایوی ایشن نے نہ صرف فوج کے ہیلی کاپٹر استعمال کیے جو کہ سرکاری ملکیت ہیں بلکہ وہ دو کروڑ روپے بھی ادا نہیں کیے جو ایندھن اور دیگر اخراجات کی مد میں حکومت کے پاس جمع کرائے تھے۔☆[13]

جدول:9.6 اے ڈبلیو ٹی کے تحت چلنے والے اداروں اور اُن کے کاروباری شراکت داروں کی کارکردگی کا موازنہ

	حصص پر فی صد تناسب	سرمایہ کاری	اداشدہ سرمایہ	نفع و نقصان	حصص کا منافع	سرمایہ کاری پر نفع فی صد	نفع کی ادائیگی کا فی صد تناسب	مالیت پر نفع کا فی صد تناسب
عسکری کمرشل بینک لمیٹڈ								
1999	44	511,015	986,226	282,446	172,590	15	61	29
2000	44	830,829	986,226	315,588	147,934	12	47	32
2001	44	530,829	1,035,537	550,051	207,107	17	38	53
عسکری جنرل انشورنس کمپنی								
1999	25	12,500	57,500	10,172	–	0	0	18
2000	25	12,500	66,125	13,119	–	0	0	20
2001	25	12,500	76,044	13,588	11,407	23	84	18
عسکری لیزنگ لمیٹڈ								
1999	54	125,887	240,000	62,401	48,000	21	77	26
2000	54	183,874	324,000	91,454	64,800	19	71	28
2001	54	183,874	324,000	64,483	–	0	0	20
عسکری سیمنٹ لمیٹڈ								
1999	90	3,176,921	1,600,987	(611,148)	–	0	0	-38
2000	90	3,685,710	1,600,987	(153,374)	–	0	0	-10
2001	90	3,982,950	1,600,987	(218,409)	–	0	0	-14
موبل عسکری لبریکینٹ لمیٹڈ								
2000	30	137,644	454,830	(52,078)	–	0	0	-11
2001	30	136,449	454,830	(55,271)	–	0	0	-12

جدول: 9.7   اے ڈبلیو ٹی کے منصوبوں پر نفع/نقصان، 2001ء

منصوبے	ملین روپے	ملین امریکی ڈالر
آرمی ویلفیئر شوگر ملز (بدین)	-31.1	-.536
آرمی ویلفیئر سیمنٹ (نظام پور)	-582.341	-10.04
آرمی ویلفیئر شو پروجیکٹ	-1.805	-31.12
آرمی ویلفیئر وولن ملز (لاہور)	1.472	25.38
آرمی ویلفیئر ہوزری پروجیکٹ	0.314	.0054
آرمی ویلفیئر رائس ملز (لاہور)	0.166	.003
آرمی اسٹڈ فارم (پروبین آباد)	22.435	.387
آرمی اسٹڈ فارم (بوئل گنج)	26.454	.456
آرمی فارم (رخبا ئیکنتھ)	11.121	.192
آرمی فارم (خوسکی)	0.217	.004
رئیل اسٹیٹ (لاہور)	0.166	.003
رئیل اسٹیٹ (راول پنڈی)	39.662	.684
رئیل اسٹیٹ (کراچی)	25.036	.432
رئیل اسٹیٹ (پشاور)	-1.178	-.02
AWT پلازا	17.219	.296
بلیو لیگون (راول پنڈی)	11.696	.202
الغازی ٹریول	1.083	.0186
سروسز ٹریول (راول پنڈی)	-1.005	-.017
لیاژان آفس (کراچی)	-4.783	-.082
لیاژان آفس (لاہور)	-1.364	-.24
عسکری فارماسیوٹیکل	-529.591	-9.131
AWT کمرشل مارکیٹ پروجیکٹ	-1.364	-.024
عسکری کمرشل انٹرپرائزز	-2.921	-.05

AWT کے مالی حالات فوج کی دیگر فاؤنڈیشنوں کی نسبت زیادہ دگرگوں ہیں۔ جنرلوں کے اس دعوے کے برعکس کہ فوج کی کاروباری کمپنیاں سویلین سے زیادہ منافع بخش ہوتی ہیں، ان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ بہت سے اعلیٰ افسر یہ بات ماننے پر تیار نہیں کہ AWT کی کاروباری سرگرمیاں نہ چلنے کی بنیادی وجہ کاروباری طور پر ناتجربہ کار فوجی ہیں۔ میجر جنرل جمشید ایاز خان کا دعویٰ ہے کہ ان فوجی کمپنیوں کی اعلیٰ انتظامیہ میں تو فوجی ہیں مگر عملی منصوبہ بندی اور اختیار سویلین ماہرین کے پاس ہے۔☆[14] تاہم AWT اور فوجی فاؤنڈیشن جس کا جائزہ آگے آرہا ہے، کے اکاؤنٹس کو دیکھ کر یہ بات درست نظر نہیں آتی۔

فوجی فاؤنڈیشن

فوجی فاؤنڈیشن، AWT یا دیگر فاؤنڈیشنوں سے بہتر کارکردگی دکھانے والا ادارہ سمجھی جاتی ہے مگر چونکہ درست اعداد و شمار میسر نہیں، اس لیے اس دعوے کو ماننا مشکل ہے۔ اس ادارے کو 1953-54ء میں ایک کروڑ اسّی لاکھ روپے کے سرمایے سے قائم کیا گیا تھا اور اب فوجی فاؤنڈیشن کے پاس تینتالیس ارب سے زائد سرمایہ ہے۔ تاہم فاؤنڈیشن کے چوبیس میں سے بارہ منصوبے ملی جلی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو جدول 9.8)

صاف بات ہے کہ 2001ء میں ان بارہ میں سے چار پروجیکٹ منافع میں نہیں چل رہے تھے۔ کمپنی کے تینوں شوگر مل کوئی چھ کروڑ روپے کا خسارہ دکھا رہے تھے۔ ایک اخباری خبر کے مطابق تینوں شوگر مل اور گنے کے بیجوں کے فارم کوئی ایک ارب روپے سالانہ کے خسارے میں تھے۔☆[15] اسی لیے سندھ میں کھوسکی کے قریب شوگر مل کو بیچنا پڑا۔

فوجی فاؤنڈیشن کی شوگر مل کی کارکردگی سے متعلق دو نکات قابلِ غور ہیں۔ پہلا نکتہ تو یہ کہ گنے پیدا کرنے والے علاقوں میں ہونے کے باوجود فوجی فاؤنڈیشن کے تینوں شوگر مل خسارے میں چل رہے ہیں جو بدانتظامی کا ثبوت ہے۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) شیر خان جو فوجی فاؤنڈیشن کے ہیڈکوارٹر میں پانچ سال ڈائریکٹر ٹیکنیکل (شوگر) رہے تھے، ان کا کہنا ہے کہ احتساب کے معیار ڈھیلے ہونے کے باعث انتظامیہ کے لوگ بدعنوانیوں میں ملوث ہوئے

جس سے کمپنی کے مفادات کو نقصان پہنچا۔ بریگیڈیئر کے مطابق ملوں کی اعلیٰ انتظامیہ سرکاری شعبے کی افسر شاہی کی طرح کام کرتی رہی اور ادارے کے وسیع تر مفادات کو نظرانداز کیے رکھا۔☆[16] یاد رہے کہ پاکستان میں زیادہ تر سرکاری شعبے کے صنعتی اور کاروباری ادارے اپنی نااہلی اور بدعنوانی کے لیے مشہور ہیں۔ شیر خان کے مطابق انھوں نے فوجی فاؤنڈیشن کے اعلیٰ افسروں کی کئی بار اس طرف توجہ دلائی مگر یہ بے سود کوشش نکلی۔

جدول 9.8: 2001ء میں فوجی فاؤنڈیشن کے منصوبوں پر نفع/نقصان

پروجیکٹ	ملین روپے	ملین امریکی ڈالر
فوجی شوگر مل (ٹنڈو محمد خان)	نقصان	
فوجی شوگر مل (خوسکی)	نقصان	
فوجی شوگر مل (سانگلہ ہل)	نقصان	
اصل نقصان	-58.424	-1.007
فوجی شوگر کین ایکسپریمینٹل اینڈ سیڈ ملٹی پلیکیشن فارم	10.258	0.177
فوجی سیریلز	9.226	0.159
فوجی کارن کمپلیکس	22.78	0.393
فوجی پولی پروپلین مصنوعات	-16.273	-0.281
فاؤنڈیشن گیس	143.071	2.467
فوجی سیکیورٹیز سروسز	7.634	0.132
فوجی فاؤنڈیشن انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اینڈ کمپیوٹر سائنسز	2.645	0.045
این آئی سی پروجیکٹ	11.865	0.205
فاؤنڈیشن میڈیکل کالج	3.992	0.069

دوسری بات یہ کہ کھوسکی شوگر مل کی فروخت کا معاملہ احتساب کی زد میں بھی آتا ہے۔ 2005ء کے اوائل میں اس مل کو تیس کروڑ روپے میں بیچ دیا گیا جب کہ اس کے لیے اڑتیس کروڑ روپے سے زیادہ کی بولی لگ چکی تھی۔ سینٹ میں دفاع کی پارلیمانی کمیٹی نے اس فروخت پر سوال اٹھائے تو دفاع کے پارلیمانی سیکریٹری تنویر حسین نے کم قیمت پر فروخت کا اعتراف کیا۔ اس کے باوجود فوجی فاؤنڈیشن کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سیّد محمد امجد نے پارلیمانی کمیٹی کے روبرو پیش ہونے سے انکار کردیا اور قومی اخبارات میں اشتہارات کے ذریعے مالی بدانتظامی کی تردید کی گئی۔ اس طرح پارلیمانی کمیٹی کا استحقاق مجروح ہوا۔ ایک انٹرویو میں جنرل امجد نے کہا، ''فاؤنڈیشن نے پچاس فی صد اضافے کا مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے کوئی ایک اور ایسی تنظیم دکھا دو جس نے اتنی ترقی کی ہو۔''☆17

پارلیمنٹ کی اس نافرمانی کے باوجود وزارتِ دفاع نے جنرل امجد کو کمیٹی کے سامنے پیش ہونے پر مجبور نہیں کیا۔☆18

حاضر ملازمت جنرل کبھی بھی کسی ''اپنے بندے'' کو احتساب کی زد میں نہیں آنے دیتے، خصوصاً جنرل امجد کو تو ''صاف ستھرا'' جنرل بنا کر پیش کیا جاتا رہا۔ ویسے بھی جنرل اور اُن کے ادارے احتساب سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں۔

اپنی اس تحقیق کے دوران میں نے جنرل امجد سے چار انٹرویو کیے اور ہر بار اُنھیں خود راستی پر مُصر پایا یعنی وہ مسلح افواج کو چھوڑ کر ہر ادارے پر تنقید کرتے رہے۔ جنرل امجد پاکستان کی سیاسی و سول سوسائٹی کو بھی فوج پر تنقید کا حق دینے پر تیار نہیں۔ اُن امجد کا کہنا تھا کہ ''کسی کو بھی یہ اخلاقی حق نہیں کہ فوج پر اعتراض کرے یا ملک چلائے۔ آخر سیاست دان ملک چلانے کی کون سی تربیت رکھتے ہیں؟''☆19

حقیقت یہ ہے کہ دراصل منتخب نمائندوں کے پاس وہ طاقت ہی نہیں جس سے فوجی افسروں کا احتساب کیا جاسکے کیوں کہ سیاسی ادارے کمزور ہیں اور سیاسی قیادت نااہل ہے۔ جنرل امجد کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے باوجود یہ حقیقت نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ

فوجی فاؤنڈیشن کے صنعتی یونٹ کم قیمت پر بیچے گئے اور شوگر ملوں کے معاملوں میں نظم ونسق کے اچھے خاصے مسائل تھے۔ فوجی فاؤنڈیشن کے ایک سابق ملازم شیر خان کے مطابق ٹنڈو محمد خان کا شوگر مل جو نقصان میں چل رہا تھا، اس کی پیداواری صلاحیت چالیس ہزار ٹن تک بڑھانے پر اچھے خاصے اخراجات ہوئے پھر بھی اتنی رقم کھا کر یہ منصوبہ مطلوبہ مالی نتائج حاصل نہیں کر سکا۔☆[20]

پنجاب میں فوجی کبیر والا پاور کمپنی بھی مسائل کا شکار رہی ہے اور پانچ سال تک ایکویٹی اور قرضوں کا تناسب خراب رہا۔ (ملاحظہ ہو، جدول 9.9) ☆[21]

1998ء میں ایکویٹی سے قرضوں کا تناسب دو اعشاریہ چھیانوے تھا جو غیر اطمینان بخش کارکردگی کا مظہر تھا۔ مگر اگلے تین سال میں یہ تناسب مزید خراب ہو گیا۔ پھر 2002ء میں قدرے بہتر ہو کر 2.21 ہو گیا۔ اس طرح مجموعی اثاثوں پر خالص منافعے کا تناسب خاصا کم رہا جس سے کم مدت کے واجبات بھی ادا نہیں کیے جا سکتے تھے۔☆[22]

نتیجہ یہ نکلا کہ فوجی فاؤنڈیشن کے واجبات 1998ء سے 2002ء کے درمیان اس کے اثاثوں سے بڑھ گئے۔ گو کہ 2001ء میں صورتِ حال کچھ بہتر ہوئی، پھر بھی اثاثوں اور واجبات کا تناسب زیادہ بہتر نہیں ہوا۔ 2002ء میں اس کے پاس اتنی اہلیت تھی کہ وہ ہر ایک روپیے کے واجبات پر 1.45 روپیہ ادا کر سکے۔

2001ء میں سیمنٹ فیکٹری بھی کوئی بیس کروڑ کے سالانہ خسارے میں چل رہی تھی۔☆[23] سیمنٹ فیکٹری کی مالی حالت کو مارکیٹ کی خراب صورتِ حال پر ڈالا جا سکتا ہے، یعنی فوجی فاؤنڈیشن کے اس دعوے کے باوجود کہ ادارہ بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ غلط فیصلوں اور بعض اوقات منڈی کی صورتِ حال سے مالی مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں۔

فوجی فاؤنڈیشن کا اصل کاروبار کھاد کے کارخانوں کو کہا جا سکتا ہے کیوں کہ وہی پہلے پہل اس کام میں آئی اور اب کوئی ساٹھ فی صد مارکیٹ کا حصہ فوجی فاؤنڈیشن کے پاس ہے۔☆[24]

جدول:9.9 فوجی کبیروالا پاور کمپنی پر مالیاتی تناسب کا قرضہ

سال	کل قرضے (Rs.)	کل مالیت (Rs.)	تناسب
1998	4,630,339,647	1,566,744,540	2.96
1999	6,152,471,538	1,788,950,150	3.44
2000	6,721,437,644	1,818,108,451	3.70
2001	8,186,516,809	2,635,409,004	3.11
2002	6,962,321,872	3,146,791,902	2.21

جدول:9.10 فوجی فاؤنڈیشن کے منصوبوں کے کل اثاثوں پر منافعے کی شرح کا تناسب

سال	زرِمنافع(Rs.)	کل اثاثے (Rs.)	اثاثوں میں نفع کی تناسب
2000	29,158,301	8,539,546,095	0.34
2001	81,730,053	10,821,925,813	0.76
2002	95,682,043	10,556,351,312	0.91

جدول:9.11 فوجی فاؤنڈیشن کے منصوبوں کے اثاثوں پر حالیہ واجب الادا رقوم کا تناسب

سال	حالیہ اثاثے (Rs.)	حالیہ واجب الادا رقوم(Rs.)	تناسب
1998	280,760,097	1,130,271,414	0.2484006
1999	146,549,978	1,180,486,900	0.124143672
2000	926,543,679	1,154,255,411	0.802719805
2001	2,344,497,260	1,813,138,195	1.293060433
2002	2,797,939,792	1,923,531,921	1.454584539

جدول:9.12 فوجی جارڈن فرٹیلائزر کمپنی کے نافذ العمل نفع کی شرح

سال	نافذ العمل آمدنی	کل فروخت	نافذ العمل نفع کی شرح
2000	-970,632	6,068,778	-0.159939
2001	-661,985	6,246,229	-0.105982
2002	450,997	3,964,326	0.1137639

مارکیٹ میں اتنا بڑا حصہ ہونے کی بدولت فوجی فاؤنڈیشن کھاد کی رسد اور قیمتوں کو اوپر نیچے کرسکتی ہے۔ پھر بھی سرمایہ کاری کے غلط فیصلوں کے باعث انتظامیہ خاطر خواہ فائدے نہ اٹھا سکی، مثلاً فوجی فرٹیلائزر کمپنی (FFC) کی ایکویٹی سے ایک ارب روپے نکال کر فوجی جارڈن فرٹیلائزر کمپنی میں لگا دیے گئے جس سے فوجی فاؤنڈیشن کے مجموعی منافعے کا صفایا ہوگیا۔ یاد رہے کہ FFC کے منافعے پر کمپنی کا خاصا انحصار تھا۔

مالیاتی ماہر اور تجزیہ نگار فرخ سلیم کے مطابق FJFC کی کارکردگی بہت خراب تھی، اس لیے FFC کی ایکویٹی سے اس کی مدد کرنا غلط فیصلہ تھا۔[☆25]

FJFC میں FFC (تیس فی صد)، FF (دس فی صد)، جارڈن فاسفیٹ مائنز کمپنی (دس فی صد)، پاک کویت انویسٹمنٹ کمپنی (چھ فی صد)، غیر ملکی نجی (پچیس فی صد)، مقامی نجی (پانچ فی صد)، جنرل پبلک اور نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ (نو فی صد) اور دولتِ مشترکہ ڈیولپمنٹ کارپوریشن (پانچ فی صد) کی ایک مشترکہ کمپنی ہے، اس نے غیر ملکی کرنسی میں چار قرضے حاصل کیے۔ اس میں تین کروڑ امریکی ڈالر اور کینیڈین ایکسپورٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے، پانچ کروڑ تیس لاکھ امریکی ڈالر جرمنی کی کریڈی ٹنٹالٹ فرویڈروقیبو کے، پانچ کروڑ ستر لاکھ امریکی ڈالر فرانسیسی بینکوں کے ایک کنسورشیم کے اور چار کروڑ امریکی ڈالر امریکہ کے ایک ایکسپورٹ امپورٹ بینک کے تھے۔[☆26] یہ رقم امریکا سے ایک سیکنڈ ہینڈ امونیا پلانٹ خریدنے کے لیے استعمال کی گئی جو سینتیس کروڑ ڈالر کا تھا مگر غلط سرمایہ کاری ثابت ہوا۔[☆27] اسی خراب کارکردگی کو دیکھتے ہوئے فوج کے سربراہ پرویز مشرف نے فوجی فاؤنڈیشن

سے کہا کہ وہ اپنے منصوبوں کی منفعت بڑھائے۔☆[28] اس مشورے کے ساتھ حکومت کی طرف سے مالی امداد بھی دی گئی۔ سرکاری معاشی سروے کے مطابق 2003ء سے FF کو سالانہ ایک ارب روپے کا زرِ تلافی ادا کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح کی مدد قرضوں یا مالی ضمانتوں کی شکل میں کسی اور نجی ادارے کو نہیں دی گئی۔☆[29]

ان تمام شواہد کے باوجود FF کے سربراہ نے بدانتظامی یا خراب کارکردگی کا اعتراف کبھی نہیں کیا اور جنرل امجد نے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا دفاع کرتے ہوئے یہی گردان جاری رکھی کہ فوجی فاؤنڈیشن دیگر سرکاری اداروں سے بہتر ہے بلکہ کچھ نجی کاروباروں سے بھی اچھی چل رہی ہے۔ انھوں نے یہ اعتراف بھی نہیں کیا کہ فوجی کاروباری سرگرمیوں کے لیے تعلقات استعمال کیے جاتے ہیں یا ان سے حکومت پر مالی بوجھ پڑتا ہے۔ جنرل امجد نے کئی ملاقاتوں میں FJFC کے معاملے کو نظرانداز کیے رکھا اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا بھی دفاع کرتے رہے۔ لگتا ہے کہ فوج کی تجارتی سرگرمیوں سے فائدے اٹھانے والا کوئی بھی شخص کسی بھی منفی پہلو پر سوچنے یا بات کرنے پر تیار نہیں اور مسلح افواج کو قومی ترقی میں معاون ثابت کرنے پر تُلا رہتا ہے۔

شاہین فاؤنڈیشن

شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن کی چھوٹی کمپنیوں کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں کیوں کہ ان کی زیادہ تر کاروباری سرگرمیاں اسٹاک ایکسچینج میں درج نہیں ہیں۔ چنانچہ اس گفتگو میں ہمارا موضوع شاہین فاؤنڈیشن کی ایئر لائن رہے گی جس کے بارے میں عوام کو کچھ معلومات میسر ہیں۔

ایئر لائن کی بیلنس شیٹ کے مطابق شاہین ایئر انٹرنیشنل نے دسمبر 1999ء سے مئی 2001ء کے دوران میں چھ کروڑ روپے گنوائے۔ یہ رقم ان سات کروڑ روپوں کے علاوہ ہے جو سول ایوی ایشن اتھارٹی سے لی جانے والی خدمات کے عوض واجب الادا تھے۔ 1990ء کے عشرے کے اوائل میں جب ایئر لائن نے کام کا آغاز کیا تو صورتِ حال اور بھی خراب تھی۔

ایئرلائن انڈسٹری کے ایک ماہر الطاف سلیم کے مطابق شاہین ایئر انٹرنیشنل کو ہونے والے کاروباری نقصان کی بڑی وجہ حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کو دیے جانے والے رعایتی ٹکٹ تھے جن سے ایئر لائن کے اخراجات میں بہت اضافہ ہوا۔ کسی ایئر لائن کے پاس اگر طیارے بہت کم تعداد میں ہوں تو وہ اپنی سرمایہ کاری پر منافع حاصل نہیں کر پاتی۔ کاروباری سمجھ نہ ہونے کے باعث منافع گھٹتا رہا مگر سرمایہ کاری بڑھتی رہی۔ 2004ء میں آپریشن بند ہونے تک ایئر لائن چھ طیارے حاصل کر چکی تھی۔ پھر نجی سرمایہ کار خالد صہبائی اور پرویز علی خان نے اس ایئر لائن کو ڈیڑھ ارب کے مالیاتی واجبات کے ساتھ ہی خرید لیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آٹھ اپریل 2004ء کو ساٹھ کروڑ ادا کر کے ایئر لائن خرید لی۔☆[30]

ایئر لائن اس لیے فروخت کی گئی کہ اس کی مالی حالت اس کے باوجود بہت خراب تھی کہ اسے سرکاری وسائل سے بغیر کسی معاوضے کے مستقل رقم ملتی رہی۔ پشاور، کوہاٹ، میانوالی اور رفیقی (کراچی) کے PAF اڈوں کی اسپیشل آڈٹ رپورٹ کے مطابق 2001ء اور 2002ء کے مالی سال میں ایئر لائن پر پارکنگ کی مد میں اکیاسی لاکھ چودہ ہزار روپے واجب الادا تھے جسے ادا کرنے سے وہ قاصر تھی۔ یہ ادائیگی اس لیے ملتوی کی گئی کہ شاہین ایئر انٹرنیشنل کا کہنا تھا کہ ایک نوزائیدہ ایئر لائن ہونے کے باعث وہ یہ واجبات ادا کرنے سے قاصر تھی۔☆[31] آڈٹ کرنے والوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ فضائیہ سے ملنے والی معاونت کے باوجود اسے نقصان ہو رہا تھا۔ اسی طرح شاہین ایئر پورٹ سروسز نے (جسے منافع بخش سمجھا جاتا تھا) سرکاری عمارتوں میں قائم اپنے دفاتر کے کرایے بھی ادا نہیں کیے۔☆[32]

وسائل کی چوری

شاہین ایئر انٹرنیشنل کے ہاتھوں سرکاری وسائل کی چوری ہی واحد مالیاتی بوجھ نہیں تھا۔ برس ہا برس سے شہری اور دیہی اراضی کی فوجیوں میں تقسیم سے بھی سرکار کا بہت نقصان ہوا۔ جیسا کہ ساتویں باب میں بتایا گیا، فوج کے اعلیٰ جنرل زمینوں کے حصول کو نوآبادیاتی روایات پر اور فلاحی بنیادوں پر جائز قرار دیتے رہے ہیں۔ اگرچہ زرعی زمینیں عام سپاہیوں کو بھی دی

گئیں لیکن شہری املاک صرف افسروں کے لیے مخصوص رہی ہیں جس سے فوج اراضی کے کاروبار میں غالب آ گئی ہے۔

زمینوں کے حصول کا رجحان مسلح افواج کے سیاسی اثرات، حکمرانی میں ان کی مداخلت (براہِ راست فوجی اور سویلین حکومتوں کے دوران میں) اور حکومت کی کمزوری کی نسبت سے بڑھی ہے۔ غیر منقولہ جائیدادوں میں فوج کی ملکیت اربوں روپے کی ہے۔ زمین میں دفاعی ادارے کے مفادات دو قسم کے عمل سے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو انفرادی ممبروں کے لیے زمین کا حصول اور دوسرے سرکاری زمینوں کی دفاعی سے تجارتی مقاصد کے لیے تبدیلی، جس میں فوج کسی حساب کتاب کے بغیر کرایے کی رقم خود رکھ لے۔ جیسا کہ ہم نے باب 7 میں بیان کیا ہے کہ چونکہ تقسیمِ اراضی کے پورے تصور نے قانونی طریقوں اور قوانین وضوابط کا مذاق اڑا کر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا یہ تصور خاصا سرقہ پسند ہو گیا ہے۔ حالانکہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے یا عوام کے فائدے کے لیے ریاست خود زمین کو بیچ سکتی تھی یا پٹے پر دے سکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ دفاعی مقاصد کی زمینوں کا تجارتی استعمال مشرف کے دور میں خاصا بڑھا ہے اور فوجی زمینوں پر تجارتی بازار اور شاپنگ پلازا بننے لگے ہیں۔ کنٹونمنٹ بورڈ اکثر ایسے اشتہار شائع کراتے ہیں جن میں کاروباری لوگوں کو بازار تعمیر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ریاستی اراضی کے ایسے غلط استعمال کی نشان دہی کئی آڈٹ رپورٹوں نے کی ہے۔ مثال کے طور پر آڈٹ رپورٹ 182 میں نشان دہی کی گئی کہ عمارتوں اور دکانوں کے کرایے براہِ راست سرکاری خزانے میں جمع نہ کرائے جانے سے کوئی ڈیڑھ کروڑ روپے کا سرکاری نقصان ہوا۔ یہ دکانیں اے ون ٹائپ زمین پر تعمیر کی گئی تھیں جسے قانون (Clar 1937 Rules) کے مطابق صرف فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا اور کسی دوسرے مقصد کے لیے اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔☆33

اسپیشل آڈٹ رپورٹ 187 کے مطابق کلفٹن (کراچی)، والٹن (لاہور)، سیالکوٹ اور گجرانوالہ کے کنٹونمنٹ بورڈ فوجی رہائشی زمینوں کو تجارتی استعمال میں لاتے رہے جس سے کوئی ایک ارب روپے سے زیادہ کا سرکاری نقصان ہوا۔ اس کے علاوہ فوج کے آپریشنل

استعمال کی اراضی کو تجارتی بنانے سے بھی کوئی تیرہ کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔[34] جب کہ خود ملٹری لینڈ مینول اس کی اجازت نہیں دیتا۔

آڈٹ رپورٹ کے تخمینے بھی کم قیمت ظاہر کرتے ہیں ورنہ اراضی کی مارکیٹ ویلیو کہیں زیادہ ہے۔ احتساب اور شفافیت نہ ہونے کے باعث آرمی کور اور ایئر فورس کے اڈوں کی جانب سے وصول کیے گئے کرایوں کی بابت صحیح اعداد و شمار بھی دستیاب نہیں ہیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ رقوم فلاحی کاموں کے لیے استعمال کی جاتی ہیں مگر ان اخراجات کی تفصیل نہیں دی جاتی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سرکاری زمینوں یا عمارتوں کو پٹے پر دینے سے جو وسائل حاصل ہوتے ہیں، ان کی چوری کا حساب کرنا مشکل ہے چونکہ فوج پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے، لہٰذا اس قسم کے جبری غصب سے ریاست کو پہنچنے والے نقصانات کا تخمینہ لگانا انتہائی مشکل ہے۔

فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن (FWO)

FWO کی کارکردگی میں بھی نااہلی کے شواہد ملتے ہیں۔ آڈٹ رپورٹ 179 کے مطابق اس ادارے کے مالیاتی سال 1999/2000 کے اکاؤنٹس میں ٹھیک ٹھاک خسارہ تھا۔ اس مالیاتی سال میں ادارے کی کل آمدنی چار ارب روپے سے کچھ زیادہ تھی جب کہ اخراجات کا تخمینہ پانچ ارب روپے سے کچھ زیادہ تھا۔ اس طرح کوئی اٹھانوے کروڑ روپے کے خسارے کا بوجھ ریاست کو اٹھانا پڑا۔ آڈٹ رپورٹ نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ مالیاتی خسارے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ادارے کی کارکردگی مالیاتی لحاظ سے یا تو جاری رہنے کے قابل نہیں یا پھر FWO سرکاری اداروں سے اپنے واجبات کی وصولی میں زیادہ منظم نہیں۔[35]

FWO کے خسارے والے اخراجات کی یہ تفصیلات فوجی افسروں کے ان دعووں کو چیلنج کرتی ہیں وہ جو ان اداروں کی بہتر کارکردگی کے بارے میں کرتے رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ حکومت کی جانب سے ان اداروں کے خساروں کی ذمے داری قبول کرنے کے یہ ثبوت سابقہ آرمی چیف جنرل اسلم بیگ کے اس دعوے کی نفی بھی کرتے ہیں کہ NLC اور FWO فوجی

ادارے نہیں ہیں۔ اسلم بیگ کا یہ دعویٰ دراصل ان کے اس احساس کا عکاس ہے جو پیشہ ور فوج کو نہ تو کسی کاروباری مہم جوئی اور نہ ہی کسی غیر فوجی ذمے داری میں ملوث دیکھنا چاہتا ہے۔☆36

درحقیقت اکثر اعلیٰ فوجی افسر اس کتاب کے لیے دیے گئے انٹرویز میں FWO، NLC اور فلاحی اداروں کو فوج سے منسلک سمجھنے پر اپنی ناگواری کا اظہار کرتے رہے۔ یہ افسر اپنے اداروں کی نااہلی تسلیم کرنے پر بھی تیار نہیں، مگر اس کتاب میں پیش کیے گئے گوشوارے نااہلی کا ثبوت ہیں۔

معاشی مواقع کی قیمت

رفاہی فاؤنڈیشنوں کی کارکردگی کے بارے میں زیادہ حقائق کو لوگوں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ معلومات کو لوگوں کی دسترس سے دور رکھنا اعلیٰ فوجی حکام کے مفاد میں ہے کیوں کہ اس طرح وہ باآسانی مسلح افواج اور فوجی اداروں کی اعلیٰ کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ حقائق کو پوشیدہ رکھنے سے ان کے لیے یہ استدلال پیش کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ فوجی ادارے ملک کی معاشی ترقی میں ایک فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ 1947ء میں ملک کے قیام سے لے کر آج تک فوج اور اس کے حامی یہی کہتے آئے ہیں کہ فوجی ادارے ملکی ترقی کے لیے ایک عنصر ہیں۔☆37 ریمنڈ مور (Raymond Moore) جیسے مصنّفین نے پاکستان میں فوج کی فاؤنڈیشنوں کو ملک کی سماجی و معاشی ترقی میں معاون کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسی طرح کے دلائل ہن ٹنگٹن اور اسٹیپان جیسے مغربی مصنّفین بھی دیتے رہے ہیں۔ ہن ٹنگٹن (Huntington) خصوصی طور پر ترقی سے متعلق تناظر پر زور دیتا ہے۔ کمال اتاترک، جمال عبدالناصر اور ایوب خان جیسے فوجی جرنیلوں کی تعریف کرتے ہوئے ہن ٹنگٹن کہتا ہے، ''فوجی اصلاح پسند... سماجی و معاشی تبدیلیاں لانے میں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔''☆38 جانوویٹز (Janowitz) جیسے مصنّفین ترقی پذیر ممالک کے روایتی معاشروں میں فوج کو مغربی نقطۂ نظر کے سماجی و معاشی اصلاحات کا داعی سمجھتے ہیں۔☆39 لہٰذا ان کے نزدیک فوجی اخراجات یا اس قسم کے دفاعی اخراجات معاشی ترقی کے لیے نحوست نہیں بلکہ باعثِ برکت

ہیں۔ سرکاری اخراجات کے ایک حصے کے طور پر دفاع کے بڑے اخراجات کو مختصر سی درمیانی مدت میں معیشت کو تقویت دینے کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی ایسے دانشوروں کی کمی نہیں جو سویلین کے مقابلے میں فوجی حکومت کو ترجیح دیتے ہیں، مثلاً مشرف دور میں اسٹیٹ بینک کے گورنر عشرت حسین کے خیال میں غیر مستحکم سیاسی حکومتوں کے مقابلے میں فوجی حکومتیں معاشی ترقی میں زیادہ معاون ہوتی ہیں اور ملک میں معاشی استحکام لاتی ہیں۔☆40

عجیب بات یہ ہے کہ فوج کے بارے میں عشرت حسین نے جب اپنی کتاب Pakistan: The Economy of an Elitist State لکھی تو اس وقت فوج کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر میں ایک ڈرامائی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے فوجی حکومتوں کو اس امر پر ملامت کی کہ وہ اشرافیہ کے ساتھ مل کر ریاستی وسائل پر اجارہ داری قائم کرتی رہتی ہیں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ایوب خان اور ضیاء الحق کی فوجی حکومتوں نے دولت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی جس سے معاشی عدم استحکام پھیلا۔ مگر بعد میں عشرت حسین نے اپنا نقطۂ نظر بدل لیا۔☆41 ان کے خیالات میں تبدیلی اس وقت آنی شروع ہوئی جب انھوں نے 2000ء میں مشرف کی فوجی حکومت میں شمولیت اختیار کی۔ اب ان کے خیال میں مسلح افواج کی کاروباری سرگرمیوں کے معیشت پر منفی اثرات نہیں پڑ رہے تھے۔☆42

عشرت حسین نے اپنے دلائل کی حمایت میں ایک جدول پیش کیا جو کراچی اسٹاک ایکسچینج کے فراہم کردہ اعداد و شمار پر مبنی تھا۔ اس جدول کے مطابق فوج اور اس کی ملحقہ کمپنیوں کے مجموعی اثاثے اسٹاک ایکسچینج کی غیر مالیاتی کمپنیوں کے مجموعی اثاثوں کا صرف تین اعشاریہ چھ فی صد تھے۔☆43

تاہم ان اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے چار نکات ذہن میں رکھنے چاہییں۔ پہلا تو یہ کہ جدول میں دیے جانے والے اعداد و شمار ان فوجی کمپنیوں کے فراہم کردہ ہیں جو اسٹاک ایکسچینج اور سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان میں رجسٹرڈ ہیں۔ ان رجسٹرڈ فوجی کمپنیوں کی تعداد صرف نو ہے۔ چنانچہ یہ اعداد و شمار نامکمل ہیں اور فوج کی تمام کاروباری سرگرمیوں کی وضاحت نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ کہ تین اعشاریہ چھ فی صد میں فوج کی وہ سرمایہ کاری شامل نہیں ہے جس کا اندراج موجود نہیں۔

سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان کے ایک اعلیٰ افسر کے مطابق فوج کی فاؤنڈیشنیں سات سو اٹھارہ کمپنیوں میں سرمایہ کاری کر چکی ہیں اور اصل صورتِ حال اس وقت واضح ہوگی جب ان تمام کمپنیوں کے اثاثے جمع کیے جائیں۔ تیسری بات یہ کہ عشرت حسین کے تجزیے میں دفاعی انتظامیہ کی املاک کی خرید و فروخت میں سرمایہ کاری شامل نہیں جس سے فوج اور اس کے ذیلی اداروں کو اچھا خاصا منافع ملتا ہے۔ فوج کے تمام مالیاتی مفادات جمع کیے جائیں تو نجی شعبے کے اثاثوں کا کوئی دس فی صد اختیار فوج کے پاس ہوگا۔ دوبارہ حساب کتاب کی بنیاد مختصر اور درمیانی سائز کے کاروبار، ذیلی اداروں اور انفرادی ممبروں کے مفادات پر ہوگی۔ یہ اعداد و شمار مسلح افواج کو مارکیٹ بلکہ پوری معیشت میں ایک بڑا نبرد آزما فریق بنا دیتے ہیں۔ عشرت حسین نے فوجی تجارت کو مواقع سے حاصل ہونے والے فائدوں کا ذکر نہیں کیا اور یہ وہ نکتہ ہے جسے کتاب کے اس حصے میں بعد میں بیان کیا جائے گا۔ چوتھا نکتہ یہ ہے کہ عشرت حسین کے کلیے میں واجبات شامل نہیں اور صرف نئی رجسٹرڈ کمپنیوں کی لاگت بتائی گئی ہے۔ چونکہ واجب الادا رقوم بہت زیادہ ہیں، اس لیے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی اصل قدر و قیمت معلوم نہیں ہوتی۔

عشرت حسین کے خیالات میں تبدیلی اس عام رویے کا اظہار ہے جو ٹیکنو کریٹ اور فوجی حکومتوں کے مابین باہمی مفاہمت کا حامل ہوتا ہے۔ افسر شاہانہ حکومتوں کے غیر سیاسی کھلاڑی غیر مقبول اقدامات آسانی سے کر لیتے ہیں۔ اوڈونیل (O'Donnell) کے مطابق:

جس سماجی شعبے میں بھی ٹیکنو کریٹس کام کرتے ہوں اُن کی خاصیتیں یکساں ہوتی ہیں۔ اُن کے لیے رول ماڈل اور اُن کے ذریعے سماجی تناظر کے موزوں صورت رہنے کی جو توقعات ان سے وابستہ کی جاتی ہیں، اُن کے اثرات ان کی اپنی سوسائٹی میں نظر آتے ہیں۔ اُنھیں تکنیکی مسائل حل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے جس میں جذبات، احساسات اور سیاسیات کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ سیاست اور گفت و شنید کو رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ سماجی حقائق کے بنائے گئے نقشے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں جس کی کارکردگی بہتر ہے، وہ اچھا ہے۔ اور بہتر کارکردگی کے ثمرات وہ ہوتے ہیں جنھیں آسانی سے براہِ راست شمار کیا جا سکے۔☆46

فوجی افسر شاہی یقیناً ایک مؤثر اور فوری حل فراہم کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ کسی بھی ملک

میں فوجی افسر شاہی برسرِ اقتدار آکر ایک مصنوعی یک جہتی فراہم کرتی ہے جو منتشر معاشروں میں سیاسی حکومتیں فراہم نہیں کرسکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات دوسرے خطوں اور فوجی حکومتوں کے بارے میں بھی کہی گئی ہے، مثلاً الفریڈ اسٹیفن کی کتاب میں برازیل میں بھی فوج کو قومی استحکام کا ضامن بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔☆[47] اس طرح اندرونی اور بیرونی خطرات کے مقابل قوم پرستی کا پرچار کیا جاتا ہے۔ چونکہ فوج معاشی وسماجی عدم استحکام کو قوم کے لیے بڑا خطرہ بنا کر ابھارتی ہے، اس لیے ان شعبوں میں کام کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مگر محض مالیاتی یا ملکی معاشی کارکردگی کو جواز بنا کر فوج کی سیاست یا معیشت میں شمولیت کو حق بجانب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جدول 9.13: فوج کی ملکیت اور ملحقہ کمپنیوں کے اثاثے (2002ء)

غیر مالیاتی	
غیر مالیاتی لمیٹڈ کمپنیوں کے مجموعی اثاثے (ارب روپوں میں)	1,069.97
فوجی ملکیت اور ملحقہ کمپنیوں کے اثاثے (ارب روپوں میں)	59.19
مجموعی اثاثوں میں فوجی کمپنیوں کا حصہ	5.53%
مالیاتی	
مالیاتی لمیٹڈ کمپنیوں کے کل اثاثے (ارب روپوں میں)	2,907.16
فوجی ملکیت اور ملحقہ کمپنیوں کے اثاثے (ارب روپوں میں)	84.06
مجموعی اثاثوں میں فوجی کمپنیوں کا حصہ	3%
تمام شعبے	
مالیاتی لمیٹڈ کمپنیوں کے کل اثاثے (ارب روپوں میں)	3,977.13
فوجی اور ملحقہ کمپنیوں کے اثاثے (ارب روپوں میں)	143.25
مجموعی اثاثوں میں فوجی کمپنیوں کا حصہ	3.60%

ماخذ: حسین، 2004ء

حقیقت یہ ہے کہ فوج کے معاشی سرگرمیوں میں براہِ راست ملوث ہونے سے مارکیٹ متاثر ہوتی ہے اور اجارہ داریاں قائم ہوتی ہیں کیوں کہ فوجی منصوبے خراب کارکردگی دکھانے کے باوجود مزید وسائل لیتے رہتے ہیں اور اپنی کاروباری سرگرمیوں اور افراد کے لیے ناجائز مواقع حاصل کرتے رہتے ہیں۔

اس رویے نے بعض حلقوں میں اجارہ داری کی ایک صورت پیدا کردی ہے۔ ذرائعِ نقل و حمل، کھاد اور سیریل کے کارخانے فوجی غلبے کی مثال ہیں۔ فوج کی مالیاتی خودمختاری کی حمایت کرنے والے کہتے ہیں کہ فوج ہر شعبے میں تو اجارہ داری قائم نہیں کرتی اور فوجی کمپنیوں کو ٹھیکے بھی اُن کی بہتر اور صاف ستھری کارکردگی کی بنا پر ملتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنا چاہیے کہ فوج کو ہر شعبے میں اجارہ داری قائم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ فوج کو اُن شعبوں میں فوقیت حاصل ہوتی ہے جہاں بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہو جو نجی شعبہ نہ کرسکے، مثلاً این ایل سی اور ایف ڈبلیو او، افرادی، مالیاتی اور دیگر وسائل استعمال کرنے میں بڑے مستعد ہوتے ہیں جن کی بدولت وہ نقل و حمل اور تعمیراتی شعبے میں غالب رہتے ہیں۔

پاکستان ریلوے بھی کبھی سامان کی ترسیل کا سب سے بڑا ذریعہ تھی لیکن این ایل سی نے اس سے یہ کاروبار ہتھیا لیا۔ پاکستان ریلوے کے عہدے دار اسی صورتِ حال سے ناخوش ہیں کیوں کہ وہ سامان کی ترسیل کے منافع بخش کاروبار کی اجارہ داری سے محروم ہوگئے ہیں۔ اس طرح ایک سرکاری ادارے کا کاروبار دوسرے سرکاری ادارے کو منتقل ہوگیا (اگرچہ این ایل سی اور ایف ڈبلیو او محکمۂ دفاع کا حصہ ہیں لیکن اُنھیں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ سرکاری اداروں کو اپنی خدمات نجی اداروں کی طرح فراہم کریں)۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ پاکستان ریلوے کی کارکردگی کو بہتر بنایا جاتا، فوج نے ایک مساوی سرکاری ادارہ اس کے مقابلے کے لیے قائم کردیا۔

چند مخصوص شعبوں میں فوجی اجارہ داری دیگر اجارہ داروں کو بھی کُھل کھیلنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ فوج اپنی غالب طبقاتی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے ملک کے قومی وسائل کا ناجائز استعمال کرتی ہے اور اپنے حواری سرمایہ داروں کو بھی ان وسائل سے فائدہ اٹھانے کا

موقع فراہم کرتی ہے۔ اس طرح فوج غالب طبقات کی طرح اپنی طاقت اور مالی حیثیت کو اپنے مفاد میں استعمال کرتی ہے۔ اُن معروف سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کو ملکی وسائل سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جاتی ہے جو برسرِ اقتدار قوتوں اور فوج کے حامی ہوں۔ نتیجتاً سرمایہ کار حلقہ فوجی اقتدار کی حمایت کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

ہر فوجی حکومت کے دور میں ایسے اہم سرمایہ دار موجود رہے ہیں جو فوج کے ساتھ مل کر اپنا کاروبار چمکاتے رہے ہیں۔ حکومت میں فوج کی اہمیت کے پیشِ نظر بڑے سرمایہ داروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ جی ایچ کیو سے تعلقات قائم کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے ایک بڑے نجی بینک کو چلانے والے منشا گروپ کے نمائندوں کو کارپوریٹ سیکٹر میں فوج کی مداخلت پر کوئی اعتراض نہیں۔ مسلم کمرشل بینک کے صدر آفتاب منظور نے اپنے انٹرویو میں اس بات کا اقرار کیا کہ فوج کی جانب سے بینکاری کرنے سے اُن کے بینک کو کوئی خطرہ نہیں۔☆44 بینک الحبیب کے صدر عباس حبیب نے بھی جو ایک دوسرا پرانا اور نجی بینک ہے، ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔☆45 ان دونوں بزنس گروپس کا شمار ایسے نجی مالیاتی اداروں میں ہوتا ہے جنھوں نے سول اور فوجی حکمرانوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی بنیاد پر کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ آمرانہ حکومت دوسرے غالب طبقات کے لیے ہمیشہ ترقی کے مواقع فراہم کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اُن کے خلاف کوئی اظہارِ رائے نہیں کرتے۔

تاہم ایسے ادارے بھی ہیں جو فوج اور اس کے حواریوں کی جانب سے کاروبار میں شمولیت پر اعتراض کرتے ہیں۔ انٹرنیشنل اسٹاک ایکسچینج کراچی کے زاہد ظہیر اور کریسینٹ گروپ آف انڈسٹریز کے طارق شفیع کارپوریٹ سیکٹر میں فوج کی شمولیت پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اُن کا اعتراض اس بات پر تھا کہ فوجی سرمایے کے پیچھے کچھ خفیہ مالی تحفظات ہوتے ہیں جسے اگر بجٹ میں شامل کرلیا جائے تو دفاعی بجٹ میں خاصا اضافہ ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ فوجی سرمایہ کار نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں اور وہ بزنس سے متعلق اہم اور خفیہ معلومات تک ترجیحی بنیادوں پر رسائی حاصل کرلیتے ہیں جو کاروباری لحاظ سے بے حد غیر منصفانہ ہے۔

اس طرح کاروباری معاملات میں فوج کی شمولیت کو پاکستان میں (اور دیگر ممالک میں بھی) اکثر اعتراض کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا کیوں کہ اس طرح کئی ایک لوگ اس غیر قانونی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ترکی اور انڈونیشیا بھی اس کی دوسری مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر ترکی میں کل نجی اثاثوں کا صرف پانچ فی صد فوج کے پاس ہے جو فیصلہ کن اجارہ داری کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ اسی طرح انڈونیشیا میں بھی قومی وسائل کا استحصال مختلف بااثر سیاسی حلقوں کے ساتھ ساز باز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو اور سوہارتو نے بھی اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر ایسی ہی سرمایہ داری کو جنم دیا جو اس ملک میں 1997ء کے معاشی بحران کا بڑا سبب بنی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فوج کا ارادہ معیشت پر مکمل قبضہ کرنے کا نہیں ہے۔ معاشی ترقی سے تعلق کی بنا پر اور یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کہ معاشی طریقِ کار اس کا اصل مقصد نہیں ہے، مسلح افواج دوسرے لوگوں کو کارپوریٹ حلقوں یا سماجی معاشی ترقی کو ایک زیادہ اہم کردار ادا کرنے سے نہیں روکتیں۔ فوج اپنی معاشی دل چسپی کو خود اپنی بہبود اور ملک کی سماجی معاشی ترقی کے لیے ایک مفید حصے کے طور پر پیش نہیں کرتی۔ بہرحال فوجی صدر دفتر قواعد و ضوابط کی غیر موجودگی میں دوستی پیدا کرتا ہے۔ دفاعی ادارہ وسائل اور مواقع کی سرقہ پسندانہ تقسیم در تقسیم کو جاری رکھنے میں مسلح افواج اور سویلین اقتدار کی سرپرستی میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے اس دعوے کے برعکس کہ فوج اہلیت کی حمایت کرتی ہے، پاکستان کے سینئر جنرل تجارت اور سیاست دونوں میں اپنے ساتھیوں کی معاونت کرتے ہیں۔

فوجی حکومتوں میں ٹیکنوکریٹس اور خصوصاً معیشت اور تجارت کے ماہرین پر انحصار بڑھ جاتا ہے جن کی مدد سے مالیاتی وسائل کو فوج کی جدید کاری پر لگایا جاتا ہے۔ جنرلوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کاروباری پھیلاؤ کو اپنے قابو میں رکھا جائے۔ پاکستان میں فوجی حکومتوں نے عوام کی انفرادی مالی حالت بہتر بنانے کے بجائے ملکی معیشت پر زیادہ توجہ دی جس سے ہتھیار خریدے جاتے رہے۔ ایسا عام طور پر دو طریقوں سے کیا جاتا ہے۔

اوّل تو یہ کہ ایسے قانونی ہتھکنڈے آزمائے جائیں جن سے کاروباری طبقہ قابو میں رہے،

مثلاً جدید کاروباری تنظیمیں جو حکومت کے قابو سے باہر تھیں، انھیں ایوب خان کے دور میں قواعد وضوابط کے تحت لایا گیا۔ 1958ء کی ''تنظیمِ نو'' جسے 1961ء میں قانونی شکل دی گئی، اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔☆[48] دوسری بات یہ کہ سرکاری کنٹرول کو وسائل کی تقسیم کے ذریعے لاگو کیا گیا مگر کامیاب کاروباری لوگ اس کو بھی اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے لگے۔☆[49]

ایوب حکومت نے وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کے لیے سرکاری مشینری استعمال کی اور پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (PIDC) جیسے ادارے قائم کیے۔ اس سرکاری ادارے کو نجی حلقوں میں صنعتی اور تجارتی بنیادوں کو ترقی دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ پی آئی ڈی سی نے مغربی پاکستان میں 1962ء سے 1969ء کے درمیان پچّیس صنعتی منصوبے لگائے جن میں سے اکثر کو بعد میں مالیاتی و صنعتی گروپوں کو منتقل کردیا گیا۔☆[50] اسی طرح ضیا حکومت نے کئی کاروباری خاندانوں کو نئی زندگی دے کر حکومت کے قائم کردہ نئے سیاسی ڈھانچے میں شامل کرلیا۔ 1980ء کے بعد سے دیگر کاروباری گروپ بھی کامیابی کے لیے فوجی اور سویلین حکومتوں کے محتاج رہے ہیں۔ مضبوط سیاسی اداروں کے نہ ہونے اور ریاست اور سماج کا کردار فیوڈل اور مطلق العنان ہونے کے باعث بڑے کاروباری لوگ مطلق العنانیت میں ہی پروان چڑھتے رہے ہیں۔ چنانچہ منشا اور ہاشوانی جیسے بڑے کاروباری گروپوں کے ارتقا میں بڑی حد تک ریاستی مدد بھی شامل رہی ہے۔

مطلق العنان سویلین حکومتیں اور فوجی ٹولے بھی بڑے کاروباریوں اور زمیں داروں کی مدد کرتی رہی ہیں کیوں کہ سول اور ملٹری افسر شاہانہ حکومتوں کے لیے بڑے کاروباری خاصے سودمند ہوتے ہیں۔ اگر بڑے کاروباری گروپوں کے بجائے بہت سے چھوٹے چھوٹے گروپ یا کاروباری فریق ہوں تو صورتِ حال کنٹرول کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے، مثلاً 1968ء میں چار بڑے کاروباری خاندان یعنی داؤد، سہگل، آدم جی اور اعوان مجموعی اثاثوں کا کوئی ستّر فی صد حصہ کنٹرول کر رہے تھے۔ جیسا کہ رشید امجد نے 1974ء میں کراچی اسٹاک ایکسچینج کی بابت اپنے ایک مقالے میں واضح کیا کہ اکتالیس صنعتی گھرانے نجی شعبے کے اثاثوں کا کوئی اسّی فی صد کنٹرول کرتے تھے۔☆[51]

بھٹو کی ریاستی ملکیت والی پالیسی کے باوجود صورتِ حال کچھ زیادہ نہیں بدلی۔ جس کا مقصد کارپوریٹ سیکٹر میں اشرافیہ کے کنٹرول کو تتر بتر کرنا تھا۔ ضیا نے بھٹو کی پالیسی بدلتے ہوئے صنعتی اور کاروباری ادارے ریاستی ملکیت سے واپس نجی ملکیت میں دینا شروع کر دیے۔ ان خاندانوں میں نواز شریف کا خاندان بھی شامل تھا جسے ضیا کی پالیسیوں سے فائدے پہنچے۔ جنوری 1991ء میں نواز حکومت نے نجکاری کمیشن قائم کر کے سرکاری اداروں کی نجکاری شروع کی جس سے بڑے کاروباریوں کو فائدے پہنچے۔

مئی 1998ء میں چھپنے والی شاہد الرحمٰن کی کتاب ''پاکستان کس کی ملکیت ہے'' (Who Owns Pakistan?) کے مطابق حکومت نے منشا گروپ کی مدد کر کے اسے مسلم کمرشل بینک خریدنے کے قابل بنایا۔[52] نجکاری کا مقصد یہ تھا کہ:

> اداروں کے واجبات پاکستان کے عوام پر قائم رہیں اور اثاثے نئے مالکان کو منتقل ہو جائیں۔ ضیاء الحق کی پالیسی اداروں کو اچھی قیمت پر فروخت کے بجائے کوڑیوں کے مول فروخت کا باعث بنی۔[53]

لہٰذا نجکاری کی پالیسی نے دراصل اُس صورتِ حال کو بحال کیا جو ایوب کے دور میں بڑے سرمایہ داروں کو کاروباری مواقع پر اجارہ داری کی شکل میں حاصل تھی۔ 1993ء میں نجکاری کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کی قیادت ایچ یو بیگ کر رہے تھے۔ اس کمیٹی نے انکشاف کیا کہ اڑتیس کاروباری ادارے ملک کے ساٹھ فی صد (تین سو اسّی ارب روپے) کاروباری اثاثوں کے مالک ہیں۔ نمایاں سرمایہ دار خاندانوں کی تعداد تقریباً اپنی جگہ قائم رہی۔ 1970ء میں بیالیس خاندان ہوا کرتے تھے جو 1997ء میں بڑھ کر چوالیس ہو گئے۔

2004ء اور 2005ء تک فوجی ادارے بھی اُن کمپنیوں کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے جن کی کارپوریٹ سیکٹر پر اجارہ داری تھی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے دیہی اور شہری علاقوں میں کثیر جائیدادیں بھی بنالی تھیں۔ فوج کا اراضی ہتھیانے کا یہ سلسلہ 1950ء کی نصف دہائی سے شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ اراضی کی تقسیم برطانوی دور کی روایات کے مطابق تھی، لیکن اس پالیسی نے فوجی اداروں کو سماجی و معاشی معاملات میں شمولیت کا مواقع فراہم کیا جو کبھی صرف

جاگیردار طبقے کے زیرِ اثر تھے۔فوجیوں میں زرعی اراضی کی تقسیم کا مقصد دراصل جاگیرداروں اور زمیں داروں کے اثر کو مقامی طور پر کم کرنا اور اُنھیں یہ باور کرانا تھا کہ زمینی وسائل کی ازسرِنو تقسیم کے لیےفوج زیادہ بااثر اور اہم ادارہ ہے۔تاہم جیسا کہ ہم نے باب 7 میں ذکر کیا کہ ان اقدامات نے رفتہ رفتہ فوج اور جاگیردار طبقے کے درمیان مشترکہ مفادات پر مبنی تعلقات کو جنم دینا شروع کردیا اور زرعی اصلاحات کی تمام انقلابی کوششوں کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔اب یہ حال ہے کہ اعلیٰ قومی افسران بڑے جاگیرداروں کی طرح اپنی زرعی جائیداد کو سرمایے میں اضافے سے زیادہ اثر و رسوخ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام سلسلہ باہمی حمایت کی بنیاد پر بالکل اسی طرح پروان چڑھا جس طرح سرمایہ داروں اور فوج کے درمیان ہوا تھا۔

باہمی حمایت پر مبنی سرمایہ داری کا تصور فریڈرک لین کے Rent and Tribute سے متعلق مقالے کی یاد دلاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا فریڈرک لین نے Rent سے متعلق اس تصور کا ذکر کیا تھا جو یورپ کے سرمایہ کار فوجیوں کو معاشی مواقع کے حصول کے لیے ادا کرتے تھے۔ جب کہ موجودہ دور میں، جس کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، Rent and Tribute کے درمیان یہ تعلق کچھ زیادہ ہی وسیع ہوگیا ہے۔فوجی اداروں کو منافع کمانے کی اجازت اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ دوسرے بااثر گروہوں اور افراد کے لیے معاشی مواقع فراہم کرتے رہیں۔ یہ صورتِ حال ان تمام ممالک پر صادق آتی ہے جن کا ذکر باب اوّل میں سول اور فوجی تعلقات کے بارے میں کیا گیا تھا۔ تاہم پاکستان جیسی ریاستوں میں سول اور فوجی تعلقات کی نوعیت بڑی مختلف ہے، یہاں استحصال ملک سے باہر نہیں بلکہ ملکی سطح پر فوج کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

زیادہ تر فوجی افسر اپنے اداروں کی غیر معمولی صلاحیتوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ان تعریفوں کا مقصد فوج کی اعلیٰ صلاحیتوں کی تشہیر کرنا ہے تاکہ انھیں ریاست پر حکمرانی کا اہل ثابت کیا جاسکے۔ تاہم یہ صلاحیتیں متنازع ہیں۔ AWT اور FF جیسے فوجی اداروں کی ناقص کارکردگی اس کی ایک مثال ہیں۔فوجی اداروں کی یہ صلاحیت کہ وہ اپنی کارکردگی کو صیغۂ راز میں رکھ سکیں، لوگوں کو یہ باور کرانے میں خاصی معاون ہوتی ہیں کہ وہ باصلاحیت ہیں مگر اس بارے میں کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں۔

ان فوجی اداروں کی مالیاتی نااہلی ریاست کے خزانے پر ایک بوجھ ہے۔ اکثر یہ مالیاتی بوجھ ریاست کو اپنے ذمے لینا پڑتا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے۔ اس قسم کی مالیاتی سہولتیں اور امداد آزاد معیشت کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ نجی ادارے اس قسم کی سہولتوں سے محروم رہتے ہیں۔ فوج کی نجی شعبے اور منافع سازی میں شمولیت ملک میں حمایت یافتہ سرمایہ کاری کو جنم دیتی ہے۔ یہ صورتِ حال اجارہ دار طبقوں کو ریاست اور اس کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے فوج کے ساتھ گٹھ جوڑ پر اُکساتی ہے اور ایسے میں ان سب لوگوں کے نقصان کو فراموش کر دیا جاتا ہے جو ''اشرافیہ کے گٹھ جوڑ'' کا حصہ نہیں ہوتے۔

باب–10

فوج کی کاروباری سرگرمیاں اور پاکستان کا مستقبل

چونکہ ہم پاکستان میں فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا جائزہ لے چکے ہیں، اس لیے اب اُن بنیادی تحقیقی سوالوں کی جانب پلٹتے ہیں جن کے تحت ہم نے اس کام کوشروع کیا تھا۔ جب فوج کے افسر مال بنانے لگیں اور مسلح افواج کی ساکھ کو ذاتی اور ادارے کے معاشی اثر ورسوخ میں اضافے کے لیے استعمال کرنے لگیں تو کیا فوج بیرکوں میں واپس جانا چاہے گی یا جمہوری اداروں کو پنپنے دے گی؟

فوجیوں کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کے لیے فوج کی کاروباری سرگرمیاں کیا معنی رکھتی ہیں جب کہ اس کے افسران خود ریاست اور اس کے وسائل پر قبضہ کرکے ایک آزاد طبقے کی شکل اختیار کر چکے ہوں؟ اور پھر آخری مگر بہت اہم سوال یہ ہے کہ کس طرح اعلیٰ فوجی عہدے داروں کے معاشی مفادات پاکستانی سماج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا پڑوسی ممالک اور باقی دنیا سے تعلقات پر کیا اثر ہوتا ہے؟

فوج کی کاروباری سرگرمیوں پر ایک اور نظر

جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے تعارفی باب میں لکھا تھا کہ فوج کی کاروباری سرگرمیوں

سے مراد وہ مخصوص فوجی سرمایہ ہے جو فوجی برادری اور خصوصاً افسروں کے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جسے دفاعی بجٹ سے الگ رکھا جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ احتساب نہ ہونے کے باعث اس طرح کا سرمایہ غیر قانونی اور مشتبہ ہوتا ہے۔ فوج کی کاروباری سرگرمیاں فوج کی اندرونی معیشت کا حصہ ہوتی ہیں جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایسا سرمایہ دنیا کے اکثر ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ تاہم مطلق العنانی کا مزاج رکھنے والے ممالک میں اس کا اثر ونفوذ زیادہ مضر ہوتا ہے، خصوصاً اُن ملکوں میں جو مسلح افواج کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ جب افواج سویلین حکومتوں کے قابو سے باہر ہوں تو وہ اپنے سماج اور اس کی معیشت کی ہر سطح اور ہر حصے پر اثر انداز ہونے کی تگ و دو کرتی ہیں۔

انتخابی جمہوریت کا سادہ اصول معاشرے کے دیگر عناصر کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ مسلح افواج کو زیرِ نگیں رکھیں۔ جن ملکوں میں انتخابی جمہوریت مستحکم ہو وہاں بھی فوج پارٹنرشپ بنا کر منافع کماتی ہے اور سول سوسائٹی پر سیاسی تسلط قائم کرنے کی کوشش کرسکتی ہے لیکن وہاں سیاسی فریق فوج کو قابو میں کر کے اسے معیشت سے دور رکھتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ چین میں اُس وقت ہوا جب کمیونسٹ پارٹی نے فوج کو حکم دیا کہ وہ خدمات کے شعبے سے اپنے معاشی مفادات ختم کرے۔ تاہم نیم مطلق العنان اور فوجی بالادستی والے سیاسی نظام میں جہاں مسلح افواج سماج اور ریاست پر غالب ہوں، وہاں ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وہاں فوج اپنے غلبے کی بدولت اپنے معاشی مفادات کا تعین خود کرتی ہے اور سرکاری ونجی شعبوں کے وسائل کا استحصال کرتی ہے۔ جس سے اس ادارے کی اقتدار کی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ اس کتاب میں ہم نے فوج کے سیاسی اثر ونفوذ اور اس کے معاشی مفادات کے تعلق کو سمجھنے کے لیے پاکستان کا مطالعہ ایک مثال کے طور پر کیا ہے۔

پاکستان میں فوج کی کاروباری سرگرمیاں

پاکستان میں فوج کے معاشی مفادات دفاعی انتظامیہ کی خواہشِ اقتدار کا نتیجہ ہیں، جو اسے اپنے تمام سول فریقین کی بالادستی سے آزاد ہوکر خودمختار شکل اختیار کرنے کی راہ دکھاتے

ہیں۔فوج اور اس کے چاروں ذیلی اداروں کے تجارتی منصوبے خواہ وہ براہِ راست ادارے کے تحت ہوں یا فوجی برادری کے افراد کے ہاتھ میں، دراصل سول سوسائٹی اور جمہوری اداروں کے مقابلے میں مسلح افواج کی طاقت کا اظہار ہیں۔ تاہم یاد رہے کہ فوج کے معاشی مفادات جو اس عرصے میں خود مستحکم معاشی سلطنت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، فوج کے سیاست میں داخلے سے پہلے وجود نہیں رکھتے تھے۔

1950ء کے عشرے کے اوائل ہی سے کمزور جمہوری اداروں اور خصوصاً فوج کے تحفظ کے ایجنڈے، جو آگے چل کر ریاست کے قومی تحفظ کا ایجنڈا قرار پایا، کے باعث فوج رفتہ رفتہ سیاست اور ملکی نظم ونسق میں شامل ہوتی گئی۔ پڑوسی ملک بھارت سے خطرے کی وجہ سے سیاسی قیادت جو کہ خود دفاعی شعبے کو سنبھالنے کی استعداد نہیں رکھتی تھی، فوج پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے لگی۔ سیاسی قیادت نے بھی قومی سلامتی کو بنیاد بنا کر قومی اکثریتی رائے کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے ہوا یہ کہ زیادہ تر وسائل فوج کو منتقل ہوتے چلے گئے۔ ترقیاتی کاموں کے بجائے دفاعی مسائل پر زیادہ زور دینے سے مرکز اور صوبوں کے باہمی تعلقات بھی خراب ہوئے۔ حکمران طبقات کے سیاست دان قومی سلامتی کی آڑ میں فوج کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ سیاست کی خراب صورتِ حال نے فوج کو موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے معاشی مفادات کو مستحکم کرے اور انھیں باقاعدہ ادارے کی شکل دے اور ان اقدامات کو فوجیوں کی فلاح و بہبود کے نام پر درست ثابت کرے۔ مزید برآں 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں بڑے صنعتی منصوبے قومی ترقی میں فوج کی جانب سے قوم کو تحفے کی شکل میں پیش کیے گئے۔

پاکستان کے نام ور کالم نگار خالد احمد کے خیال میں فوج کے معاشی مفادات پاکستان کے خاص قومی ایجنڈے کا شاخسانہ ہیں۔ اس سوال کے جواب میں کہ فوج سے وابستہ افراد کو اس قدر سہولتیں اور مراعات کیوں دی جاتی ہیں؟ خالد احمد کا کہنا تھا کہ ''جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں، اس کا خمیازہ تو ہمیں بھگتنا ہی ہوگا۔''☆[1] دفاعی محافظ کی حیثیت کو فوج نے ریاست، سماج اور معیشت میں اپنے بڑھتے ہوئے نفوذ کا جواز بنایا۔ یوں اُسے یہ اختیار مل گیا کہ وہ پالیسی سازی

کرے اور معاشی اور دوسرے وسائل کو جس طرح مناسب خیال کرے، استعمال میں لائے۔

فوج کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں اور پیشہ واریت

فوج کی مالیاتی خودمختاری کی جڑیں بیرونی خطرات سے تحفظ فراہم کرنے کے جواز میں پیوست ہیں۔ آئین کے مطابق فوج کا بنیادی کام بیرونی خطروں سے تحفظ اور ضرورت پڑنے پر سویلین حکام کی درخواست پر انھیں مدد فراہم کرنا ہے۔ تاہم فوج نے قومی سلامتی کے بہانے ریاست اور سماج کے ہر شعبے میں سرایت کر کے خود اپنے مفادات کا تحفظ شروع کر دیا۔ اس کا اظہار فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل تنویر محمود احمد کے بیان میں ہوا جو انھوں نے اگست 2006ء میں دیا تھا جس میں مسلح افواج کی اہمیت اور مضبوط فوجی دفاع کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ اسرائیل کے لبنان پر حملے کے موقع پر انھوں نے کہا:

> لبنانی وزیراعظم کو میڈیا کے سامنے رونا پڑا کیوں کہ اُن کے ملک کی دفاعی صلاحیت کمزور تھی اور ہم پاکستان میں ایسا نہیں ہونے دیں گے... زندہ قومیں اپنے وسائل کی قربانی دے کر اپنی مسلح افواج کو حالتِ امن میں بھی جنگ کے لیے تیار رکھتی ہیں۔ یہ قربانی ضروری ہے کیوں کہ اسی طرح مستقبل میں بیرونی خطرے سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔[☆2]

اب اس بیان کو ایئر مارشل کی طرف سے سفارتی آداب کی خلاف ورزی سمجھا جائے یا فوج کی جانب سے ریاستی وسائل پر اُس کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے والوں کے لیے ایک دھمکی گردانا جائے؟ بہرحال، فوج اپنی کاروباری سرگرمیوں کے جواز میں قومی سلامتی کا سوال اٹھاتی ہے۔ اس کتاب کے پانچویں اور چھٹے ابواب میں بیان کیے جانے والے تجارتی منصوبے اور شہری و دیہی اراضی پر قبضے مسلح افواج کو چاق چوبند رکھنے کی قیمت ہیں۔ تاہم عوام کے لیے دیے گئے فضائیہ کے سربراہ کے بیان میں اور بھی بہت کچھ قابلِ غور ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) طلعت مسعود کے مطابق ''اگر ملک مسلح افواج کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا یا بھارتی خطرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اُسے مضبوط دفاعی فوج رکھنے کی قیمت تو ادا کرنی پڑے گی۔''[☆3]

اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ فوج اور دیگر بھارت دشمنی سے فائدے اٹھانے والے لوگ بیرونی خطرے کی کوئی اور تشریح کرنے ہی نہیں دیں گے۔ گویا ہمارے ملک کو اپنے لیے ہندوستان سے ہمہ وقت عدم تحفظ کا خوف لاحق رہے گا جس کے نتیجے میں اس کے لیے ترقی کی بجائے دفاع ہی پہلی ترجیح بنا رہے گا۔ معروف پاکستانی مؤرّخ عائشہ جلال اسے ''فوجی اقتدار کی ریاست'' کہتی ہیں، جہاں فوج اس امر کو یقینی بناتی ہے کہ ترقی پر دفاع کو فوقیت حاصل رہے۔

حکمتِ عملی کے زاویے سے دیکھا جائے تو اس عدم توازن سے فوجی افسروں کی پیشہ واریت پر اثر پڑتا ہے۔ اور یہ فوج میں انقلابی اقدامات کی راہ مسدود کر دیتا ہے، ان کے ہاں یہ تصور ہی ناپید ہو جاتا ہے کہ فوج کے حجم کو کم یا درست کیا جائے اور یہ کہ ایک چھوٹی مگر زیادہ مستعد فوج کے نظریے پر کام کیا جائے۔ اس لیے کہ ایسی صورتِ حال میں اُس کے پیشِ نظر ایسے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے جو ادارے کی سطح پر اس کے پھیلاؤ کی اجازت دیتے ہیں۔

ادارے کی حیثیت سے فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے اس کے مزاج پر پڑنے والے اثرات کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ اس عرصے میں اعلیٰ جنرلوں کے منافع سازی میں ملوث ہونے سے دو نتائج نکلے ہیں۔ ایک تو یہ کہ فوجی عہدے دار ایک بڑا سرمایہ دار طبقہ بن گئے ہیں جو سرمایہ دارانہ عیاری سے ریاست کے مالیاتی اور دیگر وسائل کا استحصال کرنا جانتے ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب کے پانچویں، چھٹے اور ساتویں باب میں دکھایا گیا کہ سینئر جنرلوں نے ادارے کے اثر و رسوخ کو اپنی سیاسی اور معاشی طاقت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ دوسرے یہ کہ ان معاشی مفادات کے حاصل ہونے پر جنھیں ایک سیاسی قوت بھی صل تھی، فوج کا ادارہ اپنے حاضر ملازمت اور سبک دوش ہونے والے اراکین سمیت ایک برادری بن گیا جس نے آگے چل کر خود کو ایک مستحکم خود مختار طبقے میں تبدیل کر لیا۔ اس طبقے میں شمولیت کے طے شدہ قواعد و ضوابط ہیں اور ادارے کی سطح پر بنا ہوا نظامِ کار ہے جو اس کے معاشی مفادات کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

جولائی 1977ء میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے جو قانونی و آئینی تبدیلیاں کیں، اُن سے فوج کی سیاسی طاقت کو استحکام ملا اور فوج دیگر سیاسی قوتوں کے

مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوگئی۔ 1973ء کے آئین میں دفعہ اٹھاون دو (ب) کی شمولیت سے فوج نے اپنا تحفظ یقینی بنایا اور پھر اپریل 2004ء میں قومی سلامتی کونسل بنا کر فوج کی بالادستی کو حتمی شکل دے دی گئی۔ اب وہ اپنے معاشی مفادات کا تحفظ کر سکتی ہے اور دوسرے سیاسی فریقین سے اپنی سیاسی شرائط تسلیم کرا سکتی ہے۔ قومی سلامتی کونسل کے ارکان میں نو سویلین کے ساتھ مسلح افواج کے چار سب سے بڑے جنرل بھی شامل ہیں۔ قومی سلامتی کونسل کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اسٹریٹیجک امور جن میں قومی وسائل کی تقسیم شامل ہے، کا فیصلہ کرے۔

فوج کی طاقت میں بتدریج اضافہ فوجیوں کے مزاج پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ گو کہ اعلیٰ جنرل سیاست اور معیشت میں عدم شمولیت کے دعوے کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیاست میں ملوث ہونے کی وجہ سے فوجی افسر خود کو احتساب سے بالاتر سمجھنے لگے ہیں اور یہ احساس اب نچلے درجے کے فوجیوں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ اب مراعات اور سہولتوں کا حصول فوجیوں کا حق سمجھا جانے لگا ہے اور رہائشی منصوبوں، زرعی اراضی کے علاوہ رعایتی نرخوں پر پانی اور گیس کی سہولتیں فوجیوں کو فراہم کر کے توقع کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ تن دہی سے اپنے کام کریں گے۔ یہاں بحریہ کے ایک درمیانے درجے کے افسر کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ پر مکان ملنے کا شکریہ ادا کیا تو اس کے اعلیٰ افسر نے کہا کہ اُسے خود کو زیرِ بار محسوس کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ بحریہ کے ایک افسر کی حیثیت سے یہ تو اس کا حق تھا۔☆4

جہاں تک مسلح افوج میں پیشہ واریت کا تعلق ہے تو اس کے لیے کاروباری سرگرمیاں دو دھاری تلوار کا کام کرتی ہیں۔ مالیاتی اور دیگر مراعات نے فوجیوں میں مسابقت کے رُجحان کو فروغ دیا ہے، خصوصاً جونیئر اور درمیانے درجے کے افسران میں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اچھی کارکردگی کے نتیجے میں اعلیٰ عہدہ ملنے سے اُنھیں مزید مراعات ملیں گی۔ بریگیڈیئر بننے پر مراعات کے دروازے کھل جاتے ہیں تو میجر جنرل بننے پر ہُن برسنے لگتا ہے۔ تاہم مقابلے کی اس دوڑ میں ہمیشہ قواعد وضوابط نہیں چلتے بلکہ اکثر اعلیٰ افسروں کی چشمِ کرم بہت کام آتی ہے، یعنی صرف انفرادی صلاحیتوں سے کام نہیں چلتا بلکہ افسروں کی خوشنودی کی بھی ضرورت ہوتی

ہے۔ اس سے فیصلوں کے مشتبہ اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کے منافی ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ بحریہ کے ریٹائرڈ کیپٹن عرفان شہریار کے مطابق:

> میجر، کرنل اور اُن کے ماتحت افسر زیادہ پیشہ واریت اور تربیت میں مگن ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے اُن پر دباؤ کم ہوتا ہے مگر شادی کے بعد حقائق بدل جاتے ہیں اور ملنے جلنے سے اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور مراعات نظر آنے لگتی ہیں۔ لہٰذا بریگیڈیئر اور اس سے اوپر یہ خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اب ان کا واسطہ اعلیٰ سطح کے افسروں سے پڑتا ہے اور معاشی فوائد نظر آنے لگتے ہیں۔ دو ستاروں والے جرنیل اور اُن سے اوپر کے عہدے دار ایک ایسی اشرافیہ کا حصہ بن جاتے ہیں جن کے پاس دولت بھی ہوتی ہے اور طاقت بھی۔ ☆5

اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیشہ واریت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ اب بھی ایسے افسر موجود ہیں جو اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں تک محدود رہتے ہیں مگر ان کو عوامی اداروں میں کام کا موقع تک نہیں فراہم ہوتا۔ ایسے کتنے ہیں، ان کی تعداد بھی معلوم نہیں۔ علاوہ ازیں اعلیٰ عہدوں کی سطح پر معاشی مفادات بھی زیادہ ہوتے ہیں اور اعلیٰ فوجی عہدے دار ہی ملک اور دفاعی اسٹبلشمنٹ کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ مبینہ طور پر کئی اعلیٰ جرنلوں نے اپنے اختیارات مالی بدعنوانیوں کے لیے استعمال کیے ہیں، مثلاً لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) زاہد علی اکبر پر قومی احتساب بیورو نے الزام لگایا کہ انھوں نے واپڈا کے سربراہ کی حیثیت سے 1987ء سے 1992ء کے درمیان بدعنوانیاں کیں۔ گو کہ اس بدعنوانی کی مالیت معلوم نہیں پھر بھی ایک اندازے کے مطابق انھوں نے 98-1993ء کے دوران کوئی سوا تین کروڑ روپے اپنے غیر ملکی اکاؤنٹ میں منتقل کیے۔ ☆6 بحریہ کے سربراہ منصور الحق پر الزام تھا کہ انھوں نے فرانسیسی اگوستا آبدوزوں کی خریداری میں رشوتیں وصول کیں۔ بہرحال یہ دو مثالیں سمندر میں نظر آنے والے برف کے تودے کی طرح ہیں جس کا بڑا حصہ نظروں سے پوشیدہ ہے، کیوں کہ دفاعی شعبے میں شفافیت کی کمی ہے۔

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی بدولت ملنے والی مراعات اور سہولتوں کے طفیل فوجی

قیادت کو اپنے ماتحت افسروں کی حمایت حاصل رہتی ہے جس کی بدولت انھیں سویلین حکومتوں کو ہٹانے میں آسانی ہوتی ہے۔

فوج کے افسران بالخصوص بریگیڈیئر اور ان سے اوپر کے افسران اپنے سربراہ کا حکم بلا چون و چرا مان لیتے ہیں کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ نہ صرف معاشی فوائد سے بلکہ نوکریوں سے بھی محروم ہوسکتے ہیں۔ فوج کی کاروباری سرگرمیاں فوج میں نظم و ضبط کو قائم رکھنے میں کیا کردار ادا کرتی ہیں، اس پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے دفاعی تجزیہ کار اکرام سہگل کا کہنا ہے، ''چونکہ میجر جنرل بننے پر بہت سا مالی فائدہ ہوتا ہے، اس لیے کوئی بھی بریگیڈیئر اپنا مستقبل غارت نہیں کرنا چاہتا۔''☆7 اس طرح فوج کا یہ نظم و ضبط اُس کی قیادت کے لیے کارآمد ثابت ہوتا ہے جب کہ یہ سیاسی قوتوں، غیر منظم سول سوسائٹی اور مسلح افواج کے درمیان عدم توازن کی صورتِ حال کو اور بڑھا دیتا ہے۔ یوں فوج دوسروں کے مقابلے میں زیادہ منظم اور مستحکم فریق کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔

فوج کی سیاسی و مالیاتی خودمختاری سے اس کی پیشہ واریت پر منفی اثر پڑتا ہے۔ فوج کی طاقت اور مکمل اختیارات کے باعث ادارے میں احتساب کم ہوجاتا ہے۔ گو کہ فوج سخت احتسابی طریقِ کار رکھنے کی دعوے دار ہے، پھر بھی مجموعی سیاسی و انتظامی ڈھانچا فوج کا احتساب نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے اخراجات پر پوچھ گچھ کرتا ہے۔ سینئر جنرل اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ تجارتی منصوبوں کے باعث اُن کا پیشہ ورانہ کام متاثر ہوتا ہے، مثلاً سابق چیف آف جنرل اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فرخ خان کے مطابق ''فوجی فاؤنڈیشنوں سے ہماری پیشہ واریت متاثر نہیں ہوتی۔ چیف آف جنرل اسٹاف کی حیثیت سے میں کبھی آرمی ویلفیئر ٹرسٹ یا فوجی فاؤنڈیشن کے اجلاس میں شریک نہیں ہوا۔''☆8 تاہم مسئلہ اصل میں یہاں وقت دینے کا نہیں ہے بلکہ اس معاشی ٹکراؤ کا ہے جو فوج کی پیشہ واریت پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس ایک ریٹائرڈ فوجی کرنل کے الفاظ میں، ''فوجی افسر پراپرٹی ڈیلر بن جاتے ہیں اور راتوں رات کروڑوں کما لیتے ہیں اور مسلح افواج کا یہ شعبہ الزامات کی زد میں آجاتا ہے۔''☆9

پاکستان کی سیاست

فوج کے معاشی منصوبوں میں شمولیت کا سب سے سنگین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریاست پر سیاسی اختیار سے متعلق فوجیوں کے تصورات بدل جاتے ہیں۔ مسلح افواج کی مالیاتی خودمختاری ایک معاشی سلطنت تشکیل دیتی ہے جس سے فوجی افسر ریاست کا سیاسی کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں۔ چونکہ سیاسی طاقت سے مالیاتی فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس لیے فوجی برادری اسے مستحکم رکھنا چاہتی ہے۔ اس طرح معاشی و سیاسی مفادات کا ایک قبیح چکر چلتا رہتا ہے، یعنی سیاسی طاقت سے معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں جن سے فوجی افسروں کو مزید طاقت کی طلب ہوتی ہے تاکہ نظم ونسق میں بااثر کردار ادا کیا جائے۔

ملک کی آزادی کے ابتدائی برسوں میں فوج کے معاشی مفادات صرف اس حد تک تھے کہ قومی بجٹ سے سالانہ دفاعی اخراجات حاصل کیے جائیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ قومی سلامتی کو اوّلیت دیتے ہوئے مسلح افواج کو ریاست اور اس کے نظریے کے دفاع کی جو ذمے داری سونپی گئی، اس سے فوج کو معیشت و سیاست میں سرایت کرنے کی ترغیب ملی۔ ابتدائی حکومتوں نے مسلح افواج کو دل کھول کر وسائل مہیا کیے اور اس پر کوئی سخت کنٹرول نہیں رکھا جس سے فوج نے خود کو ریاست اور اس کے وسائل کے استعمال کا حق دار سمجھنا شروع کر دیا۔ یوں رفتہ رفتہ دفاعی اسٹیبلشمنٹ نے اپنی جڑیں معیشت اور سماج کے تمام شعبوں میں پھیلا لیں۔

ہر فوجی حکومت نے ریاستی وسائل سے اپنی برادری کے لوگوں کو مزید مواقع فراہم کیے۔ ریاست کے محافظ ہونے اور واحد مضبوط قومی ادارے کے طور پر مسلح افواج نے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اکتوبر 1999ء میں اقتدار پر قبضے کے بعد فوج نے پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تعداد میں حاضر ملازمت اور ریٹائرڈ افسروں کو حکومت اور سرکاری شعبے کے اداروں میں تعینات کیا، اس کے علاوہ متعدد فوجی کمپنیوں کو بڑے بڑے ٹھیکے دیے گئے اور فوج کے ذیلی اداروں اور فوجی برادری کے انفرادی ارکان کو بھی مواقع فراہم کیے گئے۔ لیفٹیننٹ جنرل اسد درّانی کے مطابق یہ فوجی قیادت کے لیے بڑی فطری سی بات تھی کہ ملازمتوں پر اپنے قابلِ اعتماد

لوگوں کو فائز کیا جائے۔ چونکہ مطمحِ نظر یہ تھا کہ حالات سدھارے جائیں اور ترقی کی جائے۔ لہٰذا جنرل مشرف نے بھی اپنے آزمودہ لوگوں کو ملازمتیں دیں۔

تاہم اس طرزِ فکر سے سویلین ادارے مزید کمزور ہوئے اور مسلح افواج کے لوگ مزید طاقت ور ہوگئے۔ جیسا کہ اس کتاب کے چھٹے باب میں ثابت کیا گیا کہ معاشی مفادات نے فوجی برادری کو ایک آزاد طبقے کی شکل دے دی جو معاشرے کے دوسرے طبقوں میں اپنے حلیفوں کے مفادات کے تحفظ کرنے لگا اور اس نے ریاست کے نظم و نسق کو سنبھالنے کا کام ادارے کی ذمے داری بنا لیا۔ اس لیے اب سیاست سے دستبردار ہونا فوج کے لیے گھاٹے کا سودا ہوگیا۔ ان حالات میں ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ فوج مکمل طور پر بیرکوں میں چلی جائے اور جمہوری اداروں کو پروان چڑھنے دے۔

اعلیٰ فوجی جنرل اپنی سیاسی و مالیاتی خودمختاری سے انکار کرتے ہیں اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اقتدار پر فوجی قبضے دراصل معاشی مفادات کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ یہ دعوے کرتے ہیں کہ سویلین اداروں اور سیاسی قیادت کی نااہلی کے نتیجے میں فوج اقتدار کو میں آنا پڑتا ہے۔ ان کے مطابق سیاسی قیادت کی نااہلی کے باعث پاکستان میں جمہوریت ناممکن ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سیّد محمد امجد کے مطابق ''میں نے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا کہ کیا ہم جمہوریت کے لیے تیار ہیں؟ کیا مسلم دنیا جمہوریت کے لیے تیار ہے؟''☆10 جنرل کی سیاسی صورتِ حال میں یہ مایوسی پاکستان کی سماجی سیاسیات کا شعور نہیں رکھتی جس سے پیدا ہونے والی قیادت میں اتنا دم خم ہی نہیں کہ وہ فوج کو بیروکوں میں واپس بھیج سکے۔ سیاسی نظام کے نقائص بیان کرتے ہوئے جنرل امجد نے یہ بات نہیں سمجھی کہ خود فوج ایسے نیم مطلق العنان نظام کی دل دادہ ہے جس میں بالادست طبقے اپنے ہی مفادات کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ چنانچہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ فوج سیاسی حومتوں سے بہتر ہے بلکہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ تمام بالادست طبقے سیاسی حرص و ہوس میں مبتلا ہیں۔

لوٹ مار کا یہی وہ چکر ہے جو ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے کہ جب فوج اور سویلین قیادت اپنے مفادات کے لیے مل کر مطلق العنانیت کو فروغ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس

کتاب کے دوسرے اور تیسرے باب میں دیکھا کہ سیاسی حکومتوں نے بھی فوج کو مضبوط کیا ہے تاکہ اپنے مخالفین پر برتری حاصل کرسکیں۔ افسوس کہ فوج بھی ان سے مختلف نہیں ہے۔ فوج کے اعلیٰ جنرل بھی اقربا پروری اور گروہی سیاست کو فروغ دیتے اور ان جماعتوں اور گروہوں کی پشت پناہی کرتے ہیں جو فوج کے اقتدار کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ فوجی رہنما بھی سیاست دانوں کی طرح وسائل پر اجارہ داری کی کوشش میں رہتے ہیں۔ ''ڈیلی ٹائمز'' کے مدیر نجم سیٹھی کے بقول واحد فرق یہ ہے کہ فوج قوانین کو توڑ مروڑ کر اپنے قوانین بنا لیتی ہے تاکہ کوئی اس کے اقدامات کو بدعنوانی قرار نہ دے سکے۔☆11

یہاں وفاداری یا نظریات نہیں بلکہ مفادات اصل میں اقدامات کی بنیاد بنتے ہیں۔ اس لیے نہ تو فوج کو سیاست سے نکالا جاسکتا ہے اور نہ ہی فوج جمہوری ادارے مضبوط ہوتے دیکھ سکتی ہے۔

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے جال فوج میں حریصانہ رویوں کو ترویج دیتے ہیں۔ فوج اپنے سویلین ساتھیوں سے مل کر ریاست وسائل کا استحصال کرتی ہے اور دونوں مل کر مطلق العنان نظام سے مالیاتی فائدے اٹھاتے ہیں۔ تاہم اس سے ملک کے سیاسی مستقبل پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے ریاست کی منفی پالیسیاں سامنے آتی ہیں جن سے مرکز اور وفاقی اکائیوں کے درمیان تفریق بڑھتی ہے اور قومیتی تضاد میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ریاست پر فوجی نیم آمرانہ قوتوں کا تسلط قائم ہوتا ہے۔

آج پاکستان میں فوج کی بالادستی ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کی تین جہات ہیں۔ فوج سماج، سیاست اور معیشت میں سرایت کرچکی ہے۔ اس کے علاوہ فوج نے قومی اور بین الاقوامی مسائل کو اپنے انداز سے پیش کر کے فکری صورتِ حال کو بھی اپنے قابو میں کرلیا ہے۔ گزشتہ فوجی آمروں کے مقابلے میں جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت سوسائٹی کے اداروں کو کنٹرول کرنے میں زیادہ کامیاب رہی ہے۔ میڈیا کو قابو میں رکھنے کے لیے جزا و سزا کے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہی حربہ سول سوسائٹی کے دوسرے اداروں پر بھی کامیابی سے آزمایا گیا۔ اس کے علاوہ قومی سلامتی کا واویلا اس مؤثر طریقے سے کیا جاتا ہے کہ ملک میں

کوئی بھی فوج کے وجود یا بالادستی کو للکار نہیں سکتا۔

2006ء میں حزبِ اختلاف کی دو بڑی جماعتوں کے رہنماؤں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے میثاقِ جمہوریت یا چارٹر آف ڈیموکریسی کا اعلان کیا۔ تاہم مشترکہ کوشش سے بھی وہ مسلح افواج کو سیاست سے باہر دھکیلنے کی کوششوں میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اس میثاق میں بھی کشمیر کے مسئلے پر زور دیا گیا جس سے فوج کو تقویت ملتی ہے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میثاقِ جمہوریت ایک فرد یعنی مشرف کے خلاف احتجاج ہے نہ کہ کوئی ایسا اقدام جس سے فوج کو مستقل بنیادوں پر اقتدار سے نکال کر واپس بھیجا جا سکے۔ اسی لیے پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) خالد مقبول کا یہ کہنا درست ہے کہ ''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی حکومت فوج کو کمزور کرنا چاہے گی اور فوج کو ایسا کوئی خطرہ کبھی لاحق ہوگا۔''☆12

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی حالات اُس وقت تک نہیں بدلیں گے جب تک کہ جمہوری قوتیں اپنے اندرونی اختلافات پر قابو نہ پالیں اور ان مسائل کو حل نہ کر لیں جو سول سوسائٹی اور سیاسی قوتوں کی تقسیم کا باعث بنتے ہیں۔ سیاسی قوتوں کو پہلے سے کہیں زیادہ اور بہتر انداز میں خود کو مستحکم کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ان کے معاشی مفادات نے فوج کا کردار بھی بدل ڈالا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی ساخت کو جمہوری انداز سے منظّم کرنا ہوگا۔ خود سیاست دانوں کے مسلسل جاری رہنے والے مطلق العنان رویے مسلح افواج کو اقتدار سے الگ کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔

حالات میں تبدیلی کی ایک اور وجہ بیرونی طاقتوں کا دباؤ بھی ہو سکتا ہے، مثلاً پاکستان کا اتحادی امریکا جس پر اسلام آباد کا اسٹریٹیجک انحصار بھی ہے، اگر وہ چاہے تو اخلاقی و سیاسی امداد کا رُخ سماجی قوتوں کی مضبوطی کی طرف موڑ سکتا ہے تاکہ سیاسی نظام مضبوط ہو اور سیاست دان فوج کو سیاست سے الگ کر سکیں۔ مگر اس کے لیے بھی ملکی سیاسی قوتوں کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ پاکستان کے غیر ملکی اتحادیوں کو سمجھنا چاہیے کہ سطحی اقدامات مثلاً انتخابات کرانے سے جب کہ جمہوری اداروں پر افراد کا اقتدار قائم ہو، انتخابات کے نتائج سے پہلے دھاندلی ہوتی ہو، یا بلدیاتی نظام کے ذریعے سیاست میں مقامی یا علاقائی قوتوں کو استعمال کیا جاتا ہو، یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

ایسا مطلق العنان نظام جس میں فوج کی بالادستی ہو، ملک کے سیاسی مسائل حل نہیں

کرسکتا، نہ ہی اس سے بیرونی اتحادیوں کے مفادات کو دیرپا تقویت فراہم ہوسکتی ہے۔ سیاسی طور پر مستحکم پاکستان ہی صحیح معنوں میں مستحکم پاکستان ہوگا جو جنوبی ایشیا کے لیے نہیں، پوری دنیا کے مفاد میں ہوگا۔ فوج کی کاروباری سرگرمیاں اور معاشی خودمختاری ملک میں جمہوریت کے فروغ میں حائل ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت دوسرے ممالک ے ساتھ ساتھ ترکی اور انڈونیشیا کی شکل میں موجود ہے جہاں فوج نے ملک کی معیشت اور سیاست میں جگہ بنائی اور بین الاقوامی سرمایے نے بھی فوج کے مالیاتی سلطنت بننے میں مدد دی۔ تاہم اس معاونت نے مسلح افواج کو مضبوط کیا اور ترکی میں جمہوریت مستحکم نہیں ہوئی۔ یاد رہے کہ یہی جمہوریت کا فقدان ترکی کی یورپین یونین میں شمولیت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا مستقبل میں اثر

فوج کی اندرونی معیشت کا تخمینہ لگانا خاصا مشکل ہے اور شاید اتنا ہی مشکل یہ قیاس کرنا بھی ہے کہ ملک فوج کی کاروباری سرگرمیوں کی کیا قیمت ادا کرتا ہے۔ پھر بھی وہ قارئین جو اس موضوع پر مزید روشنی ڈالنا چاہیں، ان کے لیے اس ساری گفتگو کے اختتام پر ایک مفروضہ قائم کرنا مفید ہوگا۔ یہ اس کتاب کے تمام قارئین کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ فوج کے ایک خودمختار طبقہ بننے اور ملک کی باثر اشرافیہ کی حیثیت اختیار کرنے اور معاشرے میں انتہا پسندی کے پروان چڑھنے جیسے مسائل کو فوج کی کاروباری سرگرمیوں سے جوڑ کر دیکھیں۔

فوجی برتری کے حامل تینوں ممالک پاکستان، انڈونیشیا اور ترکی میں مشترک مسئلہ ہے۔ فوج کا ایک طبقے کی شکل اختیار کرنا اور بالادست اشرافیہ میں شامل ہوجانا اس ادارے کے سماجی اور سیاسی توازن میں بگاڑ کے مرحلے پر منصفی کے کردار کی نفی کرتا ہے، ایسے وقت میں معاشرہ جس کی اس سے امید رکھتا ہے۔ فوجی بالادستی سے عوام کے پاس متبادل کم ہوجاتے ہیں جو دیگر نظریات میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

یہ ایک دل چسپ اتفاق ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کوئی اور سیاسی نظریہ نہ ہونے کے باعث مذہب اور مذہبی عقائد متبادل بنیاد کے طور پر ابھرے ہیں جن سے ان ملکوں

کے لوگ انصاف اور بہتر نظم ونسق کی توقع کرنے لگے۔

پاکستان میں فوج نے دائیں بازو کی مذہبی سیاست کو فروغ دینے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے اور یہ نہیں سوچا کہ مذہبی عناصر مضبوط ہو کر خود فوج کا متبادل بن جائیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے قومی تحفظ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے یہاں مختلف جنگجو تنظیموں کو فوج نے ہی پروان چڑھایا ہے۔ مذہبی جماعتیں، جنگجو گروہ اور مسلح افواج ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے رہے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ دائیں بازو کی مذہبی قوتوں نے اٹھایا ہے اور عام لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ دیکھا جائے تو مذہبی قدامت پرستی میں اضافے اور عوام میں مذہب پسندی کے رُجحان نے فوج کی اہمیت میں بھی اضافہ کیا کیوں کہ ان حالات میں وہی ملک میں اور دنیا میں ایک متبادل بنیادی سیاسی وسماجی نظام کو بچانے یا قائم رکھنے کا ذریعہ ہو سکتی تھی۔

اگرچہ پاکستان کے جنرل مذہبی بنیاد پرستی اور جنگجو گروہوں کی مخالفت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن شائع شدہ اطلاعات اس کے برعکس ہیں۔ انگریزی رسالے ''ہیرالڈ'' کی ایک رپورٹ کے مطابق حکومت جنگجو گروہوں کی جانب دوغلا رویہ رکھتی ہے۔☆[13] ان اطلاعات سے امریکا اور دیگر مغربی ممالک جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اُس کے ساتھ ہیں، اُن کی اُن پالیسیوں کی اثر پذیری کے بارے میں شکوک وشبہات جنم لیتے ہیں جو وہ پاکستان میں جمہوریت اور عسکریت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ پاکستان، ترکی اور انڈونیشیا کی مسلح افواج نے معاشرے پر اپنا اختیار بڑھانے میں مذہب کو استعمال کیا ہے۔ مذہبی قوتوں کے استحکام نے ریاست اور معاشرے پر فوج کا تسلط محکم کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ دائیں بازو کی مذہبی قوتوں کو مستحکم کر کے فوج نے سماج اور ریاست پر بالادستی حاصل کر لی ہے۔

کیا فوجی بالادستی اور مذہبی انتہا پسندی میں کوئی لازمی ربطِ باہمی ہے؟ فوج کی سیاسی سرگرمیاں کس طرح سماجی رشتوں کی تشکیلِ نو کرتی ہیں؟ کیا مذہبی انتہا پسندی اور نفرتوں کو فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے فروغ کی قیمت سمجھنا چاہیے؟ یہ چند نازک اور اہم سوالات ہیں جن کے جواب کی جستجو، میں قارئین اور مستقبل کے محققین کے لیے اٹھا رکھتی ہوں۔

حواشی

تعارف

☆1۔ ''فوجی برادری'' کی اصطلاح سے یہاں مراد حاضر سروس اور ریٹائرڈ ہوجانے والے فوجی ہیں اور ایسے سویلین کی محدود تعداد بھی جو براہِ راست فوجی کاروباری سرگرمیوں پر انحصار کرتے ہیں۔

☆2۔ Tilly، 1985ء

☆3۔ Lane، 1979، صفحہ 12-65

☆4۔ Nandy، 2003ء، صفحہ 7-8

☆5۔ Hobsbawm، 2000ء، صفحہ 99

☆6۔ Brommelhorster and Paes، 2003، صفحہ 4

☆7۔ ایضاً، صفحہ نمبر 2

☆8۔ جیسا کہ نمبر 1 میں بیان کیا گیا، یہاں حاضر سروس اور ریٹائرڈ دونوں طرح کے فوجی شامل ہیں اور ایسے سویلین جو براہِ راست فوجی کاروباری سرگرمیوں پر انحصار کرتے ہیں۔

☆9۔ 'Ministry refuses to explain Fauji Foundation issue'، *Daily Times*، 5/جون 2005ء

☆10۔ Feit، 1973ء، صفحہ 6

☆11۔ Singer، 2004، دیکھیے Davis، 2002، Mulvenon، 2001ء، Brommelhorster and Paes، 2003ء، اور Holmqvist، 2005ء

☆12۔ Peter Lock کے ساتھ ای میل کے ذریعے گفتگو۔ (مزید دیکھیے Lock، 2000)

☆13. Redlick, Fritz, *The German Military Enterpriser and His Work Force: A Study in European Social and Economic History,* 2 Vols. (Wiesbaden, (1964).

☆14- Van Crefeld, 1977

☆15- Tilly، 1992ء، صفحہ 87

☆16- ایضاً

☆17- Brommelhorster and Paes، 2003ء، صفحہ 2-3

☆18- Mulvenon، 2001ء، صفحہ 25، 8-27

☆19- Huntington، 1996ء، صفحہ 203، Stepan، 1971ء، صفحہ 9-20، Mares، 1998ء، صفحہ 3-5

☆20- Halpern، 1963ء

☆21- جلال، 1991ء، صفحہ 4-63، مزید دیکھیے Robinson، 1996ء

☆22- Callahan، 2003ء

☆23- Huntington، 1996ء، صفحہ 203

☆24- Holmqvist، 2005ء، صفحہ 39

☆25- Wintrobe، 2000ء، صفحہ 9-31

☆26- ڈی ایچ اے کراچی میں سمندری پانی کو پینے کے قابل بنانے والے پلانٹ کے افتتاح کے موقعے پر خطاب۔

☆27- نصر، 2001ء، صفحہ 12-9

☆28- McCulloch، 2005ء، صفحہ 6، 19-12

☆29- Lock، 2000، صفحہ 9

☆30- Brommelhorster and Paes، 2003ء، صفحہ 63

☆31- Mulvenon، 2001ء، صفحہ نمبر 61۔ اس تحقیق کے دوران انٹرویو کیے جانے والے کئی ریٹائرڈ فوجی افسر ایسے ہی خیالات کے حامل تھے۔

☆32- ایضاً، صفحہ نمبر 11

☆33- مثلاً بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اپنی وزارتِ دفاع کو ''ڈبل فائل'' سسٹم نافذ کرنے کا کہا جس سے سول افسر شاہی کو فوج پر بالادستی حاصل ہوگئی۔ اس طریقے سے سروس ہیڈ کوارٹر کے کسی افسر کے نوٹس پر مبنی فائل براہِ راست اعلیٰ سیاسی قیادت کو نہیں جاتی بلکہ وزارتِ دفاع ایک دوسری فائل بنا کر اپنے تاثرات لکھتا ہے۔ اس طرح سول افسر شاہی کو فوج پر بالادستی حاصل ہوگئی۔ (ریئر ایڈمرل (ریٹائرڈ) راجا مینن اور سابق وفاقی سیکریٹری این این ووہرا سے انٹرویو بمقام نئی دہلی، 2006ء)

☆34- جلال، 1991ء

☆35- رضوی، 2003ء

☆36- Olsen، 2000ء

☆37- حوالے کے لیے دیکھیے John Lancaster، 'Pakistanis question perks of power'، *Washington Post*، 22 نومبر 2002ء۔

پہلا باب: فوج کی کاروباری سرگرمیاں — ایک تناظر

☆1۔ Dauvergne، 1998، صفحہ 137 اور Midgal، 1988، صفحہ 19

☆2۔ Levi، 2002ء، صفحہ 40

☆3۔ Tilly، 1992ء، صفحہ 7-96

☆4۔ Grindle، 1996ء، صفحہ 79

☆5۔ دو قوتوں کے درمیان تناؤ پر مباحث کے لیے دیکھیے Poggi، 1978ء اور Lasswell، 1958ء

☆6۔ Krasner، 1984ء، صفحہ 225

☆7۔ Migdal، 1988ء، مزید Migdal، 2001ء، صفحہ 94-58

☆8۔ Grindle، 1996ء، صفحہ 79

☆9۔ Nordlinger، 1981ء، مزید دیکھیے Greetz، 1981ء، Skowronek، 1982، Dahl، 1961ء اور Migdal، 1988ء

☆10۔ Migdal، 1988ء، صفحہ 205-181

☆11۔ افسر شاہانہ مطلق العنانیت پر مواد کے لیے دیکھیے O'Donnell، 1973ء، مزید دیکھیے Linz، 1978ء

☆12۔ Schmitter، 1974ء، مزید دیکھیے Schmitter 1978ء

☆13۔ Malloy، 1977ء

☆14۔ Malloy et al., 1996ء

☆15۔ گو کہ غیر سرکاری فریق تشدد پر ریاستی اجارہ داری کو للکارتے ہیں، قومی ریاست کی مسلح افواج کے تسلط کو حکومت تسلیم کرتی ہے۔ ہم اس تھکا دینے والی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ یہ اجارہ داری کس طرح دی جاتی ہے اور حکمرانوں کو کس نے یہ حق دیا کہ فوج کو تسلیم کرے۔

☆16۔ گو کہ پولیس بھی تسلط کے طریقے استعمال کر سکتی ہے، پولیس اور نیم فوجی دستے، مسلح افواج کے مقابلے میں بہت کم استعداد رکھتے ہیں۔ ہتھیاروں کے بڑے نظام اور گولہ باری کی طاقت کی بدولت فوج بہت زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔

☆17۔ Malloy، 1977ء، صفحہ 4

☆18۔ Perlmutter، 1974ء، صفحہ 12۔ پرل مٹر کے مطابق بھارت بھی مطلق العنانیت کے قریب تھا۔ اسی نقطۂ نظر کو عائشہ جلال نے بھی اپنی تحریر میں بیان کیا ہے۔ دیکھیے جلال، 1995ء۔

☆19۔ این این وہرہ اور ریر ایڈمرل (ریٹائرڈ) کے آرمینن سے کیے جانے والے انٹرویو جو 13 / دسمبر 2005ء اور 12 / جنوری 2006ء کو کیے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ڈبل فائل'' سسٹم کے ذریعے سروس ہیڈ کوارٹر سے نکلنے والے تمام میمو اور دیگر دستاویز وزارتِ دفاع میں جاتے جہاں ایک اور فائل وزارت کے تبصرے کے ساتھ سیاسی رہنماؤں کو فیصلے کے لیے بھیجی جاتی۔

☆20۔ Peri، 2002ء

☆21۔ Larry Makinson کا مضمون Outsourcing the Pentagon: who benefits from the politics and economics of national security?، ماخذ www.icij.org/pns/report.aspx?aid=385

☆22۔ ایضاً

☆23۔ ایضاً

☆24۔ Werve، 2004ء

☆25۔ http://coursesa.matrix.msu.edu/~hst306/documents/indust.html

☆26۔ Perlmutter، 1981ء، صفحہ 59

☆27۔ Migdal، 1988ء، صفحہ 187

☆28۔ Perlmutter، 1981ء، صفحہ 53-4

☆29۔ ایضاً، صفحہ 55

☆30۔ انسانی حقوق کی کارکن شیرال لکتھی لکا سے انٹرویو (کولمبو، 9رفروری 2006ء)

☆31۔ Mulvenon، 2001ء

☆32۔ Mora، 2002ء

☆33۔ Joffe، 1997ء، صفحہ 179

☆34۔ Woodrow Wilson International Centre میں راقم نے جو تحقیقی مقالہ پیش کیا، اس پر James Mulvenon کا تبصرہ۔ (واشنگٹن ڈی سی 2005ء)

☆35۔ Wintrobe، 1998، صفحہ 138

☆36۔ Klebnikov، 2003ء

☆37۔ Mora، 2002ء

☆38۔ Perlmutter، 1981ء، صفحہ 10-16

☆39۔ ایضاً، صفحہ 39

☆40۔ ایضاً، صفحہ 41

☆41۔ ایضاً، صفحہ 41-2

☆42۔ Holsti، 1996ء، صفحہ 61

☆43۔ Perlmutter، 1981ء، صفحہ 42-3؛ 50-1

☆44۔ ایضاً، صفحہ 125

☆45۔ Olsen، 2000ء، صفحہ 11

☆46۔ Callahan، 2003ء، صفحہ 205-6

☆47۔ Perlmutter، 1981ء، صفحہ 131-2

☆48۔ Halpren، 1963ء

☆49۔ Weaver، 1973، صفحہ 78-94

☆50۔ Perlmutter، 1977ء، صفحہ 111

☆51۔ Feit، 1973ء، صفحہ 3

☆52۔ Perlmutter and Bennett، 1980ء، صفحہ 206-7

☆53۔ Perlmutter، 1977ء، صفحہ 111

☆54۔ Stepan، 1988ء، صفحہ 15، مزید دیکھیے، Stepan، 1971ء، صفحہ 6-60

☆55۔ Perlmutter، 1977ء، صفحہ 106

☆56۔ Crouch، 1978ء، مزید دیکھیے McCulloch، 2003ء، صفحہ 7-96

☆57۔ ایضاً

☆58۔ سابق آرمی چیف لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محبوب الرحمٰن سے انٹرویو (ڈھاکہ، 7/فروری 2006ء)

☆59۔ Feaver، 2003ء، صفحہ 95-54

☆60۔ پیپلز کانگریس کی قرارداد نمبر XX1V/MPRS/1966، دفعہ 3، پیراگراف 7

☆61۔ McCulloch، 2005ء، صفحہ 9-6

☆62۔ Kinzer، 2001ء، صفحہ 16

☆63۔ ایضاً، صفحہ 9

☆64۔ Narli، 2000، صفحہ 12-109

☆65۔ Roulleau، 2000، صفحہ 5

☆66۔ اجارہ داری کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں— اوّل تو اس میں زیادہ وسائل کا معاملہ ہے۔ مثلاً ترکی کی فوجی افسر شاہی کو سول افسروں سے زیادہ مراعات ملتی ہیں۔ جس سے وسائل پر اجارہ داری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس میں اجارہ داری کا قیام بھی شامل ہے۔ مثلاً بڑے تعمیراتی اور نقل وحمل کے کاروبار پر پاک فوج کا قبضہ۔

☆67۔ Van de Walle، 2001ء، صفحہ 51-113

☆68۔ ایضاً، صفحہ 185

☆69۔ Holmqvist، 2005ء، صفحہ 25

دوسرا باب: پاکستانی فوج میں افسر شاہی کا فروغ، 77-1947

☆1۔ Perlmutter، 1977، صفحہ 93

☆2۔ Cohen، 2004ء، صفحہ 4-223

☆3۔ Tan Tai Yong، 2005، صفحہ 9-62

☆4۔ ایضاً، صفحہ 65

☆5۔ ایضاً، صفحہ 71

☆6۔ پاشا، 1998ء، صفحہ 135

☆7۔ سردار عطاء اللہ مینگل سے انٹرویو (کراچی، 31/جولائی 2004ء)

☆8۔ Nordlinger، 1977ء، صفحہ 42-35

☆9۔ Janowitz، 1971، صفحہ 317

☆10۔ Nordlinger، 1977ء، صفحہ 42-35

☆11۔ ایک افسر سے گفتگو، جو ملٹری سیکریٹری کی شاخ میں ملازم تھا۔ یہ شاخ تمام فوجی اہل کاروں کی تعینات، تبادلے اور ترقی کی ذمے دار ہے۔
☆12۔ پاکستان نیوی کے نفسیات داں سے گفتگو (اسلام آباد، اپریل 1999ء)
☆13۔ صدیقہ آغا، 2001ء، صفحہ 3-60
☆14۔ جنرل شمیم عالم خان سے انٹرویو (راول پنڈی، 21/ مارچ 1994ء)
☆15۔ جنرل (ریٹائرڈ) جہانگیر کرامت سے انٹرویو (لاہور، 12/ جنوری 2004ء)
☆16۔ Huser، 2002ء، صفحہ 2-20
☆17۔ Cohen، 2004ء، صفحہ 105
☆18۔ صدیقی، 1996ء، صفحہ 70
☆19۔ حقانی، 2005ء، صفحہ 15
☆20۔ جلال، 1991ء، صفحہ 44
☆21۔ Cohen، 2004ء، صفحہ 102
☆22۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اے آر صدیقی سے انٹرویو (کراچی، 20/ جولائی 2004ء)
☆23۔ جنرل پرویز مشرف کا ٹیلی وژن پر خطاب، 12/ جنوری 2002ء
☆24۔ حقانی، 2005ء، صفحہ 97-131، 309-261، مزید دیکھیے عباس، 2005، صفحہ 16-201
☆25۔ خان، 1963، صفحہ 199-67
☆26۔ ایضاً، صفحہ 40-239
☆27۔ چیمہ، 2000، صفحہ 6-135
☆28۔ Cloughly، 1999ء، صفحہ 97-239
☆29۔ 1990ء کی دہائی کے دوران، جب پنجاب حکومت وزیرِاعظم نواز شریف کے بھائی شہباز شریف چلا رہے تھے، انھوں نے آرمی کو ghost اسکولوں (ایسے اسکول جو صرف کاغذوں میں وجود رکھتے تھے) کا پتا لگانے اور انھیں بند کرنے کو کہا، تاکہ اُن کو اُس وقت سرکاری کاغذات سے بھی خارج کیا جا سکے۔ صوبائی حکومت کے محکمۂ تعلیم اس بات کی تصدیق کرنے سے قاصر تھا کہ کتنے اسکول واقعی کام کر رہے تھے۔
☆30۔ اس بات کو ملحوظِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ counter-plotist Literature کی اصطلاح کوئی منفی پہلو نہیں رکھتی بلکہ یہ تو صرف مختلف دلائل کے بنیادی فرق کو واضح کرتی ہے۔
☆31۔ جلال، 1991ء، صفحہ 4-63
☆32۔ شفقت، 1997ء
☆33۔ Kux، 2001ء
☆34۔ Cohen، 2004ء، صفحہ 102
☆35۔ شفقت، 1997ء، صفحہ 21
☆36۔ وسیم، 1994ء، صفحہ 123
☆37۔ حمزہ علوی، وسیم میں، 1994ء، صفحہ 133
☆38۔ ایضاً، صفحہ 131-51

☆39۔ ایضاً، صفحہ 115

☆40۔ Feit، 1973، صفحہ 2

☆41۔ ایضاً، صفحہ 4-5، Banfield، 1958ء، صفحہ 85

☆42۔ Feit، 1973ء، صفحہ 2-5

☆43۔ علوی، 1983ء، صفحہ 42-3

☆44۔ علوی، 1982a، صفحہ 172-91

☆45۔ علوی، 1982b، صفحہ 296-99

☆46۔ سعید شفقت، 'شخصیت' یا 'اوصافِ شخصی' کو بذاتِ خود تغیر پذیر قرار دیا ہے۔

☆47۔ علوی، 1983ء

☆48۔ حقانی، 2005ء

☆49۔ علوی، 1983ء، صفحہ 66

☆50۔ ایضاً، صفحہ 71

☆51۔ ایضاً، صفحہ 66-70

☆52۔ کھوڑو، 1998، صفحہ 373

☆53۔ وسیم، 1994ء، صفحہ 117

☆54۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 80

☆55۔ کھوڑو، 1998ء، صفحہ 375

☆56۔ عباس، 2005ء، صفحہ 28

☆57۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 80

☆58۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی سے انٹرویو (راول پنڈی، 6/نومبر 2003ء)

☆59۔ شفقت، 1997ء، صفحہ 9

☆60۔ عباس، 2005ء، صفحہ 35

☆61۔ میجر جنرل افتخار جو کہ کمانڈر اِن چیف کے عہدے پر تعینات تھے، کے اچانک انتقال کے سبب ایوب خان کو ترجیح دی گئی۔ دیکھیے عباس، 2005ء، صفحہ 27، 2-51

☆62۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی سے انٹرویو (راول پنڈی، 6/نومبر 2003ء)

☆63۔ ریاض ہاشمی سے انٹرویو (کراچی، 2/اگست 2004ء)

☆64۔ کھوڑو، 1998ء، صفحہ 439-40

☆65۔ جلال، 1991ء، صفحہ 94

☆66. Minutes of Cabinet meeting, 9 September 1947, 67/CF/47, National Documentation Center, Cabinet Division, Islamabad.

☆67۔ حقانی، 2005ء، صفحہ 32

☆68۔ شفقت، 1997ء، صفحہ 31

☆69۔ Cohen، 2004ء، صفحہ 102

☆70۔ چیمہ، 2002ء، صفحہ 182
☆71۔ سر الیگزینڈر رسائمن کا خط بہ نام سر گلبرٹ لیتھ ویٹ لٹوٹ (کے لیے دیکھیے)، خان، 2002ء، صفحہ 12
☆72۔ Edward Feit، 1973ء، صفحہ 73-4
☆73۔ وسیم، 1994ء، صفحہ 145
☆74۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 9
☆75۔ Feit، 1973، صفحہ 6
☆76۔ McCulloch، 2003ء، صفحہ 96-7
☆77۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 103
☆78۔ ایضاً، صفحہ 104-5
☆79۔ شفقت، 1997ء، صفحہ 45-57
☆80۔ علوی، 1983، صفحہ 54-61
☆81۔ جلال، 1991ء، صفحہ 306-7
☆82۔ حقانی، 2005ء، صفحہ 67
☆83۔ Ziring، 1994، صفحہ 57
☆84۔ ایضاً، صفحہ 29
☆85۔ سالک، 1979، صفحہ 29
☆86۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 134
☆87۔ Ziring، 1994ء، صفحہ 69-70، مزید دیکھیے حقانی، 2005ء، صفحہ 72-4
☆88۔ امریکی قونصلیٹ (ڈھاکا)، کیبل 'Selective genocide' 28/ مارچ 1971، مزید دیکھیے امریکی سفارت خانہ (نئی دہلی)، کیبل، 'Selective genocide' 29/ مارچ 1971 اور امریکی قونصلیٹ (ڈھاکا)، کیبل، 'Killings at university' 30/مارچ 1971ء
☆89۔ Dissent from US policy toward East Pakistan, — ٹیلی گرام بہ نام اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ، اپریل 1971ء، دیکھیے:

http://www.gwu.edu/~nsarchiv/NSAEBB/NSAEBB79/ BEBB8.pdf

☆90۔ 'Policy options towards Pakistan' ہنری کسنجر کا Memorandum for the President، 28/اپریل 1971،

http://www.gwu.edu/~nsarchiv/NSAEBB/NSAEBB79/BEBB9.pdf

☆91۔ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کا کیبل، USG Expression of Concern on East Pakistan، 6/ اپریل 1971ء

☆92. Henry Tanner, 'Bhutto denounces council and walks out in tears', *New York Times*, 16/دسمبر/1971

☆93۔ Kux، 2001ء، صفحہ 203، بھٹو کو اوائل نومبر 1971ء میں چین بھیجا گیا تھا۔
☆94۔ شفقت، 1997ء، صفحہ 79

☆95۔ حقانی، 2005ء، صفحہ 7-65
☆96۔ جیمز، 1993ء، صفحہ 75
☆97۔ جلال، 1991ء، صفحہ 318
☆98۔ شفقت، 1997ء، صفحہ 118، جلال، 1991ء، صفحہ 16-314
☆99۔ علوی، 1983ء، صفحہ 52
☆100. Patrick Keatley، 'The brown bomb'، *Guardian* (Manchester)، 11 / مارچ 1965
☆101۔ خان، 1993ء، صفحہ 407
☆102۔ ایضاً، صفحہ 412
☆103۔ ایضاً، صفحہ 417
☆104۔ جلال، 1991ء، صفحہ 316
☆105۔ عبدالحفیظ پیرزادہ سے انٹرویو (اسلام آباد، جولائی 2004ء)

تیسرا باب: فوجی طبقے کا ارتقا، 1977-2005

☆1۔ عارف، 1995، صفحہ 72
☆2۔ *The News*، لاہور، 23 / اپریل 1994ء
☆3۔ Kux، 2001ء، صفحہ 238
☆4۔ حسین، 1990ء، صفحہ 15
☆5۔ ایضاً، صفحہ 22
☆6۔ ایضاً، صفحہ 32
☆7۔ ایضاً
☆8۔ نصر، 2001ء، صفحہ 7۔ ہر محلے میں ناظمِ صلوٰۃ مقرر کیے گئے تاکہ تمام مرد باجماعت نماز پڑھیں۔ اور جو نہیں پڑھتے تھے، اُن کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا اور زور زبردستی کا استعمال کیا جاتا تھا۔
☆9۔ نصر، 2001ء، صفحہ 144
☆10۔ ایضاً
☆11۔ Jacoby، 2004ء، صفحہ 178
☆12۔ دادخان، 1999ء، صفحہ 158
☆13۔ Jones، 2003ء، صفحہ 7
☆14۔ حسنین، 2005ء، صفحہ 26
☆15۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 186
☆16۔ عباس، 2005ء، صفحہ 120
☆17۔ حمید گل کے ساتھ انٹرویو، بتاریخ 15 / مئی 1994ء۔ مزید دیکھیے حقانی، 2005ء، صفحہ 201۔

☆18۔ عارف، 1995ء، صفحہ 143۔ عارف حوالہ دیتے ہیں میجر جنرل شیر علی خان کا جو جنرل یحییٰ خان کے مشیر تھے اور جنھوں نے فوج کو نجات دہندہ کے طور پر پیش کرنے کی مہم چلائی۔ بعد میں تمام فوجی آمروں نے اس مشورے پر عمل کیا۔

☆19۔ Verkaaik، 2005ء، صفحہ 87-61، 17-111

☆20۔ صدیقہ۔ آغا، 2001ء، صفحہ 145

☆21۔ نصر، 2001ء، صفحہ 7-135

☆22۔ شاہ، 2002ء، صفحہ 1-90

☆23۔ بے نظیر بھٹو (1990-1988ء اور 96-1993ء) غلام مصطفیٰ جتوئی، نگراں وزیراعظم (1990ء)، نواز شریف (93-1990ء اور 99-1997ء)، بلخ شیر مزاری، نگراں وزیراعظم (1993ء)، معین قریشی، نگراں وزیراعظم (1993ء)، اور معراج خالد، نگراں وزیراعظم (97-1996ء)۔

☆24۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 209

☆25۔ ایضاً، صفحہ 10-205

☆26۔ Bray، 1997ء، صفحہ 324۔ لیفٹیننٹ جنرل اسد درّانی نے سپریم کورٹ کو حلف نامے میں اس آپریشن کا اعتراف کیا۔

☆27۔ شاہ، 2002ء، صفحہ 109-83

☆28۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) طلعت مسعود (اسلام آباد، 6/اگست 2004ء)

☆29۔ حسین، 'Pakistan's political forces and the army'، *The Nation*، 20/مئی، 1990ء

☆30۔ http://www.pildat.org/eventsdel.asp?detid=70، Parlimentary Over sight of Security Sector کے موضوع پر ہونے والی گول میز گفتگو میں، جو پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لجسلیٹو ڈیموکریسی اینڈ ٹرانسپرنسی (PILDAT) نے منعقد کی تھی، لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) تنویر نقوی کا تبصرہ (اسلام آباد، 25/فروری 2005ء)

☆31۔ میجر جنرل راشد قریشی کے ساتھ انٹرویو (راول پنڈی، 2002ء)

☆32۔ دونیا عزیز کے ساتھ انٹرویو (اسلام آباد، 24/جولائی 2004ء)

☆33۔ رزّاق تبا کے ساتھ انٹرویو (کراچی، 3/اگست 2004ء)

☆34۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) شوکت قادر کے ساتھ انٹرویو (راول پنڈی، 31/اکتوبر 2003ء)

☆35۔ پراوین سوامی کے ساتھ گفتگو (نئی دہلی، جنوری 2006ء)

☆36۔ جواد احمد کا خط بہ عنوان 'Political women?'، *The News*، 18/اگست 2005ء، اس خط میں وزیر برائے بہبودِ خواتین کی ایڈوائزر محترمہ نیلوفر بختیار کے ٹیلی وژن کو دیے گئے انٹرویو کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا تھا جس میں انھوں نے ایسے ہی ایک ادارے کے افتتاح کا اعلان کیا تھا۔

☆37۔ آسیہ عظیم کے ساتھ انٹرویو (اسلام آباد، 28/جولائی 2004ء)

☆38۔ جسٹس ماجدہ رضوی کے ساتھ انٹرویو (اسلام آباد، 10/اگست 2004ء)

☆39۔ Ashley Tellis کے ساتھ انٹرویو (واشنگٹن ڈی سی، 11/اگست 2005ء)

☆40۔ حقانی، 2005ء، صفحہ 220, 205

☆41۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 19-210

☆42۔ Dawn کے ریزی ڈنٹ ایڈیٹر ضیاء الدین سے انٹرویو (28/نومبر 2003ء)

☆43۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 5-224

☆44۔ حقانی، 2005ء، صفحہ 237

☆45۔ ایضاً، صفحہ 43-221

☆46۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 4-192

☆47۔ وڑائچ، 2006ء، صفحہ 136

☆48۔ ایڈمرل فصیح بخاری سے انٹرویو (اسلام آباد، 6/اکتوبر 2003ء)

☆49۔ محمد شہزاد 'Musharraf had decided to topple Nawaz much before Oct 12'، *South Asia Tribune*، نمبر 12، 13-7/اکتوبر، 2002ء

☆50۔ *Daily Times* کے بیورو چیف رانا قیصر اور Dawn کے ایڈیٹر ضیاء الدین سے گفتگو (اسلام آباد، جون 2006ء)

☆51۔ 'Opposition seeks debate in senate'، *Dawn*، یکم اگست 2006ء، صفحہ 19

☆52۔ 'Pakistan urged to probe 7 reporters' deaths'، *Reuters*، 27/جولائی 2006ء

☆53۔ وسیم، 2006ء، صفحہ 71

☆54۔ http://news.bbc.co.uk/1/hi/world/south_asia/1958219.stm

☆55۔ عباس، 2005ء، صفحہ 227

☆56۔ http://news.bbc.co.uk/1/hi/world/south_asia/1958219.stm

☆57۔ ایضاً

☆58۔ وسیم، 2006ء، صفحہ 28

☆59۔ ظفر اللہ خان کے ساتھ انٹرویو (اسلام آباد، 21/جولائی 2004ء)

☆60۔ وسیم، 2006ء، صفحہ 57

☆61۔ ایضاً

☆62۔ دیکھیے ڈان، 21/دسمبر 2002ء

☆63۔ 'PPP, PML gulf can't be bridged'، *The News*، 3/جولائی 2006ء

☆64۔ 'PML will re-elect Musharraf'، *Dawn*، 8/مئی 2006ء

☆65۔ رکن قومی اسمبلی اور ق لیگ کی آسیہ عظیم کے ساتھ انٹرویو (اسلام آباد، 28/جولائی 2004ء)

☆66۔ مریم حسین، '56 govt. MNA's protest to Aziz'، *Daily Times*، 22/جون 2006ء

☆67۔ وسیم، 2006ء، صفحہ 2-31

☆68۔ 'Musharraf seeks vote for his supporters'، *Dawn*، یکم اگست 2006ء، صفحہ 3

☆69۔ 'Ministers' son beats passenger at airport'، *The News*، 11/اگست 2005ء

☆70۔ 'Law minister takes law into his hands, again'، *Peninsula*، 9/مئی 2005ء

☆71۔ ہمایوں گوہر کا مضمون بہ عنوان 'The minister, the waiter and the donkey'، *The Nation*، 25/ستمبر 2005ء

☆72۔ 'PML activists ransack Peshawar Press Club'، *The News*، 30/جون 2006ء، صفحہ 12

☆73۔ Mann، 1993ء، صفحہ 438

☆74۔ Cohen، 2004ء، صفحہ 69

☆75۔ LaPorte، 1997ء، صفحہ 121

☆76۔ معین قریشی کے ساتھ انٹرویو (واشنگٹن ڈی سی، 18/اگست 2005ء)

☆77۔ عباس، 2005ء، صفحہ 1-160

☆78۔ ایضاً، صفحہ 227

☆79۔ Banfield، 1958، صفحہ 85

☆80۔ ایضاً، صفحہ 9-178

☆81۔ شاکر حسین، 'Running scared'، *The News*، 3/اگست 2005ء

☆82۔ Kux، 2001ء، صفحہ 5-324

☆83۔ معین قریشی کے ساتھ انٹرویو (واشنگٹن، 18/اگست 2005ء)

☆84۔ رحمان، 1998ء

☆85۔ ایضاً، صفحہ 26

☆86۔ Feit، 1973، صفحہ 4

☆87۔ صدر مشرف کے آرمی چیف ہونے کے باعث انھیں اس شمار میں شامل نہیں کیا گیا۔

☆88۔ مشاہد حسین، 'All parties flirt with Pak army'، *Times of India*، 28/ستمبر 1990ء

☆89۔ Jacoby، 2004ء، صفحہ 8-145

☆90۔ حسین، دیکھیے حاشیہ نمبر 88

☆91۔ قاضی حسین احمد سے انٹرویو (لاہور، 2002ء)

☆92۔ مولانا فضل الرحمٰن سے انٹرویو (اسلام آباد، 9/مارچ 2004ء)

☆93۔ Jacoby، 2004ء، صفحہ 137

چوتھا باب: فوج کے کاروباری نظام کی تشکیل

☆1۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا خط نمبر 57/1، بہ تاریخ 20/جولائی 1978ء

☆2۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سعید قادر کے ساتھ انٹرویو (راول پنڈی 2005ء)

☆3۔ http://www.fwo.com.pk/intro.php

☆4۔ http://www.sco.gov.pk

☆5۔ دیکھیے، روزنامہ آواز (اردو اخبار)، بہ تاریخ 24/جولائی 2004ء
☆6۔ ریفرنس سپریم کورٹ آف پاکستان، کیس نمبر CP 1593/98
☆7۔ Moore، 1979ء، صفحہ 210
☆8۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 237
☆9۔ http://www.pakmart.com/fauji/intro.htm
☆10۔ Moore، 1979، صفحہ 230
☆11۔ شفقت، 1997، صفحہ 37
☆12۔ http://fauji.org.pk/industrial&commercial/industrial%20and%20 commercial%20operations.htm
☆13۔ http://www.fauji.org.pk/investment.htm
☆14۔ 2004ء میں لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد امجد فوجی فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر اور لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمود فوجی فرٹیلائزر کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔
☆15۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد امجد کے ساتھ انٹرویو (راول پنڈی، 2004ء)
☆16۔ http://fauji.org.pk/
☆17۔ ذوالفقار علی بھٹو کے وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کے ساتھ ای میل انٹرویو (18/اکتوبر 2004ء)
☆18۔ شاہین فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر ایئر مارشل (ریٹائرڈ) شاہد ذوالفقار کے ساتھ انٹرویو (اسلام آباد، 12/مئی 2000ء)
☆19۔ http:/.shaheenfoundation.com/corporate_profile.htm
☆20۔ صدیقہ۔آغا، 2003ء، صفحہ 127
☆21۔ SF sold SAI in 2004
☆22۔ Mora، 2003ء
☆23۔ ایضاً

پانچواں باب: فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا تشکیلی دور، 77-1954

☆1۔ Moore، 1979ء
☆2۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ارشد طارق کے ساتھ انٹرویو (راول پنڈی، 4/نومبر 2003ء)۔ دیگر افسران نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔
☆3۔ Lock، 2000، صفحہ 4
☆4۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) زاہد زمان سے انٹرویو (راول پنڈی، 7/اکتوبر 2003ء)
☆5۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سیّد محمد امجد سے انٹرویو (راول پنڈی، 12/اکتوبر 2003ء) اور میجر جنرل

(ریٹائرڈ) جمشید ایاز خان سے انٹرویو (اسلام آباد، 10/اکتوبر، 2003ء)

☆6۔ Moore، 1979، صفحہ 229

☆7۔ ایضاً، صفحہ 3-232

☆8۔ علوی، 1979، صفحہ 45

☆9۔ شفقت، 1997

☆10۔ ایضاً، صفحہ 9-45

☆11۔ Jacoby، 2005ء، صفحہ 5-4

☆12۔ ایضاً

☆13۔ Hale، 1994، صفحہ 174، http://www.oyakbank.com.tr/english/the_oyak_group.aso

☆14۔ Jacoby، 2005ء، صفحہ 19

☆15۔ وسیم، 1994ء، صفحہ 93

☆16۔ خان، 1967، صفحہ 50-49، 66-51

☆17۔ علوی، 1979ء، صفحہ 56

☆18۔ انٹرویو، لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) اسد درّانی (راول پنڈی، 3/نومبر 2003ء)

☆19۔ http://www.fwo.com.pk/intro.php

☆20۔ رضوی، 2003، صفحہ 5-104

☆21۔ ظہیر، 1998ء

☆22۔ خان، 1967ء، صفحہ 32

☆23۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 5-104

☆24۔ سراج الحق میمن، 'Genesis of separatist sentiment in Sindh'، *Dawn*، 23/ مارچ 2001ء، (یومِ پاکستان کا خصوصی شمارہ)

☆25۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 105

☆26۔ Feldman، 1972ء، صفحہ 6-305

☆27۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) فہیم حیدر رضوی کا انٹرویو (راول پنڈی، 9/نومبر 2003ء)

☆28۔ Jones، 2003ء، صفحہ 55

☆29۔ Ziring، 1994، صفحہ 49

☆30۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 105

چھٹا باب: فوج کی کاروباری سرگرمیوں میں توسیع، 2005-1977

☆1۔ Castro and Zamora، 2003ء، صفحہ 43

☆2۔ Hale، 1994ء، صفحہ 329

☆3۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) خالد مقبول سے انٹرویو (لاہور، 22/مارچ 2004ء)
☆4۔ سابق چیف بحریہ ایڈمرل (ریٹائرڈ) سعید محمد خان سے انٹرویو (اسلام آباد، 3/نومبر 2003ء)
☆5۔ کرنل (ریٹائرڈ) بختیار خان سے انٹرویو (کراچی، 5/مئی، 2004ء)
☆6۔ O'Donnell، 1973ء، صفحہ 87
☆7۔ نجم سیٹھی سے انٹرویو (لاہور، 17/اگست 2004ء)
☆8۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) جمشید ایاز خان سے انٹرویو (اسلام آباد، 10/اکتوبر 2003ء)
☆9۔ جوائنٹ سیکریٹری (اسٹیبلشمنٹ ڈویژن) زاہد سعید سے انٹرویو (اسلام آباد، 9/اکتوبر 2003ء)
☆10۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فیض علی چشتی سے انٹرویو (راول پنڈی، 6/نومبر 2003ء)
☆11۔ قومی اسمبلی پاکستان کے مباحث، پیر، 29/دسمبر 2003ء (دفتری رپورٹ: گیارھواں سیشن، جلد 11 میں شامل نمبر 1-4)، صفحہ 664
☆12۔ رحمان، 2004ء، صفحہ 42-72
☆13۔ میجر جنرل شوکت سلطان سے انٹرویو (راول پنڈی، 19/ستمبر 2003ء)
☆14۔ ریفرنس سی ایم ایل اے خط نمبر 57/1/CMLA، مؤرخہ 20/جولائی 1978ء
☆15۔ مشیر برائے مالیاتی امور و چیف اکاؤنٹ آفیسر پاکستان ریلوے، محمد علی سے انٹرویو (لاہور، 2/اکتوبر، 2003ء)
☆16۔ NLC at a Glance. Brief for the OIC NLC (راول پنڈی، National Logistic Cell Report، 2000ء، صفحہ 16)
☆17۔ جنرل (ریٹائرڈ) مرزا اسلم بیگ سے انٹرویو (راول پنڈی، 29/اکتوبر 2003ء)
☆18۔ شاہین کا مطلب ہے عقاب، جو PAF کے شناختی نشان کا حصہ ہے۔
☆19۔ بحریہ کا مطلب ہے سمندری فوج۔
☆20۔ ایڈمرل (ریٹائرڈ) فصیح بخاری سے انٹرویو (اسلام آباد، اگست 2004ء)، صدیقہ - آغا، 2001ء، صفحہ 6-64
☆21۔ ایڈمرل (ریٹائرڈ) طارق کمال خان سے انٹرویو (اسلام آباد، 1/نومبر 2003ء)
☆22۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) طلعت مسعود سے انٹرویو (لندن، جنوری 2000ء)
☆23۔ http://www.marigas.com.pk
☆24۔ ایضاً
☆25۔ سہیل سانگی، 'معدنی دولت، فوجی کنٹرول'، (Natural resources and the military's control) BBC urdu.com پر اردو رپورٹ، پیر، 20/جون 2005، 16:25 جی ایم ٹی، 21:25 پی ایس ٹی
☆26۔ Paes and Shaw، 2003ء، صفحہ 7-146
☆27۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) فہیم حیدر رضوی سے انٹرویو (راول پنڈی، 9/نومبر 2003ء)
☆28۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) علی جواہر سے انٹرویو (راول پنڈی، 10/نومبر 2003ء) یہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ میں کام کرنے والے پہلے افسران میں تھے۔

☆29۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) معین الدین حیدر سے انٹرویو (کراچی، 4/اگست 2004ء)
☆30۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) فہیم حیدر رضوی سے انٹرویو (راول پنڈی، 9/نومبر 2003ء)
☆31۔ ایضاً
☆32۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد امجد سے انٹرویو (راول پنڈی، 12/اکتوبر 2003ء)، جنرل امجد کو ریٹائر ہونے کے بعد فوجی فاؤنڈیشن کا چیئرمین بنایا گیا۔
☆33۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جاوید اشرف قاضی سے انٹرویو (راول پنڈی، 5/نومبر 2003ء)
☆34۔ محمد علی سے انٹرویو (لاہور، 2/اکتوبر 2003ء)
☆35۔ http://www.shaheenfoundation.com/shaheen_aero_traders.htm
☆36۔ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) شاہد ذوالفقار سے انٹرویو (اسلام آباد، 12/مئی 2000ء)
☆37۔ http://www.bahria.com.pk/page8.html
☆38۔ دیکھیے *Dawn*، 26/اکتوبر 2004ء
☆39۔ ایضاً
☆40۔ سیّد محمد علی، 'Plight of the fisher folk in Pakistan'، *Daily Times*، 14/جون 2005ء
☆41۔ *The News* کے رپورٹر ذوالفقار علی شاہ سے انٹرویو (کراچی، 31/جولائی 2004ء)
☆42۔ 'Resolution on fishermen issue disallowed'، *Dawn*، 26/نومبر 2004ء
☆43۔ نوید احمد، 'There is no plot that is free of cost no matter what the person's rank'، میجر جنرل شوکت سلطان، ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر سے انٹرویو، *Newsline*، جلد 19، نمبر 1، جولائی، 2006ء، صفحہ 32
☆44۔ کرنل (ریٹائرڈ) بختیار خان سے انٹرویو (کراچی، 5/مئی 2004ء)
☆45۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) الترمذی سے انٹرویو (لاہور، 23/مارچ 2004ء)
☆46۔ 'PAF and heroin smuggling'، *The Nation* (اداریہ)، 16/اپریل 1997ء
☆47۔ رضوی، 2003ء، صفحہ 236
☆48۔ ایضاً، صفحہ 182
☆49۔ Hale، 1994، صفحہ 174
☆50۔ سرتاج عزیز سے انٹرویو (اسلام آباد، 8/اکتوبر 2003ء)
☆51۔ ایضاً
☆52۔ الٰہی بخش سومرو سے انٹرویو (اسلام آباد، 26/جنوری 2004ء)
☆53۔ بےنظیر بھٹو سے انٹرویو (لندن، فروری 2000ء)
☆54۔ شاہ محمود قریشی سے انٹرویو (بھوربن، 13/اپریل 2004ء)
☆55۔ سابق فوجی سربراہ مرزا اسلم بیگ سے انٹرویو (راول پنڈی، 29/اکتوبر 2003ء)
☆56۔ فصیح بخاری سے انٹرویو (اسلام آباد، اکتوبر 2005ء)
☆57۔ '$1,700 Pak per capita income in real terms'، *The Nation*، 25/فروری 2000ء

☆58۔ 'Smuggling costs govt. Rs. 100 billion every year'، *Dawn*، 25/فروری 2000ء
☆59۔ طارق شفیع سے انٹرویو (کراچی، 31/جولائی 2004ء)
☆60۔ رزّاق ببّا سے انٹرویو (کراچی، 3/اگست 2004ء)
☆61۔ گورنمنٹ آف پاکستان، 2006ء، صفحہ 252
☆62۔ اسحاق ڈار سے انٹرویو (نیویارک، فروری 2004ء)
☆63۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) آغا مسعود حسن سے انٹرویو (اسلام آباد، 26/اگست 2004ء)
☆64۔ فہیم بصر، 'Army subsidiaries to collect toll on GT road'، دی نیوز، 22/دسمبر 1999ء
☆65۔ ایضاً
☆66۔ ایڈمرل فصیح بخاری سے ای میل انٹرویو (7/دسمبر 1999ء)
☆67۔ پروفیسر حسن عسکری رضوی سے گفتگو (نئی دہلی، جنوری 2006ء)
☆68۔ نثار کھوڑو سے انٹرویو (واشنگٹن ڈی سی، 2004ء)
☆69۔ 'زرداری گروپ چار ریڈیو اور ٹی وی چینل کا مالک ہے' تکبیر (اردو)، 11/جولائی 1996ء
☆70۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) بشیر باز سے انٹرویو (راول پنڈی، 23/دسمبر 1999ء)، ان فاؤنڈیشنوں میں ریٹائرڈ افسروں کی مدتِ ملازمت عام طور پر تین سال ہوتی ہے۔
☆71۔ ملک میں کوئی نجی ہیلی کاپٹر سروس نہیں کیوں کہ ان پر پابندی ہے۔
☆72۔ عسکری ایوی ایشن کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) بشیر باز سے انٹرویو (راول پنڈی، 3/دسمبر 1999ء)
☆73۔ سینیٹر ایم پی بھنڈارا سے انٹرویو (راول پنڈی، 20/جولائی 2004ء)
☆74۔ ایضاً
☆75۔ فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ پر 20 فی صد ٹیکس ہے، جب کہ بحریہ فاؤنڈیشن اور شاہین فاؤنڈیشن پر 33 فی صد
☆76۔ اسحاق ڈار سے انٹرویو (نیویارک، 2004ء)، مزید دیکھیے احمد مراد، 'Army Welfare Trust: vested khaki interests and double standards of business accountability' *The Friday Times*، 14-20/دسمبر 2001
☆77۔ سرتاج عزیز سے انٹرویو (اسلام آباد، 8/اکتوبر 2003ء)
☆78۔ Peter Lock سے ای میل گفتگو (بون، مارچ 2000ء)
☆79۔ Cockburn and St Clair، 1998، صفحہ 257
☆80۔ 'PAF and heroin smuggling'، *The Nation*، 16/اپریل 1997ء
☆81۔ Miles Jasphet، ڈائریکٹر ہولارڈ انشورنس سے انٹرویو (پری ٹوریا، 9/فروری 2000ء)
☆82۔ ایضاً
☆83۔ Dupree، 1991، صفحہ 59
☆84۔ اکرام سہگل سے انٹرویو (کراچی، 2/اگست 2004ء)
☆85۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) فہیم حیدر رضوی سے انٹرویو (راول پنڈی، 9/نومبر 2003ء)

☆86۔ رضوان قریشی، 'Malik Riaz talks tough'، *Blue Chip*، شمارہ نمبر 23، جلد 2، اپریل 2006ء، صفحہ 21-22

☆87۔ ریفرنس، سپریم کورٹ آف پاکستان، کیس نمبر CP1593/98

☆88۔ http://paknews.com/pk/main1jun-21.html

☆89۔ رضوان قریشی، 'Malik Riaz talks tough'، *Blue Chip*، شمارہ نمبر 23، جلد 2، اپریل 2006ء، صفحہ 22

☆90۔ 'DHA and Bahria Town to integrate infrastructure'، *Daily Times*، 8/اکتوبر 2006ء

☆91۔ http://fedworld.gov/cgi-bin/re...5c36&CID=C23168945312500014 3436640

☆92۔ http://www.dawn.com/2000/07/12/ebr8.htm

☆93۔ عائشہ صدیقہ، 'Military needs to reconsider its functioning'، *The Friday Times*، جلد 13، نمبر 49، 7-1/فروری 2002ء

☆94۔ http://www.nab.gov.pk/Public_info_material.asp#IMP_doc

☆95۔ عباس، 2005ء، صفحہ 187

☆96۔ سلیم الطاف سے انٹرویو (فرینکفرٹ، اپریل 2000ء)

☆97۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) اسد درّانی (راول پنڈی، 3/نومبر 2003ء)

☆98۔ کیپٹن عامر شاہ، 'Airline industry on the move'، *Dawn*، 10/مئی 2004ء

☆99۔ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) شاہد ذوالفقار سے انٹرویو (اسلام آباد، 12/مئی 2000ء)

☆100۔ ریٹائرڈ اور حاضر سروس فوجی افسروں کو ایئر لائن 50 فی صد رعایت دیتی ہے۔

☆101۔ بریگیڈیئر بشیر باز سے انٹرویو (راول پنڈی، دسمبر 1999ء)

☆102۔ آڈیٹر جنرل آف پاکستان، 2003a، صفحہ 5-6

☆103۔ بحریہ فاؤنڈیشن اور الغازی ٹریول ایجنسی کے ملازمین سے گفتگو (اسلام آباد، 2003ء)

☆104۔ جلال، 1995ء، صفحہ 143

☆105۔ http://fauji.org.pk/Industrial&Commercial/Subsidaries&AssociatedCo/FAUJI%20OIL.htm

☆106۔ جاوید بخاری، 'Strategic issues in privatization'، *Dawn*، 6/اکتوبر 2003ء

☆107۔ ایضاً

☆108۔ مالیاتی ماہر ہارون شریف سے انٹرویو (اسلام آباد، فروری 2004ء)

☆109۔ ڈان کے ایڈیٹر ضیاء الدین سے انٹرویو (اسلام آباد، 28/نومبر 2003ء)

☆110۔ عائشہ صدیقہ، 'Military needs to reconsider its functioning'، *The Friday Times*، جلد 13، نمبر 49، 7-1/فروری 2002ء

☆111۔ مدیر کے نام خط، 15/فروری 2002ء

☆112۔ مارکیٹنگ کوٹے کا انحصار پیداواری کوٹے پر ہے۔

☆113۔ احمد مراد، 'Army Welfare Trust: vest khaki interest and double standards of business accountability'، *The Friday Times*، 14-20/دسمبر 2001ء

☆114۔ اسحاق ڈار سے انٹرویو (نیویارک، 2004ء)

☆115۔ ایضاً

☆116۔ عشرت حسین سے انٹرویو (واشنگٹن ڈی سی، 6/اکتوبر 2004ء)

☆117۔ اسحاق ڈار سے انٹرویو (نیویارک، 2004ء)

☆118۔ ڈان، 2/ستمبر 2003ء

☆119۔ 'Bahria Varsity ordinance promulgated'، *Dawn*، 8/فروری 2000ء

☆120۔ سابق فوجی سربراہ جنرل (ریٹائرڈ) جہانگیر کرامت سے انٹرویو (لاہور، 12/جنوری 2004ء)، انھیں 2004ء میں امریکا میں سفیر مقرر کیا گیا۔ اُن کا خیال تھا کہ زیادہ تر سول ادارے، خاص طور پر عدلیہ میں کوئی دم خم نہیں ہے۔

☆121۔ دو فوجی افسروں سے گفتگو (اسلام آباد، 8/جولائی 2006ء)

☆122۔ '1,027 civilian posts occupied by servicemen'، *Dawn*، 3/اکتوبر 2003ء

☆123۔ پروفیسر فاروق حسنات سے انٹرویو (لاہور، 26/نومبر 2004ء)

☆124۔ وقار گیلانی، 'Army administration devastating academics, say PU teachers'، *Daily Times*، یکم اکتوبر 2004ء

☆125۔ مخدوم خورشید زمان قریشی سے انٹرویو (بہاول پور، 2004ء) بہاول پور میں یقیناً ایسا ہی تھا جہاں بہت سے سینئر فوجی افسروں کو اراضی دی گئی۔

☆126۔ ڈاکٹر اسد سعید سے انٹرویو (اسلام آباد، مارچ 2004ء)

☆127۔ 'Is Varan a legal authority?'، *The News*، 5/اکتوبر 2004ء

☆128۔ دیکھیے *Daily Times*، 30/اکتوبر 2004ء

☆129۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) آغا مسعود حسن سے انٹرویو (اسلام آباد، 2004ء)

☆130۔ Karaosmanoglu، 1993، صفحہ 33

☆131۔ احمد مراد، 'Army Welfare Trust' (دیکھیے حاشیہ نمبر 113)

☆132۔ رؤف کلاسرا، 'Army Trust in bad financial shape'، *The News*، 29/اگست 2001ء

☆133۔ احمد مراد، 'Army Welfare Trust' (دیکھیے حاشیہ نمبر 113)

ساتواں باب: نئے زمین دار

☆1۔ Kariappar، 2003ء

☆2۔ محمود اور شوکت، 1998ء، صفحہ 123

☆3۔ ایضاً،صفحہ 30

☆4۔ NAP-XI (4)/2003، پیر،29/دسمبر 2003ء

☆5۔ 'Improper use of defence lands'، *The News*، 11/اکتوبر 2004ء

☆6۔ ہارون رشید، 'بولوں کہ نہ بولوں'، اردو رپورٹ، BBC urdu.com، پیر،20/جون 2005ء، 16:05 جی ایم ٹی، 21:05 پی ایس ٹی

☆7۔ ذوالفقار گھمن، 'Army allotted land for golf course against rules'، *Daily Times*، 6/اگست 2006ء

☆8۔ Kariappar، 2003،صفحہ 18

☆9۔ شراکتی فصل میں بوائی اور کٹائی میں زمین کے مالک اور مزارعے کا آدھا آدھا حصہ ہوتا ہے۔ دونوں حصے دار آپس میں رقم کی بجائے حاصل ہونے والی فصل کوتقسیم کرتے ہیں۔ فصل کے کاروبار میں مزارعے کا اصل کام تو فصل اُٹھانے کے لیے اُس کی محنت و مشقت ہوتی ہے۔ کرایے داری میں ویسے تو عام طور سے ایک مقررہ رقم کرایے دار مالک کو طے شدہ وقت پر ادا کیا کرتا ہے۔

☆10۔ Kariappar، 2003،صفحہ 40

☆11۔ ایضاً،صفحہ 41

☆12۔ ایضاً،صفحہ 2

☆13۔ تنازعے کی وجہ سے لاگت میں اضافہ ہو جاتا ہے کیوں کہ نیم فوجی دستوں کی تعیناتی پر رقم خرچ ہوتی ہے جو فارم چلانے کی مجموعی لاگت میں جمع کی جائے تو اخراجات منافعے سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

☆14۔ 'Soiled hands: Pakistan Army's repression of the Punjab farmers' movement'، *Human Rights Watch Report*، جلد 16، نمبر 10، جولائی 2004ء،صفحہ 17

☆15۔ ہر صوبائی حکومت کا ایک ریونیو ڈپارٹمنٹ ہوتا ہے جو اراضی کا ریکارڈ رکھتا ہے اور محصول جمع کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے۔ اس ڈپارٹمنٹ میں اپیل کا اعلیٰ ترین اختیار بورڈ آف ریونیو کے پاس ہوتا ہے۔

☆16. Kariappar, 2003, p.9 Kariappar quotes Javed Aslam, member colonies, Board of Revenue, Punjab

☆17۔ ایضاً،صفحہ 15

☆18۔ ایضاً،صفحہ 5-24

☆19۔ فوج کا مؤقف آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل شوکت سلطان نے جیو ٹی وی کے پروگرام کیپٹل ٹاک میں بیان کیا تھا۔ (اگست 2003ء)

☆20۔ دیکھیے Bauer، 2003ء،صفحہ 269

☆21۔ Epstein، 1985ء،صفحہ 18-3

☆22۔ دیکھیے Bauer، 2003ء،صفحہ 269

☆23۔ http://fauji.org.pk/exp_seed.htm

☆24۔ علی، 1988ء

☆25۔ پاشا، 1998ء، صفحہ 5

☆26۔ فائنر، 1975ء

☆27۔ ایضاً، صفحہ 103

☆28۔ دیکھیے 'Land allotment to army officers'، *Dawn*، 25/جون 2003ء

☆29۔ احمد، 2006ء، صفحہ 32

☆30۔ حسین، 2002ء، صفحہ 61، مزید دیکھیے صدیقہ، 2006ء، صفحہ 21

☆31۔ رضوی، 1988، صفحہ 132

☆32۔ حکومتِ مغربی پاکستان، 1959ء، صفحہ 13-12

☆33۔ Herring، 1983ء، صفحہ 99

☆34۔ Jones، 2003ء صفحہ 33

☆35۔ حمزہ علوی، 'Authoritarianism and legitimation of state power in Pakistan', http://ourworld.compuserve.com/homepages/sangat/Power.htm

☆36۔ حسین، 2002ء، صفحہ 62

☆37۔ محمود اور شوکت، 1998ء، صفحہ 16

☆38۔ 'NA passes budget amid criticism'، *Dawn*، 18/جون 2005ء

☆39۔ ہوتی اکرام، 'Real estate lobby nips proposal for real story'، *The News*، 26/مئی، 2005ء

☆40۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فہیم حیدر رضوی سے انٹرویو (راول پنڈی، 9/نومبر 2003ء)

☆41۔ احمد، 2006، صفحہ 34

☆42۔ فاروقی، 2005ء، مزید دیکھیے راؤ، 2006ء

☆43۔ تقسیم ہند سے قبل کے دنوں میں فوجی چھاؤنیاں چار طرح کی اراضی رکھتی تھیں: دفاعی، صوبائی حکومتی، وفاقی حکومتی اور نجی۔ پہلی تین اقسام اے، بی اور سی تھیں جن کے اندر مزید درجے بھی تھے۔ یہ اقسام مختلف نوعیت کی ملکیت اور ان کے خصوصی استعمال کے لیے تھیں۔ مثلاً اے ون اراضی صرف دفاعی مقاصد کے لیے تھی۔

☆44۔ MLC ڈپارٹمنٹ کے سینئر افسروں کے مطابق چھاؤنیوں کی زیادہ تر جائیداد نجی زمین پر مشتمل ہے جو برطانوی شاہی فوج کی لیز پر تھی۔ یہ زمین مہاجروں کو دی جاسکتی تھی مگر اس کے بجائے افسروں کو منتقل کردی گئی۔

☆45۔ یاد رہے کہ زیادہ تر لیز کے معاہدے 2020ء کے آس پاس منسوخ ہوجائیں گے اور ان پر حکومتی پالیسی واضح نہیں ہے۔ اس معاملے کی جزوی پیچیدگی یہ بھی ہے کہ یہ زمینیں سویلین لوگوں کو فروخت کی جاچکی ہیں۔

☆46۔ سینیٹ سیکریٹریٹ، 2003bء صفحہ 1 سے 8

☆47۔ اعلیٰ افسروں کا مطلب ہے، جنرل سے لے کر میجر جنرل تک کے عہدے دار۔ درمیانے درجے کے افسروں میں شامل ہیں، بریگیڈیئر سے لے کر کرنل تک کے عہدے دار اور جونیئر افسروں میں شامل ہیں، لیفٹیننٹ کرنل سے لے کر کیپٹن تک کے عہدے دار۔

☆48۔ سینیٹ سیکریٹریٹ، 2003b، صفحہ 1 سے 8
☆49۔ Office of Director Audit، 1998ء
☆50۔ فرحت اللہ بابر، 'Another DHA through military fiat'، خط بہ نام مدیر The News، 27/فروری، 2005ء
☆51۔ ریاض ہاشمی سے انٹرویو (کراچی، 2/اگست 2004ء)
☆52۔ اکرام سہگل سے انٹرویو (کراچی، 2/اگست 2004ء)
☆53۔ ایضاً
☆54۔ صدیقہ، 2006a ء
☆55۔ ایضاً
☆56۔ ریاض ہاشمی سے انٹرویو (کراچی، 2/اگست 2004ء)
☆57۔ سینیٹ سیکریٹریٹ، 2003a ء، صفحہ 12
☆58۔ ڈی جی آئی ایس پی آر، میجر جنرل شوکت سلطان سے انٹرویو (راول پنڈی، 2004ء)
☆59۔ ذوالفقار گھمن، 'NA questions land deals by Musharraf and ISI DG'، Daily Times، 24/جولائی 2004ء
☆60۔ دیکھیے آڈٹ رپورٹ نمبر De/R/2001-2002/01 (اسلام آباد، Department of the Auditor-General of Pakistan، 2001/02ء)
☆61۔ ایضاً
☆62۔ قانونی لحاظ سے پابندی بعد میں لگائی جاتی ہے۔
☆63۔ کراچی کی ایک کاروباری شخصیت ناظم حاجی سے انٹرویو (کراچی یکم اگست 2004ء) اس خبر کی تصدیق ہیرلڈ کے سابق ایڈیٹر عامر علی خان نے بھی کی۔
☆64۔ 'Army demands 20,000 acres along super highway'، Star، 27/ستمبر 2000ء
☆65۔ 'Army tells Sindh govt. to give 12,000 acres'، Star، 15/اپریل، 2003ء
☆66۔ سہیل سانگی، 'جامشورو میں شورش'، اردو رپورٹ، BBC urdu.com، پیر 20/جون 2005ء، 15:15 GMT، 20:15 PST
☆67۔ طارق محمود، 'قراقرم کے نجات دہندہ'، اردو رپورٹ، BBC urdu.com، پیر، 20/جون 2005ء 16:27 GMT، 21:27 PST
☆68۔ عزیز اللہ خان، 'مارملنگ پہ زندگی تنگ'، اردو رپورٹ، BBC urdu.com، پیر، 20/جون 2005ء، 16:03 GMT، 21:03 PST
☆69۔ قیصر بنگالی، 'Perils of militarized politics'، Dawn، 3/اگست 2006ء
☆70۔ سہیل سانگی، 'بڑے میاں تو بڑے میاں'، اردو رپورٹ، BBC urdu.com، پیر، 20/جون 2005ء، 16:26 GMT، 21:26 PST
☆71۔ زرِتلافی میں زمین کی لاگت اور تعمیراتی اخراجات کا کچھ حصہ شامل ہے۔

☆72۔ رعایتی تعمیرات کو رعایتی رہائش نہیں سمجھنا چاہیے جو کہ کئی ترقی یافتہ ممالک میں بے گھر افراد کو فراہم کی جاتی ہے۔

☆73۔ قیصر بنگالی، 'Perils of militarized politics'، *Dawn*، 3/اگست 2006ء

☆74۔ صدیقہ، 2006a، صفحہ 29

☆75۔ دی نیوز، اگست 2004ء

☆76۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) خالد مقبول سے انٹرویو (لاہور، 22/مارچ 2004ء)

☆77۔ فرحت اللہ بابر، 'A DHA in Islamabad now'، *The News*، 18/فروری 2005ء

☆78۔ ایضاً

☆79۔ 1997/98ء میں بدعنوانی کے الزامات پر بحریہ کے سربراہ کی برطرفی کے بعد مختلف سودوں میں رشوتیں لینے کی خبریں آتی رہیں۔ ایسی کچھ خبریں ساؤتھ ایشیا ٹریبیون میں شائع ہوئیں۔ مثلاً دیکھیے ساؤتھ ایشیا ٹریبیون کے 30/جون 2005ء کے شمارے میں ایم ٹی بٹ کی خبر جس کے مطابق منصور الحق نے فرانسیسی سودے میں گھپلے کو دبانے کے لیے 2 کروڑ 10 لاکھ ڈالر ادا کیے۔ حکومت نے اس خبر کی تردید نہیں کی۔

☆80۔ ایم ٹی بٹ، 'How a cook unraveled a multi-billion dollar army scam in Lahore'، *South Asia Tribune*، 31/مئی 2005ء

☆81۔ جائیداد کا کاروبار کرنے والے دلّالوں اور معماروں سے انٹرویو (بہاول پور، 2004/2005ء)

☆82۔ ڈی ایچ اے حکام نے 1250 ایکڑ 2½ ارب روپے میں خریدی اور 2125 ایکڑ 8½ ارب میں۔

☆83۔ ریونیو کے افسروں سے انٹرویو۔

☆84۔ 'Rawalpindi: residents threaten to block G. T. Road'، *Dawn*، 3/فروری 2003ء

☆85۔ اسٹیٹ ایجنٹوں سے انٹرویو (لاہور، 10/اگست 2004ء)

☆86۔ جسٹس (ریٹائرڈ) میاں اللہ نواز خان سے انٹرویو (لاہور، اگست 2004ء)

☆87۔ ایاز امیر، 'Realtor's paradise'، *Dawn*، 10/دسمبر 2004ء

☆88۔ کراچی میں متعدد چھاؤنیاں ہیں۔ پہلے دی گئی تعداد میں بحریہ کی چھاؤنیاں شامل نہیں ہیں۔

☆89۔ اکرام سہگل، 'Creek City, bleak city'، *The Nation*، 2/اگست 2003ء

☆90۔ چیف ملٹری افسر لاہور چھاؤنی سے انٹرویو (لاہور، دسمبر 2004ء)

☆91۔ قدیر، 2000ء

☆92۔ 2004 YLR 629, Basharat versus CDA، (جسٹس تنویر بشیر انصاری کی عدالت میں)، رٹ پٹیشن نمبر 2524 of 2002ء، فیصلہ مؤرخہ 23/جولائی 2003ء

☆93۔ بلوچستان حکومت کے ایک سینئر افسر سے گفتگو (15/جولائی 2006ء)

☆94۔ حکومتِ سندھ 2003ء

☆95۔ رؤف کلاسرا، 'CDA explains cheap land allotement for GHQ'، *The News*، 2/فروری، 2005ء

☆96۔ احمد، 2006ء، صفحہ 8-36

☆97۔ Herring، 1983ء

☆98۔ علوی، 1976ء، صفحہ 337
☆99۔ زیدی، 1999ء
☆100۔ زیدی، 1999ء، صفحہ 38
☆101۔ ندیم سعید، 'وردی والے نمبردار'، اردو رپورٹ، BBC urdu.com، پیر، 20/ جون 2005ء
21:06 PST، 16:06 GMT
☆102۔ گزدر، 2003ء، صفحہ 3
☆103۔ اصطلاح 'ruralopis' سب سے پہلے ایک ماہر شہری منصوبہ بندی ڈاکٹر محمد اے قدیر نے استعمال کی تھی۔
☆104۔ یہ نچلے طبقے یا طوائف کا ناچ ہوتا ہے جو وہ صرف مردوں کے سامنے کرتی ہے، اسے اخلاقی گراوٹ کی علامت سمجھا جاتا ہے۔
☆105۔ درّانی، 1996ء
☆106۔ نواز آباد گاؤں کے ایک بے زمین کسان سے انٹرویو (11/ جولائی 2004ء)
☆107۔ ایضاً
☆108۔ یونس آباد گاؤں میں برادری کے سربراہ حاجی یونس سے انٹرویو (کراچی، یکم اگست 2004ء)
☆109۔ وی اے جعفری، 'Allotment of Clifton Beach'، خط بہ نام مدیر، *Dawn*، 17/ مارچ، 2005ء
☆110۔ مخدوم خورشید زمان قریشی سے انٹرویو (بہاول پور، 24/ جولائی 2004ء)
☆111۔ مشتاق گادی کے ساتھ انٹرویو (اسلام آباد، 30/ جولائی 2004ء)
☆112۔ بشیر شاہ سے انٹرویو (کراچی، 5/ اگست 2004ء)
☆113۔ سردار عطاء اللہ مینگل سے انٹرویو (کراچی، 31/ جولائی 2004ء)
☆114۔ سول اپیل نمبر 1999/30 بہ تاریخ 24/ ستمبر 2003ء
☆115۔ پاکستان نیوی کے کمانڈر سے انٹرویو (اسلام آباد مارچ 2003ء)
☆116۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) محمد سلیم سے انٹرویو (بہاول پور، 12/ اگست 2004ء)

آٹھواں باب: فوجیوں کی فلاح و بہبود

☆1۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) آغا مسعود حسن سے انٹرویو (اسلام آباد، 26/ اگست 2004ء)
☆2۔ 2004/5 کے مالی سال کے اعداد و شمار عبوری ہیں۔ فوج کی پنشن کا اوسط کوئی تیس یا اکتیس ارب روپے تک ہوگا۔ عبوری اعداد و شمار جون تک ہونے والے اخراجات کو ظاہر کرتے ہیں تاکہ مالیاتی سال کے آخر تک کو۔
☆3۔ بلقیس، 1994ء، صفحہ 51-229
☆4۔ ناصر، 2000ء، صفحہ 20-111
☆5۔ http://usfspa-lawsuit.info/mccarty-mccarty.htm
☆6۔ Wilders، nd، صفحہ 3-1
☆7۔ Asch and Warner، 1994ء

☆8۔ ایضاً
☆9۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد امجد سے انٹرویو (راول پنڈی، 12/اکتوبر 2003ء)
☆10۔ Kerans, Drover and Williams، 1988ء، صفحہ 32, 36
☆11۔ کرنل (ریٹائرڈ) بختیار خان سے انٹرویو (کراچی، 5/مئی 2004ء)
☆12۔ Kerans et al.، 1988ء، صفحہ 27-36
☆13۔ ڈاکٹر عشرت حسین سے انٹرویو (واشنگٹن ڈی سی، 6/اکتوبر 2004ء)
☆14۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) فہیم حیدر رضوی سے انٹرویو (راول پنڈی، 9/نومبر 2004ء)
☆15۔ ایضاً
☆16۔ شاہین فاؤنڈیشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر سے انٹرویو (اسلام آباد، 11/مئی 2000ء)
☆17۔ صدر پرویز مشرف کا کراچی میں DHA desalination plant کی تقریب کے موقعے پر افتتاحی خطاب
☆18۔ Yong، 2005ء، صفحہ 26
☆19۔ ایضاً
☆20۔ ایضاً، صفحہ 79
☆21۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) زاہد زمان سے انٹرویو (راول پنڈی، 7/اکتوبر 2003ء)
☆22۔ قیصر بنگالی 'Perils of militarized politics'، *Dawn*، 3/اگست 2006ء
☆23۔ Cohen، 2004ء، صفحہ 223-4
☆24۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد امجد سے انٹرویو (راول پنڈی، 12/اکتوبر 2003ء)

نواں باب: فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا خمیازہ

☆1۔ احمد مراد، 'Army Welfare Trust: vest khaki interests and double standards of business accountability'، *The Friday Times*، 14-20/دسمبر 2001ء
☆2۔ اسحاق ڈار سے فون پر انٹرویو (نیویارک، 2005ء)
☆3۔ مراد، دیکھیے حاشیہ نمبر 1
☆4۔ اسحاق ڈار، 2005ء
☆5۔ مراد: دیکھیے حاشیہ نمبر 1
☆6۔ KPMG کے ایک ذریعے سے انٹرویو (اسلام آباد، **2004ء**)
☆7۔ اس منافعے کے تناسب کو اصل منافعے اور اثاثوں کے تعلق سے لگایا جاتا ہے تاکہ مختلف شعبوں میں آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی سرمایہ کاری کی عملی کارکردگی دکھائی جاسکے۔ یہ مجموعی اثاثوں پر ماحصل مجموعی رقوم کے منافعے کو دکھاتا ہے۔ اور اس میں وسائل یا لگنے والی رقوم کے تعلق کی نشان دہی نہیں کی جاتی۔
☆8۔ جامد اثاثوں پر ماحصل کو اصل منافعے اور جامد اثاثوں کے تعلق پر لگایا جاتا ہے، جس سے جامد اثاثوں کے انتظام و استعمال کی کارکردگی ناپی جاتی ہے۔ جامد اثاثوں پر کم ماحصل کا مطلب ہے کمتر استعمال، ناقص انتظام اور

دستیاب وسائل کی بے کاری۔

☆9۔ سرمایے پر ماحصل کا سب سے قابلِ قبول پیمانہ جس سے منافعے اور لگنے والے سرمایے کے تعلق کو ناپا جاتا ہے جس میں ایکویٹی اور طویل مدت کے قرضے بھی شامل ہیں۔ سرمایے پر ماحصل یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ مالکان کی طویل مدتی رقوم اور دیگر مفاد بردار کی رقوم کس حد تک استعمال ہوئی ہیں۔

☆10۔ منافعے کا یہ تناسب اور مفاد برداروں کی ایکویٹی کے باہمی تعلق کا اظہار ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ مالکان کی رقوم پر کتنا منافع ہو رہا ہے۔

☆11۔ آڈیٹر جنرل آف پاکستان، 2003a ء، صفحہ 5-6

☆12۔ انٹرویو (راول پنڈی، دسمبر 1999ء)

☆13۔ آڈیٹر جنرل آف پاکستان، 2003a ء، صفحہ 5-6

☆14۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) جمشید ایاز خان سے انٹرویو (اسلام آباد، 10/اکتوبر 2003ء)

☆15۔ فرخ سلیم، 'Is Fauji Foundation in trouble?'، *Dawn*، 14/مئی 2001ء

☆16۔ شیر خان، 'When selling sugar mills isn't so sweet'، *The News*، 16/مئی 2005ء

☆17۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سیّد محمد امجد سے انٹرویو (راول پنڈی، 12/اکتوبر 2003ء)

☆18۔ فرحت اللہ بابر، 'When foundations are shaken'، *The News*، 23/مئی 2005ء

☆19۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سیّد محمد امجد سے انٹرویو (راول پنڈی، 12/اکتوبر 2003ء)

☆20۔ خان: دیکھیے حاشیہ نمبر 16

☆21۔ قرضے اور ایکویٹی کا تناسب کسی ادارے کے طویل مدت ادائیگی کی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے یہ تعین بھی ہو جاتا ہے کہ قرض دینے والوں کو کتنا تحفظ حاصل ہے۔ طویل مدت کے قرضوں کی ادائیگی کے تناظر میں یہ تناسب جتنا کم ہوگا، کمپنی کے قرضوں کی صورتِ حال اتنی ہی بہتر ہوگی۔

☆22۔ موجودہ اوسط آرگنائزیشن کے قلیل مدتی قرض کی ادائیگی کی اہلیت کو ظاہر کرتا ہے۔

☆23۔ سلیم: دیکھیے حاشیہ نمبر 15

☆24۔ عشرت حسین سے انٹرویو (واشنگٹن ڈی سی، 6/اکتوبر 2004ء)

☆25۔ سلیم: دیکھیے حاشیہ نمبر 15، مزید دیکھیے سلطان احمد، 'Military's sprawling business enterprises'، *Dawn*، 6/اکتوبر 2003ء

☆26۔ سلیم: دیکھیے حاشیہ نمبر 15

☆27۔ ایضاً

☆28۔ 'CE calls for improving profitability of Fauji Foundation's units'، *The News*، 2/فروری 2000ء

☆29۔ حکومتِ پاکستان، 2006ء، صفحہ 252

☆30۔ شاہین فاؤنڈیشن کے ایک ذریعے سے انٹرویو (راول پنڈی، 2004ء)

☆31۔ آڈیٹر جنرل آف پاکستان، 2003b ء، صفحہ 3-4

☆32۔ ایضاً، صفحہ 5

☆33- ایضاً، صفحہ 5-6
☆34- آڈیٹر جنرل آف پاکستان، 2003c ء، صفحہ 4-5
☆35- آڈیٹر جنرل آف پاکستان، 2003a ء، صفحہ 4
☆36- جنرل (ریٹائرڈ) مرزا اسلم بیگ سے انٹرویو (راول پنڈی، 29/ اکتوبر 2003ء)
☆37- خان، 1963ء، صفحہ 161-77
☆38- Huntington، 1996ء، صفحہ 346
☆39- Janowitz، 1964ء، صفحہ 48
☆40- حسین، 2004
☆41- حسین، 1999ء، صفحہ 15-16, 378
☆42- عشرت حسین سے انٹرویو (واشنگٹن ڈی سی، 6/ اکتوبر 2004ء)
☆43- حسین، 2004ء، صفحہ 6-7
☆44- آفتاب منظور سے انٹرویو (کراچی، 29/ جولائی 2004ء)
☆45- عباس حبیب سے انٹرویو (کراچی، 4/ اگست 2004ء)
☆46- O'Donnell، 1973ء، صفحہ 84
☆47- Stepan، 1971ء، صفحہ 12
☆48- Kochanek، 1983ء، صفحہ 70
☆49- ایضاً، صفحہ 77
☆50- شفقت، 1997ء، صفحہ 45-9
☆51- Kochanek، 1983ء، صفحہ 94, 96
☆52- رحمان، 1998ء، صفحہ 26-7
☆53- ایضاً، صفحہ 30
☆54- ایضاً، صفحہ 56-62

دسواں باب: فوج کی کاروباری سرگرمیاں اور پاکستان کا مستقبل

☆1- خالد احمد سے انٹرویو (لاہور، 17/ اگست 2004ء)
☆2- 'Air chief meets governor'، *Dawn*، 9/ اگست 2006ء
☆3- لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) طلعت مسعود سے گفتگو (اسلام آباد، 9/ اگست 2006ء)
☆4- کیپٹن (ریٹائرڈ) عرفان شہریار کی بیان کردہ کہانی (اسلام آباد، فروری 2004ء)
☆5- کیپٹن (ریٹائرڈ) عرفان شہریار سے انٹرویو (اسلام آباد، 6/ نومبر 2003ء)
☆6- http://www.nab.gov.pk/PRESS/NEW/ASP?389
☆7- اکرام سہگل سے انٹرویو (کراچی، 2/ اگست 2004ء)

☆8۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) فرخ خان سے انٹرویو (راول پنڈی، 15/اکتوبر 2003ء)
☆9۔ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمود ایل ملک، 'Scheming away'، خط بہ نام مدیر *Newsline*، جلد 19، نمبر 2 (اگست 2006ء)، صفحہ 15
☆10۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سیّد محمد امجد سے انٹرویو (راول پنڈی، 12/اکتوبر 2003ء)
☆11۔ نجم سیٹھی سے انٹرویو (لاہور، 17/اگست 2004ء)
☆12۔ انٹرویو، لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) خالد مقبول (لاہور، 22/مارچ 2004ء)
☆13۔ شہزادہ ذوالفقار، 'Changing loyalties'، *Herald*، جلد 37، نمبر 8 (اگست 2006ء)، صفحہ 7-46

حوالہ جات

Interviews

Khaled Ahmed (Lahore, 17 August 2004). Prominent journalist and editor of weekly, *The Friday Times*.

Lt.-General (rtd) Syed Mohammad Amjad (Rawalpindi, 20 September 2003 and 12 October 2003). Former MD, Fauji Foundation.

Sardar Asef Ahmed Ali (Bhurban, 13 April 2004). Former foreign minister.

Mohammad Ali (Lahore, 2 October 2003). Financial advisor and chief accounts officer, Pakistan Railways.

Makhdoom Alam Anwar (Bhurban, 13 April 2004). Member of PML-Q and National Assembly.

Asiya Azeem (Islamabad, 28 July 2004). Member of PML-Q and National Assembly.

Donya Aziz (Islamabad, 24 July 2004). Member of PML-Q and National Assembly.

Sirtaj Aziz (Islamabad, 8 October 2003). Former foreign and finance minister in Nawaz Sharif's cabinet.

Farhatullah Babur (Islamabad, 21 July 2004). Senator and member of the PPPP.

Sanaullah Baluch (Islamabad, 26 July 2004). Baluch leader and Senator.

General (rtd) Mirza Aslam Beg (Rawalpindi, 29 October 2003). Former army chief.

M. P. Bhandara (Rawalpindi, 20 July 2004). Member of PML-Q and National Assembly.

Admiral (rtd) Fasih Bokhari (Islamabad, 6 October 2003). Former naval chief.

Javed Burki (Islamabad, 23 July 2004). Former civil servant.

Lt.-General Faiz Ali Chishti (Rawalpindi, 6 November 2003). A prominent member of Zia ul Haq's government.

Lt.-General (rtd) Asad Durrani (Rawalpindi, 3 November 2003). Former head of the ISI and Pakistan's ambassador to Saudi Arabia during the Musharraf regime.

Maj.-General (rtd) Mehmood Durrani (Rawalpindi, 31 October 2003). Former chairman Pakistan Ordinance Factories, Wah. Pakistan's formar ambassador to the United States.

Azra Fazal (Islamabad, 3 November 2003). Member PPPP and National Assembly.

Abbas Habib (Karachi, 4 August 2004). President Bank Al-Habib.

Iqbal Haider (Karachi, 2 August 2004). Legal expert.

Lt.-General (rtd) Moin-u-Din Haider (Karachi, 9 August 2004). Served as cabinet minister under Musharraf.

Nazim Haji (Karachi, 29 July 2004). Business enterprenuer and social worker.

Col. (rtd) Aziz-ul-Haq (Islamabad, 4 November 2003). Director administration, Institute of Regional Studies, Islamabad.

Hamid Haroon (Karachi, 29 July 2004). Owner of Dawn group of newspapers.

Maimoona Hashmi (Islamabad, 24 July 2004). Member of PML-N and National Assembly. Her father was jailed by the Musharraf regime on the allegation of provoking conspiracy in the armed forces.

Riaz Hashmi (Karachi, 2 August 2004). Former officer of the ML&C Deparmtnet.

Maj.-General (rtd) Agha Masood Hassan (Islamabad, 26 August 2004). Appointed as DG *Pakistan Post* during the Musharraf regime.

Dr Mubashir Hassan (Islamabad, 20 September 2005). Finance minister in Zulfiqar Ali Bhutto's cabinet.

Fakhru-Din G. Ibraheem (Karachi, 30 July 2004). Former justice and currently a legal expert.

Ahsan Iqbal (Islamabad, 1 November 2003). Member PML-N and National Assembly.

Khurram Javed (Islamabad, 6 August 2004). Entrepreneur.

Air Marshal (rtd) Qazi Javed (Islamabad, 14 October 2003). Director Air University.

Brig. (rtd) Ali Jawahar (Rawalpindi, 10 November 2003). Served in the AWT.

General (rtd) Jahangir Karamat (Lahore, 12 January 2004). Former army chief.

Ishaq Khan Khakwani (Bhurban, 14 April 2004). Member PML-Q and National Assembly.

Ahmed Ali Khan (Karachi, 29 July 2004). Former editor of *Dawn.*

Col. (rtd) Bakhtiar Khan (Karachi, 5 August 2004). Manages the Defense club in Karachi.

Lt.-General (rtd) Farrukh Khan (Rawalpindi, 15 October 2003). Former CGS and chairman, AWT after his retirement.

Imran Khan (Islamabad, 9 October 2003). Member National Assembly and leader *Tehreek-e-Insaf* (Justice Party).

Maj.-General (rtd) Jamsheed Ayaz Khan (Islamabad, 10 October 2003). Head of Institute of Regional Studies, Islamabad.

Omar Ayub Khan (Bhurban, 14 April 2004). Member of National Assembly and minister of state for finance.

Admiral Saeed Mohammad Khan (Islamabad, 3 November 2003). Former naval chief.

Admiral Tariq Kamal Khan (Islamabad, 1 November 2003). Former naval chief (1983-6).

Zafarullah Khan (Islamabad, 21 July 2004). Peace and human rights activist.

Kamal Majeed-ud-Din (Karachi, 2 August 2004). Editor of *Daily Star*.

Aftab Manzoor (Karachi, 29 July 2004). President MCB Bank.

Lt.-General (rtd) Khalid Maqbool (Lahore, 23 March 2004). Governor of the Punjab from 2001 through to the time of the interview.

Lt.-General (rtd) Talat Masood (Islamabad, 6 August 2004).

Lt.-General (rtd) Kemal Matinuddin (Rawalpindi, 21 November 2003).

Sardar Ataullah Khan Mengal (Karachi, 31 July 2004). Baluch leader.

Lateef Mughal (Karachi, 4 August 2004). General secretary, People's Worker's Union.

Justice (rtd) Mina Allah Nawaz (Lahore, 18 August 2004). Former chief justice Lahore High Court.

Majeed Nizami (Lahore, 18 August 2004). Owner of English-language daily *The Nation*.

Farid Paracha (Bhurban, 14 April 2004). Member of Jamaat-I-Islami and National Assembly.

Brig. (rtd) Bashir Pawar (Bahawalpur, 12 August 2004).

Abdul Hafeez Pirzada (Islamabad, 1 May 2004). Information minister in the cabinet of Zulfiqar Ali Bhutto.

Lt.-General (rtd) Saeed Qadir (Rawalpindi, 15 October 2003). Former QMG and first head of the NLC.

Brig. (rtd) Shaukat Qadir (Rawalpindi, 31 October 2003). Former president of the Institute of Policy Research, Islamabad (IPRI).

Naveed Qamar (Bhurban, 14 April 2004). Member of the PPPP.

Feroz Qasim (Karachi, 31 July 2004). Prominent entrepreneur.

Lt.-General (rtd) Mohammad Qayyum (Rawalpindi, 14 October 2003).

Lt.-General (rtd) Javed Ashraf Qazi (Rawalpindi, 05 November 2003). Former

DG ISI and federal minister for railways, and later education under the Musharraf regime.

Raheela Qazi (Bhurban, 14 April 2004). Member of National Assembly and daughter of the head of Jamaat-I-Islami, Qazi Hussain Ahmed. Provincial minister for agriculture in Punjab after Musharraf's takeover in 1999.

Moeen Qureshi (Washington, D.C., 18 August 2005). Former caretaker prime minister.

Shah Mehmood Qureshi (Bhurban, 13 April 2004). Member of the PPPP.

Maulana Fazl-ur-Rehman (Islamabad, 21 July 2004). Member National Assembly and leader of the religious alliance, the MMA.

Sherry Rehman (Islamabad, 9 October 2003). Member PPPP and National Assembly.

Maqbool Rehmatullah (Karachi, 1 August 2004). Prominent entrepreneur.

Syed Haider Abbas Rizvi (Bhurban, 14 April 2004). Member of MQM and National Assemly.

Maj.-General (rtd) Fahim Haider Rizvi (Rawalpindi, 9 November 2003). Appointed as a senior officer in the AWT in 1984.

Justice Majida Rizvi (Islamabad, 10 August 2004).

Zahid Saeed (Islamabad, 8 October 2003). Joint secretary Establishment Division (ED). This division is responsible for the transfer and posting of all civil servants or those entering the civil service.

Maj.-General (rtd) Mohammad Saleem (Bahawalpur, 12 August 2004).

Abdul Sattar (Bhurban, 13 April 2004). Former foreign minister.

Ikram Sehgal (Karachi, 2 August 2004) Former army officer and currently a prominent entrepreneur.

Najam Sethi (Lahore, 17 August 2004). Editor of English-language newspaper *Daily Times.*

Tariq Shafee (Karachi, 31 July 2004). President of the Crescent Group of Industries.

Basheer Shah (Karachi, 5 August 2004). Agriculturist from Sindh.

Justice (rtd) Naseem Hassan Shah (Lahore, 17 August 2004). Former chief justice Lahore High Court.

Zulfiqar Ali Shah (Karachi, 31 July 2004). Journalist with English-language newspaper *The News.*

Captain (rtd) Irfan Sheyryar (Islamabad, 6 November 2003).

Brig. (rtd) A. R. Siddiqui (Karachi, 30 July 2004).

Admiral (rtd) Iftikhar Hussain Sirohey (Islamabad, 3 November 2003). Former naval chief.

Elahi Bukhsh Soomro (Islamabad, 26 January 2004). Former speaker, National Assembly.

Maj.-General Shaukat Sultan (Rawalpindi, 7 October 2003). DG, ISPR.

Brig. Tayyab Sultan (Islamabad, 13 October 2003). Director of National Accountability Bureau (NAB).

Razzak Tabba (Karachi, 3 August 2004). Prominent entrepreneur.

Brig. (rtd) Arshad Tariq (Rawalpindi, 4 November 2003).

Brig. (rtd) Al Tirmazi (Lahore, 23 March 2004). Former officer of ISI.

Fauzia Wahab (Islamabad, 30 May 2003). Member of PPPP and National Assembly.

Mohammad Waseem (Islamabad, 7 August 2004).

Kunwar Khalid Yunis (Islamabad, 21 July 2004). Member of MQM and National Assembly.

Haji Yunus (Karachi, 1 August 2004). Local representative and leader of Yunisabad.

Zahid Zaheer (Karachi, 29 July 2003). President of the Overseas Investors & Chambers of Commerce in Pakistan.

Brig. (rtd) Zahid Zaman (Rawalpindi, 7 October 2003). Head of the Armed Forces Welfare Board.

Zia-u-Din (Islamabad, 28 November 2003). Resident editor, *Dawn*.

Primary Source Documents

Government of Pakistan (2006) *Economic Survey*, 2005-06. Islamabad: Government of Pakistan.

Government of West Pakistan (1959) *Report of the Land Reforms Commission of West Pakistan*, Lahore: West Pakistan Government Press.

KPMG Report on the Accounts of the Army Welfare Trust and its Companies, 2000-01.

CMLA letter No. 57/1/CMLA dated 20 July 1978.

NLC at a Glance. Brief for the OIC NLC. Rawalpindi: National Logistic Cell Report, 2000.

National Assembly of Pakistan Debates, Monday, 29 December 2003. (*Official Report: 11th Session, VOl. XI* contains No. 1-4). NAP-XI (4)/ 2003.

'Un-starred questions and their replies', Islamabad: Senate Secretariat, Friday, 26 December 2003.

'Questions for oral answers and their replies', Islamabad: Senate Secretariat, Wednesday, 10 December 2003.

Special Audit Report on the Account of Controller of Military Accounts, 2001-02. Islamabad: Special Audit Report no. 179, Auditor-General of Pakistan, June 2003 (2003a).

Special Audit Report on the Accounts of PAF Bases Peshawar, Kohat, Mianwali, and Rafiqui, 2001-02. Islamabad: Special Audit Report no. 182, Auditor-General of Pakistan, June 2003 (2003b).

Special Audit Report on the Accounts of Cantonment Boards Clifton, Walton, Sialkot and Gujranwala, 2001-02. Islamabad: Special Audit Report no. 187, Auditor-General of Pakistan, June 2003 (2003c).

Special Study of the Issue of Military Land, Report no.A-Admn-192/SSR/97-98 by the Office of Director Audit, Defense Services, Lahore, 1998.

Audit Report no. De/R/2001-2002/01. Islamabad: Department of the Auditor-General of Pakistan, 2001/02.

2004 YLR 629. Basharat Hussain versus CDA (in the court of Justice Tanveer Bashir Ansari). writ petition No. 2524 of 2002 decided on 23 July 2003.

Civil Appeal No. 30 of 1999 dated 24 September 2003. Ref: Supreme Court of Pakistan. *Case No. CP1593/98.*

US Consulate (Dacca) cable, 'Selective genocide', 28 March 1971.

US Embassy (New Delhi) cable, 'Selective genocide', 30 March 1971 and US Consulate (Dacca) cable, 'Killings at university', 30 March 1971.

'Dissent from US policy towards East Pakistan', telegram to the State Department, April 1971. See http://www.gwu.edu/~nsarchiv/NSAEBB/NSAEBB79/BEBB9.pdf

'Policy options towards Pakistan', Henry Kissinger's Memorandum for the President, 28 April 1971: http://www.gwu.edu/~nsarchiv/NSAEBB/NSAEBB79/BEBB9.pdf.

US Department of State cable, 'USG Expression of Concern on East Pakistan', 6 April 1971.

'Case pending with the various departments of federal government ministries', working paper, Karachi: Government of Sindh, 2003.

Secondary Sources

Electronic sources

Alavi, Hamza 'Authoritarianism and legitimation of state power in Pakistan', http://ourworld.compuserve.com/homepages/sangat/Power.htm

Khan, Azizullah *'Maarmallang peh Zindagi Tung'* (life made difficult in Maarmallang). Urdu report on BBC Urdu.com, Monday 20 June 2005, 16:03 GMT, 21:03 PST.

Makinson, Larry 'Outsourcing the Pentagon: who benefits from the politics and economics of national security?' http://www.icij.org/pns/report.aspx?aid=385

Mehmood, Tariq *'Karakoram key nijat dahinda'* (the saviours of Karakoram). Urdu report on BBC Urdu.com, Monday 20 June 2005, 16:27 GMT, 21:27 PST.

Rashid, Haroon *'Boolon ke naan Boolon?'* (should I speak or should I not?). Urdu report on BBC Urdu.com, Monday 20 June 2005, 16:05 GMT, 21:05 PST.

Saeed, Nadeem 'Wardi Walley Numberdar' (uniformed numberdars). Urdu report on BBC Urdu.com, Monday 20 June 2005, 16:06 GMT, 21:06 PST.

Sangi, Sohail 'Jamshooro mein Shurish' (chaos in Jamshooro). Urdu report on BBC Urdu.com, Monday 20 June 2005, 15:15 GMT, 20:15 PST.

Sangi, Sohail 'Barrey Mian tu Barrey Mian' (like the big master). Urdu report on BBC Urdu.com, Monday 20 June 2005, 16:26 GMT, 21:26 PST.

htttp://www.shaheenfoundation.com/shaheen_aero_traders.htm

http://www.bahria.com.pk/page8.html

http://wnc.fedworld.gov/cgi-bin/re...7ej5&CID=C74224653515625015000 7556

http://paknews.com/pk/main/jun_21.html

http://fedworld.gov/cgi.bin/re...Sc36&CID=C2316894531250001 4346640

http://www.dawn.com/2000/07/12/ebr8.htm

http://www.nab.gov.pk/Public_info_material.asp#IMP_doc

http://fauji.org.pk/Industrial&Commercial/Subsidiaries&AssociatedCo/FAUJI%20OIL.htm

http://fauji.org.pk/exp_seed.htm

http://usfspa-lawsuit.info/mccarty-mccarty.htm

Newspaper articles

Ahmed, Naveed 'The mother of all complexes', *Newsline,* Vol. 19, no. 01, July 2006.

Ali, Syed Mohammad 'Plight of the fisher folk in Pakistan', *Daily Times,* 14 June 2005.

Amir, Ayaz 'Realtor's paradise', *Dawn,* 10 December 2004.

Babur, Farhatullah 'Another DHA through military fiat', Letter to the editor, *The News,* 27 February 2005

Babur, Farhatullah 'A DHA in Islamabad now', *The News,* 18 February 2005.

Babur, Farhatullah 'When foundations are shaken', *The News,* 23 May 2005.

Basar, Faheem 'Army subsidiaries to collect toll on GT road', *The News,* 22 December 1999.

Bengali, Kaisar 'Perils of militarized politics', *Dawn,* 3 August 2006.

Bokhari, Jawaid 'Strategic issues in privatization', *Dawn,* 6 October 2003.

Farooqi, Monem 'Housing needs turning into serious problem', *The Nation,* 18 March 2005.

Gauhar, Hamayun 'The minister, the waiter and the donkey', *The Nation,* 25 October 2005.

Ghuman, Zulfiqar 'Army allotted land for golf course against rules', *Daily Times,* 6 August 2006.

Ghuman, Zulfiqar 'NA questions land deals by Musharraf and ISI DG', *Daily Times,* 24 July 2004.

Gillani, Waqar 'Army administration devasting academics, say PU teachers', *Daily Times,* 1 October 2004.

Hoti, Ikram 'Real estate lobby nips proposal for real story', *The News,* 26 May 2005.

Hussain, Maryam '56 govt. MNA's protest to Aziz', *Daily Times,* 22 June 2006.

Hussain Mushahid 'All parties flirt with Pak army', *Times of India,* 28 September 1990.

Hussain, Mushahid 'Pakistan's political forces and the army', *The Nation,* 20 May 1990.

Hussain, Shakir 'Running scared', *The News,* 3 August 2005.

Keatley, Patrick 'The brown bomb', *Guardian* (Manchester), 11 March 1965.

Khan, Sher 'When selling sugar mills isn't so sweet', *The News,* 16 May 2005.

Klasra, Rauf 'Army trust in bad financial shape', *The News,* 29 August 2001.

Klasra, Rauf 'CDA explains cheap land allotment for GHQ', *The News,* 2 February 2005.

Lancaster, John 'Pakistanis question perks of power', *Washington Post,* 22 November 2002.

Malik, Lt.-Colonel (rtd) Mahmood L. 'Scheming away', *Newsline,* letter to the editor, Vol. 19, no. 2, August 2006.

Memon, Sirajul Haque 'Genesis of separtist sentiment in Sindh', *Dawn,* 23 March 2001 (Pakistan Day Special Issue).

Murad, Ahmed 'Army welfare trust: vest khaki interests and double standards of business accountability', *The Friday Times,* 14-20 December 2001.

Rao, Ishtiaq 'Pakistan lacks need oriented housing policy', Pakistan Observer, 8 July 2006.

Saleem, Farrukh 'Is Fauji Foundation in trouble?', *Dawn,* 14 May 2001.

Sehgal, Ikram 'Creek city, bleak city', *The Nation,* 2 August 2003.

Shah, Capt. Aamir 'Airline industry on the move, *Dawn,* 10 May 2004.

Shehzad, Mohammad 'Musharraf had decided to topple Nawaz much before Oct 12', *South Asia Tribune,* no. 12, 7-13 October 2002.

Siddiqa, Ayesha 'Military needs to reconsider its functioning', *The Friday Times,* Vol. 13, no. 49, 1-7 February 2002.

Tanner, Henry 'Bhutto denounces council and walks out in tears', *New York Times,* 16 December 1971.

Zulfiqar, Shahzada 'Changing loyalties', *Herald,* Vol. 37, no. 8, August 2006.

The News, Lahore, 23 April 1994.

'Zardari Group controls 4 radio, TV channels', *Takbeer* (Urdu), 11 July 1996.

'PAF and heroin smuggling', *The Nation,* editorial, 16 April 1997.

'CE calls for improving profitability of Fauji Foundation's units', *The News,* 2 February 2000.

'Bahria Varsity ordinance promulgated', *Dawn,* 8 February 2000.

'$1,700 Pak per capita income in real terms', *The Nation,* 25 February 2000.

'Smuggling costs govt Rs 100 billion every year', *Dawn,* 25 February 2000.

'Army demands 20,000 acres along super h'way, *Star,* 27 October 2000.

Dawn, 21 December 2002.

'Army tells Sindh govt. to give 12,000 acres', *Star,* 15 April 2003.

'Land allotment to army officers', *Dawn,* 25 June 2003.

'1,027 civilian posts occupied by servicemen', *Dawn,* 3 October 2003.

Daily *Awaz* (Urdu paper), 24 July 2004.

Dawn, 26 October 2004.

'Is Varan a legal authority?', *The News,* 5 October 2004.

'Improper use of defence lands', *The News,* 11 October 2004.

'Resolution on fishermen issue disallowed', *Dawn,* 26 November 2004.

'Law minister takes law into his hands, again', *The Peninsula,* 9 May 2005.

'NA passes budget amid criticism', *Dawn,* 18 June 2005.

'Minister's son beats passenger at airport', *The News,* 11 August 2005.

'PPP, PML gulf can't be bridged', *The News,* 3 July 2006.

'Pakistan urged to probe 7 reporters' deaths', *Reuters,* 27 July 2006.

PML will re-elect Musharraf', *Dawn,* 8 May 2006.

'Opposition seeks debate in senate', *Dawn,* 1 August 2006.

'Musharraf seeks vote for his supporters', *Dawn,* 1 August 2006.

'PML activists ransack Peshawar Press Club', *The News,* 30 June 2006.

Journal articles

Ahmed, Naveed (2006) 'There is no plot that is free of cost no matter what the person's rank: interview of Major General Shaukat Sultan, DG, ISPR', *Newsline,* Vol. 19, no. 1, July.

Bauer, Christopher A. (2003) 'Government takings and constitutional guarantees: when date of valuation statutes deny just compensation', *Brigham Young University Law Review 2003,* no.1.

Bilquees, Faiz (1994) 'Real wages of the federal government employees: trends from 1977-78 to 1991-92', *Pakistan Development Review,* Vol. 33, no. 3, Autumn.

Bray, John (1997) 'Pakistan at 50: a state in decline', *International Affairs,* Vol. 73, no. 2, April.

Krasner, Stephen D. (1984) 'Approaches to the state: alternative conceptions and historical dynamics' (review article), *Comparative Politics,* January.

LaPorte, Robert Jr. (1997) 'Pakistan in 1996: starting over again', *Asian Survey,* Vol. 37, no. 2, February.

Mora, Frank O. (2003) 'Economic reform and the military: China, Cuba and Syria in comparative perspective', *International Journal of Comparative Sociology,* Vol. 44, no. 2.

Nasir, Zafar Mueen (2000) 'Earnings differential between public and private sectors in Pakistan', *Pakistan Development Review,* Vol. 39, no. 2, Summer.

Qadeer, Mohammad A. (2000) 'Ruralopolises: the spatial organization and residential land economy of high-density rural regions in South Asia', *Urban Studies,* Vol. 37, no. 9, pp. 1583-1603.

Qureshi, Rizwan (2006) 'Malik Riaz talks tough', *Blue Chip,* Vol. 23, no.2, April.

Redlich, Fritz 'The German military enterpriser and his work force: a study in European economic and social history', *Vieteljahreschrift fur Sozial-und Wirtschaftsgeschichte,* II.

Schmitter, Philippe C. (1974) 'Still the century of corporatism?', *Review of Politics,* Vol. 36, no. 1, pp. 85-131.

Siddiqa, Ayesha (2006a) 'General figures: how much is a General worth in real estate terms?', *Newsline,* Vol. 19, no. 1, July.

Siddiqa, Ayesha (2006b) 'The new land barons', *Newsline,* Vol. 19, no. 01, July, p. 21.

Werve, Jonathan (2004) 'Contractors write the rules', *Public I,* Vol. 10, no. 3, July. http://www.icij.org/wow/docs/contractorsbattlefield.pdf

Papers and reports

Asch, Beth J. and Warner, John T. (1994) 'A policy analysis of alternative military retirement systems', RAND report MR-465-OSD, Santa Monica: RAND Corporation.

Gazdar, Harris (2003) 'The land question', paper written for Department for International Development (DFID), UK, 4 December.

Hasnain, Zahid (2005) 'The politics of service delivery in Pakistan: political parties and the incentives of patronage, 1988-1999. 'World Bank Report No. SASPR-6, May.

Holmqvist, Caroline (2005) 'Private security companies the case of regulation', Stockholm: SIPRI Policy Paper no. 9, January.

Human Rights Watch (2004) 'Soiled hands: Pakistan Army's repression of the Punjab Farmer's Movement', *Human Rights Watch Report,* Vol. 16, no. 10, July.

Hussain, Hamid (2002) 'Armed forces and land policy', paper presented at a conference on 'Sindh, the water crisis and the future of Pakistan', organized by the World Sindhi Institute in Washington, D.C., 9 November.

Hussain, Ishrat (2004) 'Pakistan's economic progress since 2000: false dawn or promising start?' paper presented at a seminar at SAIS, Johns Hopkins University, 6 October.

Jacoby, Tim (2005) 'For the people, of the people and by the military: the regime structure of modern Turkey', paper written for the Institute of Development Policy and Management, University of Manchester.

Kariappar, Ayesha Salma (2003) 'The tenant's movement on the Okara military farm', paper submitted at the Lahore University of Management Sciences, Lahore.

Klebnikov, Paul (2003) 'Milionaire mullahs', *Forbes,* Vol. 172, no. 2, 21 July 2003.

Lock, Peter (2000) 'Exploring the changing role of the military in the economy', paper presented in Jakarta at a conference on 'Soldiers in Business: The Military as an Economic Player', 16-19 October.

McCulloch, Lesley (2005) 'Aceh: then and now', report, Minority Rights Group International, April.

Mora, Frank O. (2002) 'A comparative study of civil-military relations in Cuba and China: the effects of Bingshang', *Armed Force and Society,* Vol. 28, no. 2, Winter.

Narli, N. (2000) 'Civil-military relations in Turkey', *Turkish Studies,* no. 1.

Peri, Yorum (2002) 'The Israeli military and Israel's Palestinian policy: from Oslo to the Al Aqsa intifada', Washington, D. C., USIP report. *Peaceworks,* no. 47, November.

Roulleau, Eric (2000) 'Turkey's dream of democracy', *Foreign Affairs,* Vol. 79, no. 6, November/December.

Wilders, Malcolm 'Army welfare', report of the Office of Population Census and Surveys, Social Survey Division, UK.

Books

Abbas, Hassan (1979) 'The state in postcolonial societies: Pakistan and Bangladesh', in Harry Goulbourne (ed.), *Politics and State in the Thrid World,* Hong Kong: Macmillan.

Abbas, Hassan (2005) *Pakistan's Drift into Extremism,* New York. M.E. Sharpe.

Alavi, Hamza (1976) 'Rural elite and agricultural development in Pakistan', in R. D. Stevens, Hamza Alavi and Peter Bertocci (eds), *Rural Development in Pakistan and Bangladesh,* Hawaii: University of Hawaii Press.

Alavi, Hamza (1982a) 'The structure of peripheral capitalism', in Hamza Alavi and Teaedor Shanin (eds), *Sociology of Developing Societies,* New York: Monthly Review Press, pp. 172-91.

Alavi, Hamza (1982b) 'State and class under peripheral capitalism', in Hamza Alavi and Teaedor Shanin (eds) *Sociology of Developing Societies,* New York: Monthly Review Press, pp. 296-99.

Alavi, Hamza (1983) 'Class and state', in Hassan Gardezi and Jamil Rashid (eds) *Pakistan the roots of dictatorship,* London: Zed Press.

Ali, Imran (1988) *Punjab Under Imperialism,* 1885-1947, New Jersey: Princeton University Press.

Arif, Khalid, Mahmud (1995) *Working with Zia,* Karachi: Oxford University Press.

Banfield, Edward C. (1958) *The Moral Basis of a Backward Society,* New York: Free Press

Brommelhorster, Jorn and Paes, Wolf-Christian (eds) (2003) *The Military as an Economic Actor: Soldiers in business,* Basingstoke: Palgrave.

Callahan, Mary P. (2003) *Making Enemies: War and state building in Burma,* Ithaca: Cornell University Press.

Castro, Arnoldo Brenes and Zamora, Kevin Casas (2003) 'Soldiers as businessmen: the economic activities of Central America's militaries', in

Jorn Brommelhorster and Wolf-Christian Paes, *The Military as an Economic Actor: Soldiers in business,* Basingstoke: Palgrave.

Cheema, Pervez Iqbal (2002) *The Armed Forces of Pakistan,* Karachi: Oxford University Press.

Cloughly, B. (1999). *The History of Pakistan Army,* Karachi: Oxford University Press.

Cockburn, Alexander and St. Clair, Jeffrey (1998) *Whiteout: The CIA, drugs and the press,* London: Verso.

Cohen, Stephen P. (2004) *The Idea of Pakistan,* Washington, D. C.: Brookings Institution.

Crefeld, M. van (1977) *Supplying War: Logistics from Wallenstein to Patton,* Cambridge: Cambridge University Press.

Crouch, Harold (1978) *The Army and Politics in Indonesia,* Ithaca.

Dahl, R. (1961) *Who Governs? Democracy and power in an American city,* New Haven, Conn. Yale University Press.

Dauvergne, Peter (1998) 'Weak states and the environment in Indonesia and the Soloman Islands', in Peter Dauvergne (ed.), *Weak and Strong States in Asia-Pacific Societies,* Australia: Allen and Unwin.

Davis, James R. (2002) *Fortune's Warriors: Private armies and the new world order,* Canada: Douglas & McIntyre.

Dupree, Louis (1991) 'Pakistan and the Afghan problem', in Craig Baxter and Syed Raza Wasti, *Pakistan Authoritarianism in the 1980s,* Lahore: Vanguard.

Durrani, Tehmina (1996) *My Feudal Lord,* London: Corgi Adult.

Epstein, Richard A. (1985) *Takings,* Boston, Mass: Harvard University Press.

Feaver, Peter D. (2003) *Armed Servants Agency, Oversight, and Civil-Military Relations,* Boston, Mass.: Harvard University Press.

Feit, Edward (1973) *The Armed Bureaucrats,* Boston: Houghton Mifflin.

Feldman, Herbert (1972) *From Crisis to Crisis: Pakistan 1962-69,* Karachi: Oxford University Press.

Finer, Sameul E. (1975). 'State and nation-building in Europe: the role of the army', in Charles Tilly (ed.), *The Formation of National States in Western Europe,* New Jersey: Princeton University Press.

Government of Pakistan (2006) *Pakistan Economic Survey, 2005-06,* Islamabad: Government of Pakistan.

Greetz, Clifford (1981) *Negara: The theatre state in nineteenth century Bali,* Princeton, N.J.: Princeton University Press.

Grindle, Merilee S. (1996) *Challenging the State: Crisis and innovation in Latin America and Africa,* Cambrige: Cambridge University Press.

Hale, William (1944) *Turkish Politics and the Military,* London: Routledge.

Halpern, Manfred (1963) *The Politics of Social Change in the Middle East and North Africa,* Princeton, N. J.: Princeton University Press.

Haqqani, Hussain (2005) *Pakistan Between Mosque and Military,* Washington, D.C. Carnegie Endowment for International Peace.

Herring, Ronald J. (1983) *Land to the Tiller,* New Haven: Yale University Press.

Hobsbawm, Eric (2000) *Bandits,* New York: New Press.

Holsti, Kalevi J. (1996) *The State, War, and the State of War,* Cambridge: Cambridge University Press.

Huntington, Samuel P. (1996) *Political Order in Changing Societies,* New Haven, Conn.: Yale University Press.

Huser, Herbert C. (2002) *Argentine Civil-Military Relations From Alfonsin to Menem,* Washington, D. C.: National Defense University Press.

Hussain, Mushahid (1990) *Pakistan's Politics: The Zia years,* Lahore: Progressive Publishers.

Jacoby, Tim (2004) *Social Power and the Turkish State,* London: Frank Cass.

Jalal, Ayesha (1991) *State of Martial Rule,* Lahore: Vanguard Books, Pakistan edition.

Jalal, Ayesha (1995) *Democracy and Authoritarianism in South Asia: A comparative historical perspective,* Cambridge: Cambridge University Press.

James, Sir Morrice (1993) *Pakistan Chronicle,* Karachi: Oxford University Press.

Janowitz, Morris (1964) *The Military in the Political Development of New Nations,* Chicago: University of Chicago Press.

Janowitz, Morris (1971) 'The comparative analysis of Middle Eastern military institutions', in Morris Janowitz and J. Van Doorn (eds), *On Military Intervention,* Rotterdam: Rotterdam University Press.

Joffe, Ellis (1997) 'Party-army relations in China: retrospect and prospect' in David Shambaugh and Richard H. Yang, *China's Military in Transition,* New York: Oxford University Press.

Jones, Philip E. (2003) *The Pakistan People's Party Rise to Power,* Karachi: Oxford University Press.

Karaosmanoglu, A. (1993) 'Officers: westernization and democracy, in M. Heper, A. Oncu and H. Kramer (eds), *Turkey and the West,* London: IB Taurus.

Kerans, Patrick, Drover, Glenn and William, David (1988) *Welfare and Worker Participation,* New York: St. Martin's Press.

Khan, Ayub (1967) *Friends not Masters,* Karachi: Oxford Univeristy Press.

Khan, major General (rtd) Fazal Muqeem (1963) *The Story of the Pakistan Army,* Karachi: Oxford University Press.

Khan, Gul Hassan (1993) *Memoirs of Lt. Gen. Gul Hassan Khan,* Karachi: Oxford University Press.

Khan, Lt.-General Jahan Dad (1999) *Pakistan Leadership Challenges,* Karachi: Oxford University Press.

Khan, Roedad (ed.) (2002) *The British Papers: Secret and confidential India, Pakistan, Bangladesh documents 1958-69,* Karachi: Oxford University Press.

Khuhro, Hamida (1998) *Mohammad Ayub Khuhro: A life of courage in politics,* Lahore: Ferozsons.

Kinzer, Stephen (2001) *Cresent & Star: Turkey between two worlds,* New York: Farrar, Straus and Giroux.

Kochanek, Stanley A. (1983) *Interest Groups and Development: Business and politics in Pakistan,* Delhi: Oxford University Press.

Kux, Dennis (2001) *The United States and Pakistan 1947-2000: Disenchanted allies,* Baltimore, Md.: Johns Hopkins University Press.

Lane, Frederic C. (1979) *Profits from Power,* Albany, N. Y.: State University of New York Press.

Lasswell, Harold (1958) *Politics: Who gets what, when, how,* Cleveland: World Publishing.

Levi, Margaret (2002) 'The state of the study of the state', in Ira Katznelson and Helen V. Milner (eds), *Political Science: State of the discipline,* New York: W. W. Norton.

Linz, Juan (1978) *Breakdown of Democratic Regimes: Latin America,* Baltimore, Md.: John Hopkins University Press.

Malloy, James (ed.) (1977) *Authoritarianism and Corporatism in Latin America,* Pittsburgh: University of Pittsburgh Press.

Malloy, James, Chalmers, Doughlas, Newton, Ronald, Schmitter, Philippe, Stepan, Alfred and Grindle, Merilee S. (1996) *Challenging the State. Crisis and innovation in Latin America and Africa,* Cambridge: Cambridge University Press.

Mann, Michael (1993) *Sources of Social Power,* Vol. 2, Cambridge: Cambridge University Press.

Mares, David R. (1998) 'Civil-military relations, democracy, and the regional neighborhood', in David R. Mares (ed.), *Civil-Military Relations,* Boulder, Colo.: Westview Press.

McCulloch, Lesley (2003) 'Trifungsi: the role of Indonesian military in politics',

in Jorn Brommelhorster and Wolf-Christian Paes (eds), *The Military as an Economic Actor: Soldiers in business*, Basingstoke: Palgrave.

Mehmood, Shaukat and Nadeem, Shaukat (1998) *Land Acquisition Laws* (fourth revised and enlarged edition), Lahore: Legal Research Center.

Migdal, Joel S. (1988) *Strong Societies and Weak States*, Princeton, N. J.: Princeton University Press.

Migdal, Joel S. (2001) *State in Society*, Cambridge: Cambridge University Press.

Moore, Raymond A. Jr. (1979) *Nation Building and the Pakistan Army*, 1947-1969, Lahore: Aziz.

Mulvenon, James (2001) *Soldiers of Fortune*, New York: M. E. Sharpe.

Nandy, Ashis (2003) *The Romance of the State and the Fate of Dissent in the Tropics*, New Delhi: Oxford University Press.

Nasr, Seyyed Vali Reza (2001) *Islamic Leviathan: Islam and the making of state power*, New York: Oxford University Press.

Nordlinger, Eric (1977) *Soldiers in Politics: Military coups and governments*, N.J.: Prentice-Hall.

Nordlinger, Eric (1981) *On the Autonomy of the Democratic State*, Boston, Mass.: Harvard University Press.

O'Donnell, Guillermo A. (1973) *Modernization and Bureaucratic Authoritarianism: Studies in South American politics*, Berkeley: University of California Press.

Olson, Mancur (2000) *Power and Prosperity*, New York: Basic Books.

Paes, Wolf-Christian and Shaw, Timothy M. (2003) 'Role of entrepreneurial armed forces in Congo-Kinshasa', in Jorn Brommelhorster and Wolf-Christian Paes (eds), *The Military as an Economic Actor: Soldiers in business*, Basingstoke, Palgrave.

Pasha, Mustafa Kamal (1988) *Colonial Political Economy*, Karachi: Oxford University Press.

Perlmutter, Amos (1974) *Egypt: The praetorian state*, New Brunswick: Transaction Books.

Perlmutter, Amos (1977) *The Military in Politics in Modern Times*, New Haven, Conn.: Yale University Press.

Perlmutter, Amos (1981) *Modern Authoritarianism*, New Haven, Conn.: Yale University Press.

Perlmutter, Amos and Bennett, Valerie Pla·e (eds) (1980) *The Political Influence of the Military*, New Haven, Conn.: Yale University Press.

Poggi, Gianfranco (1978) *The Development of the Modern State*, Standford, Calif.: Standford University Press.

Redlich, Fritz (1964) *The German Military Enterpriser and His Work Force: A study in European social economic history,* 2 vols, Wiesbaden.

Rehman, Shahid ur (1998) *Who Owns Pakistan?* privately published, May.

Rehman, Tariq (2004) *Denizens of Alien World: A Study of education, inequality and polarization in Pakistan,* Karachi: Oxford University Press.

Rizvi, Hasan-Askari (2003) *Military, State and Society in Pakistan,* Lahore, Sang-e-Meel Publication.

Robinson, William I. (1996) *Promoting Polyarchy: Globalization, US intervention and hegemony,* Cambridge: Cambridge University Press.

Salik, Sadiq (1979) *Witness to Surrender,* Karachi: Oxford University Press.

Schmitter, Philippe C. (1978) 'Reflections on Mihail Manoilescu and the political consequence of delayed-dependent development on the periphery of Western Europe', in Kenneth Jowitt (ed.), *Social Change in Romania, 1860-1940: A debate on development in a European nation,* Berkeley, Calif.: University of California Press.

Shafqat, Saeed (1997) *Civil-Military Relations,* Boulder, Colo.: Westview Press.

Shah, Dr Justice Nasim Hassan (2002) *Memoirs and Reflections,* Islamabad: Alhmara.

Siddiqa-Agha, Ayesha (2001) *Pakistan's Arms Procurement and Military Buildup,* 1979-99: *In search of a policy,* Basingstoke: Palgrave.

Siddiqa-Agha, Ayesha (2003) 'Power, perks, prestige and privileges: military's economic activities in Pakistan', in Jorn Brommelhorster and Wolf-Christian Paes (eds), *The Military as an Economic Actor: Soldiers in business,* Basingstoke: Palgrave.

Siddiqi, Abdurrahman (1996) *The Military in Pakistan, Image and reality,* Lahore: Vangaurd.

Singer, P. W. (2004) *Corportate Warriors: The rise of the privatized military industry,* Cornell: Cornell University Press.

Skowronek, Stephen (1982) *Building a new American State: The expansion of national administrative capacities,* New York: Cambridge University Press.

Stepan, Alfred (1971) *The Military in Politics: Changing patterns in Brazil,* Princeton, N. J.: Princeton University Press.

Stepan, Alfred (1988) *Rethinking Military Politics,* Princeton, N. J.: Princeton University Press.

Tilly, Charles (1985) 'War making and state making as organized crime', in Peter Evans, Dietrich Reuschemeyer and Theda Skocpol, *Bringing the*

State Back In, Cambridge: Cambridge University Press.

Tilly, Charles (1992) *Coercion, Capital and European States,* Oxford: Blackwell.

Van de Walle, Nicolas (2001) *African Economics and the Politics of Permanent Crisis, 1979-99,* Cambridge: Cambridge University Press.

Verkaaik, Oskar (2005) *Migrants and Militants: Fun and urban violence in Pakistan,* New Delhi: Manas.

Warraich, Sohail (2006) *Ghaddar Kaun Nawaz Sharif Ki Kahani Un Ke Apni Zabani (Who's the Traitor? The Story of Nawaz Sharif in his Own Words),* Lahore: Sagar.

Waseem, Mohammad (1994) *Politics and the State in Pakistan,* Islamabad.

Waseem, Mohammad (2006) *Democratization in Pakistan: A study of the 2002 elections,* Karachi: Oxford University Press.

Weaver, Jerry L. (1973) 'Assessing the impact of military rule: alternative approaches', in Philippe C. Schmitter (ed.), *Military Rule in Latin America: Functions, consequences and perspectives,* California: Sage.

Wintrobe, Ronald (2000) *The Political Economy of Dictatorship,* Cambridge: Cambridge University Press.

Yong, Tan Tai (2005) *The Garrison State,* Lahore: Vanguard.

Zaheer, Hassan (1998) *The Times and Trials of the Rawalpindi Conspiracy, 1951: The first coup attempt in Pakistan,* Karachi: Oxford University Press.

Zaidi, S. Akbar (1999) *Issues in Pakistan's Economy,* Karachi: Oxford University Press.

Ziring, Lawrence (1994) *Bangladesh from Mujib to Ershad An interpretive study,* Dhaka: University Press, reprint.

اشاریہ

ش

ص

ض

ظ

ع

غ

ف

ق

گ

ل

ناظر محمود پچھلے پچیس سال سے قلم کاری اور تعلیم کے شعبوں سے وابستہ ہیں۔ 1988 سے 1993 تک روزنامہ جنگ میں حالاتِ حاضرہ پر مضامین لکھتے رہے۔ انگریزی صحافت میں روزنامہ ڈان، فائی نینشل پوسٹ اور ماہنامہ تھرڈ ورلڈ سے منسلک رہ چکے ہیں۔ اب تک کوئی دس کتابوں کے ترجمے کیے جن میں اسٹیون ہاکنگ کی مشہور کتاب کا ترجمہ ''وقت کا سفر'' کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

تدریس کے فرائض آئی بی اے کراچی اور ہمدرد یونی ورسٹی میں انجام دیتے رہے ہیں۔ یونی ورسٹی آف لیڈز سے ایم ایڈ اور یونی ورسٹی آف برمنگھم سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اسلام آباد منتقل ہو گئے جہاں UNDP کے علاوہ دیگر ترقیاتی اور تعلیمی اداروں کو خدمات فراہم کرتے رہے ہیں۔

''عائشہ صدیقہ نے تمام تر حوصلہ شکن رکاوٹوں کے باوجود اور فوجی بالادستی کی حامل ایک آمادۂ پیکار قومی سلامتی کی ریاست کے مقابل ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کی کتاب ہر اُس شخص کے لئے ایک بنیادی متن کی حیثیت رکھے گی جو یہ جاننا چاہتا ہو کہ باوجود ایک آئین، پارلیمنٹ اور عدلیہ کی موجودگی کے، پاکستان گھسٹ گھسٹ کر چلنے پر کیوں مجبور ہے۔ یہ کتاب ہمیں صرف یہی نہیں بتاتی کہ فوج پاکستان کی سیاست و معیشت پر مختلف زاویوں سے کیوں مسلط ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ اس تسلط کو قائم کیسے کئے ہوئے ہے۔''

خالد احمد

''بیسویں صدی جہاں سائنسی ایجادات و انکشافات، دو عظیم جنگوں اور قومی آزادی کی تحریکوں کی صدی تھی، وہیں اس صدی کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں فوجی انقلابات کا تجربہ ہوا۔ خاص طور سے لاطینی امریکہ اور افریقہ میں اقتدار پر فوج کا قبضہ ایک مستقل رجحان کی حیثیت اختیار کر گیا۔ جنوبی ایشیا میں پاکستان چار مرتبہ فوجی اقتدار کا مرکز بنا۔

عالمی سطح پر سیاست میں فوج کا عمل دخل اتنا بڑھا کہ ماہرینِ سیاسیات نے اس کو تحقیق کے ایک مستقل مضمون کے طور پر منتخب کر لیا لیکن اس حوالے سے بیشتر سیاسی ادب فوج کے اقتدار میں آنے اور اِس کے سیاسی اقتدار کے دوران کے رجحانات ہی کا احاطہ کرتا رہا۔ البتہ اِدھر پچھلے دو تین عشروں سے سیاسی وسماجی علوم کے ماہرین فوجی اقتدار کے اقتصادی محرکات اور مضمرات پر بھی غور کرنے پر مائل ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے 'فوجی اقتدار کی سیاسی معیشت' بجائے خود ایک اہم موضوع بن گیا ہے جس پر بڑا فکر انگیز لٹریچر وجود میں آیا ہے۔ اس تناظر میں پاکستان کے حوالے سے ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کی کتاب ایک بہت اہم تحقیق اور ایک بہت بڑے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے پہلی مرتبہ پاکستان کی معیشت میں فوج کے عمل دخل اور اس کے اقتصادی مفادات پر بڑی محنت اور تحقیق کے بعد جو چشم کشا حقائق بیان کئے ہیں اُن کو نظر انداز کرنا بڑا مشکل ہوگا۔ یہ کہنا بھی شاید بے جا نہ ہوگا کہ اب پاکستان میں جمہوریت کی اساس کو مضبوط بنانے اور جمہوری اداروں کی بالادستی کے لئے کی جانے والی کوئی بھی کوشش اُس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پائے گی جب تک کہ وہ اس کتاب کے ذریعے منظر عام پر آنے والے حقائق کو پیش نظر نہیں رکھے گی۔ یہ کتاب پاکستان میں جمہوریت کے امکانات کو ملک کے حقائق سے ہم آہنگ کرنے کا بہت اچھا وسیلہ ثابت ہوگی۔''

ڈاکٹر سید جعفر احمد

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين " اُداس نسلين" نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ "لُڙهندڙ نسُل" نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، کُڙهندڙ، ٻَرندڙ، چُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، پاڙي، ڪاٺُو، پاڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگھجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان "پڙهندڙ" نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَ نَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَ نَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا

ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو ته پَڪَ ڄاڻو ته اُهو ٻِه ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وٽن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيلا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بـہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. بين لفظن ۾ پَـنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِيـن. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَـن پاران ڪتابن ڪي ڊِجيِٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن ڪي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن ڪي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌِ کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن ڪي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ ڪي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ ڪي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڏي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موتي مَنجھہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم ـ گولو، جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڻڄاڻائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَڙَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪِڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چوڻ، چاليس ۽ ڪينئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي پنهنجو حق، فرض ۽ اٽُر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياکِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪي جو بيجل بوليو)